حکومتی بساط کی
باریکیوں کا جائزہ

سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و
شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

صراط مستقیم کے پیچ وخم اور
مشکلات کا سبق آموز قصہ

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ
بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

ایک حسینہ کے دل سے اترنے اور
نظروں سے گرنے کا عبرت انگیز ماجرا

پُرشور ماحول سے فرار
ہونے والوں کی بے بسی

بیگ صاحب کے پُرجوش دلائل
اور سچ کی تلاش کا دلچسپ انداز

جلد45 • شمارہ09 ستمبر2015 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی 74200 • فون :35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

ناگزیر

آج ہم حکومتوں کے سب سے زیادہ محبوب رجحان کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ یہ مطلقیت یا مطلق العنانی کا رجحان ہے۔ اکثر حکمراں بلکہ تمام حکمراں اس کو مملکت کے تمام عقدوں کا حل سمجھتے رہے ہیں۔ بہت سے دانشمندوں نے بھی حکومت اور ریاست کے باب میں بحث کرتے ہوئے اس کی تائید کی ہے۔ پر حقیقت یہی ہے کہ وہ رجحان تھا جس نے تاریخ کو ایک قصاب خانہ بنا دیا۔

صحیح بات شاید یہی ہے کہ انسانی فطرت اپنی آزاد وضع میں حکومت کے تسلط کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کرتی رہی ہے اور اس نے حکومت کو ہمیشہ ایک ظالمانہ اور غاصبانہ بندوبست گردانا ہے۔ ہے بھی یہی کہ حکومت اپنے جوہر میں ایک جبر ہے اور انسانی تاریخ اس جبر سے چھٹکارا پانے کی پے در پے کوششوں کا رزم نامہ ہے۔ تاریخ کی جھنجلائی ہوئی دست و پا بریدہ جرأتیں، سولی پر چڑھ جانے والی سینہ خیز صداقتیں اور بپھری ہوئی لہولہان بغاوتیں ہم پر یہی رمز منکشف کرتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان واقعہ طلب عزیمتوں کے ہیجان کا اصل رمز سینوں ہی میں رہا ہو اور زبانوں پر یہی نعرے سنائی دیے ہوں کہ فلاں ظالم اور فلاں غاصب کا تختہ الٹ دو مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ سارا ہیجان ظالموں اور غاصبوں کے اس سلسلے کے خلاف برپا ہوتا رہا ہے جس کا جامع اسم حکومت ہے۔

حکومت کا وہ خاص عملیہ کیا ہے جس کے باعث ہمیشہ ذہنوں میں بغاوتیں بھڑکتی رہی ہیں۔ وہ ایک مسلّم تسلط کی سرپرستی میں ایک برگزیدہ اقلیت کی طرف سے اکثریت کے حقوق کو غصب کرنے کا دستور ہے۔ جس کے ساتھ قانون اور اخلاق کا پورا نظام ہوتا ہے۔ پھر اپنے اس کردار کے ساتھ حکومت اپنی روح اور عمل میں ایک جبر و قہر ہوئے ہجوموں سے خطاب کرتے ہوئے یا قید خانوں کی سلاخوں کے پیچھے تلخ ہنسی ہنستے ہوئے ہمیں کتنے عجیب، عظیم اور قابلِ تعظیم محسوس ہوتے ہیں لیکن جب یہی لوگ اقتدار کی مسند پر دکھائی دیتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خوابوں کی فضا سے ناگہاں زمین پر گھسیٹ لیے گئے ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ انسانی فطرت حکومت سے کبھی انس پیدا نہیں کر سکی اور واقعی حکومتوں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانیت زمین پر آج تک پابہ زنجیر ہے۔ دنیا کی حساس اور آزادی پسند ذہانتوں نے ہمیشہ ایک ایسے دور کے خواب دیکھے ہیں جب حکومت موجود نہ ہوگی اور ایک لاحکومت اور لاریاست معاشرہ وجود میں آئے گا۔ حکومتوں کے سرفروش حریفوں اور جگردار مقتولوں کو تاریخ نے عام طور پر شہیدوں کے نام سے یاد کیا ہے۔

حکومت زیادہ سے زیادہ اقتدار اور زیادہ سے زیادہ تسلط کو اپنی طاقت خیال کرتی ہے۔ یہ محض خوش فہمی ہے، سب سے زیادہ بااقتدار حکومت سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہے۔ اس کے خلاف بغاوت کرنا خود اسی کے محکوم معاشرے میں سب سے بڑی فضیلت کا درجہ رکھتا ہے۔ چاہے اس کے خلاف کوئی ایک شخص بھی بغاوت نہ کرے لیکن درحقیقت ہر شخص اس کا باغی ہوتا ہے۔

اگر کسی حکومت کو حکومت ہونے کے باوجود اچھا کہا جانا ممکن ہے تو اچھی حکومت وہ ہے جسے معاشرہ اپنے احساسِ آزادی کا ضامن اور وکیل سمجھتا ہو اور جس کے افراد کسی فریب خوردگی کے بغیر فرائض میں حقوق کی لذت پاتے ہوں۔ ورنہ ہے یہی کہ عوام حکومتوں کو ہمیشہ اپنی امنگوں کا حریف محسوس کرتے ہیں۔ اس احساس کو دلوں سے یکسر مٹا دینا شاید ہی کسی حکومت کے بس میں ہو۔ ہاں، اس احساس کو کم کر دینا ممکن ہے اور یہ معجزہ ایک مثالی حکومت ہی سے ظہور میں آسکتا ہے۔ ویسے اپنے جوہر میں حکومت ایک شر ہے، بری حکومت ہی نہیں بہت اچھی حکومت بھی۔ اس حیثیت سے کہ وہ حکومت ہے...... ایک شر ہے...... اب یہ ایک مجبوری ہے کہ تاریخ کے موجودہ مرحلے میں یہ شر ناگزیر ہے۔

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

ستمبر 2015ء کا خوب صورت شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے...... یوم دفاع اور یوم فضائیہ کے حوالے اس ماہ کو ممتاز بنا دیتے ہیں اور اسی تناظر میں حب الوطنی کا احساس ہر پاکستانی کے دل میں اس سرزمین سے انسیت کو بڑھا دیتا ہے لیکن دورِ حاضر کے ناگوار حالات دل بوجھل کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے ممالک موسمی تغیرات کا سامنا کرتے ہیں مگر بد قسمتی سے ہمارے یہاں ''عقل اور اختیارات'' کا استعمال صرف اور صرف ذاتی مفاد اور دولت کے حصول کے لیے بڑی شدومد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر اس کا آدھا فیصد بھی ملکی مفاد کے لیے استعمال ہوتا تو اب تک اس ملک کی تقدیر اور صورتِ حال بدل چکی ہوتی۔ ہر سال سیلابی ریلوں کی خطرناک طغیانی کے باعث قیمتی جانوں اور فصلوں کی تباہی عوام کو خون کے آنسو رلاتی ہے مگر حکمران حالات کو قصوروار قرار دے کر خود کو معصوم ثابت کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ آخر خلوص کی چاشنی سے ناآشنا حکمرانوں کو کب خیال آئے گا کہ اگر ڈیم ہوتے تو یہی پانی بستیوں کو تباہ کرنے کے بجائے فصلوں کو سیراب کرتا اور بجلی بنانے کے کام آتا۔ کمال کی حکومت اور کمال کے پالیسی میکرز ہیں جو پہلے تو اطمینان سے تباہی آنے کا انتظار کرتے ہیں پھر میڈیا کے سامنے تباہ حال قوم کے چند آنسو پونچھ کر عوام کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر کے خود آرام سے بیٹھ کر بین بجاتے ہیں۔ زندہ قومیں زندگی کی سلامتی کے لیے متحرک ہوتی ہیں مگر یہاں لاشوں کی تعداد بتانے اور مُردوں کو دفنانے کے لیے انتہائی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جاتا ہے......

آج کل ذہنی طور پر عوام کو ایک اور انتشار میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جہاں روزگار کا قحط پہلے ہی پڑا ہو، وہاں تاجر برادری پر مختلف اضافی ٹیکسز کا نفاذ صنعت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ موجودہ دور میں ''بزنس فرینڈلی'' پالیسیوں کا فقدان تاجر برادری میں اختلافات کا باعث بنتا جا رہا ہے۔ بینک ٹرانزیکشنز پر ود ہولڈنگ ٹیکس کے نفاذ کے ساتھ گیس اور بجلی کے نرخوں میں اضافہ معاشی بدحالی میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے۔ ہمارے یہاں انڈسٹری کے لیے بجلی کی فی یونٹ لاگت 14 روپے کر دی گئی ہے جبکہ پڑوسی ممالک میں یہی بجلی 8 روپے فی یونٹ دستیاب ہے۔ ایسے میں پاکستانی برآمد کنندگان کس طرح عالمی مارکیٹ میں مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ہڑتالیں اور احتجاج یقیناً حکمرانوں کے لیے قابلِ فکر امر ہے۔ حکومت کی جانب سے مثبت اقدامات یقیناً ان مشکلات کو آسان کر سکتے ہیں۔ ورنہ عوام کی بددلی اور بداعتمادی میں اضافہ ملکی ترقی میں رکاوٹ بنتا رہے گا...... اب رستہ چاہے جو بھی نکالا جائے ملک میں امن و سکون اور عوام کو خوشحالی دینا حکومت کی اولین ذمے داری ہے اور یہی ملک کی ترقی کا سبب ہے...... اور بے سبب تو ہمارے یہ سندیسے بھی نہیں ہوتے جو ہر ماہ سسپنس سے اپنی محبت کا ثبوت دینے چلے آتے ہیں۔ تو چلتے ہیں ان سندیسوں کی جانب۔

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور سے محفل کی زینت بنے ہیں ''نیلی آنکھوں والی سادہ سی مسکین صورت دوشیزہ پیاری لگ رہی تھی۔ ایک کونے میں جھلملاتا ٹائٹل دوسری دفعہ عید کی مبارک باد پیش کر رہا تھا۔ خیر مبارک۔ فہرست پہ نظر ڈالی تو سبھی منجھے ہوئے فیورٹ قلم کار موجود تھے۔ سحر انگیز سلسلے اسماء قادری کے قلم سے شیش محل کا ایڈ پہلے سے دیکھ رہے ہیں جس کا بے چینی سے انتظار بھی ہے۔ امید ہے اگلے ماہ شائع ہوگا۔ ارے تبصرہ کا لکھا بھی ہوا ہے، بعد میں نظر پڑی ہے چلو زبردست ہو گیا اور جون ایلیا کی روشن خیالی بہت اچھا مضمون تھا۔ ایک دم سے نصیحتوں سے بھرپور۔ اپنی خطوط کی محفل میں پہنچے تو اپنا خط نہ پا کر تھوڑا شاک بھی ہوا۔ مسلسل 4 ماہ سے میرا خط شائع نہیں ہوا۔ اب کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے محفل میں حاضر ہونا چھوڑ دیا۔ خط شائع ہو یا نہ ہو، محفل میں شریک ہوتے رہیں گے اور اصل بات تو انصاف اور قانون کی ہے جو 1947ء سے آج تک اپنی اصل روح کے مطابق رائج نہیں ہو سکا اور نہ اس کی کوئی صورت نظر آتی ہے اللہ ہی حافظ ہے جیسے بھی حالات ہیں...... اوہو، ادریس احمد خان آپ متاثر ہوئے ہیں، اللہ آپ کو صحت دے اور محفل کی صدارت مبارک ہو۔ ویسے شنید ہے کہ ہمسایہ ملک کے کول پاور پلانٹ کے دھوئیں کی گرمی نے سندھ اور کراچی کو متاثر کیا ہے۔ خیر اللہ سب کو صحت و تندرستی عطا فرمائے اور حکومت کو بھی چاہیے تھا، ہنگامی بنیادوں پر متاثرین کی دادرسی کی جاتی لیکن پتا چلا اربابِ اختیار متاثرین کے پاس پہنچے ہی چار دن بعد تھے تو ایسے میں کیا توقع رکھیں۔ رضوان تنولی آپ نے بہت اچھی بات کی ہے لیکن آج کے دور میں حکمرانوں کو اتنا یارا کہاں؟ بشریٰ افضل اللہ تعالیٰ آپ کو صبر و حوصلہ دے۔ کوئی بھی انسان تنہا نہیں ہوتا بس مشکلات اور آزمائشیں ہوتی ہیں جس میں صبر و استقامت کا دامن تھامے رکھنا چاہیے۔ ویلکم محمد انعام مختصر تبصرے کے ساتھ آئے ہو، اچھا لکھا ہے۔ انجم فاروق، غلام یٰسین اور محمد جاوید شبیر کی تحریریں بھی زبردست تھیں، ریاض علی بغدادی اور محمد حنیف گبول اللہ تعالیٰ آپ کو آزادی عطا فرمائے، بہترین تبصرے ہیں۔ محمد خواجہ کورنگی، اللہ آپ کو بھی صبر و استقامت عطا فرمائے اور کراچی کے حالات بھی سب کے سامنے ہیں اس کے باوجود آپ کی بھرپور شرکت سے دل خوش ہو گیا۔ قدرت اللہ نیازی کی الفاظ کی فراوانی بہت اچھی لگی۔ باقی سید محی الدین اشفاق، قاضی عرفان احمد، اطہر حسین اور سید عبادت کاظمی کے تبصرے بھی عمدہ تھے۔ اللہ اکبر پوری عمارت ان کے اسلامی سرفروشانہ نعروں سے گونج اٹھی۔ دشمنوں پر فلسطینی مجاہدوں کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ فلسطینی گوریلوں نے یہودیوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ محسن، نغمانہ اور طلحہٰ کا جشن کامیاب ہو چکا تھا۔ دوسری طرف لیلیٰ آفندی ایک گھر میں مخبری پر شہید کر دی گئی اس کی موت پر بڑا تعجب ہوا کہ جس نے اتنے معرکے سر کیے اور دشمن کو بھی کئی مقامات پر جل دے کے نکل گئی، یہاں اچانک کیوں دشمنوں کے نرغے میں آ گئی۔ بے شک مخبری ہی تھی۔ خیر کہانی کا اینڈ ہو رہا تھا پھر بھی بھی

مجاہدین نے لازوال جذبے سے سرشار ہو کے اہم کارنامے انجام دیے لیکن آخری نظم نے مسلم امہ کی بے حسی کی تصویر جو کھینچی تو دل رنجیدہ ہو گیا۔ اپنی اپنی انا کی جنگ میں...... بقا کی جنگ میں...... ساری قومیں کھو چکی ہیں...... ہم بے حس ہو چکی ہیں...... ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کو سودائے جنوں جیسی بے مثال کہانی پیش کرنے پر زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہیں...... چلو معروف جگی نے بھی ماروی کی جان چھوڑ دی۔ جو اس کے شادی شدہ ہونے کے باوجود پیچھے پڑا ہوا تھا اور دوسری طرف مرینہ مرتے مرتے مراد کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ماروی بھی عجیب وغریب موڑ لیتی ہے۔ محی الدین نواب کی ماروی جتنی دلچسپ ہے ایسے ہی طول پکڑتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی سراب میں شازیہ کی اندھی محبت کے تخیل نے منیر کو زندہ کر کے سامنے لا کھڑا کیا لیکن وہ تو سراب تھا جب ہوش آیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ محبت کے حصول کے لیے جرم کی راہ اختیار کرنا کسی طور بھی قابلِ معافی نہیں۔ جیلا نے نورین کے حصول کے لیے جو خطرناک چال چلی اس میں خود ہی پھنس گیا اور ملک صاحب نے اپنی تفتیش وکارروائی سے نورین کو بھی بازیاب کرا لیا۔ ملک صاحب کی سفید پوش بہترین کہانی رہی۔ جتنا ہو سکے دنیا سے فائدہ اٹھا لے۔ کیونکہ بالآخر آرام وآسائش کے سب اسباب چھن جانے والے ہیں۔ الیاس سیتاپوری نے رموزِ شاہی میں زبردست رنگ بکھیر دیے، بہت پسند آئی۔ نازک ہاتھوں نے اینڈ پر واقعی مضبوط فیصلہ کیا تھا اور عامر اور بلال سے عقل مندانہ انتقام لیا تھا۔ مریم کے خان کی کہانی لاجواب تھی۔ لکڑبھگوں میں بچے سانجھے ہوتے ہیں اور اگر انسانوں میں ہمدردی اور احساس جاگ جائے تو ان کے بچے بھی سانجھے ہوتے ہیں جیسے جولی نے کہا مام میں این کے ساتھ جاؤں گی اور پھر اس کی ماں حیا نے بھی اجازت دے دی۔ کاشف زبیر کی بچے سانجھے دلچسپ اور بہت اچھی تحریر تھی۔ میاں بیوی کے دور دور رہنے سے بھی نقصان ہوتا ہے۔ تبھی مختار نے دوسری شادی کر لی اور وہ دانش کے ساتھ گناہوں کی دلدل میں اتر گئی۔ دانش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بیشا کی گود بھی ہری ہو گئی۔ آخر برسوں سے راہ گم ہونے پر ندامت کے آنسو بہا رہے تھے۔ ناہید سلطانہ اختر کی منقسم فیملی کی کہانی سبق آموز تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے شیخ سماالدین کے حالات وواقعات پڑھ کے بہت اچھا لگا۔ لفظ لفظ تحریر ایمان سے بھرپور تھی۔ محفل شعر وسخن میں محمد اشفاق سیال، بینش علی اور آسیہ نور کے اشعار اچھے تھے۔"

✠ **احمد خان توحیدی**، راولپنڈی سے تشریف لائے ہیں "شمارہ اگست عید کی لیو کے باعث 6 دن لیٹ 22 جون CMH راولپنڈی کے باہر بک اسٹال سے ملا۔ حسینہ ٹائٹل میں کشش نظر نہ آئی۔ انشائیہ جون ایلیا، روشن خیالی۔ پہلے قائد اعظم اور قائد ملت جیسی عظیم بے غرض قیادت تھی۔ جمعے کے دن عید الفطر آ گئے اتوار مگر حکومت نے مزید 3 دن پیر تا بدھ وقت کو ضائع کیا جو جانے کے بعد واپس نہیں آتا۔ ہمارے بچپن میں استاد پرائمری اسکول ماسٹر صادق صاحب کہتے تھے، چاند نظر آیا تب چھٹی ہوگی، ورنہ نہیں۔ کراچی کی گرمی ودہشت گردی خدا جانے ماں کی گود کی طرح سمیٹ لینے والے شہر کو کس کی نظر لگ گئی۔ اول صرف نااتفاقی ہے۔ محفل خطوط میں سر نکالا۔ ادریس احمد خان اچھے تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر تھے مبارک باد۔ طویل لیو کے باعث محفل میں شرکت نہ کر سکا تو سب ساتھی بھول گئے پھر میم کو گوری میم سمجھ کر ماروی کی طرف بھاگے۔ نواب صاحب کب تک مراد کے ہاتھوں لوگوں کو مرواتے رہیں گے اور وہ خود زخمی ہوتا رہے گا۔ مرینہ جیسی سخت جان کو آپ پھر زندہ کر دیں گے۔ معروف جگی کی زبان کی لاج رکھ کر سمیرا کو محبوب اور ماروی کو مراد کی آغوش میں ازدواجی زندگی سے لطف اندوز کرا کے بچوں کی لائن لگائیں ورنہ مراد کو دیکھ کر ہر جگہ مینڈ وتا اور مرینہ گھیر ڈالے رکھیں گی۔ پھر ملک صاحب کی سفید پوشی کا بھرم رکھنے پر نورین کی بخیریت واپسی کی خوشخبری ملی۔ جیلا جیسے نمک حرام کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ سیتاپوری صاحب کی رموزِ شاہی اچھی تاریخی کہانی لیکن سرگزشت کی قریبی تاریخی اسٹوری زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ حنیف گبول، حنا عروج، زوہیب احمد ملک، عامر اسماعیل، آسیہ نور، مدحت، رانا سجاد کے اچھے اشعار ہیں۔ سودائے جنوں بہت خوب جا رہی ہے۔ ازلی دشمن اسرائیل کے ذکر پر ابکائی آ جاتی ہے۔ ابراہیم جمالی، پہیلی، دلچسپ تحریر۔ ارملا نے شمشان سے پہلے ہی خود کو جلا لیا۔ مریم کے خان، مضبوط فیصلے، فرحانہ نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ عامر اور بلال سے خوب بدلہ لیا۔ ایس پی حامد کے حق میں شادی کا فیصلہ اچھا اقدام ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی صاحب، شیخ سماالدینؒ کی ایمان تازہ کرنے والی تحریر قبل تذکرہ اولیاءؒ میں پڑھی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب کی سراب حیران کن تحریر ہے.... ایسے واقعات ضرور ہوئے۔ آخری صفحات، ناہید سلطانہ کی راہ گم، موجودہ معاشرے میں ایک تلخ سبق آموز تحریر۔ عظیم رائٹر اسما قادری کے شیش محل کا ٹکٹ لے کر لائن میں کھڑے ہیں۔ جلد ڈلیوری لازم ہے۔ کیا پاکستان میں بیگ صاحب جیسے دوسرے وکیل اور ملک صاحب جیسے فرض شناس پولیس آفیسر نہیں ہیں؟"

✠ **محمد صفدر معاویہ**، تحصیل وضلع خانیوال سے چلے آ رہے ہیں "اگست 2015ء کا شمارہ بہترین سرورق کے ساتھ 14 جولائی کو موصول ہوا۔ جون ایلیا محترم روشن خیالی میں ملک کا منظر اور پس منظر بیان کرتے ہوئے نظر آئے۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ حکومت کی توجہ مسائل کی جانب مبذول کرواتے نظر آئے۔ باقی جس کا وقت مقرر ہو چکا، وہ پھر لقمۂ اجل بننے سے نہیں بچ سکتا۔ اپنی محفل میں آئے تو ادریس احمد خان کو کرسی صدارت پر بہت عمدہ تبصرہ کرتے پایا۔ مبارک ہو بھائی جان۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے چہرے سے نقاب اترتا ہے تو افسوس ہوتا ہے۔ بشریٰ افضل صاحبہ اللہ پاک آپ کی تمام مشکلات آسان فرمائے۔ سید عبادت کاظمی مختصر محبت نامہ لے کر آئے۔ محمد انعام بھائی ویلکم۔ انجم فاروق ساحلی بہت نوازش۔ تمام بے گناہ اسیران کو جلد سے جلد اس قید سے رہائی عطا فرمائے (آمین) ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی سودائے جنوں لاسٹ قسط ابھی ہے۔ ہمیں یہ امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی ختم ہو گی بہت ہی عمدہ کہانی تھی۔ میری بھٹی صاحب سے التماس ہے کہ وہ اب کے وادی کشمیر کے پس منظر پر کوئی ناول لکھیں۔ الیاس سیتاپوری رموزِ شاہی لے کر آئے۔ یہ تحریر پچھلے مہینے کی تحریر سے ملحقہ ہے۔ بہر حال تاریخ کا ایک باب جاننے کا موقع ملا۔ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر راہ گم لے کر آئیں جس میں شوہروں کی بے راہ روی بیویوں کو گناہ کی دلدل میں ڈال دیتی ہے۔ دانش کا کردار بہت برا رہا۔ ماروی کی یہ قسط بہت ہی عمدہ رہی۔ مراد نے مرینہ سے جان چھڑائی تو خود بھی زخمی ہوا۔ محبوب کی بے بسی ماروی نے اس سے وعدہ لے لیا۔ ادھر ماروی کے قتل کی پلاننگ ہو رہی ہے۔ بہت ہی عمدہ قسط رہی ہے۔ ملک صفدر حیات سفید پوش لے کر آئے۔ ملک صاحب نے ٹھیک طریقے استعمال کرتے ہوئے چودھری صاحب کی

بیٹی کو شادی سے ایک دن پہلے بازیاب کروالیا۔ مجھے شروع ہی سے جیلا پر شک ہوگیا تھا۔ آخر میں درست ثابت ہوا۔ کاش ہمیں ملک صاحب جیسے پولیس افسر نصیب ہوں۔ ضیا تسنیم بلگرامی شیخ سماالدین کے حالات و واقعات کو سامنے لے کر آئے۔ پڑھ کر دلی سکون محسوس ہوا۔ مریم کے خان مضبوط فیصلے کے ساتھ آئیں۔ عامر نے بہت ہی برا کیا محبت پانے کے لیے۔ کیا کوئی محبت پانے کے لیے خون بھی کرسکتا ہے؟ میرے خیال میں ہرگز نہیں۔ محفل شعروسخن عمدہ رہی۔ باقی تمام کہانیاں اور کترنیں بھی عمدہ رہیں۔ کراچی مسرور بیس میں رسالہ ملا۔ خانیوال میں جا کر پڑھا، خانیوال میں تبصرہ لکھا۔ کراچی میں آکر پوسٹ کیا۔'' (بہت خوب)

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے محفل میں شریک ہیں ''اگست کا شمارہ عید سے ایک روز قبل مل گیا۔ سوچا کہ گاؤں ساتھ لے جا کر اس کا مطالعہ کریں گے لیکن عین وقت پر بھول گیا اور پھر اس کا دیدار چار دن بعد ہوسکا۔ سرورق پر محترمہ عید مناتی ہنستی مسکراتی نظر آئیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا ایک سیاسی پارٹی کو روشن خیالی کا درس دیتے نظر آئے تاہم اب تو وہ ''جوں'' بھی ناپید ہے جو کان پر رینگتی تھی۔ انشائیہ تذکرہ مسائل کے ہمراہ خوش گمانی اپنے جلو میں لیے نظر آیا تاہم سیلاب سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ ہماری غلط فہمی ہے کہ حکمران عوام کی بہتری کے لیے مخلصانہ قدم اٹھائیں گے۔ کرسیٔ صدارت پر ادریس احمد جلوہ افروز نظر آئے۔ کراچی میں شدید گرمی کے ساتھ ہی بجلی و پانی کی عدم دستیابی نے خوف ناک صورتِ حال پیدا کر رکھی ہے۔ اللہ رحم فرمائے۔ کراچی سے ہی رضوان تنولی وزیراعظم کے فرائض انجام دیتے نظر آئے۔ قمر صائم، خوش قسمت ہیں کہ پہلی دستک پر ہی محفل کے دروازے آپ کے لیے کھل گئے ہیں۔ محمد صفدر معاویہ کراچی میں ہلاکت خیز گرمی واقعی پہلی بار پڑی ہے ورنہ موسم معتدل ہی رہتا ہے۔ اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ ارے ارے بشریٰ افضل صاحبہ! اتنا غصہ؟ بھئی میں نے کیا کر دیا ہے؟ آپ اللہ سے امید رکھیں مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔ سید عبادت کاظمی! ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ غلام یاسین نوناری! محترم یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ حقیقت کچھ زیادہ ہی تلخ ہے۔ ریاض علی البغدادی! اللہ سب بے گناہ اسیران کو رہائی عطا فرمائے۔ آمین۔ قاضی عرفان احمد عاجز! سسپنس کی یہ محفل اپنائیت سے بھرپور ہے۔ اس لیے شرکاء اپنے سکھ دکھ شیئر کرتے ہیں، آپ کو اس میں ویلکم کہا جاتا ہے۔ سودائے جنوں سسپنس میں اختتام پذیر ہوئی تاہم مجاہدین فلسطین کی یہودی قوم سے جنگ جاری ہے اللہ ان کو کامیاب فرمائے اور آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا موقع دے۔ آمین۔ ماروی میں بڑی مشکل سے ماروی نامہ سے نجات ملی تھی۔ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی راہ گم نے خوب دلچسپی کا سامان پیدا کیا۔ مختار کی دوسری شادی کو ایشا نے اپنے گناہ کا جواز بنالیا اور نفس کی غلامی میں لگی رہی۔ مختار نے ایک نامحرم کو گھر میں جگہ دے کر برائی کو کھلا راستہ دیا۔ آگ اور پیٹرول قریب ہوں تو انجام تباہی کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایشا پہلی بار ہی دانش کو تھپڑ مار کر گھر سے بھگا دیتی تو اس سب کی نوبت ہی نہیں آتی۔ مریم کے خان کی مضبوط فیصلے سنسنی خیز تحریر تھی۔ نائمہ کے ساتھ زیادتی کی گئی۔ حامد انسپکٹر ہو کر بھی کمزور نکلا جو نائمہ سے اپنے تعلق کو بچا نہ سکا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی سراب نے آبدیدہ کر دیا۔ شازیہ کی منیر سے محبت نے اس کے دماغ کو ایک ایسے منظر میں جکڑا کہ جس کی خواہش شاید ہر اس شخص کے دل میں ہوتی ہے جو اپنے کسی پیارے کو کھو بیٹھتا ہے۔ ابراہیم جمالی کی پہیلی میں ایک تجربے نے رام دیال کو شدید خسارے سے دوچار کر دیا۔ عورت کی نفسیات واقعی ایک پہیلی ہے۔ ملک صفدر حیات کی تحریر سفید پوش میں شاید پہلی بار کسی قتل کے بغیر معاملہ نمٹ گیا۔ جیلا بے چارہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سنگین قدم اٹھا بیٹھا تاہم خالی ہاتھ ہی رہا۔ کاشف زبیر کی تحریر بچے سانجھے درآمد شدہ بہترین تحریر تھی۔ لکڑ بھگے کی تلخ نوائی کہ اب مجھے اپنے بچے یاد آرہے تھے لیکن انسانوں کے برعکس مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ اگر میں نہ ہوا تو میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ کیونکہ ہم لکڑ بھگوں میں بچے سانجھے ہوتے ہیں، نے شرمندگی سے دوچار کر دیا۔ عبادت کاظمی اور جنید احمد کا انتخاب پسند آیا۔''

✠ **آر ایچ اے**، سینٹرل جیل لاہور سے تشریف لائے ہیں ''اس دفعہ ماہنامہ سسپنس اگست کا عیدالفطر کے 4 دن قبل ہی اخبار فروش سے برآمد ہوچکا تھا۔ اس لیے امید ہے کہ سب قارئین اور رائٹرز کی عیدالفطر بہت اچھی گزری ہوگی۔ سوائے ہمارے جیسے جیل کے قیدیوں کے۔ جن کے شب برات اور عید کے دن بھی عام دنوں کے مانند ہوتے ہیں۔ ہم عید کیا کسی بارش کا مزہ نہیں لے سکتے اور دوسروں کو خوش و خرم دیکھ کر ہی خوش ہوجاتے ہیں لیکن جب محفل کا کوئی دوست خوش ہونے کے بجائے اداس اور پریشان یا دکھی ہوتا ہے تو ہم اس کا دکھ دیکھا تو اپنا دکھ بھول گئے کے مصداق خاموش ہونے کے بجائے اور پریشان ہوجاتے ہیں۔ اس دفعہ محفل میں بشریٰ افضل صاحبہ اپنے دکھوں سے پریشان اور مایوس دکھائی دیں حالانکہ وہ یہ خوب سمجھتی ہیں کہ مایوسی گناہ ہے اور ان کے لیے میرا پیغام ہے کہ بقول شاعرہ وہ انسان نہیں جو گھبرا جائے حالات کے خونی منظر سے، جس حال میں جینا مشکل ہو اسی حال میں جینا لازم ہے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر روبینہ نفیس صاحبہ بھی دکھ وغیرہ سنا کر خود گم ہوگئی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی دوست ہیں جو دکھی ہو کر بھی زندگی کی گاڑی دھکیل رہے ہیں۔ ان کے لیے بھی یہی پیغام ہے کہ حالات کا مقابلہ کریں۔ محفل کے دوستوں کے نام تو نہیں لکھنا چاہتا تھا لیکن اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر نہ لکھوں تو مجھ میں اور ان میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا کیونکہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی کسی نے کبھی ہمیں یاد نہیں کیا۔ قیدی ہیں نا ہم سزائے موت کے، شاید اسی لیے ہے نا۔ ادریس احمد خان، رضوان تنولی، قدرت اللہ نیازی، سید محی الدین اشفاق، خواجہ، سید عبادت کاظمی اور جو شامل محفل نہ تھے یعنی روشنی رشید، نازپری، الببلی، قیصر اقبال کچھ، راحیل اعجاز، راجہ ثاقب نواز ثاقب، طاہرہ گلزار، سعدیہ بخاری، ہمایوں سعید، حسنین بلوچ، احسان سحر، آغا فرید، بابر عباس، تفسیر عباس، مظہر سلیم، سلمان خان صوابی، حکیم رضا خان جیسے کئی دوست گم ہوگئے ہیں۔ اس کی وجہ تو نہیں جانتا کیونکہ میرا سب سے رابطہ تقریباً ایک سال پہلے ٹوٹ چکا ہے لیکن ان تمام لوگوں نے کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔ ان کے علاوہ بھی کئی پرانے اور نئے دوست مجھے یاد ہیں۔ سودائے جنوں کی آخری قسط ختم ہونے پر نئی اسٹوری شیش محل اسما قادری کا انتظار ویسے بھی ملک کی خاطر جان دینے والے مجاہد آج بھی سرگرم ہیں ورنہ باقی حالات کا تو سب کو پتا ہے۔ فرح گل، قاضی عرفان احمد، حنیف گبول، ریاض علی بغدادی، قمر صائم اور بلیک لسٹ والے تمام نئے دوستوں کو محفل میں خوش آمدید۔ سفید پوش میں جمیل عرف جیلا کا لاکٹ جائے وقوعہ پر نہ گرتا تو شاید معاملہ ہی ختم ہوجاتا اور وہ پچھتاتا رہتا۔ سراب بھی ایسی تھی کہ دنیا زیادہ تر خیالی

رہتی ہے اور جو خیال میں وہ حقیقت بن جاتی ہے پھر خواب۔ ماروی بہت اچھی جا رہی ہے۔ دیکھو اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ بچ سا مجھے بھی مزہ دے گئی اور یقین کریں ہمارے بلاک میں کئی بلیاں ہیں اور انہوں نے اپنی اپنی حدیں مقرر کر رکھی ہیں اور وہ چاہے جتنا مرضی بھوکی پیاسی ہوں ایک دوسرے کو اپنی حد میں نہیں آنے دیتیں۔ شعر و سخن میں کوثر رضوی، آسیہ نور، حنا عروج، مدثر علی، احمد خان، مدثر کے اشعار بہترین تھے۔ کترنوں میں رضوان تنولی اور جاوید شبیر کی کترنیں بہترین تھیں۔''

فلک شیر ملک، رحیم یار خان سے تبصرہ کر رہے ہیں ''اگست کا پرچہ پڑھ کر آخری روزوں کی گرمی میں کافی کمی محسوس ہوئی۔ سرورق کسی حد تک جاذبِ نظر تھا۔ حسینہ خوش نظر آئی۔ جون ایلیا صاحب آپ کب تک اپنا سر پیٹتے رہیں گے۔ یہ مسلم لیگ وہ مسلم لیگ نہیں جو بانیِ پاکستان نے بنائی تھی۔ اس حکومت نے تو لوگوں کو آلو، پیاز سے ہی نہیں نکلنے دیا۔ باقی بحرانوں سے تو دور کی بات ہے۔ بجلی پر قابو نہیں پا سکی۔ بس ہو جائے گا کہہ کر اپنے اقتدار کی گھڑیاں پوری کر رہے ہیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ پسند آیا۔ الیاس سیتاپوری جیسے انسان ابھی تک موجود ہیں جو ہمیں ماضی میں لے جاتے ہیں۔ رموزِ شاہی بہت اچھی تحریر تھی۔ کاشف زبیر تو کاشف زبیر ہیں، بہت اچھے رائٹر ہیں۔ بچ سا مجھے میں جو سبق انہوں نے ایسے اچھے انداز میں دیا ہے، زبردست۔ ایک جانور انسان کے لیے کتنا ہمدرد ہے اور انسان کیا کر رہا ہے۔ بھٹی صاحب نے سودائے جنوں کا اینڈ کر دیا۔ بہت زبردست۔ اللہ پاک کوئی ایسا محسن پیدا کر دے جو کفر کے خلاف سیسہ پلائی دیوار ثابت ہو۔ سفید پوش میں ملک صاحب کا یہ کارنامہ پسند آیا۔ میں تیس سال سے ملک صفدر حیات صاحب کے کارنامے پڑھ رہا ہوں۔ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ محفل شعر و سخن میں فریال گوہر کراچی کا شعر بہت اچھا تھا۔ کوثر رضوی، ادریس احمد خان کے اشعار بھی قابلِ ستائش تھے۔ کہانیوں میں ابراہیم جمالی کی پہیلی زبردست تحریر تھی۔ ماروی کی کتنی قسطیں رہ گئی ہیں؟ نواب صاحب سے التماس ہے کہ اب اس کا اینڈ کر دیں۔ بابر نعیم کی تحفہ بھی کسی حد تک بہتر رہی۔ مریم کے خان کے مضبوط فیصلے نے بہت مزہ دیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی صاحب آپ کی نوازش ہے کہ ہمارا ایمان تازہ رہتا ہے۔ بہت بہت شکریہ ناہید اختر سلطانہ نے واضح کر دیا ہے کہ بیشتر انسان بھنورے کی طرح ہوتے ہیں۔ جو ایک پھول کا رس چوس کر دوسرے پر جا بیٹھتا ہے اور جب اسے احساس ہوتا ہے تو وہ گناہوں کی گہری دلدل میں جا چکا ہوتا ہے۔ بہت سبق آموز تحریر تھی، ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کو مبارکباد۔''

ابرار وارث، سندیلیانوالی سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں ''اگست کا شمارہ خلافِ توقع عید سے دو دن پہلے مل گیا اور سچے معنوں میں عید کا مزہ آ گیا۔ ٹائٹل گرل، خوب صورتی کا اعلیٰ شاہکار، اپنی میٹھی مسکان سے اہلیانِ وطن کو عید کی مبارک دیتی نظر آئی۔ جون ایلیا کی روشن خیالی پڑھی جو شروع میں تو معنی و مفہوم میں الجھی رہی خیر سمجھ آ گئی۔ کاش حکمرانوں کو بھی سمجھ آئے۔ خطوط سب کے زبردست تھے۔ ادریس احمد خان کرسیِ صدارت کی مبارک قبول کر لیں اور ماروی سے بچ کر رہنا۔ آپ کے علاقے میں ہی آئی ہوئی ہے۔ رضوان تنولی کا تبصرہ بھی خوش گفتاری کا اعلیٰ ثبوت تھا۔ قمر صائم آپ کے اور میرے نظریات سودائے جنوں کے بارے میں ''سیم سیم'' ہیں۔ اپنا خط مسلسل دوسری بار بھی شائع نہ ہونے پر دل دکھی تو ہوا خیر ٹرائی ٹرائی اگین...... (یہ ہوئی نا بات...... ہمتِ مرداں مددِ خدا) کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی فیورٹ ایکشن اور تھرل سے بھرپور کہانی سودائے جنوں کی آخری قسط پڑھی۔ بہت زبردست کہانی کو بہت جلدی میں ختم کیا گیا۔ ابھی بھی تشنگی سی باقی ہے۔ خیر آخری سطروں کی نظم دل کو بہت بھائی۔ شاید کہ ہم سب ہی بے حس ہو چکے ہیں۔ کاشف زبیر ہر دفعہ کی طرح اس بار بھی بازی لے گئے۔ بچ سا مجھے بہت ہی اعلیٰ محسوسات سے بھرپور تھی۔ محض ایک جانور کی حمایت میں بولے گئے فقروں نے اس جوڑے کو کتنے خطرات سے آزاد کروایا۔ کرس کے مرنے کے بعد این نے بہت ہمت دکھائی۔ اس ساری کہانی میں مرکزی کردار تو اس بے غرض لکڑ بھگے کا تھا۔ کتنے بے مول اور بے غرض ہوتے ہیں یہ جانور اور ہم انسان انہیں ختم کرنے کے درپے ہیں۔ دھڑکتے دلوں سے ناہید سلطانہ کی تحریر راہ گم پڑھی مگر نہ جانے کیوں پہلے بھی اسی جیسی کوئی پڑھی تھی۔ ماروی پڑھ کر اس دفعہ تو بے اختیار نواب صاحب کے ہاتھ چومنے کو دل چاہا۔ بہت زبردست موڑ لیے ماروی بھی اپنے اختتام کی طرف گامزن ہو رہی ہے۔ مرینہ کا ابھی بھی کوئی پتا نہیں زندہ ہو جائے تو......؟ اب سمیرا کو دیکھو بلاوجہ جلاپے کا شکار ہو رہی ہے۔ غلطی ماروی کی بھی ہے۔ جیسے بھی تھا روپوش ہی رہتی کیوں بتایا سمیرا کو۔ ملک صفدر حیات کی سفید پوش بھی بہت زبردست تحریر تھی۔ آخر کو جیلا سے غلطی ہو ہی گئی کہ اس کا لاکٹ نورین کے کمرے میں ہی گر گیا اور اس نے دھیان نہ دیا...... آخر میں چمن خان کے جملوں پر بڑی دیر تک ہنسی آئی...... عورت ایک بہت ہی الجھی ہوئی پہیلی ہے، اس حقیقت کو واضح کر گئی پہیلی۔ ابراہیم جمالی نے اہم نکتہ اٹھایا عورتوں کے بارے میں۔ سب سے زیادہ جو کہانی مجھے پسند آئی وہ مضبوط فیصلے تھی۔ آخر کار محبت سے انتقام لینے والے نے انتقام لے کر ہی دم لیا۔ زبردست شاہکار تھی یہ تحریر۔ نائمہ جیسی عورتیں کبھی سکون نہیں پاتیں۔ حسد، بغض اور کینہ ان کا سب کچھ تہس نہس کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ہوں اور ان کی تحریر فضول ہو، کبھی ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں...... سراب واقعی ایک بیوی کی محبت اور بے تحاشا پیار کو واضح کرتی دلوں کو جھنجوڑتی بہت زبردست اور مختصر تحریر تھی۔ بے چاری شازیہ کو مرنے کے بعد بھی ہر جگہ منیر ہی دکھائی دیتا ہے جو اس کی محبت کا والہانہ ثبوت ہے۔ آخری قہقہہ میں شکاری خود ہی اپنے پنجرے میں بند ہو گیا۔ کولن بے چارہ کتنوں کو لوٹ چکا تھا اب بھی وہ شاہانہ کروفر اور ٹھاٹ کے مزے ہی لینا چاہتا تھا کار میں کہ عدم فانی کو کوچ کر گیا۔ شیخ سماالدین کی پہچان بھی دلوں کو منور کرنے والی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں زینب فیصل آباد، حنا عروج کراچی، مدثر علی، قدرت اللہ نیازی، احمد حسن عرضی اور سید عبادت خان کے شعر زبردست تھے۔ پلیز انکل جی آخری صفحات پر مریم کے خان یا کاشف زبیر کو لے آئیں۔ شیش محل کا بے صبری سے انتظار ہے۔''

رانا سجاد اختر، نیو سینٹرل جیل ملتان سے محفل میں شریک ہیں ''عید الفطر کی خوشیوں میں اگست کا شمارہ موصول ہوا جو عید کی خوشیوں کو مزید دوبالا کر گیا۔ انشائیہ میں جون ایلیا روشن خیالی کے عنوان سے اپنا نقطہ نظر بہترین انداز میں پیش کرتے نظر آئے۔ آپ کے خطوط میں ادریس احمد خان، محمد صفدر

معاویہ، محمد قاسم رحمان، اطہر حسین، بشریٰ افضل، محمد انعام، ریاض علی بغدادی اور محمد خواجہ کا تبصرہ پسند آیا۔ برادرم محمد خواجہ جی، بڑے بھائی، ننھیالی ممانی اور بڑی بھابھی کے یکے بعد دیگرے انتقال پر ہم سب کی طرف سے تعزیت قبول فرمائیں۔ ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ رب العزت مرحومین کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین۔ رموزِ شاہی میں الیاس سیتاپوری کا ماضی کا آئینہ بہترین انداز میں تھا۔ضیا تسنیم بلگرامی نے شیخ سماالدین پر بہترین مضمون پیش کیا جو روح کو تازگی بخش گیا۔ مریم کے خان کی مضبوط فیصلے اور محی الدین نواب کی ماروی کی قسط زبردست تھی۔ محفل شعروسخن میں فریال گوہر، کوثر رضوی، محمد حنیف گبول، مدحت، زاہد چودھری، مہر محمد عامر اسماعیل، غلام یٰسین نوناری، حاجی محمد زاہد اقبال زرگر، محمد قدرت اللہ نیازی، عثمان انصاری، قاضی عرفان احمد عاجز، مونا رضوان، حنا عروج، محمد اعجاز اور محمد زریان سلطان کا انتخاب زبردست اور شاندار تھا۔ کترنوں میں رضوان تنولی کریزوی اور اطہر حسین کی اجارہ داری نظر آئی البتہ پیشکش دونوں کی تمام اچھی تھیں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے چلے آرہے ہیں ”سسپنس ڈائجسٹ اگست بہت خوب تھا۔ ذاکر صاحب جو محنت کرتے ہیں آخر اس کا ثمر تو ملنا چاہیے جو بلاشبہ تعریف سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس کا حق وہ بحسن وخوبی نبھاتے ہیں۔ اندر انشائیے میں علم وحکمت کے خزینے سے آگاہی حاصل کی۔ اداریے سے مستفید ہوئے۔ سب سے پہلے اپنے نامے پر نظر پڑی، بہت شکریہ۔ محمد خواجہ کا تبصرہ زیادہ اچھا اور جامع لگا۔ الیاس سیتاپوری نے ماضی کے جھروکوں سے آشنا کیا۔ الفاظ کا جادو سرچڑھ کر بولتا ہے اور قاری تحریر کے آخری لفظ تک کہیں بھی بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔ بچے سانجھے کاشف زبیر کی خوب صورت تحریر تھی جس میں ایک بے زبان جانور کے بچے تاثرات کا احاطہ کیا گیا۔ ویلڈن کاشف زبیر صاحب مبارک باد۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی تحریر سودائے جنوں اختتام پذیر ہوئی۔ بہت اچھی تحریر تھی جس نے اتنے عرصے تک متاثر کیا، جس میں اسرائیلیوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملایا اور ہزاروں لاکھوں فلسطینیوں کے خون کا بدلہ چکایا۔ یہ جذبہ حریت کی بے مثال داستان تھی جس نے ازحد متاثر کیا۔ ناقابلِ گرفت میں دولت کے لالچ... حرص وہوس میں مبتلا ایک بہن نے اپنی بہن کو راستے کا کانٹا سمجھ کر اس کی دولت پر غیر محسوس طریقے سے ہاتھ صاف کیا۔ احتجاج شکن بھی اچھی لگی۔ محفل شعروسخن میں اچھے اور معیاری اشعار نے محظوظ کیا اور کترنوں نے بھی دلچسپی کا عنصر بڑھایا۔ پہیلی میں ایک اداکار نے جس طرح چھپ کر اور بھیس بدل کر اپنی بیوی کا امتحان لیا۔ بھید کھلنے پر وہ اس کی بیوی پر تازیانہ ثابت ہوا۔ واقعی عورت ایک پہیلی ہے، سمجھنے کی نہ سمجھانے کی۔ تحفہ بھی پسند آئی۔ مضبوط فیصلے نے بھی اچھا تاثر دیا۔ شیخ سماالدین کے حالات وواقعات نے دل کو روشنی سے منور کیا۔ ایسے واقعات پڑھ کر دلوں کی تاریکی چھٹ جاتی ہے اور اپنا آپ اجلا اجلا سا دکھائی دیتا ہے۔ مگر شیطان بھی انسان کا ازلی دشمن ہے جو انسان کو زندگی کی آخری سانسوں تک بہکاتا رہتا ہے۔ سراب نے بھی پسندیدگی کا تاثر دیا۔ آخری قہقہہ میں کولن نے دولت کا لالچ کیا اور اسی لالچ اور حرص وہوس کے آنکھوں پر پردے پڑ گئے۔ جس میں اندھا ہو کر وہ موت کی دہلیز پار کر گیا۔ آخری صفحات کی کہانی راہ گم بہت خوب صورت اور عبرت انگیز تھی۔ انسان گناہ کیے جاتا ہے اور یہ سوچتا جاتا ہے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں۔ وہ ایسا سوچ کر اور سنگین غلطی کرتا ہے اور گناہوں کی دلدل میں دھنستا جاتا ہے۔ مگر گناہوں کی دلدل میں گلے گلے تک ڈوب کر پھر احساس ہو جانا بہت اچھا ہے۔ پھر سچے دل سے توبہ کی جائے تو اللہ تعالیٰ بھی غفور وکریم ہے اور وہ بندے کو معاف کر دیتا ہے۔ اتنی خوب صورت کہانی پر ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کو مبارکباد۔“

✠ **تابی اور بالو**، ضلع شیخوپورہ سے حاضر ہیں ”مصروف زندگی میں سے وقت نکال کر ایک دفعہ پھر سے محفل میں حاضری دینے آئے ہیں۔ ذرا راستہ تو دیں اندر آنے کا بھئی۔ جب سے سنا ہماری دلعزیز مصنفہ اسما قادری سسپنس کے صفحات پر نئی کہانی لے کر حاضر ہونے والی ہیں تو ہم نے بھی انتظار شروع کر دیا۔ امید ہے گرداب سے نکل کر شیش محل میں انٹری مزہ دے گی۔ تو جناب محفل کے شاہی تبصرہ نگاروں میں تھوڑی سی جگہ ہمیں بھی بخش دی جائے۔ فیس بک پر کی گئی تنقید نے ہمیں بھی راہ گم پڑھنے پر مجبور کر دیا کہ دیکھیں تو سہی، مصنفہ نے کیا واہیات تحریر لکھ دی۔ ایک ہی نشست میں ختم کی۔ اس تحریر نے جھنجوڑ کر رکھ ڈالا۔ ازل سے ہوتا آرہا ہے کہیں حوا آدم کو بہکا دیتی ہے اور کہیں آدم حوا کو۔ موضوع نہایت حساس تھا مگر مصنفہ نے نہایت خوب صورتی سے اپنے انجام تک پہنچایا کرداروں کو۔ ہمیں ایک لفظ بھی غیر اخلاقی نہیں ملا۔“ (یہی بات پڑھ کر اس غلط بات کہنے والے کو خود شرمسار ہونا چاہیے جس نے اپنی ہی طرف سے اتنی بے بنیاد بات کہہ کر اپنی ذات کو چھوٹا کر لیا ہے)

✠ **اشفاق شاہین**، کراچی سے شریکِ محفل ہیں ”ہر بار کی طرح اس بار بھی سسپنس بروقت کیا ملا، ہماری تو عید سے پہلے ہی عید ہو گئی۔ سرورق کو ذرا عید کا ٹچ دے دیتے۔ چاند، چوڑیاں کچھ اور تو مزہ دوبالا ہو جاتا۔ جون ایلیا کا انشائیہ روشن خیالی بہت خوب اور سبق آموز تھا۔ اپنی محفل میں پہنچے جہاں ادریس خان کرسی صدارت پر براجمان تھے، بہت اعلیٰ خط کے ساتھ۔ رضوان تنولی، قمر صائم، صفدر معاویہ، قاسم رحمانی، بشریٰ افضل سب دوستوں کے خط بہترین تھے۔ محمد انعام جی آیاں نوں۔ جاوید شبیر بھائی کوشش تو ہوتی ہے باقاعدہ رہیں پر کبھی کبھی پیشہ ورانہ مصروفیات آڑے آجاتی ہیں اور ملکی حالات آپ جانتے ہی ہیں۔ ریاض بغدادی پسندیدگی کا شکریہ۔ دوست، اللہ آپ کی مشکلات آسان فرمائے۔ محمد خواجہ، بہت افسوس ہوا۔ اللہ تمام مرحومین کو جنت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ اور دیگر لواحقین کو صبر واستقامت اور حوصلے سے نوازے۔ آمین۔ قدرت اللہ نیازی محترم حرکت میں برکت ہے اور اگر انتہائی سستی غالب آنے کا امکان ہو تو سالانہ خریداری سے بڑھ کر کوئی فارمولا آزمودہ نہیں۔ رموز شاہی بہترین تاریخی کہانی تھی۔ بچے سانجھے، بہت خوب رہی۔ ہم سوچ سکتے ہیں کہ جانور بھی حیات رکھتے ہیں۔ سودائے جنوں انجام کو پہنچی۔ اب اس کی جگہ کوئی دلچسپ اور مزید داستان لے کر آئیں، طویل ہو۔ ناقابلِ گرفت تنویر ریاض نے خوب لکھا۔ سفید پوش، ملک صفدر حیات کی کہانیاں تو پرچے کی جان ہوتی ہیں۔ انتظار رہتا ہے۔ احتجاج شکن بھی خوب تھی۔ پہیلی، پہیلی ہی رہی اور عورت تو واقعی ایک پہیلی ہی ہے اور رہتی ہی پہیلی ہے۔ ماروی زبردست جارہی ہے۔ بابر نعیم کا تحفہ لاجواب تھا۔ ڈاکٹر شیر شاہ ہمیشہ اچھا لکھتے اور خوب لکھتے ہیں اور آخری صفحات کی کہانی راہ گم ناہید سلطانہ اختر کی سنسنی خیز اور لاجواب تحریر تھی۔ محفل شعروسخن میں انتخاب عمدہ تھا خصوصاً شازیہ، فریال گوہر اور زینب کا انتخاب۔“

غلام یٰسین نوناری، چوک سرور شہید سے لکھ رہے ہیں ”اس بار سسپنس پندرہ تاریخ کو پا کر حیرت آمیز خوشی ہوئی۔ آپ نے عیدالفطر پر ایک دن پہلے سسپنس کو ہم تک پہنچا کر گویا عید کا تحفہ دیا اور یہ تحفہ اس وقت بے حد شاندار لگا جب پڑھنا شروع کیا۔ سرورق پر نظر دوڑاتے ہی نگاہوں میں نیلاہٹ اتر گئی۔ حسینہ کی مسکراہٹ جاندار لگی۔ عید مبارک پڑھ کر زیرِلب خیر مبارک کہتے ہوئے محفلِ دوستاں میں انٹری دی۔ ادریس احمد خان کرسی صدارت پر خوب صورت اور زبردست تبصرے کے ساتھ موجود تھے بہت مبارک جناب۔ اپنے پیارے دوست رضوان سلطان تنولی کو وزارت کے عہدے پر فائز پا کر بے پناہ مسرت ہوئی۔ ان کے خط سے محبت کا امرت ٹپکتا محسوس ہوا۔ زبیر حسین، اعجاز احمد راحیل، شوکت شہریار کی کمی محسوس ہوئی۔ امید ہے یہ دوست آئندہ ضرور شامل ہوں گے۔ سب سے پہلے سودائے جنوں کا مطالعہ کیا۔ دورانِ مطالعہ آنکھوں سے آنسو تواتر سے بہتے رہے۔ آخر میں دی گئی آزاد نظم مزید رلا گئی۔ کہانی کا اختتام جلدی میں کیا گیا جس سے کہانی کا مزہ کم ہو گیا۔ ماروی میں مرینہ کی اچانک موت افسردہ کر گئی۔ ماروی اور مراد کے دلوں میں چھائی نفرت کی دھند بالآخر چھٹ گئی اور دونوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ ادھر معروف اور حماد ماروی کو ختم کرنے کی پلاننگ کر چکے ہیں۔ آخری صفحات پر اپنی فیورٹ مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر راہ گم پڑھی۔ معاشرے کے تلخ حقائق کو واکرتی حقیقی کہانی لگی۔ (تفسیر عباس بابر نے ادارے کے بارے میں جو بھی کہا، غلط کہا۔ ان کا ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے) کاشف زبیر اس بار لکڑ بھگے کی کہانی لے کر آئے جس نے بے حد متاثر کیا۔ مریم کے خان کی تحریر بھی دلچسپ ثابت ہوئی۔

بشریٰ افضل، بہاولپور سے تبصرہ کر رہی ہیں ”سسپنس جب ملا تو میں دکھوں کے غموں سے چور تھی کہ اپنا دوست غمگسار سسپنس ملا۔ سسپنس کو سینے سے لگا کر بہت روئی۔ بہرحال ٹائٹل اچھا تھا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو پہلے انکل کی باتیں سنیں۔ ادریس احمد خان کرسیِ صدارت مبارک ہو۔ 16 جنوری 2015ء کو ایک بڑی بہن گئی۔ 3 ماہ بعد بھائی بڑا 14 اپریل 2015ء۔ 3 ماہ بعد میری ماں جیسی بڑی بہن جس نے کبھی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی 3 ماہ بعد 13 جولائی عید سے 4 دن پہلے ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ تین اموات نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں خود کو سنبھال نہیں پا رہی۔ میں نے کہا تھا اب میری باری ہے لیکن باجی بازی لے گئیں اور مجھے ہمیشہ کا دکھ دے گئیں۔ 2 بہن بھائی بھولے نہیں تھے کہ باجی نے بھی تیاری کر لی، یہ ہمارے لیے تین بڑے سانحے ہیں۔ مرحومین کے تمام ساتھی سورۃ یٰسین اور سورۃ فاتحہ پڑھیں۔ میرے لیے صبر کی دعا کریں۔ میں حالات کا مقابلہ کس طرح کر پاؤں گی۔ (اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ادارہ بھی آپ کے غم میں شریک ہے۔ حوصلے سے زندہ رہنے کا نام ہی زندگی ہے) دکھوں سے نکلنے کے لیے پڑھا مگر تھوڑا جتنی ہمت تھی۔ آخری قہقہہ، کولن نے لالچ کیا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ سراب، دراصل شازیہ کو اپنے شوہر سے اتنی محبت تھی کہ اس کا دل ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ پہیلی، عورت واقعی ایک پہیلی ہے۔ رام دیال نے اپنی بیوی کو اپنی اداکاری کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ارملا نے پھر بھی شوہر سے بے وفائی نہ کی۔ شیخ سماالدین کے ایمان افروز واقعات پڑھے۔“ (تبصرہ کرنے کا شکریہ)

قاسم رحمان، ہری پور سے شریکِ محفل ہیں ”خوبرو حسینہ عید کی مناسبت سے تیار ہو کر بہت چارمنگ لگ رہی تھی۔ روشن خیالی میں جون ایلیا کی قابلیت کا معترف ہونا پڑا۔ اداریے میں ایڈیٹر نے قابلِ غور باتیں کیں۔ کرسیِ صدارت پر ادریس احمد کا قبضہ تھا، مبارکاں جی! رضوان تنولی ہمیں اپنے جادوئی الفاظ کے سحر میں جکڑتے ہوئے نظر آئے۔ بیسٹ رہا آپ کا تبصرہ۔ قمر صائم کیا نوجوان مستقل قاری نہیں ہو سکتے؟ بہرحال سسپنس کی محفل میں آپ کا سواگت ہے۔ صفدر معاویہ انشائیہ کو دل میں سمویا نہیں جاتا۔ خود بخود دل میں اتر جاتا ہے۔ بشریٰ افضل مایوسی کفر ہے۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔ غلام یٰسین خوب صورت باتیں کرتے ہوئے نظر آئے۔ محمد جاوید شبیر مبارک ہو۔ سسپنس پہلے آپ کو ملا۔ محمد خواجہ دکھی نظر آئے۔ اللہ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی مزے دار اور چٹ پٹے تھے۔ سب سے پہلے آخری صفحات پر راہ گم پڑھی۔ ایشا کی خودغرضی نے حیران کیا۔ کوئی عورت اتنی سفاک کیسے ہو سکتی ہے۔ بیشا کا صبر بھی اپنا رنگ لے آیا۔ بہت ہی زبردست ناول تھا۔ اس بار کسی نے ہم سے کہا کہ ماروی کی تعریف نہ کی تو آپ کو مراد علی منگی شوٹ کر دے گا۔ ہاہاہا۔ لیکن کہانی پڑھی تو تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کہانی میں میرا موسٹ فیورٹ کریکٹر مرینہ ہے۔ بس اللہ کرے مرینہ زندہ ہو جائے۔ سمیرا کی خودغرضی پر دکھ ہوا۔ سودائے جنوں بھی اختتام کو پہنچ گئی۔“ (ہم آپ کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں)

اعجاز احمد راحیل، ماہی، ضلع ساہیوال سے چلے آ رہے ہیں ”ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے نگرانِ اعلیٰ معراج رسول صاحب نے ادارے کے پرچوں پر ہمیشہ خصوصی توجہ دی ہے۔ ان پرچوں میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور بہت سے لکھاریوں کو ہم شائقینِ ادب سے متعارف کروایا۔ سسپنس ڈائجسٹ کے قیمتی صفحات پر بہت سی لازوال کہانیاں شائع ہوئیں۔ ان میں سے کچھ ایسی ہیں جو ہمارے دل و ذہن میں نقش ہو گئیں...... دیوتا، موت کے سوداگر، شکاری، مسافر، کشکول، ستاروں پہ کمند اور پسِ زنداں سب بے مثل اسٹوریز ہیں۔ ایک کامیاب قلم کار کی اصل کامیابی بھی یہی ہے...... کہ اس کی تحریر قاری کا دل و ذہن قبول کرے اور وہ پسندیدگی کا درجہ پا لے...... لہو کو گرماتی، دھڑکنوں کو زیروزبر کرتی اور دلوں میں جذبۂ حب الوطنی پیدا کرتی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی نایاب اسٹوری سودائے جنوں بھی آخر اختتام پذیر ہو گئی۔ کہانی نے آغاز سے انجام تک ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ مجھے ان کی سب تحاریر اچھی لگتی ہیں مگر یہاں کچھ انوکھا تھا۔ سودائے جنوں کے مطالعے کے دوران مجھے بھٹی صاحب ڈاکٹر کے بجائے آبدوز کے انجینئر لگنے لگے تھے۔ سودائے جنوں ایک عہد تھا جو جدا ہو گیا۔ یہ ایک مشکل موضوع تھا۔ اس کے لیے وسیع مطالعے، مشاہدے اور پختہ تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ الوداع سودائے جنوں۔ آخر میں... ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس کے اسٹاف کے لیے سلامتی کی دعائیں اور ڈھیروں داد۔“ (بہت شکریہ)

شوکت شہریار، گورنمنٹ کالونی، اوکاڑہ سے شریکِ محفل ہیں ”عید کی شاپنگ کرنے کے لیے بازار کا رخ کیا تو اپنے محبوب ڈائجسٹ کو بک شاپ پر لٹکا دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس مرتبہ سسپنس 14 تاریخ کو ہی عید کا چاند بن کر نظر آیا۔ سرورق کی حسینہ ہمیشہ کی طرح بڑی نٹ کھٹ اور شوخ مزاج

تھی۔ جون ایلیا سے فارغ ہو کر جب حاضرِ محفل ہوئے تو ادریس خان کو بڑے جاہ و جلال کے ساتھ کرسیٔ صدارت پر براجمان پایا۔ ادریس بھائی آپ کو ڈھیروں مبارک باد۔ رضوان تنولی صاحب آپ جتنی کستوری ہر ماہ خط میں لگاتے ہیں تو لگتا ہے کہ روٹی بھی کستوری لگا کے کھاتے ہوں گے۔ کستوری لگا کے۔ قمر صائم صاحب لوگ رسالہ پڑھتے ہیں اور آپ نے چاٹنا شروع کر دیا؟ صفدر معاویہ ہمیشہ کی طرح بہترین تبصرے کے ساتھ حاضرِ محفل تھے۔ بشریٰ افضل ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنا کرم فرمائے گا اور آپ کی سب مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ قدرت اللہ نیازی بھائی اس دفعہ اپنے تبصرے میں فروٹ کا رونا روتے نظر آئے۔ اپنے پیارے بھائی غلام یٰسین نوناری کو محفل میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں اس مرتبہ سودائے جنوں سب سے پہلے پڑھی۔ ایک نہایت عمدہ کہانی کا اچانک اختتام کر دیا گیا۔ لیلیٰ کی شہادت رلا گئی مگر ایک لیلیٰ گئی تو کیا ہوا؟ ناپاک یہودیوں کے غلیظ عزائم کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہزاروں لیلیٰ عالمِ اسلام میں پیدا ہوتی رہیں گی اور ایک دن فلسطینی اپنی جدوجہد میں کامیاب ہوں گے۔ بچے سانجھے میں ایک لکڑ بھگے کا کردار بہت زبردست تھا۔ آخر میں این اور جولی کی صلح بھی ہو گئی۔ ملک صفدر حیات کی سفید پوش بھی بہترین تھی۔ نورین بے چاری خوامخواہ جیلا کی خود غرضانہ محبت کا شکار ہو گئی۔ پہیلی میں رام دیال جو کہ خود ایک بڑا اداکار تھا مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ عورت کی پہیلی کو آج تک کوئی نہیں بوجھ سکا۔ ماروی کی یہ قسط بھی گزارے لائق تھی۔ مضبوط فیصلے، فرحانہ کا کردار بہت پسند آیا۔ عامر اور بلال کا انجام بھی بہت برا ہوا۔ وہ تھے بھی اسی لائق۔ حامد کو بھی اس کی محبت واپس مل گئی۔ آخری قہقہہ میں کولن کی ساری شاطرانہ اندازی دھری کی دھری رہ گئی اور اس کو آخری قہقہہ لگانے کا موقع بھی نہ ملا۔ آخری صفحات پر راہ گم، آج کے معاشرے کی عکاسی کرتی تحریر تھی۔ گھریلو ناچاقی اور مرد کی خود غرضی کی وجہ سے ایشا کو اپنے خاوند سے بے وفائی کرنی پڑی جو کہ ناقابلِ قبول ہے۔ عورت تو صبر کا پیکر ہوتی ہے مگر ایشا جیسی عورتیں دانش جیسے مردوں کے ہاتھوں بے وقوف بن کر اپنی آخرت و دنیا دونوں گنوا بیٹھتی ہیں۔‘‘

✠ **محمد اسماعیل اجاگر،** پنڈ گھیب، ضلع اٹک سے حاضر ہوئے ہیں ’’اللہ پاک آپ کی صحت، رزق میں برکت عطا فرمائے۔ بہت ٹائم کے بعد سسپنس کی محفل میں حاضری دے رہا ہوں۔ جون ایلیا صاحب کتنی اچھی سوچ تھی آپ کی لیکن دکھ کی بات یہ ہے ہم لوگوں کو اچھی سوچ مثبت رویے، اچھے لوگوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اگر ضرورت ہوتی تو آج ہم کتنے تہذیب یافتہ ہوتے۔ اعلیٰ ترقی یافتہ ہوتے۔ سفید پوش ملک صفدر حیات کی تحریر سب سے پہلے پڑھی۔ ملک صاحب بندہ خطا کا پتلا ہے۔ آپ اپنے ان کیسز کا تذکرہ بھی کیا کریں جن میں آپ کو ناکامی ہوئی ہو۔ مضبوط فیصلے اچھی تحریر تھی۔ عامر نے فرحانہ کو لاعلم سمجھا اور مارکھا گیا۔ آج کی عورت بہت ایڈوانس ہو گئی ہے بھئی۔ پہیلی، بھی عورت پہ تحریر تھی۔ نازک دل ہوتا ہے اس عورت کا۔ آخری قہقہہ، انسان سوچتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے۔ بچے سانجھے بہت عمدہ تحریر تھی۔ کاشف زبیر صاحب کی تحریروں میں جان ہوتی ہے۔ آخری صفحات پہ راہ گم بہترین تحریر۔ انسان کے کچھ غلط فیصلے ساری زندگی برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کتنا سبق ہے ان تحریروں میں مگر ہم سیکھتے ہی نہیں۔‘‘

✠ **رمضان پاشا،** گلشنِ اقبال، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں ’’اس بار ٹائٹل اچھا تو تھا مگر عید کے شایانِ شان نہیں تھا۔ البتہ روشن خیالی والا مضمون اثر انگیز تھا۔ اداریہ بھی متاثر کن تھا مگر بے سود، نقار خانے میں اس طوطی کی چیخ کون سنے گا (آواز اٹھاتے رہنا چاہیے، خواہ کوئی سنے نہ سنے، ممکن ہے لفظ اپنی جگہ بنا لیں) خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے ادریس احمد خان کو مبارک باد۔ اشعار کی محفل میں رضوان تنولی، محمد صفدر معاویہ، جنید احمد ملک اور کراچی والی محترمہ شازیہ صاحبہ کا انتخاب بہت ہی لاجواب تھا۔ معرکہ آرا کہانی سودائے جنوں پڑھتے ہوئے کئی مقام ایسے آئے کہ دل دھڑکنا بھول گیا۔ خدانخواستہ میں دل کا مریض ہوتا تو فوت ہو جاتا۔ اختتام میرے حسبِ منشا ہوا۔ ناقابلِ گرفت میں بھی لطف آیا۔ سفید پوش، صفدر حیات نے حسبِ معمول اصل مجرموں کو بے نقاب کر ہی دیا۔ کہانی میں خوب مزہ آیا۔ پہیلی، ایک معما ہے جو نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ وہ ہے عورت۔ ان کے سامنے ہم کیا چیز ہیں۔ روح فرسا کہانی ماروی کی یہ قسط بہت جاندار اور شاندار تھی۔ کہانی مضبوط فیصلے بھی کافی تہلکہ خیز تھی۔ سراب میاں بیوی میں محبت ہو تو ایسی ہو، شازیہ کے تصورات نے کیسے کیسے کرشمے دکھائے، کہانی اچھی تھی۔ راہ گم، محترمہ ناہید سلطانہ اختر پھر سے آخری صفحات پر جلوہ گر ہوئی ہیں، اگر مستقل ہی آتی رہیں گی تو واہ واہ!! کہانی بہت ہی دبنگ تھی۔‘‘

✠ **طالب حسین طلحہ،** بہاول پور سے لکھ رہے ہیں ’’اگست کا شمارہ اس بار 13 جولائی کو ملا۔ سرورق کے ساتھ عید مبارک کا خوب صورت لفظ دل کو بھایا۔ شمارہ کی ورق گردانی شروع کی تو انشائیہ 1947ء کے دن کی خوب صورت تحریر (اور ہم سب کے لیے فکر اور سوچنے کی بات ہے) پڑھنے کو ملی۔ اس بار رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں وہی لوڈشیڈنگ جاری رہی اور پھر مہنگائی نے غریبوں کے سارے خواب چکنا چور کر دیے۔ اس بار کراچی کے عوام نے لوڈشیڈنگ، گرمی، کے ساتھ اپنے پیاروں کی لاشوں کا خوف ناک منظر دیکھا (اللہ تعالیٰ تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین) ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ دیگر تبصروں میں محترم جناب ریاض علی الماجد ادی اور برادر محمد حنیف گبول کے خوب صورت اور پیارے تبصرے دل کو لگے۔ آپ کی مقبول دعائیں ہر دم میرے ساتھ ہیں۔ آپ کے ساتھ اسیری کے ایام بہت یاد آئے۔ میں ہر وقت آپ سب کی رہائی کے لیے دعاگو ہوں۔ میں نے خط بھی لکھے شاید ملے نہیں ہیں۔ بہرحال سسپنس ہمارا ساتھی ہے تمام اسیران کو میرا عقیدت بھرا اسلام عرض کیجیے گا۔ قمر صائم بھائی آپ نے جس پیارے انداز میں میری رہائی کی مبارک باد دی آپ کا بے حد شکریہ۔ محفل شعر و سخن میں برادر حنیف گبول، رانا سجاد اختر، عثمان انصاری، مہر عامر اسماعیل، فریال گوہر (بہترین شعر پر مبارک) کی نظمیں زبردست تھیں۔ مدیرِ اعلیٰ صاحب کہانیوں پر تبصرہ نہیں ہو سکا۔‘‘

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

آصف ضیا احمد، لطیف آباد، حیدر آباد۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ محمد مرتضیٰ احتشام، جھنگ سٹی۔ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔ محمد یوسف سانول، نور پور تھل۔ اطہر حسین، کراچی۔ انجم کمال، کراچی۔ مہتاب احسان، حیدر آباد۔ وسیم احمد، مانسہرہ۔ عاصم خان، سکھر۔ شاہین تبسم، راولپنڈی۔ ناہید اختر، اسلام آباد۔ سید عاطف علی، کراچی۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔

تھی۔ جون ایلیا سے فارغ ہو کر جب حاضرِ محفل ہوئے تو اوریس خان کو بڑے جاہ وجلال کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ اوریس بھائی آپ کو ڈھیروں مبارک باد۔ رضوان تنولی صاحب آپ جتنی کستوری ہر ماہ خط میں لگاتے ہیں تو لگتا ہے کہ روٹی بھی کستوری لگا کے کھاتے ہوں گے۔ کستوری لگا کے۔ قمر صائم صاحب لوگ رسالہ پڑھتے ہیں اور آپ نے چاٹنا شروع کر دیا؟ صفدر معاویہ ہمیشہ کی طرح بہترین تبصرے کے ساتھ حاضرِ محفل تھے۔ بشریٰ افضل ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنا کرم فرمائے گا اور آپ کی سب مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ قدرت اللہ نیازی بھائی اس دفعہ اپنے تبصرے میں فروٹ کا رونا روتے نظر آئے۔ اپنے پیارے بھائی غلام یٰسین نوناری کو محفل میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں اس مرتبہ سودائے جنوں سب سے پہلے پڑھی۔ ایک نہایت عمدہ کہانی کا اچانک اختتام کر دیا گیا۔ لیلیٰ کی شہادت رلا گئی مگر ایک لیلیٰ گئی تو کیا ہوا؟ ناپاک یہودیوں کے غلیظ عزائم کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہزاروں لیلیٰ عالمِ اسلام میں پیدا ہوتی رہیں گی اور ایک دن فلسطینی اپنی جدوجہد میں کامیاب ہوں گے۔ بچے سانجھے میں ایک لکڑ بھگے کا کردار بہت زبردست تھا۔ آخر میں این اور جولی کی صلح بھی ہوگئی۔ ملک صفدر حیات کی سفید پوش بھی بہترین تھی۔ نورین بے چاری خوامخواہ جیلا کی خود غرضانہ محبت کا شکار ہوگئی۔ پہیلی میں رام دیال جو کہ خود ایک بڑا اداکار تھا مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ عورت کی پہیلی کو آج تک کوئی نہیں بوجھ سکا۔ ماروی کی یہ قسط بھی گزارے لائق تھی۔ مضبوط فیصلے، فرحانہ کا کردار بہت پسند آیا۔ عامر اور بلال کا انجام بھی بہت برا ہوا۔ وہ تھے بھی اسی لائق۔ حامد کو بھی اس کی محبت واپس مل گئی۔ آخری قہقہہ میں کولن کی ساری شاطرانہ ازی دھری کی دھری رہ گئی اور اس کو آخری قہقہہ لگانے کا موقع بھی نہ ملا۔ آخری صفحات پر راہ گم، آج کے معاشرے کی عکاسی کرتی تحریر تھی۔ گھریلو ناچاقی اور مرد کی خود غرضی کی وجہ سے ایشا کو اپنے خاوند سے بے وفائی کرنی پڑی جو کہ ناقابلِ قبول ہے۔ عورت تو صبر کا پیکر ہوتی ہے مگر ایشا جیسی عورتیں دانش جیسے مردوں کے ہاتھوں بے وقوف بن کر اپنی آخرت و دنیا دونوں گنوا بیٹھتی ہیں۔"

✠ **محمد اسماعیل اجاگر**، پنڈیگھیب، ضلع اٹک سے حاضر ہوئے ہیں "اللہ پاک آپ کی صحت، رزق میں برکت عطا فرمائے۔ بہت ٹائم کے بعد سسپنس کی محفل میں حاضری دے رہا ہوں۔ جون ایلیا صاحب کتنی اچھی سوچ تھی آپ کی لیکن دکھ کی بات یہ ہے ہم لوگوں کو اچھی سوچ مثبت رویے، اچھے لوگوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اگر ضرورت ہوتی تو آج ہم کتنے تہذیب یافتہ ہوتے۔ اعلیٰ ترقی یافتہ ہوتے۔ سفید پوش ملک صفدر حیات کی تحریر سب سے پہلے پڑھی۔ ملک صاحب بندہ خطا کا پتلا ہے۔ آپ اپنے ان کیسز کا تذکرہ بھی کیا کریں جن میں آپ کو ناکامی ہوئی ہو۔ مضبوط فیصلے اچھی تحریر تھی۔ عامر نے فرحانہ کو لاعلم سمجھا اور مار کھا گیا۔ آج کی عورت بہت ایڈوانس ہوگئی ہے بھئی۔ پہیلی، بھی عورت پہ تحریر تھی۔ نازک دل ہوتا ہے اس عورت کا۔ آخری قہقہہ، انسان سوچتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے۔ بچے سانجھے، بہت عمدہ تحریر تھی۔ کاشف زبیر صاحب کی تحریروں میں جان ہوتی ہے۔ آخری صفحات پہ راہ گم بہترین تحریر۔ انسان کے کچھ غلط فیصلے ساری زندگی برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کتنا سبق ہے ان تحریروں میں مگر ہم سیکھتے ہی نہیں۔"

✠ **رمضان پاشا**، گلشنِ اقبال، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں "اس بار ٹائٹل اچھا تو تھا مگر عید کے شایانِ شان نہیں تھا۔ البتہ روشن خیالی والا مضمون اثر انگیز تھا۔ اداریہ بھی متاثر کن تھا مگر بے سود، نقار خانے میں اس طوطی کی چیخ کون سنے گا (آواز اٹھاتے رہنا چاہیے، خواہ کوئی سنے نہ سنے، ممکن ہے لفظ اپنی جگہ بنا لیں) خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے اوریس احمد خان کو مبارک باد۔ اشعار کی محفل میں رضوان تنولی، محمد صفدر معاویہ، جنید احمد ملک اور کراچی والی محترمہ شازیہ صاحبہ کا انتخاب بہت ہی لاجواب تھا۔ معرکہ آرا کہانی سودائے جنوں پڑھتے ہوئے کئی مقام ایسے آئے کہ دل دھڑکنا بھول گیا۔ خدانخواستہ میں دل کا مریض ہوتا تو فوت ہو جاتا۔ اختتام میرے حسبِ منشا ہوا۔ ناقابلِ گرفت میں بھی لطف آیا۔ سفید پوش، صفدر حیات نے حسبِ معمول اصل مجرموں کو بے نقاب کر ہی دیا۔ کہانی میں خوب مزہ آیا۔ پہیلی، ایک معما ہے جو نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ وہ ہے عورت۔ ان کے سامنے ہم کیا چیز ہیں۔ روح فرسا کہانی ماروی کی یہ قسط بہت جاندار اور شاندار تھی۔ کہانی مضبوط فیصلے بھی کافی تہلکہ خیز تھی۔ سراب میاں بیوی میں محبت ہو تو ایسی ہو، شازیہ کے تصورات نے کیسے کیسے کرشمے دکھائے، کہانی اچھی تھی۔ راہ گم، محترمہ ناہید سلطانہ اختر پھر سے آخری صفحات پر جلوہ گر ہوئی ہیں، اگر مستقل ہی آتی رہیں گی تو واہ واہ!! کہانی بہت ہی دبنگ تھی۔"

✠ **طالب حسین طلحہٰ**، بہاول پور سے لکھ رہے ہیں "اگست کا شمارہ اس بار 13 جولائی کو ملا۔ سرورق کے ساتھ عید مبارک کا خوب صورت لفظ دل کو بھایا۔ شمارہ کی ورق گردانی شروع کی تو انشائیہ 1947ء کے دن کی خوب صورت تحریر (اور ہم سب کے لیے فکر اور سوچنے کی بات ہے) پڑھنے کو ملی۔ اس بار رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں وہی لوڈشیڈنگ جاری رہی اور پھر مہنگائی نے غریبوں کے سارے خواب چکنا چور کر دیے۔ اس بار کراچی کے عوام نے لوڈشیڈنگ، گرمی، کے ساتھ اپنے پیاروں کی لاشوں کا خوفناک منظر دیکھا (اللہ تعالیٰ تمام لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین) ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ دیگر تبصروں میں محترم جناب ریاض علی الممد ادی اور برادر محمد حنیف گبول کے خوب صورت اور پیارے تبصرے دل کو لگے۔ آپ کی مقبول دعائیں ہر دم میرے ساتھ ہیں۔ آپ کے ساتھ اسیری کے ایام بہت یاد آئے۔ میں ہر وقت آپ سب کی رہائی کے لیے دعا گو ہوں۔ میں نے خط بھی لکھے شاید ملے نہیں ہیں۔ بہرحال سسپنس ہمارا ساتھی ہے تمام اسیران کو میرا عقیدت بھرا اسلام عرض کیجیے گا۔ قمر صائم بھائی آپ نے جس پیارے انداز میں میری رہائی کی مبارک باد دی آپ کا بے حد شکریہ۔ محفل شعر و سخن میں برادر حنیف گبول، رانا سجاد اختر، عثمان انصاری، مہر عامر اسماعیل، فریال گوہر (بہترین شعر پر مبارک) کترنیں زبردست تھیں۔ مدیرِ اعلیٰ صاحب کہانیوں پر تبصرہ نہیں ہو سکا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

آصفہ ضیا احمد، لطیف آباد، حیدر آباد۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ محمد مرتضیٰ احتشام، جھنگ سٹی۔ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔ محمد یوسف سانول، نور پور تھل۔ اطہر حسین، کراچی۔ انجم کمال، کراچی۔ مہتاب احسان، حیدر آباد۔ وسیم احمد، مانسہرہ۔ عاصم خان، سکھر۔ شاہین تبسم، راولپنڈی۔ ناہید اختر، اسلام آباد۔ سید عاطف علی، کراچی۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔

خدنگ عثمانی

الیاس سیتاپوری

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے عجیب مزاج کے لوگ پیدا کیے... جنھوں نے آگے چل کر کسی نہ کسی حوالے سے اپنی ذات کو ایک شناخت دی، جو فنا کے مرحلے سے گزرنے کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے... یہی حال اس کا بھی تھا جس کی زندگی میں عجیب و غریب موڑ آئے اور اس نے اپنے طریقے سے ان کا سامنا کیا... ماضی ایک ایسا قید خانہ ہے جسے وہ اپنے حصار میں قید کر لے اس کا ذکر آنے والے دنوں میں کسی نہ کسی حوالے سے ضرور دہرایا جاتا ہے... تاریخ کا یہی اصول ہے، دن پر دن تو گزرتے جاتے ہیں مگر ان داستانوں پر وقت کی گرد نہیں جمتی... وہ بھی کسی سرزمین کا بادشاہ نہ تھا اس کے باوجود اس کے حالات کا تغیّر، واقعات کا تسلسل اور جذبات کا طوفان اس کی شخصیت کو ایک الگ ہی رنگ دے گیا۔ جسے بولنے کی جسارت نہ تھی، چلنے کا سلیقہ اور جینے کا حوصلہ نہ تھا... راتوں کی تنہائیوں میں ڈر جانے والی ذات جب ایک نئے ولولے سے زندگی کا ہنر سیکھ لے تو دنیا واقعی حیران رہ جاتی ہے... اور یہی کارنامہ اس نے بھی انجام دے کر کتنی ہی زبانوں کو گنگ کر دیا... اور یہ سب مقدر کی مہربانیوں سے ہی ممکن ہوتا ہے کہ کوئی تاریخ کے ایک اہم کردار اور دلچسپ داستان میں ڈھل جائے۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

زکریا سلطان سے دور رہنے لگا تھا۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں سلطان کسی وقت مشتعل ہوکر اس کو قتل نہ کروا دے۔

سلطان نے ایشیائے کوچک کے مشرقی اور شمالی حصوں میں بہ مشکل دو ہفتے قیام کیا۔ دعوے دارانِ سلطنت میں سے دو ابھی زندہ تھے۔ اس کے بھائی احمد کے بیٹے۔ مراد اور اس کا بھائی۔ یہ دونوں ایران میں اسمٰعیل صفوی کے مہمان تھے۔ سلطان نے اپنی فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ وہ کسی خاص تیاری کے بغیر ایران کا رخ نہیں کرسکتا تھا حالانکہ یہاں سے ایران نزدیک تھا اور قسطنطنیہ دور۔ واپسی میں وہ چند دن اماسیہ میں دریائے کلکت کے کنارے پڑاؤ ڈالے پڑا رہا۔ زکریا چھپ چھپ کر سلطان کو دیکھتا رہتا۔ اس کو حیرت تھی کہ سلطان اس کو بھول کیوں گیا تھا کیونکہ قرقود کے قتل کے چوتھے دن سرزنش کے بعد سلطان نے اس کو نہ تو طلب کیا تھا اور نہ ہی اس کی شکل دیکھی تھی۔

زکریا نمازِ فجر کے بعد دریائے کلکت کے کنارے دور تک چلا گیا۔ وہ یہاں کی کھلی فضا میں خود کو تروتازہ اور آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اگر اس کو اپنے آپ پر اختیار ہوتا تو وہ اماسیہ ہی میں رہ جاتا۔ یہاں کے لوگ سلطان سے اتنے خوفزدہ تھے کہ سلطانی لشکر کے آس پاس دور دور تک کسی مقامی کا سایہ تک نہ نظر آتا تھا۔ وہ اس جگہ کو کبھی بھی نہیں بھول سکتا تھا کیونکہ سلطان کو آبنائے باسفورس عبور کرنے کے بعد اپنے بھتیجے علاؤالدین سے پہلی جنگ یہیں لڑنی پڑی تھی۔ زکریا کو دریا کے کنارے چلتے چلتے ہلکی سی سردی محسوس ہوئی۔ وہ مڑا اور اپنے خیمے کی طرف واپس چل پڑا۔ اس نے ایک جگہ دریا کے عین ساحل پر کسی شخص کو کمبل میں منہ چھپائے بیٹھے دیکھا۔ وہ اس شخص کے سر پر جا کھڑا ہوا اور ڈانٹ کر پوچھا۔ ''اے شخص! تو کون ہے اور سلطانی لشکر سے اتنی دور منہ چھپائے کیوں بیٹھا ہے؟ کیا تو فرار ہونے کی نیت سے تو منہ چھپائے نہیں بیٹھا ہے؟''

کمبل میں منہ چھپائے شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زکریا نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ یہ یقیناً کوئی فوجی بھگوڑا ہے جو بھاگتے بھاگتے مجھ کو دیکھ کر سہم کر یہاں بیٹھ گیا ہے اور میرے جاتے ہی پھر بھاگ کھڑا ہوگا۔ زکریا نے سوچا یہ بہترین موقع ہے اس بھگوڑے کو پکڑ کر سلطان کی خدمت میں پیش کردیا جائے، سلطان اس کی وفاداری اور کارگزاری سے خوش ہوکر اس کو معاف کردے گا اور وہ اس طرح ایک بار پھر سلطان کا اعتماد اور اعتبار حاصل کرلے گا۔ یہ سوچ کر زکریا نے اس کو حکم دیا۔ ''اے شخص! اب منہ چھپانا بے کار ہے۔ میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ تو یقیناً کوئی بھگوڑا ہے اور شاید تو یہیں کہیں کا رہنے والا ہے۔ اپنے وطن کی سرزمین دیکھ کر تو نے شاہی فوج سے نکل بھاگنے کا فیصلہ کرلیا لیکن خبردار جو تو یہاں سے ایک قدم بھی ہلا۔ میں زکریا، سلطان کی ینی چری فوج کا ادنیٰ اور زیرِ تربیت طالب علم ہوں اور تجھے حکم دیتا ہوں کہ چپ چاپ کھڑا ہوجا اور میرے ساتھ سلطان کی خدمت میں چلا چل۔''

کمبل میں معمولی سی حرکت ہوئی اور وہ شخص اٹھنے لگا۔ زکریا کو شبہ گزرا کہ یقیناً اس پراسرار شخص کی نیت خراب ہے اور وہ کمبل میں ہتھیار نکال رہا ہے۔ زکریا نے اپنی تلوار نیام سے نکال کر اس کی نوک اس شخص کے کاندھے پر رکھ دی، بولا۔ ''اب کمبل اتار دے اور سیدھا سیدھا میرے ساتھ سلطان کی خدمت میں چلا چل۔ یاد رکھ اگر تو نے چالاکی دکھائی اور مجھ کو دھوکے سے زیر کرنے کی کوشش کی تو میں تلوار کی نوک تیرے گلے میں پیوست کردوں گا۔''

اس شخص نے کمبل کو اتار کر ایک طرف پھینک دیا اور درشت لہجے میں زکریا کو مخاطب کیا۔ ''تیرا دماغ تو نہیں چل گیا، احمق اور عاقبت نااندیش لڑکے۔''

زکریا کی جان نکل گئی۔ اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی، آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ یہ سلطان سلیم تھا جو نہایت بے رحم اور بے مروت نظروں سے زکریا کو گھور رہا تھا۔ وہ سلطان کے قدموں میں گر گیا۔ ''رحم! عالی مرتبت سلطان رحم! ہرچند کہ رحم کی سلطانی اصطلاح کچھ اور ہے لیکن میں نے یہ گستاخی سلطان کی وفاداری کے جذبے سے کی ہے۔''

سلطان نے حکم دیا۔ ''میرا کمبل اٹھا اور میرے ساتھ چل۔''

زکریا نے کمبل اٹھالیا۔ سلطان اپنے خیمے کی طرف چل پڑا۔ زکریا اس سے چند قدم پیچھے چل رہا تھا۔ دس قدم چلنے کے بعد ہی زکریا کو معلوم ہوگیا کہ دریا کے کنارے سلطان تنہا نہیں تھا۔ اس کے محافظ ینی چری یہاں بھی آس پاس چھپے ہوئے تھے جو سلطان کو کھڑے ہوتے دیکھ کر اس کے پاس آگئے تھے۔ یہ محافظ زکریا پر ہنس رہے تھے۔

سلطانی خیمے کے سامنے ینی چری سپاہ پرا باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ سلطان، زکریا کو ینی چریوں کی حراست میں دے کر اندر چلا گیا اور وہاں سے کچھ دیر بعد حکم بھیجا کہ زکریا کو حاضر کیا جائے۔

زکریا کپکپاتا ہوا دو ینی چری جوانوں کی گرفت میں سلطان کے خیمے میں داخل ہوا۔ سلطان نے خشمگیں نظروں سے زکریا کو دیکھا تو اسے غش آگیا لیکن اسے گرنے نہیں

دیا گیا۔ دونوں جوانوں نے ڈھیلے ڈھالے، لجلجے زکریا کو اس طرح سنبھال لیا جیسے وہ بغیر ہڈیوں کا محض گوشت پوست کا پتلا ہو۔

سلطان نے پوچھا۔ ''یہ اسے کیا ہوگیا؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''سلطان کے دبدبے نے اس کے ہوش وحواس زائل کر دیے ہیں۔''

سلطان نے دونوں جوانوں کو حکم دیا۔ ''اب تم لوگ جاسکتے ہو۔''

جب وہ دونوں چلے گئے تو سلطان نے تالی بجا کر اپنے خادم خاص کو طلب کیا۔ یہ ایک خواجہ سرا تھا جو مردانے اسے زنان خانے تک کسی روک ٹوک کے بغیر آجا سکتا تھا۔ خواجہ سرا کو دیکھتے ہی سلطان نے حکم دیا۔ ''گویّوں اور وقائع نگاروں میں سے کم از کم چار چار حاضر کیے جائیں۔''

خواجہ سرا واپس گیا اور چشم زدن میں چار گویے اور چار وقائع نگار حاضر کر دیے گئے۔

سلطان نے وقائع نگاروں سے پوچھا۔ ''اماسیہ، بروصہ اور شمال مشرقی ایشیا کی کامیاب مہمات کی بابت تم لوگوں نے کیا کام کیا؟''

ایک وقائع نگار نے سب کی طرف سے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! ہم نے ان مہمات میں سلطان کو سکندر مقدونی کا ہم پلہ پایا اور سچ بات تو یہ ہے کہ بعض معاملات میں سکندر مقدونی بھی سلطان کا ہم پلہ نہیں تھا۔''

سلطان نے بے چینی سے پوچھا۔ ''مثلاً کن معاملات میں؟''

وقائع نگار نے جواب دیا۔ ''مثلاً یہ کہ سکندر اپنے بھائی بھتیجوں کو آپ کی طرح قتل نہیں کرا سکتا تھا، حالانکہ دشمنوں کو تو کوئی بھی ہلاک کر سکتا ہے لیکن انہیں...... جن سے محبت کی جارہی ہو، قتل کروانا زبردست آزمائش کی بات ہے۔''

سلطان نے زکریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنے وقائع میں اس واقعے کو بھی شامل کرلو۔ یہ میرے دبدبے کا شکار ہے۔'' پھر گویّوں کو مخاطب کیا۔ ''تمہیں اس کے گیت تیار رکھنا چاہئیں۔''

ایک گویے نے پوچھا۔ ''لیکن حضورِ والا یہ تو ارشاد فرمائیں اس کو ہوا کیا؟ یہ بے ہوش ہے یا مر چکا ہے؟''

سلطان نے جواب دیا۔ ''یہ زندہ ہے مرا نہیں۔ یہ زیرِ تربیت لڑکا ہے، اپنے گیتوں میں اسے بھی شامل کرلو۔''

کچھ دیر بعد گویّوں نے اپنے گیت چھیڑے اور سلطان بڑے انہماک سے یہ گیت سننے لگا۔ اس دوران زکریا کو ہوش آگیا۔ اس نے اپنے آس پاس جو یہ گانا اور ترنم بکھیرتا ماحول دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سلطان نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا اور اپنی بے نیازی برقرار رکھی۔

سلطان گویّوں کے گیتوں سے بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد وقائع نگاروں سے مرقوم وقائع کی کتابیں لے لیں اور انہیں ادھر ادھر سے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ بعد میں ان سب کو رخصت کر دیا۔ جب وہ جارہے تھے تو سلطان نے سب کے لیے ایک ہی فقرہ ادا کیا۔ ''محنت اور محنت...... بہت زیادہ محنت۔''

جب وہ سب چلے گئے تو زکریا دلہن کی طرح سکڑ کر بیٹھ گیا۔ سلطان نے اچانک سوال کیا۔ ''یہ تو ابھی گر کیوں گیا تھا؟ تجھے کچھ کھلا پلا تو نہیں دیا گیا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس رعبِ سلطانی نے مجھے نیم بسمل کر کے رکھ دیا۔''

سلطان نے حقارت سے کہا۔ ''دریا کے کنارے جو کچھ تو نے کیا، وہ ناقابلِ معافی تھا۔ میں بھائی قرقود کی یاد میں ایک مرثیہ لکھنا چاہتا تھا۔ جب مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہوئی تو میں دریا کے کنارے کمبل اوڑھ کر بیٹھ گیا اور اپنے مرحوم بھائی کی یاد میں مرثیہ لکھنے لگا لیکن تو نے... بے ہودگی سے دخل اندازی کی اور میری فکر اور وجدان ایک ساتھ برباد ہوگئے۔''

زکریا نے گڑگڑا کر گزارش کی۔ ''سلطان معظم رحم! میں نے جو کچھ بھی کیا، اس میں میری نیت بالکل درست تھی۔''

سلطان نے کہا۔ ''جی تو نہیں چاہتا تھا کہ تجھے معاف کردوں لیکن ایک بار معاف ضرور کروں گا۔ میں تو تجھے چالاک اور ہوشیار سمجھتا تھا لیکن تو میری توقع پر پورا نہیں اترا۔ یہ درست ہے کہ میں کمبل میں تھا لیکن اس کے باوجود میں دور سے پہچانا جاسکتا تھا۔ میرا قد، میرے جسم کی مخصوص ساخت، منفرد اور نمایاں ڈیل ڈول، ایک خاص انداز کی نشست...... تیری جگہ میں ہوتا تو کبھی بھی دھوکا نہ کھاتا۔''

زکریا نے عرض کیا۔ ''اب میں بھی دھوکا نہیں کھاؤں گا، میں وعدہ کرتا ہوں۔''

سلطان نے کہا۔ ''اچھا، اب جا اور جو کچھ کہا ہے اس پر پورا اترنے کی کوشش کر۔''

زکریا اجازت پاتے ہی باہر نکل آیا۔ بعد میں وہ کئی دن تک حیرت زدہ رہا کہ وہ شیر کے منہ سے صحیح سلامت نکل کیسے آیا۔

زکریا کو اپنا استاد ارسلان بہت یاد آرہا تھا۔ سلطان
ی قربت میں اسے یہ تکلیف دہ اور تشویش ناک تجربہ ہوا تھا
کہ موت سلطان کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے اور پتا
ہیں کب معانقہ کرنے نمودار ہوجائے۔ اس نے سوچا اگر
ستاد ارسلان پاس ہوتا... تو بڑی ڈھارس رہتی اور مزاج
ناس سلطانی استاد... ارسلان اس کو قیمتی اور مفید مشوروں
سے نوازتا رہتا۔ ینی چری سپاہ زکریا کا مذاق اڑاتی رہتی۔ وہ
جب بھی زکریا کو دیکھتے ہنس کر کہتے۔ "اس کم بخت نے تو حد
کردی۔ اپنے سلطان کو پہچان ہی نہ سکا۔"

کوئی دوسرا کہتا۔ "خوش قسمت تھا جو بچ گیا ورنہ
سلطان ایسی غلطیاں کب معاف کرتا ہے۔"

زکریا کو ان باتوں سے تکلیف پہنچتی۔ وہ اپنے کانوں
میں انگلیاں ٹھونس لیتا۔

دریائے کلکت کے کنارے پانچ دن قیام کرنے
کے بعد سلطان کے حکم سے خیمے اکھاڑ دیے گئے اور سلطانی
لشکر ترکی کے شمال مغربی سمت سفر کرنے لگا۔ یہ ایک فاتح کا
لشکر تھا۔ جدھر سے گزرا رعایا نے اس کے آس پاس کھڑے
ہوکر پرشوق نظروں سے زیارت کی اور فوج کے گزر جانے
کے بعد بھی وہ کئی دن تک سلطان سلیم اور اس کی فوج پر
تبصرے اور تجزیے کرتے رہے۔ انہیں سلطان سلیم میں
مقدونیہ کے سکندر، روما کے سیزر اور کارتھج کے ہنی بال کی
مشابہت محسوس ہوئی تھی۔

کئی دن بعد یہ لوگ آبنائے باسفورس کے سامنے پہنچ
گئے۔ وہاں ہلکورے کھاتی بحری سطح پر کشتیوں کا ہالا ڈولا بڑا
پرلطف لگ رہا تھا۔ سلطان سلیم نے اپنے ملاحوں کو حکم دیا۔
"میرے بہادر اور قیمتی جوانوں کو کشتیوں پر بٹھا کر قسطنطنیہ
کے ساحل پر اتار دو تاکہ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی عوام
اور خواص کو میری کامیاب واپسی کی خبر کردیں اور وہ میرا
شایانِ شان استقبال کرسکیں۔" اس کے بعد اس نے ذرا سی
دیر کے لیے سکوت اختیار کیا۔

سلطان کے حکم کی اس طرح تعمیل ہوئی کہ کئی کشتیاں
آبنائے باسفورس کو عبور کرگئیں۔ سلطان نے دو دن قسطنطنیہ
کے سامنے ایشیائی ساحل پر قیام کیا۔ زکریا نے ان چند
دنوں میں یہ محسوس کیا کہ شاید سلطان اس کو بھول چکا ہے۔ یہ
شبہ اس لیے ہوا تھا کہ اس دوران سلطان نے اسے بھولے
سے بھی نہیں یاد کیا تھا۔ لیکن ایشیائی ساحل چھوڑنے سے
پہلے ہی سلطان نے زکریا کو طلب کرلیا۔ اس وقت سلطان
ساحلی ریت پر کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کے آس پاس ینی

چری محافظ کھڑے تھے۔ سامنے سمندر کی سرکش اور بے چین
موجیں بار بار سلطان کے قدموں کی طرف لپک رہی تھیں اور
عاجز اور ناکام ہوکر واپس جارہی تھیں۔ سلطان کی نظریں
سمندری سطح کا بڑی دور تک جائزہ لے رہی تھیں جب زکریا
کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو کچھ دیر تک سلطان نے اس
پر کوئی توجہ ہی نہ دی۔ کسی محافظ نے سلطان کو مطلع کیا۔
"سلطان معظم! زکریا حاضر ہے۔"

سلطان نے زکریا کو سرسری نظروں سے دیکھا اور
'ہونہہ' کہہ کر سمندری سطح پر نظریں جمائے رہا۔ اس دوران
زکریا نے اپنے ہی جیسے چند دوسرے زیر تربیت ینی چری
نوجوانوں کو بھی سلطان کی خدمت میں آتے دیکھا اور اس
بات کا انکشاف ہوا کہ سلطان نے محض زکریا ہی کو نہیں بلایا تھا
بلکہ زکریا جیسے دوسرے طلبا کو بھی طلب کرلیا گیا تھا۔ زکریا
نے سلطان کے چہرے سے اس کی سوچ اور ارادوں کو بھانپنا
چاہا لیکن وہ بالکل سپاٹ اور غیر جذباتی تھا اور یہ پتا تک نہ چلتا
تھا کہ سلطان نے کسی کو اپنے روبرو طلب بھی کیا ہے۔

تقریباً نصف ساعت تک بے خبری اور لاتعلقی کی فضا قائم
رہی۔ آخر سلطان اچانک زکریا کی طرف گھوما اور اس کو مخاطب
کیا۔ "زکریا! تیرا اپنے استاد ارسلان کی بابت کیا خیال ہے؟"

زکریا نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "استاد
ارسلان کی بابت میں اپنے خیال کو کس طرح ظاہر کروں۔
حضور تو خود بھی مردم شناس اور جوہر آشنا ہیں۔ استاد ارسلان
کو مجھ سے زیادہ تو سلطان معظم ہی پہچانتے ہیں۔ میں کیا
عرض کروں اور اگر میں کچھ عرض بھی کروں گا تو یہ چھوٹا منہ
بڑی بات کے مصداق ہوگا۔"

سلطان نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "زکریا! مجھ سے
اڑنے کی کوشش نہ کر۔ میں ارسلان کی بابت تیری اپنی
رائے معلوم کررہا ہوں۔"

زکریا نے عرض کیا۔ "سلطانِ معظم! استاد ارسلان کی
ذات اور ان کی لیاقت اور صلاحیت پر میرا تبصرہ فضول اور
بے معنی ہے۔ انہیں سلطان معظم نے منتخب کیا ہے اور سلطان
معظم کا انتخاب میری تنقید اور تبصرے سے بالا ہے۔"

سلطان نے خفگی سے کہا۔ "کیا ارسلان نے تجھ کو یہی
درس دیا ہے کہ میں تجھ سے کوئی مشورہ کروں تو تو خوشامد اور
چاپلوسی سے کام لے۔ تو تو قاضی بننا چاہتا ہے۔ قاضی تو...
بے باک، صاف گو اور دلیر اور صائب الرائے ہوتے ہیں اور تو
ان میں سے ایک خصوصیت کا بھی حامل نہیں پھر تو قاضی
کیوں اور کس طرح بن سکتا ہے۔"

زکریا کو سلطان کی خفگی سے ڈر بھی لگا اور افسوس بھی ہوا کہ چالاک سلطان اس کو خوشامدی، زمانہ ساز اور موقع پرست سمجھ رہا ہے۔ اس نے عرض کیا۔ ''سلطان معظم! میں استاد ارسلان پر کسی قسم کی رائے زنی نہیں کرسکتا۔ وہ میرا استاد ہے اور استاد کا مقام باپ سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے......''

سلطان نے دور سطحِ سمندر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا، بولا۔ ''زکریا! میری انگلی کی سیدھ پر دیکھ تو سہی، کیا دور سمندر کی سطح سے یہ نہیں محسوس ہوتا کہ وہاں ڈھلان ہے، نشیب ہے اور سمندر اس ڈھلان اور نشیب میں اترتا ہوا نظر آتا ہے۔ آخر ایسا کیوں؟ یہ ڈھلان اور نشیب مجھے ہی نظر آتے ہیں یا تجھ کو بھی۔ اگر یہ سب کو نظر آتے ہیں تو ایسا کیوں ہے......اس کا کوئی خاص سبب؟''

زکریا نے سمندری سطح کی حدِ نظر پر نشیب اور ڈھلان کو واضح طور پر محسوس کیا اور چکرا گیا کیونکہ بالکل یہ محسوس ہوتا تھا گویا وہاں تک جو کشتی یا شے جائے گی سمندری کھڈ میں گر جائے گی۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور خوف زدہ لہجے میں عرض کیا۔ ''سلطان معظم! آپ جس حصے کو سمندری ڈھلان یا نشیب فرما رہے ہیں مجھ کو تو وہ حصہ سمندری کھڈ نظر آتا ہے۔ اگر ہم سب کو اسی راستے سے قسطنطنیہ پہنچنا ہے تو پھر ہماری خیر نہیں۔''

سلطان نے حقارت سے جواب دیا۔ ''احمق! ہم اسی کھڈ کو عبور کرکے ایشیائی ساحل پر اترے تھے اور اب دوبارہ پھر یہیں سے گزر کر قسطنطنیہ میں داخل ہوجائیں گے۔ دراصل یہ وہ کھڈ ہے جو دورانِ سفر ہمیشہ آگے ہی آگے رہتا ہے۔ یہ فریبِ نظر ہے یا پھر یہ کہ ہم اور ہماری کشتیاں... مدوّر راستوں پر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ یہ میری اپنی رائے اور اپنی قیاس آرائی ہے۔ معلوم نہیں تیرا استاد ارسلان اس سلسلے میں کیا رائے رکھتا ہے۔''

زکریا کو سلطان کی باتیں کسی دیوانے کی بڑ محسوس ہورہی تھیں۔ اس نے سوچا سلطان ایسی فضول باتیں کیوں سوچتا رہتا ہے۔ آخر اس سے حاصل کیا ہوتا ہوگا؟

اسی دوران چند مضطرب اور بے باک لہریں سلطان کے قدموں کو چھوکر واپس چلی گئیں۔ سلطان نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے اور اپنی پشت کو کرسی سے ٹکا کر زور جو لگایا تو لڑکھڑا گیا۔ کرسی گر گئی مگر سلطان کرسی گرنے سے پہلے ہی کھڑا ہوچکا تھا۔ زکریا سلطان کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ سلطان کو سہارا دینا چاہتا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

ایک محافظ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سلطان کے قریب پہنچا اور عرض کیا۔ ''سلطان معظم! ریاست طرابزون کا ایک مشتبہ نوجوان اذن باریابی چاہتا ہے۔ کہتے ہیں یہ نوجوان ایران کے بادشاہ اسمٰعیل صفوی کا ننھیالی رشتے دار ہے اور ایشیائے کوچک میں رہ کر ایرانی حکومت کے لیے جاسوسی کرتا رہا ہے۔''

سلطان نے حکم دیا۔ ''اس کو حاضر کیا جائے۔''

حکم کے ذرا دیر بعد تین ینی چری جوان ایک بائیس تئیس سالہ نوجوان کو دونوں شانوں اور گدی سے دبوچے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ زکریا اس وقت بھی سلطان کے پاس ہی کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

سلطان نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ یہ کیا کہتا ہے؟''

ایک محافظ نے جواب دیا۔ ''عالی مقام! یہ اسمٰعیل صفوی کی ماں کا رشتے دار ہے اور ایشیائے کوچک میں عثمانی سلطنت کے خلاف ہرزہ سرائیاں کرتا پھر رہا ہے اور ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ یہ ہماری ایشیائی رعایا کو ہماری حکومت کے خلاف ورغلاتا رہتا ہے۔ یہ خطرناک کام یہ نوجوان تن تنہا نہیں انجام دے رہا بلکہ اس کے ساتھ اور بھی کئی ہیں۔''

سلطان نے غصے میں حکم دیا۔ ''اسے میرے قدموں میں دھکیل دیا جائے۔''

محافظوں نے اس نوجوان کو سلطان کے قدموں میں گرا دیا لیکن اچانک اس شخص نے خود کو آزاد کروالیا اور تیزی سے سلطان پر حملہ آور ہوگیا۔ اس نے بھرپور مکا سلطان کی کنپٹی پر مارنے کی کوشش کی لیکن اسی لمحے زکریا نے پیچھے سے لپک کر اس نوجوان کی دونوں پنڈلیوں پر اپنے دونوں پیروں سے ایک زوردار ضرب لگائی۔ نوجوان اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اوندھے منہ ریت پر ڈھیر ہوگیا۔ زکریا نے خود کو بھی اس کے اوپر گرا دیا اور اس کی کلائیاں پکڑلیں۔

سلطان کو اپنے محافظوں پر بڑا غصہ آیا۔ وہ کھڑا دانت پیس رہا تھا۔ اس نے اپنے محافظوں سے کہا۔ ''احمقو! یہ کیسی غلطی کر بیٹھے تھے تم لوگ؟'' اس کے بعد اس نے زکریا کی طرف اشارہ کیا۔ ''اگر اس وقت یہ لڑکا میرے قریب نہ ہوتا تو اس موذی نصرانی کے بچے نے میرا کام تمام کردیا تھا۔''

سلطان کے محافظ اپنی غفلت اور کوتاہی پر شرمندہ تھے۔ زکریا نے اس نوجوان کو اپنی پوری قوت سے دبائے رکھا۔ سلطان نے اس نوجوان کو زکریا کی گرفت سے چھڑوا کر اپنے گرانڈیل محافظوں کی تحویل میں دے دیا اور کہا۔ ''اس کو قید میں رکھا جائے کیونکہ میں اس سے وہ راز اگلواؤں گا

جن کے زیرِ اثر اس نے اتنی بڑی ہمت کی۔‘‘
اس واقعے نے سلطان کو محتاط کر دیا اور وہ اسی وقت اپنے خیمے میں چلا گیا۔ زکریا کی داہنی ہتھیلی زخمی ہو چکی تھی۔ اس میں سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا لیکن زکریا نے اس خون کی پروا نہیں کی۔ کرتے کے دامن سے خون پونچھا اور اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔
پورے لشکر میں یہ حیران کن خبر گشت کر گئی کہ کسی نصرانی نے سلطان پر حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ سلطان کے جاں نثاروں میں سے بیشتر نے سلطانی خیمے کے سامنے کھڑے ہو کر سلطان کو اپنا عاجزانہ پیغام بھیجا۔ ’’ہمیں افسوس ہے کہ ہماری موجودگی میں یہ سنگین اور شرم ناک واقعہ پیش آیا۔‘‘
لیکن سلطان نے کوئی ردِعمل نہیں ظاہر کیا۔ ساحل پر کشتیوں کا ہجوم ہو چکا تھا کیونکہ سلطان اپنی فوج کے ہمراہ قسطنطنیہ پہنچنے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ یوں تو لشکر میں طرح طرح کی آوازوں سے شور و غل برپا رہتا تھا کیونکہ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں، چلنے پھرنے کی دھمک اور پُرشور آہٹیں گھوڑوں کی ہنہناہٹ، ساحلِ سمندر پر مضبوط کشتیوں میں ملاح مزے دار عشقیہ گیت الاپتے رہتے تھے لیکن سلطان پر ناگہانی حملے کی خبر نے ماحول کو سنسان کر دیا تھا۔ ہر کوئی خاموش ہو گیا۔ ہاں گھوڑوں کی ہنہناہٹیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔
اس واقعے کے دوسرے دن نمازِ فجر کے بعد سلطان نے اپنے خیمے سے متصل دوسرے خیمے میں مختصر سا دربار لگایا اور وہیں اس نصرانی کو طلب کر لیا۔ اس وقت سلطان کو زکریا کے ساتھی نوعمر ینی چریوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور دوسرے تجربہ کار ینی چری خیمے کے چاروں طرف پھیلے پہرا دے رہے تھے۔ زکریا سلطان کے روبرو کھڑا تھا کیونکہ اس کو یہ خاص جگہ خود سلطان نے دی تھی۔
بائیس تیئیس سالہ خوب صورت نصرانی سلطان کے سامنے اس طرح پیش کیا گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیے گئے تھے اور اس حالتِ بے بسی میں بھی اس کو دو طاقت ور نوجوانوں نے پکڑ رکھا تھا۔
سلطان نے اس کو عمیق نظروں سے دیکھ کر سوال کیا۔ ’’نوجوان! تیرا نام کیا ہے؟‘‘
حملہ آور نے جواب دیا۔ ’’میرا کوئی نام نہیں سلطان...... اگر میں تجھ کو قتل کر دینے میں کامیاب ہو جاتا تو میرا نام قاتل تھا لیکن بحالتِ ناکامی میرا کوئی نام نہیں۔ میں ایک گمنام شخص ہوں۔‘‘
سلطان نے کہا۔ ’’اب جبکہ تو مجھ سے اپنا نام تک چھپا رہا ہے تجھ سے یہ پوچھنا فضول ہے کہ تو نے یہ مذموم حرکت کیوں کی؟ تو مجھ کو قتل کیوں کرنا چاہتا تھا؟ اگر میں تیرے ہاتھ سے مارا جاتا تو اس سے تجھ کو حاصل کیا ہوتا؟‘‘
حملہ آور نے جواب دیا۔ ’’سلطان! تو نے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو قتل کر دیا۔ اس سے تجھ کو کیا حاصل ہوا؟ پھر یہ کہ شاہ ایران نے تیرے دو بھتیجوں کو جو پناہ دے رکھی ہے تو انہیں کیوں قتل کروا دینا چاہتا ہے؟‘‘
سلطان نے اپنے محافظوں سے پوچھا۔ ’’اس نالائق اور ناہنجار کی تلاشی لینے کے بعد کچھ نکلا بھی یا نہیں؟‘‘
ایک ینی چری نوجوان نے دور سے جواب دیا۔ ’’سلطان معظم صرف ایک خط...... پتا نہیں یہ خط کس کو لکھا گیا ہے۔‘‘
اس کے بعد اس نے یہ خط سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سلطان نے یہ خط ینی چری سپاہ کے سردار پاشا کے حوالے کر دیا اور حکم دیا۔ ’’بہ آوازِ بلند پڑھ کر سنایا جائے۔‘‘
ادھیڑ عمر متوسط قدوقامت کے سنان پاشا نے اس خط کو بہ آوازِ بلند پڑھنا شروع کر دیا۔
’’ایشیائے کوچک کے لوگوں کو بتایا جائے کہ عثمانی سلطنت کا اصل حق دار شہزادہ مراد ہے، غاصب حکمران سلیم سنگ دل کا بھتیجا مراد۔ ترکوں کو ان کے اصل اور حقیقی حکمران سے متعارف کروا دیا جائے۔ انہیں مراد کے لیے تیار کیا جائے اور انہیں سلطان سلیم سنگ دل کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔ جس طرح بھی ممکن ہو یہ کام کیا جائے۔‘‘
سلطان نے زکریا کو اپنے قریب بلا کر دریافت کیا۔ ’’زکریا! کل تیری ایک ہتھیلی زخمی ہوئی تھی اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس میں سے خون رسنے لگا تھا جسے تو بار بار اپنے کرتے کے دامن سے پونچھ رہا تھا۔ کیا تو یہ بتا سکتا ہے کہ تیری ہتھیلی پر یہ زخم کس طرح آیا تھا؟‘‘
زکریا نے جواب دیا۔ ’’سلطان معظم! اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چاقو تھا اور یہ اس چاقو سے سلطان کو زخمی کرنا چاہتا تھا۔‘‘
سلطان نے پوچھا۔ ’’وہ چاقو اس وقت کہاں ہے؟‘‘
زکریا نے جواب دیا۔ ’’میرے پاس۔‘‘ اس کے بعد اس نے ایک ننھا سا چاقو سلطان کے حوالے کر دیا۔ سلطان نے اس کو الٹ پلٹ کر بغور دیکھا اور نصرانی سے کہا۔ ’’تو ایشیائے کوچک میں اس لیے آیا تھا کہ مجھ کو قتل کر کے مراد کو میری جگہ تخت نشین کرا دے۔ میرے بھتیجے نامراد کو بامراد کر دے؟ کیوں یہی بات تھی نا؟‘‘ اس کے

بعد سلطان نے ایک ادائے خاص سے کہا۔ ''او نصرانی کے بچے! میں تجھ کو ہلاک نہیں کروں گا کیونکہ اگر میں تجھ کو قتل کرادوں تو پھر میرا خط شاہِ ایران کو کون پہنچائے گا۔''

اس کے بعد سلطان کے حکم سے اس شخص کو خوب پیٹا گیا۔ پیٹنے والوں کو سلطان نے ہدایت کردی تھی کہ اس نصرانی کو بس اس حد تک مارا جائے کہ ہلاک نہ ہو۔ چنانچہ اس کو نہایت احتیاط سے اسی حد تک پیٹا گیا کہ وہ اس مار سے ہلاک نہیں ہوا۔

سلطان اس خیمے سے اپنے خاص خیمے میں چلا گیا اور زکریا کو اس خیمے میں طلب کرلیا۔ اس وقت سلطان ایک بڑے اور اونچے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کی کمر اور ایک ہاتھ کی کہنی گاؤ تکیے میں دھنس گئی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ایک برہنہ تلوار تھی۔ جس وقت زکریا اس خیمے میں داخل ہوا، سلطان تلوار کی افقی دھار پر انگلی چھوا چھوا کر اس کی تیزی کا اندازہ لگا رہا تھا۔ زکریا نے سلطان کو اس انداز اور حلیے میں دیکھا تو سہم گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید سلطان اس کی کسی بات سے ناراض ہوگیا ہے اور اس وقت اس کو قتل کرادینے کی نیت سے بلوایا گیا ہے۔

زکریا کے جی میں آئی کہ وہ خیمے سے بھاگ کھڑا ہو مگر سلطان کی تیز اور دلوں میں اتر جانے والی نظروں نے زکریا کے پاؤں پکڑلیے۔ اچانک سلطان نے زکریا کو مخاطب کیا۔ ''زکریا! اگر میں کسی طرح مار دیا جاؤں یا مرجاؤں تو اس کا کیا اثر ہوگا؟ اس کے اچھے برے نتائج اور اثرات کی بابت تیری کیا رائے ہے؟''

زکریا نے برجستہ عرض کیا۔ ''سلطان معظم! اول تو خدا نہ کرے کہ ایسا ہو، سلطان کی تنہا زندگی پوری مملکت کی رعایا سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ ملک، یہ علاقہ، یہ تاج و تخت، حضور والا کی عدم موجودگی میں یتیم، بیوہ اور بے آسرا ہوجائیں گے۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''اور اگر تو مار دیا جائے یا تیرے جیسا کوئی اور یا کئی دوسرے ینی چری ہلاک ہوجائیں تو......؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ان کی جگہ لینے کے لیے دوسرے ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ خود میں کیا ہوں اور میری اہمیت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ میں خوب جانتا ہوں، حضور والا موجود ہیں تو ہم سب بھی ہیں۔ سلطان معظم ہندسوں میں سب سے بڑی اکائی ہیں اور ہم سب صفر کی جگہ ہیں۔ یہ صفر جب تک حضور کی اکائی سے وابستہ رہتے ہیں تو ان کی بھی قیمت ہوجاتی ہے لیکن اگر انہیں اکائی سے الگ کردیا جائے تو یہ کچھ بھی نہیں رہتے۔''

شاید سلطان کو زکریا کا یہ جواب بہت پسند آیا تھا کیونکہ کسی حال میں بھی نہ ہنسنے والا سلطان مسکرانے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی ننگی تلوار زکریا کی طرف بڑھادی، بولا۔ ''لے، یہ میرا عطیہ ہے، اس کو سنبھال کر رکھ۔ اس سے میری اور اپنی حفاظت کرتا رہ اور ہاں یہ بات ہمیشہ یاد رہے کہ یہ میرا، سلطان سلیم کا عطیہ ہے۔ اس کی عزت اور بھرم اسی میں ہے کہ اس کی موجودگی میں بزدلی اور کم ہمتی نہ دکھائی جائے۔''

زکریا نے نہایت ادب سے تلوار لے لی اور کئی بار جھک کر سلطان کی تعظیم بجالایا۔

سلطان نے پوچھا۔ ''تو نے شاہی اقامتی درس گاہ میں اپنے لیے کس مضمون کو بطور خاص پسند کر رکھا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''سلطان کی وفاداری اور جان نثاری اور انسانوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنا۔''

سلطان اس جواب سے سوچ میں پڑ گیا پھر پوچھا۔ ''تیرا حافظہ کیسا ہے؟ کیا تو انسانوں کی شکلیں، ان کے اوصاف، خصوصیات اور اہمیات کے ساتھ یاد رکھنے کی قابلیت رکھتا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''اس صلاحیت اور قابلیت کے بغیر میں انسانوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کر ہی نہیں سکتا۔''

سلطان نے ایک چبھتا ہوا سوال کردیا۔ ''تو اپنے والدین کی بابت کیا جانتا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ہر انسان کے دو باپ ہوتے ہیں ایک وہ جو پرورش کرتا ہے اور دوسرا وہ جو تعلیم و تربیت سے سنوارتا ہے۔ سلطان معظم کی تنہا ذات میں یہ دونوں ہی صفات موجود ہیں۔ حضور والا پرورش بھی فرماتے ہیں اور تعلیم و تربیت سے بھی سنوارتے ہیں اس لیے میرے لیے سلطان معظم کی ذات والدین سے بڑھ کر ہے۔''

سلطان نے اچانک کھڑے ہوکر زکریا کو شفقت آمیز انداز میں دھکا دیا۔ ''اچھا اب تو دفع ہوجا۔ اب ہم دونوں قسطنطنیہ کے شاہی محل سے ملحقہ تیسرے صحن میں ملیں گے۔ وہاں تیرا استاد ارسلان بھی ہوگا۔''

زکریا بھاگ کر خیمے سے نکلا تو ینی چریوں کا محافظ دستہ کسی غلط فہمی کا شکار ہوگیا۔ انہوں نے زکریا کو حراست میں لے لیا اور شاہی خیمے کی تحقیقات کے بعد جب اس کا یقین ہوگیا کہ سلطان بخیریت ہے اور وہ زکریا سے بہت خوش ہے تو انہوں نے زکریا کو عزت و احترام سے اس کے اپنے خیمے میں چلا جانے دیا۔

☆☆☆

سلطان اپنے لشکر کے ساتھ آبنائے باسفورس عبور کر کے قسطنطنیہ میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس کے مخبروں نے یہ خبر دی کہ ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی کے ارادے اچھے نہیں ہیں اور اس کے آدمی سلطان کے بھتیجے مراد کے حق میں تشہیر اور تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں۔ سلطان نے اپنے مخبروں کی وحشت انگیز اطلاعات کا بظاہر کوئی اثر نہیں لیا لیکن بباطن مستعد اور چوکس ہو گیا۔ اس نے اپنے چند خاص مخبر اسی دن ایشیائے کوچک روانہ کر دیے اور انہیں حکم دیا کہ وہاں سے انتہائی اہم اور ناقابلِ تردید خبریں روانہ کی جائیں تاکہ ان کا ویسا ہی تدارک اور علاج بھی کیا جائے۔

زکریا ایک بار پھر شاہی اقامتی درس گاہ میں داخل ہو گیا۔ استاد ارسلان اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ زکریا کی سمجھ داری اور وفاداری کے قصے استاد ارسلان کے کانوں تک پہنچ چکے تھے۔ وہ بہت خوش تھا چنانچہ زکریا جیسے ہی اس کے سامنے پہنچا استاد ارسلان نے اس کو اپنے سینے سے لگا لیا بولا۔ ”زکریا! تو نے میری عزت و آبرو رکھ لی، میری مستقبل بین آنکھیں تیرے شاندار زمانۂ آئندہ پر لگی ہوئی ہیں۔“

زکریا نے جواب دیا۔ ”استادِ محترم! آپ مجھے بہت یاد آتے رہے۔ میں نے سلطان کو بتا دیا ہے کہ میں نے اپنے لیے بطورِ خاص سلطان سے وفاداری اور انسانی مطالعہ اور مشاہدے کے مضمون کو پسند کر لیا ہے۔“

استاد ارسلان نے کہا۔ ”شاباش آفرین ہے تیری عقل و دانش پر۔ اب اس خاص مضمون کے بعد پڑھنے یا سیکھنے کو رہ ہی کیا جاتا ہے۔“

اس دن استاد اور شاگرد بیرکوں کے سامنے لگے ہوئے درختوں میں سے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ یہیں زکریا نے اپنے استاد کو بتایا کہ معلوم نہیں کیوں وہ اپنے والدین کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس کو اپنے بھائی بہن بھی یاد آرہے تھے اور اپنا وہ بھائی بھی جس کا نام میمو تھا اور اب اسلامی نام معلوم نہیں کیا رکھا جا چکا ہوگا اور پتا نہیں وہ کہاں رہ رہا ہے۔

استاد ارسلان نے زکریا کا کان پکڑ لیا، بولا۔ ”زکریا! تو، تو غضب کا چالاک اور عقل مند انسان ہے پھر یہ تو بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ تو نے بڑی محنت اور مشکل سے سلطان کا اعتماد حاصل کیا ہے۔ اب کیا تو یہ چاہتا ہے کہ یہ ذرا سی غلطی یا بات پر زائل ہو جائے؟“

زکریا نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں یہ نہیں چاہتا۔ میں ایسا نہیں چاہتا۔“

استاد ارسلان نے کہا۔ ”تب پھر آئندہ اپنے والدین کا ذکر بھی نہ کرنا۔“

زکریا نے جواب دیا۔ ”بہت بہتر استاد محترم۔“

کچھ عرصہ سلطان نے اس کو یاد ہی نہیں کیا۔ زکریا کو یوں محسوس ہوا گویا سلطان نے اس کو فراموش کر دیا ہے۔ وہ ہر روز فجر کی نماز سے دو گھنٹے پہلے اٹھ جاتا۔ کچھ دیر کتابیں پڑھتا رہتا اور اس کے بعد فجر کی نماز ادا کرتا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ ہوا خوری کے لیے نکل جاتا اور کافی دیر تک ادھر ادھر پھرتا رہتا۔

زکریا اور ارسلان، سلطان کی بابت باتیں کرتے کرتے اکتا گئے تو اصول جہانبانی اور اندازِ جہانگیری پر باتیں کرنے لگے۔ زکریا نے حکومت کی خاطر جو مظالم دیکھے تھے، ان سے وہ بہت دلبرداشتہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے استاد ارسلان کو سلطان کے بھائی قرقود کے قتل کا افسوس ناک واقعہ سنایا تو استاد ارسلان کی آنکھیں بھر آئیں، بولا۔ ”زکریا! سلطان کا یہ، وہ بھائی تھا جو اس کو بے حد چاہتا تھا اور بچپن سے ہی وہ دونوں ایک دوسرے پر اپنی جانیں قربان کر دینے پر آمادہ و تیار رہا کرتے تھے لیکن بالآخر ان میں اتنا اختلاف بڑھا کہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور آخر سلطان نے قرقود کو قتل کروا دیا۔“

زکریا نے عرض کیا۔ ”استادِ محترم! میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر سلطان ناکام رہتا تو اس کا قرقود ہی جیسا حشر ہوتا۔“

ارسلان نے گھبرا کر اپنے آس پاس دیکھا اور خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”ارے ہمیں کیا پڑی ہے جو اس موضوع پر بات کریں۔ سلطان نے اب تک جو کچھ بھی کیا بہتر کیا اور آئندہ بھی جو کچھ کرے گا بہتر ہی کرے گا کیونکہ ہمارا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ سلطان غلطی نہیں کر سکتا اور یہی وہ عقیدہ ہے جس میں ہم سب کی نجات اور فلاح ہے۔“

تقریباً ایک ہفتے بعد سلطان زیر تربیت ینی چریوں سے ملنے خود پہنچ گیا۔ وہ طلوعِ آفتاب کے فوراً بعد زیر تربیت نوجوان کی بیرکوں میں پہنچا اور ان کے نظم وضبط اور رہن سہن کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ ان نوجوانوں سے بہت خوش ہوا جنہوں نے اپنے کمرے میں سلیقہ مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ سلطان نے ہر نوجوان کے لباس بستر اور روزمرہ میں کام آنے والی دوسری چیزوں کا استاد کی نظر سے معائنہ کیا اور جہاں بھی بے قاعدگی اور بے ضابطگی نظر آگئی، اس کی سرزنش

کی اور اس کو خوب اچھی طرح ڈانٹا پھٹکارا۔ سلطان نے انہیں بتایا کہ ہر طالب علم اور زیر تربیت نوجوان کا پہلا امتحان ہی یہ ہے کہ اس کے رہن سہن میں قاعدے اور ضابطے کو دیکھا جائے۔ اگر کوئی نوجوان اس میں ناکام ہے تو اس کا صریحاً یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے بقیہ امتحانوں میں بھی ناکام ہوگا۔ کسی ینی چری نوجوان میں نظم وضبط نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

دوپہر سے ذرا پہلے سلطان نے اعلان کردیا کہ وہ دوپہر کا کھانا ینی چری طلبا کے ساتھ ہی کھائے گا۔ اس اعلان کے بعد وہ ارسلان کے پاس چلا گیا۔ ارسلان نے سلطان کو خوش آمدید کہا اور سرتاپا عجزو نیاز بن گیا۔ سلطان ارسلان کو ترچھی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس وقت ارسلان کے پاس زکریا نہیں تھا۔ سلطان نے پوچھا۔ ”اور رہوڈس کے استاد! کیا تو اپنے شاگردوں سے اس حد تک غافل ہو چکا ہے کہ وہ یہاں نظر ہی نہیں آتے۔“

ارسلان نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ”سلطان معظم! کبھی کبھی میں اپنے شاگردوں کو تنہا بھی چھوڑ دیا کرتا ہوں۔ اس سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہوجاتی ہے اور جب کسی شخص میں خود اعتمادی پیدا ہو چکی ہو تو پھر اس کو کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔“

سلطان نے کہا۔ ”ایسی ہی باتیں تیرا شاگرد زکریا بھی کرلیتا ہے، اس میں تیری جھلک تیرا پرتو موجود ہے۔“

ارسلان پھولا نہ سمایا اور سلطان کا شکریہ ادا کیا۔

دوپہر کو ہر شخص کھانے کے ہال میں پہنچ گیا۔ سلطان کی موجودگی نے ان سب کی قوتِ گویائی سلب کرلی تھی۔ آخر سلطان خود گویا ہوا۔ ”میرے بچو! اور استادو! شاید میں جنوبی اور مشرقی ایشیا کے طوفانی دوروں سے بھی اتنا خوش نہیں ہوا تھا جتنا کہ آج خوش ہوں۔ میں خود بھی اس درس گاہ میں رہ چکا ہوں اور کھانے کے اس ہال میں اپنے... ہم جماعت اور ہم خیال ساتھیوں سے مزے مزے کی باتیں کرکے لطف اندوز ہوتا رہا ہوں۔“

سلطان کے سامنے ینی چری کے اساتذہ اور زیر تربیت طلبا سر جھکائے مؤدب کھڑے تھے۔ اسی دوران ایک دروازے سے زکریا بھی داخل ہوا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ سلطان کی تیز نظروں نے اسے ہال میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ استاد ارسلان نے ہاتھ کے اشارے سے زکریا کو اپنے پاس بلایا۔ جب یہ سلطان اور استاد ارسلان کے قریب پہنچا تو سلطان نے بطور خاص زکریا کو مخاطب کیا۔ ”میرے بچے! کیا تجھ کو یہ خبر نہیں ملی تھی کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں؟“

زکریا نے جواب دیا۔ ”جی سلطان معظم! اس وقت میں گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر کرات میدان کے کئی چکر لگایا کرتا ہوں۔ مجھے یہ بات تو معلوم ہوگئی تھی کہ سلطان والا تیسرے صحن میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں نے سوچا، سلطان معظم کے استقبال اور پابہ رکابی کے لیے بہت سے اساتذہ اور طلبا تو موجود ہی ہیں، اگر میں اپنے روزمرہ کے ضروری معمولات پورے کرکے قدرے تاخیر سے بھی پہنچوں گا تو کیا فرق پڑے گا۔“ پھر ندامت سے عرض کیا۔ ”اور اگر سلطان معظم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہوں تو میں نادم اور شرمسار ہوں۔“

سلطان نے زکریا کی کسی بات کا بھی جواب نہیں دیا لیکن سب کو مخاطب کرکے جو بات کہی گئی، اس سے زکریا کی بڑی عزت افزائی ہوئی۔ سلطان نے کہا۔ ”میں نے کہیں پڑھا ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم کھجور کا پودا لگانے لگو اور تمہیں اچانک یہ معلوم ہوجائے کہ قیامت کا نزول شروع ہو چکا ہے تو تم قیامت کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھو اور اسے مکمل کرکے ہی دم لو۔“

اب زکریا کی عزت اور مرتبے میں جو اضافہ ہوا تھا، وہ ہر کسی نے محسوس کرلیا۔ استاد ارسلان کا مارے خوشی کے سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ سلطان نے زکریا کو اور زیادہ اپنے قریب کرلیا اور اس کی زخمی ہتھیلی کی بابت استفسار کیا جو تقریباً مندمل ہو چکی تھی۔

اس کے بعد سب نے مل جل کر کھانا کھایا۔ یہ بڑا دلکش اور عجیب سماں تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا سلطان اپنے کنبے میں بیٹھا کھانے پینے کا مزہ لوٹ رہا ہو۔ ینی چری کے لوگ اس لیے خوش تھے کہ سلطان انہیں اپنا سمجھتا تھا اور اس وقت سلطان کا اپنا خاص کنبہ بھی اتنا اہم وقیع اور مؤقر نہیں تھا جتنے ینی چری کے لوگ۔ کھانے کے دوران سلطان نے انہیں کئی بار یہ یقین دلایا کہ ”اس دنیا میں اگر میں کسی پر سب سے زیادہ اعتماد اور بھروسا کرتا ہوں تو وہ تمہی لوگ ہو۔“

پھر سلطان کو اچانک یاد آیا کہ اس کا وزیراعظم پیری پاشا اور ایشیائے کوچک کی افواج کا سپہ سالار سنان پاشا تو ان میں موجود ہی نہیں۔ اس نے حکم دیا۔ ”کھانے کے بعد ان دونوں کو بھی یہیں بلالیا جائے۔“

لیکن کسی کو اس حکم کی تعمیل کے لیے زحمت نہیں اٹھانی پڑی کیونکہ پیری پاشا اور سنان پاشا دونوں ایک ساتھ خود ہی حاضر ہوگئے تھے۔ سلطان انہیں اپنے سامنے دیکھ کر خوش ہوا لیکن اس کی یہ خوشی کی کیفیت مسکراہٹ سے نہیں چہرے

کی طمانیت سے محسوس کی جا سکتی تھی۔ سلطان نے کہا۔ ''اچھا ہوا تم دونوں بھی یہیں آ گئے ورنہ میں نے تمہاری حاضری کا فرمان جاری کر دیا تھا۔''

کھانے کے بعد سلطان چند اساتذہ، پیری پاشا اور سنان پاشا کے ساتھ تیسرے صحن کی عمارتوں کے اس کمرے میں چلا گیا جہاں پیچیدہ اور مشکل مسائل پر غور و فکر کے لیے مجلسِ مشاورت بیٹھتی رہی تھی اور یہی وہ جگہ تھی جہاں کئی حکومتوں اور ملکوں کے خلاف فیصلے کیے گئے تھے اور بعد میں ترکوں نے انہیں عملاً شرمناک شکستیں دی تھیں۔

جب سلطان اپنے آدمیوں کے ساتھ اس عمارت میں داخل ہو رہا تھا تو ینی چری کے ذہین لوگوں نے اپنی اپنی جگہ وثوق سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب کسی سلطنت یا ملک کا تہ و بالا ہونے والا ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ شاید سلطان رہوڈس کو تباہ و برباد کرنے کا ارادہ کر چکا ہے۔

مگر دوسرے نے اس سے اختلاف کیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اب سلطان مغربی ملکوں کو زیرنگیں لانے والا ہے اور ان مغربی ملکوں میں سرفہرست ہنگری، آسٹریلیا اور فرانس تھے۔

لیکن ان میں چند ایسے بوجھ بجھکڑ بھی تھے جو سلطان کی مہم جوئی کا آئندہ ہدف مشرق اور جنوب کو سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب سلطان اپنی سب سے بڑی حریف سلطنت ایران پر لشکرکشی کرنے والا ہے کیونکہ وہاں ترکی سلطنت کے دو امیدوار اب بھی پناہ گزیں ہیں اور جب تک یہ ایران میں موجود ہیں سلطان سلیم کسی اور طرف توجہ کر ہی نہیں سکتا۔

کسی نے اس پر اعتراض کیا۔ ''کیا سلطان اپنے دونوں بے وقعت اور آوارہ گرد بھتیجوں کی گوشمالی کی خاطر ایران کی طاقت ور سلطنت سے چھیڑ خانی کر سکتا ہے؟''

اس کا معترض کو شاندار جواب مل گیا۔ ''تو جن دونوں بھتیجوں کو آوارہ گرد اور بے وقعت سمجھ رہا ہے، وہ ایران کی طاقت ور سلطنت کی پشت پناہی میں سلطان کے لیے بہت خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں اور پھر ایران کی طاقت ور سلطنت کیا اپنی پڑوسی ترک مضبوط سلطنت کو حسد کی نظروں سے نہیں دیکھتی ہو گی؟ ان حالات میں دونوں ہی سلطنتیں ایک دوسرے کے لیے جذبۂ خیر سگالی کے بجائے اپنے اپنے دلوں میں آتشِ رشک و حسد کی سوزش محسوس کر رہی ہوں گی۔''

ایک جہاندیدہ سپاہی نے کہا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیں ایرانیوں کے خلاف صف آرا ہونا ہی پڑے گا۔''

دوسرے نے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ''اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہو گا۔ ایک تو یہ کہ ایرانی بھی ہماری طرح مسلمان ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاہ اسمٰعیل صفوی اس عہد کی ایک طاقتور شخصیت کا نام ہے۔ اس کو جنگیں لڑنے اور جیتنے کا طریقہ آتا ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں شاندار چالیں چلنے میں یکتا ہے۔ پتا نہیں اس تصادم کا نتیجہ کیا نکلے اور کون جانے اس میں کون جیتے گا اور کون ہارے گا۔''

ایک زندہ دل سپاہی ہنسنے لگا۔ ''بھائیو! ہم بھی کتنے احمق ہیں، سلطان کے کیا ارادے ہیں اور اس وقت اس کے زیر بحث کون سے امور ہیں، یہ جانے بغیر ہم خوامخواہ سر مغزنی کر رہے ہیں۔ خاموش رہو اور انتظار کرو کہ سلطان اپنے آئندہ لائحہ عمل کا خود اعلان کر دے۔''

سلطان کمرے کے آخری سرے پر اس جگہ بیٹھ گیا جو اونچے تخت کی طرح سلطانی چبوترا کہلاتی تھی۔ چبوترے ہی پر دائیں بائیں کی قدرے نچلی سطح پر پیری پاشا اور سنان پاشا بیٹھ گئے۔ چبوترے کے نیچے سلطان کے عین مقابل اقامتی درس گاہ کے اساتذہ بیٹھ گئے۔ کمرے کے دروازوں کو باہر سے بند کر کے ینی چری محافظوں نے بڑی مستعدی سے سنبھال لیا تھا تا کہ باہر کا کوئی شخص اندر جانے کی کوشش نہ کرے۔

سلطان نے پہلے تو خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور اس کی مہربانیوں اور نوازشوں کا شکر ادا کیا اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی تعریف و توصیف کی اور آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجا پھر رسول ﷺ... کے ساتھیوں کو دعاؤں اور منقبتوں کا تحفہ بھیجا جو ہر قدم پر آپ ﷺ کے جاں نثار اور معین و مددگار رہے اور آپ ﷺ کے بعد اسلام کو دور دور تک پھیلا دیا۔ آخر میں اپنا مدعا بیان کیا۔ ''حکومت اور سلطنت بھی کتنی دلکش اور حسین چیزیں ہیں۔ شاہی خاندان کا ہر فرد اس کا طالب اور متمنی نظر آتا ہے لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو حکومت کی شرائط اور مطالبات کو پورا کر سکے۔ میرے بھائیوں نے اس کی ہوس کی میرے بھتیجوں نے اس تمنا میں اپنی جانیں دے دیں اگر وہ اس کے اہل ہوتے تو آج میری جگہ وہ ہوتے۔ میں ایک حکمران ایک سلطان کی حیثیت سے تمہارے سامنے موجود ہوں جو میری لیاقت، میری صلاحیت اور میری اہلیت کا سب سے بڑا ثبوت اور سب سے بڑی دلیل ہے۔ اب میری خواہش ہے کہ اپنی اس صلاحیت اور لیاقت کو مزید ثابت کر دوں۔ میرے بھتیجے ایران میں ایک غیر مخلص کے سہارے اپنی لیاقت، اہلیت

اور اپنے حق کے دعوے دار ہیں۔ جب تک وہ موجود ہیں، میں خود کو حکومت اور سلطنت کا قطعی اہل کس طرح سمجھ سکتا ہوں اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنے بھتیجوں کو شاہِ ایران سے طلب کرلوں۔ میں شاہ ایران کے لیے خیر سگالی کے جذبات رکھتا ہوں اس لیے شاہ ایران کو بھی میرے جذبوں کی قدر کرنا چاہیے اور میرے دونوں بھتیجوں کو میرے حوالے کر دینا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے خاندانی اور اندرونی معاملات میں بیرونی لوگ دخل دیں اگر وہ ایسا کریں گے تو غلطی کریں گے اور بہت ممکن ہے کہ انہیں اپنی اس غلطی کا اس وقت احساس ہو جب پانی سر سے گزر چکا ہو اور سوچنے اور معقول فیصلہ کرنے کا وقت نکل چکا ہو۔''

پیری پاشا نے مشورہ دیا۔ ''حضور والا کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شاہ ایران اسمٰعیل صفوی ہمارا باج گزار نہیں ہے اور وہ ہماری بات کسی طرح بھی نہیں مانے گا۔''

ارسلان نے عرض کیا۔ ''میری ناچیز عقل یہ کہتی ہے کہ پہلے ہمیں پوری تیاری کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر شاہ ایران ہماری بات نہ مانے تو اس کو بزورِ قوت بات ماننے پر مجبور کر دیا جائے۔''

کسی دوسرے استاد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''شاہ ایران سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ سلطان معظم اپنے دونوں بھتیجوں کو بھلا دیں اور اللہ پر تکیہ کریں وہ جیسا چاہے گا کرے گا۔''

سلطان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ گرج کر بولا۔ ''اے کم ہمت شخص! تو خاموش ہو جا کیونکہ تو مشورے دینے کا اہل نہیں ہے۔ گویا تو ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ ہم شاہ ایران سے خوف زدہ ہو کر چپ چاپ صبر کر کے بیٹھ جائیں۔'' اس کے بعد سنان پاشا کو مخاطب کیا اور پوچھا۔ ''سنان پاشا! تو کیا سوچ رہا ہے تو بھی تو کچھ کہہ؟''

سنان پاشا نے عرض کیا۔ ''سلطان معظم! شاہ ایران ہمارے خلاف احتیاطی تدابیر پہلے ہی اختیار کر چکا ہے اس لیے جب تک ان تدابیر کا توڑ نہ سوچا جائے، ہماری ہر مہم ناکام واپس آ جائے گی۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''تو شاہ ایران کے کس منصوبے کی بات کر رہا ہے، اس کو کیا پتا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں؟''

سنان پاشا نے عرض کیا۔ ''حضور والا! اس نے ستر ہزار آدمی تبریز اور ایشیائے کوچک کے درمیان آباد کر رکھے ہیں۔ یہ سب شاہ کے وفادار ہیں اور انہیں یہ ہدایت مل چکی ہے کہ سلطان جیسے ہی حملہ آور ہو، وہ سلطنت ترکیہ کے اندر بغاوت کر دیں اور سلطان کو عاجز اور پریشان کر کے رکھ دیں۔''

سلطان ایک دم سناٹے میں آ گیا، بے خیالی میں کہا۔ ''تو یہ بات ہے...... ہونہہ۔ تو میرے پاس اس کا بھی علاج ہے۔ میں نے ایک بار جو ارادہ کر لیا، کر لیا۔ میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اگر شاہ ایران نے یہ بے ہودہ حرکت کی ہے تو اس کو اس کی سزا بھی ملنا چاہیے۔ کم از کم میں تو اس کو معاف نہیں کر سکتا۔''

پیری پاشا نے سر جھکا کر عرض کیا۔ ''معاملہ نازک ہے سلطان معظم! ہمیں خطرات کا پورا پورا خیال رکھنا ہوگا۔''

سلطان نے ارسلان کی طرف دیکھا۔ ارسلان نے عرض کیا۔ ''ہمیں اپنی برتری ثابت کرنا چاہیے۔'' پھر سوال کیا۔ ''سلطان معظم! شاہ کے حامی ناصری سے کوئی کام نکل سکتا ہے یا نہیں؟ وہ کہاں ہے؟''

سنان پاشا نے سلطان کو بولنے کا موقع ہی نہ دیا، بولا۔ ''ہمیں یہ بات اسی ناصری سے معلوم ہوئی ہے۔''

سلطان نے پاشا کو حکم دیا کہ تبریز اور ایشیائے کوچک کے درمیان اپنے اتنے آدمی پھیلا دے کہ یہ لوگ پہلے تو ان کا پتا چلائیں پھر جب ان کا پتا چل جائے تو ایک مقررہ وقت پر ان سب پر حملہ کر کے قتل کر دیا جائے۔'' میرا خیال ہے کہ اگر ہم اپنی اس تجویز پر پوری طرح عمل کر گئے تو شاہ ایران کو ناکام بنا دینا بہت آسان ہو جائے گا۔''

سنان پاشا پھڑک گیا بولا۔ ''کام بظاہر تو بہت مشکل نظر آتا ہے لیکن ناقابلِ عمل نہیں ہے۔''

پیری پاشا نے عرض کیا۔ ''ان آدمیوں کی تربیت میں کروں گا میرا خیال ہے چالیس ہزار سے تو کام نکل جائے گا؟''

سلطان نے بے ساختہ جواب دیا۔ ''بالکل بالکل، چالیس ہزار ہوشیار، ستر ہزار غافلوں کو بہ آسانی زیر کر لیں گے۔''

ارسلان نے عرض کیا۔ ''تو اس کی تیاری کل ہی سے شروع ہو جانا چاہیے۔''

سلطان نے پیری پاشا سے کہا۔ ''پیری پاشا! تو چالیس ہزار آدمیوں کو تربیت دے اور انہیں ہر طرح یہ باور کروا دیا جائے کہ انہیں ستر ہزار کا آناً فاناً خاتمہ کر دینا ہے۔''

پیری پاشا نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم کا اقبال بلند رہے پھر ہر کام بہ آسانی ہو جائے گا۔''

کافی دیر بعد سلطان اپنے دوسرے صحن والے محلات میں چلا گیا اور سنان پاشا، پیری پاشا اور ارسلان وغیرہ نے اپنے کمروں کا رخ کیا۔ زکریا ارسلان کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس طرح دوسرے اساتذہ کا بھی

انتظار ہو رہا تھا۔ ینی چری کے کافی لوگ ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے پوچھا۔ ''جناب والا! سلطان نے آپ لوگوں سے کون سی اہم خدمات لینے کا فیصلہ کیا ہے؟''

اساتذہ کے پاس اس کا ایک ہی جواب تھا۔ ''وقت آنے پر سب کچھ بتا دیا جائے گا لیکن ابھی کچھ بھی نہیں۔''

اس جواب سے لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی مگر وہ اصرار بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ سلطان قبل از وقت افشائے راز کو پسند نہیں کرتا اور اس کے مجرم کی کم از کم سزا موت مقرر ہے۔

ارسلان زکریا کو اس کے اپنے کمرے میں لے گیا اور پوچھا۔ ''زکریا! سلطان نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے چند ہزار آدمی ایران کی سرحد پر ترکی علاقے میں آباد کر دے۔ اب ہمیں ان آدمیوں کا انتخاب کرنا ہے جنہیں وہاں آباد کیا جائے۔ کیا تو وہاں جانے کے لیے تیار ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''استاد محترم! اگر اس کام کے لیے مجھے مناسب آدمی سمجھا گیا تو کیا میں انکار کر کے بچ سکتا ہوں؟''

ارسلان نے کہا۔ ''ہاں تو انکار کر کے بچ سکتا ہے کیونکہ سلطان تیرا لحاظ کرتا ہے۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''لیکن اگر میرا ترکی سرحدی علاقے میں آباد ہو جانا سلطان کے لیے مفید ہے تو میں سلطان کی لحاظی رعایت نہیں چاہتا۔ میں بخوشی چلا جاؤں گا مگر ایک سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔''

ارسلان نے کہا۔ ''کون سا سوال......؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ترکی کی اندرونی سرحدوں میں محض آباد ہو جانا تو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کا کوئی خاص مقصد بھی تو ہوگا اور جب تک یہ مقصد نہ معلوم ہو جائے میں محض آباد ہونے میں کسی قسم کی لگن یا خوشی نہیں محسوس کروں گا۔''

ارسلان نے مسکرا کر کہا۔ ''وہ مقصد بھی وقت سے بہت پہلے ہی بتا دیا جائے گا۔ صرف تجھے لیکن شرط رازداری کے ساتھ۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''شرط رازداری کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں بہرحال رازدار ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ رازداری کسے کہتے ہیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر کسی سلطانی راز کو قبل از وقت ظاہر کر دیا جائے تو اس کا خمیازہ کیا بھگتنا ہوگا۔''

ارسلان نے کہا۔ ''تب پھر وقت کا انتظار کر تجھ کو بہت جلد وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جس کا بتایا جانا ضروری ہوگا۔''

اس بات کو ہفتے سے زیادہ گزر گیا۔ اس دوران ارسلان اور چند اساتذہ کو کئی بار غائب دیکھا گیا۔

پھر ایک دن زکریا کو دوسرے صحن میں طلب کر لیا گیا۔ اسی محل اور اسی کمرے میں جہاں سلطان کے سات بھتیجے تانت کی مدد سے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیے گئے تھے۔

اس وقت پیری پاشا، سنان پاشا اور ارسلان بھی موجود تھے۔ سلطان نہیں تھا۔ زکریا کو اس ماحول سے خوف سا محسوس ہوا۔ زکریا کو شبہ گزرا کہ شاید ایک بار پھر وہی تماشا ہونے والا ہے لیکن سامنے کے کھلے دروازے سے اندر کسی کی موجودگی کا پتا نہیں چلتا تھا۔

سنان پاشا اور پیری پاشا زکریا کو کن انکھیوں سے مسلسل گھورے جا رہے تھے۔ زکریا نے ان دونوں کو بغور دیکھنا چاہا لیکن دونوں کا رعب غالب آ گیا اور زکریا کی کمزور شخصیت مغلوب ہو گئی۔ ارسلان نے زکریا کی کشمکش کو محسوس کر لیا اور اس کی ہمت افزائی کے خیال سے کہا۔

''زکریا! یہ سلطان کے وزیر پیری پاشا ہیں اور یہ دوسرے سنان پاشا۔ ایشیائے کوچک کی مشرقی جنوبی افواج کے سپہ سالار۔ تو یہ جان کر یقیناً خوش ہوگا کہ یہ دونوں بھی شاہی اقامتی درس گاہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ یہ بات ان دونوں کے لیے اور ان دونوں کی لیاقت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے شاہی اقامتی درس گاہ کے لیے فخر کی ہے۔ میری خواہش ہے کہ تو بھی اس درس گاہ کا قابلِ فخر فرزند ثابت ہو۔''

پیری پاشا نے ارسلان سے پوچھا۔ ''استاد محترم! کیا یہی وہ نوجوان ہے جس نے سلطان کو یہ بتایا تھا کہ اس کا پسندیدہ موضوع انسان کا مطالعہ اور مشاہدہ ہے؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''جی جناب والا! یہی وہ نوجوان زکریا ہے۔''

پیری پاشا نے زکریا کو مخاطب کیا۔ ''ادھر میری طرف دیکھ اور مجھ سے آنکھیں ملا کر بات کر۔''

زکریا نے پیری پاشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پیری پاشا مسکرانے لگا بولا۔ ''نوجوان! تیرا شوقِ بلند پروازی تیری بربادی اور ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے۔ میں وزیراعظم ہوں اس لیے درگزر کرتا ہوں مگر سلطان یہ بات کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی اجازت کے باوجود کوئی شخص اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''محترم وزیراعظم! سلطان کے حکم کی تعمیل میں ہلاک ہو جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں اس کی نافرمانی میں مارا جاؤں۔''

پیری پاشا اس کے جواب سے اش اش کر اٹھا اور بولا۔ ''بلاشبہ یہ نوجوان جوہرِ قابل رکھتا ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ!''

استاد ارسلان فرطِ خوشی سے آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔

پیری پاشا نے زکریا سے پوچھا۔ ''تو انسانوں کو پڑھتا ہے۔ مجھے پڑھ اور یہ بتا کہ میں کس قسم کا انسان ہوں؟''

زکریا نے چند لمحے پیری پاشا کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ''ابھی میں محض طالب علم ہوں۔ آپ کو پڑھنے اور سمجھنے میں وقت اور صحبت درکار ہے۔ ویسے آپ کے منصب اور اس پر تادیر برقرار رہنے کے پیش نظر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بلا کے موقع شناس اور سلطان کے مزاج آشنا ہیں۔''

پیری پاشا نے جھینپ کر کہا۔ ''یہی بات ہر اس شخص کے لیے کہی جا سکتی ہے جو سلطان سے قریب ہو اور اس کی کچھ عرصہ کامیاب خدمت کر چکا ہو۔''

سنان پاشا نے سوال کیا۔ ''اور میری بابت...... میں کیسا آدمی ہوں؟''

زکریا نے سنان پاشا کو بغور دیکھا۔ اس نے سنان پاشا کی آنکھوں میں خشونت اور بے مروتی محسوس کی۔ سنان پاشا زکریا کو بڑی بے رحم نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ارسلان کو شبہ گزرا کہ شاید زکریا مرعوب ہو چکا ہے اور وہ سنان پاشا کی بابت کچھ کہتے ہوئے خوف محسوس کر رہا ہے۔ اس نے ایک بار پھر زکریا کی حوصلہ افزائی کی۔ ''زکریا! تکلف کی کوئی ضرورت نہیں، سنان پاشا تیری لیاقت اور قابلیت کا امتحان لے رہا ہے۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جس شخص کو میں نے بارہا قریب سے دیکھا ہو، اس کا مطالعہ یا مشاہدہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پھر بھی بزرگوں اور عقل مندوں کا قول ہے کہ انسانی چہرہ اس کے باطن اور کردار کا غماز ہوتا ہے۔ سنان پاشا کی آنکھوں میں خشونت اور بے مروتی یہ بتا رہی ہے کہ قابو میں آئے ہوئے مواقع رحم اور مروت کی نذر نہیں کیے جا سکتے اس کے علاوہ یہ کہ اپنے فریق کو ظالمانہ سختی اور درندگی سے کچل کر بقیہ حریفوں کے لیے عبرت اور خوف کا سامان مہیا کر دیا جائے۔ سنان پاشا کا چہرہ ایک ایسی کتاب کی طرح ہے جس کا نفسِ مضمون اس کے سرورق کے رنگوں میں موجود ہو۔ سنان پاشا سلطانی احکام کی تعمیل میں اپنے دل میں چناں چنیں کی رمق تک نہیں محسوس کرتا۔ اس کا چہرہ بندۂ بے عذر اور جاں نثار، اطاعت گزار کا چہرہ ہے۔ سلطان کسی بھی ایسے شخص پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتا ہے۔''

سنان پاشا نے شوخ نظروں سے زکریا کو گھورا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''نوجوان! تیرا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جناب والا! ابھی تو میں راہ نوردِ شوق ہوں اور پھر یہ کہ کتاب اپنے آپ کو خود نہیں پڑھتی، مجھ کو دوسرے لوگ پڑھیں گے۔ آپ پڑھیں گے، وزیراعظم پڑھیں گے، میرے استاد محترم پڑھیں گے۔''

پیری پاشا اور استاد ارسلان کو ہنسی آگئی لیکن سنان پاشا چڑ گیا بولا۔ ''نوجوان! تجھ کو میری ہی نگرانی اور ماتحتی میں کام کرنا ہوگا۔ تو نے مجھے پڑھ بھی لیا ہے چنانچہ تجھے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی ہوگی کہ میں ایک بے رحم اور سفاک انسان ہوں اور کسی کے ساتھ ۔۔۔رعایت اور مروت کا ذرا بھی قائل نہیں۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جناب والا کو بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں خود بھی مروت اور رعایت پسند نہیں کرتا۔''

ارسلان نے مداخلت کی، پہلے سنان پاشا کو سمجھایا۔ ''سنان پاشا! یہ مبتدی نوجوان ہے اس کو ہم سب سے بہت کچھ سیکھنا اور سمجھنا ہے اس لیے اگر یہ اپنی ناتجربہ کاری میں کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھے تو یہ رعایت کا مستحق ہوگا۔'' پھر زکریا کو سمجھایا۔ ''زکریا! زیادہ ڈینگیں مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سنان پاشا، سلطان کا نہایت معتمد سپہ سالار ہے۔ تجھے اپنے سپہ سالار کا احترام کرنا چاہیے۔''

سنان پاشا نے شکایتاً کہا۔ ''استاد ارسلان! اس کو سمجھاؤ، یہ زیادہ باتیں نہ کیا کرے کیونکہ اگر ایسی ویسی کوئی بات سلطان کے روبرو نکل گئی تو اس کو سلطان سے کون بچائے گا؟'' پھر زکریا کو مخاطب کیا۔ ''صاحبزادے! جس سے کچھ حاصل کرنا ہو اس کا احترام کرنا ہی پڑتا ہے اور میری یہ بات بھی یاد رکھو کہ زیادہ صاف گوئی گستاخی میں شامل ہو جاتی ہے۔''

زکریا خاموش ہو گیا۔ یہیں پیری پاشا اور سنان پاشا نے زکریا کو مطلع کر دیا کہ چند دنوں بعد اچانک اس کو قسطنطنیہ چھوڑ دینا ہوگا اور وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں چلا جائے گا۔

پیری پاشا نے ارسلان سے کہا۔ ''استاد ارسلان! چند ضروری ہدایتیں جو ایسے موقعوں پر میں دیا کرتا ہوں آج تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ تم تخلیے میں اس کو خوب اچھی طرح سمجھا دینا۔''

استاد ارسلان نے ہامی بھر لی۔ کچھ ہی دیر بعد سلطان کی تشریف آوری کا اعلان ہوا اور سلطان اپنے محافظین اور مصاحبین کے جلو میں نمودار ہوا۔ یہ لوگ سلطان کے استقبالیہ کو بڑھے۔ سلطان نے انہیں سرسری نظروں سے دیکھا اور وزیراعظم اور سنان پاشا کو بطور خاص مخاطب کیا۔ ''تم لوگ اپنے منصوبے پر کب عمل کرو گے؟''

پیری پاشا نے جواب دیا۔ ''پرسوں، سلطان معظم پرسوں۔''

سلطان نے سنان پاشا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تو کیا کہتا ہے سنان پاشا؟''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! میں وزیراعظم کے جواب پر صاد کرتا ہوں۔''

سلطان نے استاد ارسلان کی طرف دیکھا اور زکریا پر سرسری نظریں ڈالتے ہوئے ارسلان سے کہا۔ ''تجھ کو ایک اچھا شاگرد مل گیا۔'' پھر زکریا سے کہا۔ ''انسان کو اپنی اتفاقیہ سرخروئی پر ناز نہیں کرنا چاہیے۔ میری تلوار کو میری وجہ سے بڑی بڑائی حاصل ہے لیکن اگر میں غلطی سے تلوار کی نوک پر گر جاؤں تو کیا میری تلوار مجھ سے رعایت برتے گی؟ ہرگز نہیں، تو نے ساحل پر نصرانی حملہ آور کو مجھ سے دور رکھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لینا کہ تیری غلطیوں اور کوتاہیوں پر تجھ کو رعایت اور مروت دی جائے گی، ہرگز نہیں۔ وقت اور زمانہ کسی کو معاف نہیں کرتا اور میں بھی اسی وقت اور زمانے کی پیداوار ہوں پھر میں کس طرح معاف کر دوں گا۔'' پھر سنان پاشا کو ہدایت کی۔ ''یہ خطرناک اور نازک منصوبہ کسی کوتاہی اور غلطی کے بغیر پورا ہونا چاہیے۔ تو کسی سے جواب طلب کرے یا نہ کرے، لیکن میں تجھ سے ضرور جواب طلب کروں گا۔''

سنان پاشا نے ازراہِ طنز زکریا کی بابت سلطان سے عرض کیا۔ ''سلطان معظم! اس کو انسانوں کے مطالعے اور مشاہدے کا شوق ہے اس لیے اگر مناسب ہو تو اس کو انسانوں میں چھوڑ دیا جائے اور اسے میرے ساتھ نہ بھیجا جائے۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''نہیں، یہ تیرے ساتھ جائے گا۔ وہاں بہت سارے انسان ہوں گے، یہ انہیں پڑھتا بھی رہے گا اور اپنا کام بھی کرتا رہے گا۔''

زکریا کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ سلطان میں معلوم نہیں کیا بات تھی کہ زکریا اس کی طرف دیکھنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ سلطان نے استاد ارسلان اور زکریا کو اسی وقت رخصت کر دیا۔ پیری پاشا اور سنان پاشا سلطان کے پاس ہی رہ گئے۔

استاد ارسلان دوسرے صحن سے نکل کر تیسرے صحن میں آ گیا۔ زکریا اس کے ساتھ تھا جو سر جھکائے نہایت مؤدبانہ انداز میں چل رہا تھا۔ استاد ارسلان بھی کسی فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی کسی لمحے بے خیالی میں زکریا کی طرف دیکھ لیتا تھا لیکن بات نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے۔ زکریا نے خود کو بستر پر گرا دیا اور استاد ارسلان کرسی پر بیٹھ گیا۔ زکریا اپنے استاد سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ کچھ دیر تک دونوں ہی خاموش رہے۔ آخر اس سکوت کو استاد ارسلان نے توڑ دیا، بولا۔ ''زکریا! اس وقت لیٹنے سے کام نہیں چلے گا ذرا اٹھ کر بیٹھ جا اور یوں بھی یہ سوئے ادبی ہے کہ میں بیٹھا رہوں اور تو لیٹ جائے۔''

زکریا پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا، شرمندگی سے کہا۔ ''استاد محترم! اس گستاخی پر میں معافی کا طالب ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''زکریا! میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ بہت زیادہ باتیں نہ کیا کر۔ اس میں آدمی پکڑا جاتا ہے اور ہمیشہ دوسروں کی عزتِ نفس اور اس کی انا کا خیال رکھ کیونکہ انسان اس کا گھاؤ نہیں برداشت کرتا۔''

زکریا سمجھ گیا کہ استاد ارسلان یہ باتیں کس کی بابت کہہ رہا ہے، بولا۔ ''آئندہ میں آپ کی نصیحتوں پر عمل کروں گا۔ مجھے ایک موقع اور دیجیے۔''

استاد ارسلان نے افسوس سے کہا۔ ''میں اگر تجھ کو ایک موقع اور نہیں دوں گا تو کروں گا کیا۔ اور دیکھ یہ سنان پاشا تجھ سے خوش نہیں ہے، وہ تجھ پر کڑی نظریں رکھے گا۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ اس سے محفوظ رہ۔ وہ تجھ پر جن پہلوؤں سے حملہ آور ہوگا، اپنے کانوں سے سن لے۔ تو جوان ہو رہا ہے، تیرے سینے میں دل ہے، نوجوان، نوعمر اور نوخیز دل۔ یہ کسی مہ جبیں پر عاشق بھی ہو سکتا ہے جبکہ اس وقت بھی مچل رہا ہو گا لیکن خبردار جو تو نے دیارِ غیر میں دل لگی کی۔ ینی چری میں جو لوگ ہیں، سلطان ان کی بابت یہ بات بالکل پسند نہیں کرتا کہ یہ شادیاں کریں اور علیحدہ علیحدہ کنبوں کو جنم دیں چنانچہ تو نہ کسی لڑکی سے عشق کرے گا، نہ شادی۔''

زکریا کے دل پر ایک چوٹ سی لگی کیونکہ یہ پابندی ناقابل قبول اور ناگوار تھی، بولا۔ ''اس کا یہ مطلب ہوا استاد محترم کہ میں اپنے سینے سے دل کو نکال کر کہیں پھینک دوں۔ سلطان یا کسی کو بھی نوجوانوں کے ان معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ اگر وہ ایسی غلطی کریں گے تو معلوم نہیں اس کے کیا نتائج نکلیں۔''

استاد ارسلان نے زکریا کو سمجھایا۔ ”زکریا! ابھی تجھے بہت کام کرنا ہے، ایسی باتیں نہیں کرتے کیونکہ اگر یہ باتیں سلطان تک پہنچ گئیں تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تیرا کیا حشر ہو۔ بہر حال سلطان نہیں چاہتا کہ تو اور تیرے جیسے دوسرے نوجوان عورتوں یا لڑکیوں کے چکر میں پڑ کر گمراہی اختیار کریں۔ جن مردوں کو عورتیں زیر کر لیتی ہیں شکست اور ناکامیاں ان کا مقدر بن جاتی ہیں لیکن جو عورتوں کے لیے ناقابلِ تسخیر ہوتے ہیں، وہ ہر کسی کے لیے ناقابلِ تسخیر ثابت ہوتے ہیں۔“

زکریا چپ ہو گیا۔ وہ اب اپنے آپ میں کسی چیز کی کمی محسوس کرنے لگا تھا۔ کسی شے کی ضرورت محسوس کرنے لگا تھا اور وہ شے لڑکی یا عورت کے سوا کچھ اور نہیں تھی۔ استاد ارسلان زکریا کو سمجھنے اور اس کے احساسات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، آخر کہنے لگا۔ ”سنان پاشا سے بہر حال ہوشیار رہنا کیونکہ وہ تجھ سے بےزار سا ہو گیا ہے۔“

زکریا نے استاد ارسلان کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور لکڑی کے صندوق کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ اس صندوق میں لباس، بستر اور دوسری چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور صندوق کے اوپر چند کتابیں رکھی تھیں۔ زکریا نے ان میں سے ایک کتاب اٹھالی اور اسے اٹھا کر پڑھنے لگا۔ استاد ارسلان کو زکریا کی بے نیازی اور بے پروائی سے دکھ پہنچا۔ اس نے اپنے استاد کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

استاد ارسلان نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ”زکریا! میں تجھ سے باتیں کر رہا ہوں تو اٹھ کر چلا گیا۔ میری باتیں تو سن لے، اس کے بعد چلے جانا۔ میری باتیں تیرے کام آئیں گی۔“

زکریا نے دور ہی سے جواب دیا۔ ”استاد محترم! آپ کو مجھ سے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے۔ اب آپ کے پاس کہنے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے؟ اسی طرح میں نے جتنا کچھ سن لیا ہے، اس کے بعد اور کچھ میں نہیں سننا چاہتا۔“

استاد ارسلان نے زکریا میں بغاوت کے آثار دیکھ لیے تھے اس لیے وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر ہی وہاں سے چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد زکریا نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا، اس وقت وہ بے حد مغموم تھا۔

شام کو جب چراغ جل گئے اور گھروں اور عمارتوں سے چراغوں کی روشنی پھوٹ پھوٹ کر چاروں طرف پھیلنے لگی تو زکریا ات میدان کے اس پار نظریں جما کر دیکھنے لگا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ات میدان کی جنوبی حدود کے نشیبی حصوں میں راہبوں کی خانقاہیں بنی ہوئی تھیں اور ان میں صدیوں سے تارک الدنیا انسان رہتے بستے آئے تھے۔ وہ لوگ جو دنیا کی آلائشوں سے فرار حاصل کر چکے ہیں اور جنہیں عورت سے نفرت تھی اور وہ لوگ جو عورت کو معصیت کی جڑ سمجھتے تھے۔ زکریا کو عورت کے خیال ہی سے اپنے وجود اور نس نس میں کیف کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا کیا ایسا ممکن ہے کہ انسان اور خاص کر نوجوان اپنی زندگی سے عورت کی نفی کر دیں اور کرب ناک اذیت سے بھی دوچار نہ ہوں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ عورت کی کمی کسی اور شے سے پوری کر لی جائے۔ شہرت، ناموری، عزت، عظمت، شجاعت یا کوئی دوسرا مشغلہ جو عین فطری مذاق کے مطابق ہو۔ عورت کی کمی کی تسکین کر سکتا ہے؟ ان سوالوں کا بس ایک ہی جواب تھا۔ نہیں قطعی نہیں، بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔

وہ رات کے اندھیرے میں اپنے کمرے سے نکل کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور اپنے پراگندہ ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ اس سلسلے میں جتنا سوچتا، اس کی وحشت میں اضافہ ہونے لگتا۔ اس نے سوچا اس سلسلے میں کسی راہب کا مشورہ حاصل کرنا چاہیے ممکن ہے اس کے پاس اس بارے میں کچھ آزمودہ طریقے ہوں جن کی مدد سے وہ سلطان کی منشا پوری کر سکے۔ وہ کتنی دیر تک باہر بیٹھا رہا، کچھ پتا نہیں چلا۔ اسے اس وقت ہوش آیا جب اس کے نگراں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کو متنبہ کیا کہ اب وہ مزید باہر نہیں رہ سکتا۔ اس کو کمرے میں داخل ہو جانا چاہیے۔ وہ کمرے میں واپس چلا گیا اور کچھ کھائے پیے بغیر ہی اپنے بستر پر گر گیا۔ وہ پوری رات فکر اور اندیشوں کی نذر ہو گئی۔ جس ماحول میں وہ سالہا سال سے خوش اور مطمئن رہ رہا تھا، عورت کے ذکر ہی سے اس میں انتشار اور فتور پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا، کیا عورت واقعی ہنگاموں اور فتوروں کی جڑ ہے؟ کیا سلطان اس لیے عورت کے وجود کو ینی چری نوجوانوں سے دور رکھنا چاہتا ہے؟ اندیشوں اور وسوسوں کے باوجود وہ عورت سے گریز اختیار کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

دوسرے دن صبح وہ اپنے معمولات سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ناصریوں کی ایک خانقاہ میں چلا گیا۔ یہاں ویران اور پرسکون فضا میں زندگی کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہر طرف سناٹا اور سکوت تھا۔ وہ تاریک حجروں سے گزر کر ایک ہال میں پہنچ گیا۔

اس ہال میں ایک جگہ، کونے میں کوئی باریش شخص

مطالعے میں مشغول تھا اور پورا ہال خوشبو سے مہک رہا تھا۔ لوبان کا دھواں اوپر چھت سے ٹکرا کر پورے کمرے میں گھوم رہا تھا۔ زکریا کو ہال میں داخل ہوتے دیکھ کر اس باریش شخص نے خوش آمدید کہا اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ زکریا اس کے پاس چلا گیا۔ راہب کا باوقار انداز زکریا کو مرعوب اور متاثر کر رہا تھا۔ اس نے زکریا سے پوچھا۔ ''بیٹے! کیا تو کسی خاص مقصد سے یہاں آیا ہے؟''

زکریا راہب کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ راہب انجیل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس وقت اس نے زیر مطالعہ صفحے پر انگلی رکھ کر اسے بند کر دیا تھا۔ راہب نے ایک بار پھر سوال کیا۔ ''نوجوان! تو کون ہے اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''محترم بزرگ! میں مسلمان ہوں اور سلطان کی اقامتی درس گاہ میں زیر تربیت ہوں......''

راہب گھبرا گیا بولا۔ ''پھر یہاں میرے پاس کیا لینے آیا ہے؟ اپنی درس گاہ میں واپس جا ورنہ سلطان مجھ سے جواب طلب کرلے گا۔''

زکریا نے کہا۔ ''جناب والا! میں آپ کا زیادہ وقت برباد نہیں کروں گا۔ شاہی درس گاہ میں جو تعلیم دی جا رہی ہے، اس سے مجھے اختلاف ہے۔ اسی سلسلے میں آپ کے پاس چلا آیا۔ میں آپ سے چند سوالوں کے جوابات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

راہب سناٹے میں آگیا۔ وہ کسی سوچ میں پڑ گیا پھر ایک ہلکا سا تبسم اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوا پوچھا۔ ''نوجوان! کیا تجھے سچ بولنے کی تعلیم دی گئی ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جی ہاں محترم بزرگ...... اسلام جھوٹ کو باطل کہتا ہے اور باطل بمنزلہ کفر ہے اس لیے اسلام میں کفر کی کوئی گنجائش نہیں اور ہمارا مذہب ہمیں سچ کی تعلیم دیتا ہے۔''

راہب نے کہا۔ ''دیکھ تو جھوٹ نہیں بولے گا۔ میں تجھ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جناب! آپ ایک نہیں دس سوال کریں، میں ان سب کے صحیح جواب دوں گا اور اس کے بعد آپ کو بھی میرے سوالوں کے صحیح جواب دینے ہوں گے۔''

راہب نے انجیل کے اوراق میں سے اپنی انگلی نکال کر اس جگہ کپڑے کی دھجی رکھ دی اور زکریا سے سوال کیا۔ ''لڑکے! کیا تو اپنے باپ دادا کی طرف سے بھی مسلمان ہے؟''

زکریا چکرا گیا، پوچھا۔ ''اس سوال سے آپ کا مطلب؟''

راہب نے جواب دیا۔ ''صاحبزادے! ہم دونوں میں سچ بولنے کا سمجھوتا ہو چکا ہے اس لیے تجھ کو میرے ہر سوال کا سچ میں جواب دینا ہوگا۔''

زکریا نے آہستہ سے کہا۔ ''محترم بزرگ! میں آبائی مسلمان نہیں ہوں۔ میرا تعلق کریٹ سے ہے اور غالباً اس جزیرے میں ایک بھی مسلمان نہیں۔''

راہب نے خوش ہوکر زکریا کی طرف دیکھا۔ ''میرے بچے! تیری باتوں سے مسیحیت کی بو آرہی ہے۔ میں نے تیرے جسم سے یسوع مسیحؑ کی خوشبو محسوس کرلی تھی۔ آہ، مسیحیت پر یہ کتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے کہ اس کی اولاد نرینہ مسلمانوں کے سلطان کی خدمت گزار بنادی گئی ہے۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا تو خوش ہے؟ تجھے اپنے والدین، عزیز و اقارب اور اپنا وطن بھی یاد آتا رہتا ہے؟ کیا تجھ کو اپنے آبائی مذہب سے بھی کسی قسم کی دلچسپی ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جناب والا! آپ فضول باتوں میں وقت نہ ضائع کریں اور مجھ کو اجازت دیں کہ اپنے سوالات کروں اور آپ مجھ کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔''

راہب نے افسردگی سے کہا۔ ''سوال کر، میں جواب دینے کی کوشش کروں گا۔''

زکریا نے کہا۔ ''بزرگ محترم! سلطان ہمیں عورت کے پاس جانے سے منع کرتا ہے۔ کہتا ہے عورت سے دور رہ ورنہ برباد ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں آپ کا خیال ہے؟''

راہب نے جواب دیا۔ ''یقیناً سلطان پر مسیحیت کا سایہ پڑ گیا ہے ورنہ وہ اتنی زریں اور قیمتی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ عورت سے دور ہی رہنا چاہیے کیونکہ اس کی صحبت اور قربت میں معصیت کے سوا کچھ نہیں۔''

زکریا نے کہا۔ ''جناب محترم! اگر عورت معصیت ہی معصیت ہے تو آپ لوگ شادی کیوں کرتے ہیں؟''

راہب نے جواب دیا۔ ''میرے بچے! عورت کے بارے میں معصیت کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کر پھر ہر بات صاف ہو جائے گی، ہر اعتراض اپنا جواب پالے گا۔''

زکریا نے کہا۔ ''ارشاد! میں کوشش کروں گا کہ......''

لیکن راہب نے بات کاٹ دی، کہا۔ ''شادی مسیحیت میں بھی ہوتی ہے لیکن محض اس لیے کہ عورت تو یوں ہی راندۂ درگاہ ہے۔ اس راندۂ درگاہ سے اس لیے شادی کرلینا چاہیے کہ بڑی معصیت سے بچنے کے لیے چھوٹی معصیت کو قبول کرلینے میں کوئی حرج نہیں۔''

زکریا نے سوال کیا۔ ''جناب والا! سلطان عورتوں

اور لڑکیوں سے گریز اور پرہیز کا حکماً اعلان کر رہا ہے، کیا یہ بات ممکن ہے؟ کیا کوئی شخص عورت اور لڑکی کے بغیر بھی فعال اور کارآمد ہوسکتا ہے؟"

راہب نے جواب دیا۔ "ہاں اس کے بغیر بھی رہا جاسکتا ہے مجھ ہی کو دیکھ لے، کیا میں عورت کے بغیر زندہ نہیں ہوں؟"

زکریا نے عاجزی سے کہا۔ "حضور والا! وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے نفس پر قابو کس طرح پایا؟ تاکہ میں بھی اسی طریقے پر نفس کو قابو میں رکھنے کی تدبیر کروں۔"

راہب نے جواب دیا۔ "میں نے تو کوئی خاص طریقہ نہیں اختیار کیا تھا لیکن اس کا اگر کوئی خاص طریقہ ہوسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس پہلو پر کچھ سوچا ہی نہ جائے۔"

زکریا نے پوچھا۔ "اور کوئی بات؟"

راہب نے جواب دیا۔ "اپنے خدا سے لو لگا کر سب کچھ بھلا دینا۔ دنیا سے منہ موڑ کر میری طرح گوشہ نشین ہوجانا، نفس کشی کرنا۔"

زکریا نے کہا۔ "لیکن بزرگوار! میں سلطان کی اقامتی درس گاہ کا ایک طالب علم ہوں۔ میں آپ کی تعلیمات پر کس طرح عمل پیرا ہوسکتا ہوں؟"

راہب نے افسوس سے کہا۔ "تب پھر مجبوری ہے۔ دنیا میں رہ کر عورتوں کی قربت میں اس سے بچاؤ کی کوئی ترکیب نہیں۔"

زکریا اس جواب سے بہت مایوس ہوا۔ مزید کوئی بات کیے بغیر اپنی درس گاہ میں واپس چلا گیا۔ راہب حیران اور پریشان اس کو واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

زکریا کی عدم موجودگی میں ہر کوئی پریشانی اور بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا۔ استاد ارسلان کی پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کو کسی حد تک یہ یقین ہوچکا تھا کہ زکریا فرار ہوگیا۔ جب تک زکریا ملا نہیں تھا، استاد ارسلان اپنے انجام سے لرزاں و ترساں تھا اور اس کو اپنی موت اپنے سامنے نظر آرہی تھی۔ استاد ارسلان نے زکریا کو آتے دیکھا تو دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گیا اور فرطِ خوشی میں کہا۔ "زکریا! تو نے پریشان کردیا۔ یہ تو کہاں چلا گیا تھا؟"

زکریا نے کوئی جواب نہیں دیا اور استاد ارسلان کے پاس سے گزرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے استاد ارسلان بھی کمرے میں داخل ہوگیا، بولا۔ "زکریا! آخر بات کیا ہے؟ یہ تو میری باتوں کے جواب کیوں نہیں دیتا؟"

زکریا نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس بار استاد ارسلان ایک دم گرم ہوگیا، غصے میں بولا۔ "زکریا! میں تیری گستاخیاں مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ میں تیرا استاد ہوں۔ تو مجھ سے بے ہودہ اور غیر مہذبانہ رویہ رکھے گا تو میں تجھے اس کی سزا دوں گا۔"

زکریا نے بے چین ہوکر استاد ارسلان کی طرف دیکھا اور آہستہ سے تنفر آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "استاد محترم! میں بہت پریشان ہوں، مجھے اور زیادہ پریشان نہ کیجیے۔"

استاد ارسلان نے تحکمانہ شان سے کہا۔ "زکریا! اگر تو میری بات نہیں سنتا تو نہ سن۔ اب میری زبانی سلطان کا فیصلہ سن لے۔ سلطان نے تجھ کو دوسرے صحن میں کافی دیر پہلے طلب فرمایا تھا۔ تو یہاں موجود نہیں تھا اس لیے یہ فرض مجھے سونپا گیا ہے کہ میں تجھ کو اپنے ساتھ لے کر سلطان کی خدمت میں پہنچ جاؤں۔"

زکریا کو اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ استاد ارسلان نے مزید حاکمانہ شان سے کہا۔ "اب یہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں، اسی وقت میرے ساتھ چل ورنہ سلطان کا عتاب معلوم نہیں کیا رنگ لائے۔"

زکریا کا سارا غصہ، ساری خفگی بھاپ بن کر اڑ گئی۔ وہ چپ چاپ استاد ارسلان کے ساتھ ہولیا۔ کچھ دیر بعد دونوں اس پھاٹک پر پہنچ گئے جو دوسرے اور تیسرے صحن کے حدِ اتصال پر واقع تھا۔ دربانوں نے انہیں نہیں روکا اور یہ دونوں دوسرے صحن میں داخل ہوگئے۔ اب زکریا پر خوف طاری ہونے لگا تھا۔ اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ "استاد محترم! کچھ پتا ہے سلطان نے ہمیں کیوں طلب کیا ہے؟"

استاد ارسلان نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "سلطان کی منشا دوسرا کس طرح جان سکتا ہے؟ تیرے فضول سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"

زکریا اور زیادہ خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے بے جا غصے میں استاد ارسلان کے اعتماد اور شفقت کو بھی کھو دیا تھا۔ وہ چپ ہوگیا لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر سوال کیا۔ "استاد ارسلان! سلطان مجھ سے کیا پوچھے گا؟"

استاد ارسلان نے ایک بار پھر جھڑک دیا۔ "میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ اپنے فضول سوالوں سے مجھ کو تنگ نہ کر۔ اگر حوصلہ ہے تو یہی سوال سلطان سے کرنا، ان کے صحیح جواب سلطان ہی دے سکے گا۔"

زکریا چپ ہوگیا۔ سلطان کے آدمی ان دونوں کا شاید انتظار ہی کر رہے تھے۔ وہ انہیں لے کر ایک نئے دیوان میں چلے گئے۔ زکریا یہاں پہلے نہیں آیا تھا۔ یہ دیوان اتنا عریض اور طویل تھا کہ اس میں بیک وقت پانچ چھ سو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ اس میں اوپر چاروں طرف کی دیواروں میں کرسیاں بنی ہوئی تھیں لیکن دیوان کے آخری سرے پر اس کی عقبی دیوار سے ملحق سلطان کی نشست گاہ تھی جو سر دست خالی تھی لیکن دیوان میں پندرہ سولہ امراء اس وقت بھی موجود تھے۔ استاد ارسلان، زکریا کو لے کر دیوان کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ سلطان کا انتظار ہر کوئی کر رہا تھا، اسی عالم میں چند سپاہی ایک نوجوان کو لے کر دیوان میں داخل ہوئے۔ شاید اس کے گالوں پر تھپڑ بھی لگائے گئے تھے کیونکہ اس کا چہرہ سرخ بھی تھا اور سوجا ہوا بھی۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اندر سے ایک شخص نمودار ہوا اور اعلان کیا کہ استاد ارسلان، زکریا اور نوجوان قیدی اور اس سے متعلقہ سپاہیوں کے سوا سبھی باہر چلے جائیں۔

دیوان ذرا سی دیر میں خالی ہوگیا۔ زکریا کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر استاد ارسلان کو مخاطب کیا۔ ”استاد محترم! کیا سلطان نے مجھے از راہِ عتاب طلب فرمایا ہے؟“

استاد ارسلان نے زکریا کو کہنی ماری اور آہستہ سے جواب دیا۔ ”چپ رہ، سلطان تشریف لانے ہی والے ہیں۔“

ابھی یہ فقرہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ سلطان کی تشریف آوری کا غلغلہ بلند ہوا اور سلطان دیوان کے داہنی طرف کے دروازے سے نمودار ہوا۔ دیوان میں موجود لوگ قدرے جھک کر تعظیم بجالائے۔ سلطان نے ہر ایک پر سرسری نظر ڈالی اور حکم دیا۔ ”پیری شاہ کہاں چلا گیا ہے؟ اس کو بلوایا جائے۔“

پھر استاد ارسلان سے پوچھا۔ ”یہ نوجوان کہاں ملا؟“

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ”سلطان معظم! اس سے یہ سوال کیا گیا تھا مگر یہ خاموش رہا۔“

سلطان نے درشت لہجے میں کہا۔ ”پیری پاشا کو فوراً بلایا جائے۔“ اس کے بعد سلطان اچانک زیر حراست نوجوان کی طرف متوجہ ہوگیا، بولا۔ ”یہ کہاں ملا؟ اور اپنے فرار کی وجہ کیا بتاتا ہے؟“

ایک نگراں نے جواب دیا۔ ”سلطان معظم! یہ اپنی غلطی پر ذرا بھی نادم نہیں۔ کہتا ہے کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا اور یہ کہ میں آق شہر اپنی محبوبہ کے پاس جا رہا تھا۔“

سلطان نے زیر حراست نوجوان کے چہرے کو بغور دیکھ کر پوچھا۔ ”یہ اس کے دونوں رخسار لال اور سوجے ہوئے کیوں ہیں؟“

ایک نگراں نے جواب دیا۔ ”سلطان معظم! اس نے مزاحمت کی تھی اور گرفتاری کے بعد اپنے افعالِ شنیع پر ندامت کے بجائے دلیری دکھائی تھی۔“

سلطان نے پوچھا۔ ”افعالِ شنیع ...... کیا مطلب؟“

نگراں نے جواب دیا۔ ”سلطان معظم! یہ اپنے جذبۂ محبت کو معلوم نہیں کیا سمجھتا ہے۔ بار بار یہی کہتا ہے کہ یہ یا تو اپنی محبوبہ کے پاس جا کر دم لے گا یا پھر اس کوشش میں اپنی جان دے دے گا چنانچہ خدام سلطان نے اس کی... بے باکی اور ہٹ دھرمی پر سرزنش کی جس سے اس کے دونوں رخسار لال اور متورم ہوگئے۔“

سلطان نے تالی بجائی اور جب خدمت گار حاضر ہوگیا تو اس کو حکم دیا۔ ”زیر حراست نوجوان کے آدمیوں سے پوچھا جائے کہ ان میں وہ کون ہے جس نے اس نوجوان کی سرزنش کی اور اس کے دونوں رخسار زخمی کر دیے۔“

اتنے میں ہانپتا کانپتا پیری پاشا بھی آ گیا۔ سلطان نے پیری پاشا سے انتہائی غیظ و غضب میں خطاب کیا۔

”پیری پاشا! تو ات میدان کی جنوبی حدوں پر واقع خانقاہوں میں چلا جا، وہاں ناصریوں کے تارک الدنیا اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگے ہیں۔ وہ سلطانی مفروروں کو ورغلاتے اور گمراہ کرتے ہیں، ان سے کہہ دیا جائے کہ سلطان نے ابھی تک اپنی غیر مسلم رعایا اور ناصری مقتدایان دین سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کی ہے پھر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟“

پیری پاشا نے عرض کیا۔ ”حضور والا! اس کی فوراً تعمیل ہوگی۔“

سلطان نے زیر حراست نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا مجرم ہے، ینی چری کا مفرور نوجوان۔ یہ میرے کنبے کا ایک فرد ہے۔ اس کو میں سزا دوں یا معاف کردوں، یہ میرا فعل ہے۔ پھر کسی اور کو یہ حق کس نے دیا کہ اس کو تھپڑوں سے مارے۔ اس جرم کے مرتکب کو یہی سزا دی جائے یعنی اس کے بھی دونوں رخسار لال اور متورم کر دیے جائیں۔“

پیری پاشا نے عرض کیا۔ ”اس کی بھی فوراً تعمیل ہوگی۔“

سلطان نے استاد ارسلان اور زکریا کے سوا سبھی کو

دیوان سے نکال دیا لیکن پیری پاشا کو روک لیا۔ سلطان نے پیری پاشا اور استاد ارسلان کو ایک ساتھ مخاطب کیا۔ ''کیا میرا پیغام ان لوگوں کے گوش گزار نہیں کر دیا گیا جو آذر بائیجان کے قریب ترکی آبادیوں میں رہنے بسنے جا رہے ہیں۔ انہیں بتا دیا جائے کہ وہ اس وقت تک اپنی مرضی کے مالک نہیں رہیں گے جب تک کہ سنان پاشا انہیں یہ نہ بتا دے کہ اب وہ اپنے ذاتی معاملوں میں جو سلطانی مقاصد اور مفاد پر اثر انداز نہیں ہوتے، آزاد ہیں۔''

پیری پاشا نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم کا یہ پیغام اکثریت کے گوش گزار کر دیا گیا ہے، بقیہ کو چند دنوں میں بتا دیا جائے گا۔''

استاد ارسلان نے عرض کیا۔ ''سلطان معظم! میں نے یہ بات متعلقہ لوگوں تک پہنچا دی ہے لیکن چند ناتجربہ کار اور خام شعور نوجوان اس کی اہمیت اور نزاکت کو محسوس نہیں کر سکے ہیں۔''

سلطان نے زکریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ان ناتجربہ کار بے شعوروں میں یہ بھی شامل ہے؟''

استاد ارسلان نے مؤدبانہ تائید کی۔ ''جی سلطان معظم۔''

سلطان نے کہا۔ ''یہ ایک بار میری جان بچا چکا ہے ممکن ہے اس اعزاز نے اس کو متکبر کر دیا ہو۔ بہرحال اس کو اس بار معاف کر دیا جائے لیکن اس کو یہ بتا دیا جائے کہ یہ ہنڈی بار بار نہیں بھنائی جا سکے گی۔''

پیری پاشا نے عرض کیا۔ ''سلطان معظم! یہ خاکسار ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہے جو بہت نازک بھی ہے اور خطرناک بھی.....''

سلطان نے پوچھا۔ ''کیا ابھی اسی وقت؟''

پیری پاشا نے جواب دیا۔ ''وہ بات اس وقت میرے ذہن اور حافظے میں محفوظ ہے۔ کچھ دیر بعد ممکن ہو محو ہو جائے، ذہن سے نکل جائے اس لیے اسی وقت عرض کر دینے کی اجازت دی جائے۔ اس کے علاوہ یہ اجازت بھی دی جائے کہ میں حضور کے گوش مبارک کے قریب سرگوشی میں عرض کر دوں۔''

سلطان نے اجازت دے دی۔

پیری پاشا سلطان کے کان کے قریب منہ لے جا کر آہستہ سے بولا۔ ''سلطان معظم! نوجوانوں کو معاملاتِ عشق اور امورِ محبت میں کسی حد تک آزادی دی جائے کیونکہ تاریخ انسانی میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ حکم عدولی، بغاوت، سرکشی، ریاکاری اور انتہا پسندی عشق اور محبت کی ادائی

بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ

حالات و افکار

☆ اے فرید! ان عشاق الٰہی کے بدن کو چیر کر دیکھے تو اس میں سے رتی بھر خون بھی نہیں نکلے گا۔ جو بدن اللہ تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے رنگ میں رنگا گیا ہو، اس بدن میں تو خون ہوتا ہی نہیں۔

☆ اے فرید! محبوب کی جدائی بہت بڑا دکھ ہے، جس کا محبوب اس سے بچھڑ جاتا ہے، ہجر و فراق کے صدموں سے اس کا تن بدن سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے۔ اگر مجھے بچھڑا ہوا پیارا مل جائے تو میں سمجھوں مجھے ایک نہیں سیکڑوں پیاروں کی رفاقت حاصل ہو گئی۔

☆ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سیکھنا جانتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں سے پوچھ پوچھ کر سیکھ جاتے ہیں۔ اے فرید! تجھے ان لوگوں کے پیچھے بالکل نہیں لگنا چاہیے جو سیکھنا جانتے ہی نہیں۔

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

پیداوار ہیں۔''

سلطان نے وزیراعظم کو ڈانٹ دیا۔ ''پیری پاشا! تو خود تو بوڑھا ہو چکا ہے مگر نوجوانوں کی سفارش کر رہا ہے۔ میں اپنے نوجوانوں کو یہ رعایت نہیں دے سکتا کیونکہ ... کسی بھی معاملے میں مروت، رعایت، معمولی سی نرمی، برائے نام چھوٹ نہایت خطرناک خرابی کی مرتکب ٹھہرتی ہیں۔ جو نوجوان اپنی سفلہ خواہشات کو خود پر غالب آجانے کا موقع دیتے ہیں، وہ کسی نرمی اور مروت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔''

پیری پاشا خاموش ہو گیا۔ سلطان نے نہایت تند و تیز لہجے میں کہا۔ ''سنان پاشا کی مکمل فرماں برداری اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ینی چری کی کچھ روایات ہیں۔ اس کی ایک شناخت ہے۔ ایک مخصوص مزاج اور خصوصی تعارف۔ اگر اس سے یہ خصوصی تعارف چھن جائے تو اس کو ینی چری نہیں کچھ اور کہا جائے گا۔ میں عشق سے منع نہیں کرتا لیکن عشق عورت سے نہیں اپنے فرائض سے ہونا چاہیے۔ اپنے کام اور اپنے نام سے ہونا چاہیے، اپنے مقاصد اور اپنے نصب العین

سے ہونا چاہیے۔''

استاد ارسلان نے عرض کیا۔''سلطان معظم کو اس پر یقین رکھنا چاہیے کہ میرے اپنے شاگردوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو سلطان کی توقعات پر پورا نہ اترے۔''

اتنے میں اطلاع ملی کہ سنان پاشا اذن باریابی کا طالب ہے۔ سلطان نے جواب دیا۔''اس کو فوراً حاضر کیا جائے اور استاد ارسلان اور زکریا کو واپس جانے کی اجازت دی جائے۔''

زکریا بہت مایوس اور دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ استاد ارسلان نے اس کو سمجھایا۔''زکریا! سلطان کے کلمات تو نے سن لیے۔ سنان پاشا کی مکمل فرماں برداری اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ تجھ کو سنان پاشا کی آنکھ بند کر کے وفاداری کرنا ہوگی اور تجھے سلطان کی توقعات پر بہر حال پورا اترنا چاہیے۔''

زکریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک باغیانہ خیالات رکھتا ہے۔ چند دنوں بعد زکریا کئی سو آدمیوں کے ساتھ ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقے میں آباد ہونے کے لیے روانہ ہوگیا۔ سلطان نے زکریا کے ذمے یہ اضافی خدمت کردی تھی کہ وہ وقائع نویس کا فرض بھی انجام دے۔

زکریا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سیواس کے مشرق میں وان جھیل کے مغربی ساحل پر مقیم ہوگیا۔ یہاں ایک شاندار بستی تھی جس میں ہزاروں جنگجو آباد تھے۔ یہ بھی نسلاً ترک تھے۔ ان کے مکانات بے ترتیب بنے ہوئے تھے اور ان کے بیوی بچے زمانے کے اونچ نیچ سے بے پروا بڑی پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن مردوں کا مزاج بیوی بچوں..... سے مختلف تھا۔ ان میں کا ہر شخص جو بھی کام کر رہا تھا۔ اس سے قطع نظر جنگی مشقوں میں ضرور وقت دیتا تھا۔ یہ سو سو، پچاس پچاس کی ٹولیوں میں یک جا ہو کر آپس میں معرکہ کارزار گرم رکھتے تھے۔ جب زکریا اپنے ساتھیوں کو لے کر ان کی بستی میں آیا تو وہاں ایک شور سا مچ گیا۔ اگر دو چار آدمیوں کی بات ہوتی تو شاید اتنی توجہ نہ دی جاتی لیکن یہ سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ اس لیے مقامی باشندوں کو ان کی رہائش پر تشویش بھی ہوئی اور اعتراض بھی۔ انہوں نے انہیں آباد ہونے سے منع کیا۔ اپنے آدمیوں میں زکریا کی حیثیت با اختیار اور ذمے دار تھی۔ زکریا نے اپنے آدمیوں کو بالکل منع کر دیا تھا کہ وہ مقامی لوگوں سے کوئی بات نہ کریں۔ وہ سارے معاملات خود طے کرے گا اور الجھنیں خود سلجھائے گا۔ زکریا اور اس کے ساتھیوں نے کھلے میدان میں خیمے نصب کر دیے اور ان میں رہنے لگے۔ مقامی لوگ ان نو واردوں کو بڑی عجیب و غریب نظروں سے دیکھتے رہے لیکن بات کرنے کوئی بھی نہیں آتا۔ صبح ہوئی تو زکریا اور اس کے ساتھی اپنے کام میں مشغول ہو گئے اور بستی والوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ بستی کے بچے عورتیں اور نوجوان دور سے ان کا تماشا دیکھتے رہتے۔

کئی دنوں بعد شام کو مغرب سے ذرا پہلے بستی کا ایک ادھیڑ عمر شخص پانچ ساتھیوں کو لے کر زکریا کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے زکریا کے آدمیوں سے پوچھا۔''تمہارا سردار کہاں ملے گا؟''

زکریا کے ایک ساتھی نے جواب دیا۔''ہمارے سردار سے مغرب کے بعد ملاقات ہوجائے گی۔ وہ خود بھی تم لوگوں سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔''

یہ لوگ اس وقت تو واپس چلے گئے لیکن مغرب کے بعد دوبارہ پہنچ گئے۔ زکریا کے خیمے میں دو شمعیں روشن تھیں جن کی روشنی اتنی تیز نہیں تھی کہ اندر کی ہر شے بیک نظر اور بہ آسانی دیکھی جا سکے۔ زکریا کے چند ساتھی مقامی آدمیوں کو زکریا کے خیمے میں لے گئے۔ انہوں نے ایک نوعمر لڑکے کو اپنے سامنے دیکھ کر آپس میں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنا شروع کر دیں۔ انہیں اس نوعمر لڑکے کی سرداری پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص نے زکریا کے ایک آدمی سے پوچھا۔''تمہارا سردار کہاں ہے؟''

اس آدمی نے زکریا کی طرف اشارہ کیا۔''یہ سردار ہی تو ہیں ہمارے...... تم کس سردار کو پوچھ رہے ہو؟''

ادھیڑ عمر شخص نے متذبذب لہجے میں کہا۔''یہ نوعمر صاحبزادے یعنی یہ تمہارے سردار ہیں یا سردار کے صاحبزادے۔''

اب زکریا خود ہی مخاطب ہوگیا بولا۔''کیا تمہیں میری سرداری پر شبہ ہے...... اگر شبہ ہے تو کیوں؟ کیا میں صورتاً سردار نظر نہیں آتا؟''

ادھیڑ عمر شخص نے جواب دیا۔''نہیں سردار، یہ بات تو نہیں ہے۔ میں نے اس لیے شک و شبے کا اظہار کیا کہ آپ کی نوعمری نے ہمیں شک و شبے میں مبتلا کر دیا تھا۔''

زکریا نے کہا۔''ہاں ایسا ممکن ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ موجودہ ترک سلطان کے مخالف ہیں۔ سنگ دل سلطان نے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں سے جو سلوک کیا ہے ہم نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور سلطان کو سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا لیکن آخر کار سلطان حاوی آگیا اور

ہم سب وہاں سے فرار ہو کر ایران کی سرحد پر آن بسے۔ اگر سلطان نے ہمارا پیچھا کیا تو ہم یہاں سے ایرانی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ اسی کشمکش میں میرا باپ مارا گیا اور سرداری میرے حصے میں آ گئی ورنہ ابھی میری عمر سرداری کے لائق کہاں؟"

ادھیڑ عمر شخص کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ بالکل بجلی کی طرح جو لمحہ بھر کے لیے کوند کر غائب ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا۔ "ہاں اب میں تمہاری بات پر یقین کر سکتا ہوں۔ تم کل کتنے آدمی ہو جن پر عتاب نازل ہوا؟"

زکریا نے جواب دیا۔ "ان کی تعداد کی گنتی تو نہیں کی گئی لیکن یہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔"

ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا۔ "اور تمہاری عورتیں اور بچے کہاں ہیں؟"

زکریا نے ایک سرد آہ بھری بولا۔ "میری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی لیکن دوسروں کے بیوی بچے سلطان کے آدمی واپس لے گئے۔ جب ہم لوگ بیوی بچوں کو لے کر قسطنطنیہ سے فرار ہوئے تھے تو ہمارے ارادوں کی خبر سلطان کو بھی ہو گئی۔ اس نے ہمارے تعاقب میں اپنی فوج بھیج دی جس نے آبنائے باسفورس پر ہمیں پکڑ لیا۔ ہمارے بیوی بچے تو سلطان کی تحویل میں چلے گئے مگر ہم لوگ نکل بھاگے۔"

اس نے ایک بار پھر سرد آہ بھری۔ "اگر خدا کو منظور ہوگا اور ہماری قسمتوں میں ہوگا تو ہمارے آدمیوں کی ان سے دوبارہ ملاقات ہو جائے گی ورنہ جو خدا کی مرضی وہی ہماری مرضی۔"

مقامی لوگ زکریا کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ ایک نے کہا۔ "نوجوان! تمہارے ساتھ جو ہوا سو ہوا۔ خدا کی مشیت سمجھ کر صبر کرو مگر اب تم لوگ محفوظ ہو، ہمارے ساتھ مل جل کر رہو۔ یہاں سلطان کی طاقت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔"

زکریا نے کہا۔ "یہ سب جو میرے ساتھ آئے ہیں، میرے انتہائی وفادار لوگ ہیں۔ موقع پڑنے پر یہ اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ میں ان پر ناز کرتا ہوں۔"

جھیل وان کے ساحل پر آباد مقامی لوگوں نے ان نوآمدہ مہمانوں کی شاندار پذیرائی کی۔ جانور کٹے، ضیافتیں ہوئیں، میدانوں میں دور تک دونوں طرف کے لوگ مل جل کر بیٹھے۔ خوش گپیاں ہوئیں۔ مقامی لوگوں کو اس بات کی خوشی تھی کہ ان کی طاقت میں چند سو جنگجو جوانوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ زکریا اور اس کے آدمی ان سے جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

چند دنوں بعد زکریا نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ مقامی لوگوں کا معمر سردار صفی الدین زکریا سے کچھ کہنے کے لیے بے چین ہے۔ وہ زکریا سے بہت زیادہ ربط ضبط بڑھا چکا تھا۔ صفی الدین صورت و شکل ہی سے سردار لگتا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں سرخ و سفید وجیہہ چہرہ ان سب میں ممتاز تھا۔ وہ جب اپنے آدمیوں میں بیٹھتا تو سب سے الگ نظر آتا۔ وہ زکریا کو اپنی چوپال میں برابری کا مقام دیتا کیونکہ اس نے زکریا کو سردار تسلیم کر لیا تھا۔

زکریا اپنا بیشتر وقت سردار صفی الدین کی صحبت میں گزارتا۔ وہ اس شخص سے اس کی ساری قوم کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اس نے سردار صفی الدین کے پاس آنے جانے والوں میں کئی مشتبہ آدمی دیکھے جو چپ چاپ آئے اور تخلیہ میں صفی الدین سے باتیں کر کے واپس چلے جاتے۔ یہ لوگ کہاں سے آتے اور کہاں چلے جاتے اس کو کچھ پتا نہ تھا۔ لیکن یہ اجنبی جب بھی آتے اور باتیں کر کے چلے جاتے تو صفی الدین فکرمند ہو جاتا۔ کافی دیر فکر میں ڈوبا کچھ سوچتا رہتا اور جب ہوش میں آتا تو اپنے آدمیوں میں سے چند دانا و بینا آدمیوں کو تخلیہ میں بلا کر ان سے گھنٹوں صلاح و مشورے کرتا رہتا۔ زکریا اس راز کو اگلوانے کی فکر میں تھا۔

اپنے خیمے کے در سے اس نے دیکھا، چند گھڑسوار مشرق سے نمودار ہوئے اور سردار صفی الدین کے مکان کے پاس اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر کر اندر چلے گئے۔ زکریا فوراً تیار ہو کر خود بھی صفی الدین کے پاس چلا گیا۔ اس کو دروازے پر ہی روک لیا گیا۔ صفی الدین کا لڑکا رکن الدین دروازے پر پہرا دے رہا تھا۔ اس نے زکریا کو روکتے ہوئے کہا۔ "جناب والا! والد محترم اپنے چند خاص مہمانوں سے مصروفِ گفتگو ہیں۔ اس وقت نہیں مل سکتے۔"

زکریا نے بے پروائی سے کہا۔ "کوئی بات نہیں صاحبزادے میں پھر آ جاؤں گا۔"

لیکن اسی وقت اندر سے صفی الدین خود نمودار ہوا بولا۔ "رکن الدین...... زکریا کو اندر آنے دے۔ اب یہ غیر نہیں رہا، اپنا ہی آدمی ہے۔"

اس کے بعد زکریا کی طرف بڑھ کر ہاتھ ملایا اور معانقہ کے بعد ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا جہاں ایک سفید فرش پر سات اجنبی چہرے بیٹھے مصروفِ گفتگو تھے۔ ان کے سامنے پھلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں رکھی تھیں۔ صفی

الدین نے اپنے مہمانوں سے زکریا کا تعارف کروایا۔ ''سنو دوستو! یہ زکریا ہے سلطان کے باغی قبائل کا نوجوان امیر زادہ۔ یہ بھی سلطان کے ظلم و زیادتی کا شکار رہ چکا ہے اور اب چند سو آدمیوں کے ساتھ ہمارے پڑوس میں بس گیا ہے۔ ہم سب اس کی نہ صرف عزت کرتے ہیں بلکہ محبت بھی کرنے لگے ہیں۔'' اس کے بعد زکریا سے کہا۔ ''اور زکریا یہ لوگ ایران کے شہر تبریز سے آئے ہوئے ہیں۔ بادشاہ اسمٰعیل صفوی نے ان کے ذریعے ہمیں یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہمیں سنگ دل سلطان سلیم سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وقت پڑنے پر ایران اپنے سرحدی اور پڑوسی بھائیوں کی پوری طرح مدد کرے گا۔ یہ لوگ شاہِ ایران کی دوستی کا یقین لے کر آئے ہیں۔''

زکریا نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں پوچھا۔ ''معزز سردار! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟''

صفی الدین نے جواب دیا۔ ''امیر زادے، میں نے بڑی سادہ باتیں کی ہیں۔ تیری طرح ہم بھی سلطان سلیم کو سخت ناپسند کرتے ہیں گو کہ وہ ہمارا سلطان ہے لیکن ہم دل سے اس کو سلطان نہیں مانتے۔ وہ ظالم ہے اس نے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو ہلاک کر کے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے۔ تیرے جیسے معلوم نہیں کتنے قبائل کو جلاوطن اور ملک بدر کر دیا گیا ہے۔ کیا تو اور تیری قوم ایسے ظالم اور سفاک سلطان کا دل سے ساتھ دے سکتی ہے؟ میرا خیال ہے ہرگز نہیں۔ اسی طرح میں اور میری قوم بھی ترکی سلطان کے خلاف ہیں۔''

زکریا نے مایوسی سے کہا۔ ''لیکن ہماری مخالفت سے سلطان کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟''

صفی الدین مسکرایا۔ ''نقصان؟ امیر زادے...... نقصان کیسے نہیں پہنچ سکتا۔ ہم سب کی مخالفت سلطان کو بہت گراں پڑے گی۔ آج میں تجھ کو نہایت اہم باتیں بتانا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں تجھ سے وفاداری اور رازداری کا عہد لوں گا۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

صفی الدین نے آئے ہوئے مہمانوں سے زکریا کا تفصیلی تعارف کروایا۔ اس نے اپنے مہمانوں سے کہا۔ ''یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ سلطان کی سخت گیری اور ظلم نے ہمیں تیس چالیس ہزار تلواریں بخش دی ہیں۔ سلطان نے جب کبھی بھی ایران پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو اسے اپنی سرحدوں کے اندر ہی تقریباً ایک لاکھ دس ہزار شمشیریں نیام کے باہر کوندتی ہوئی پیشوائی کو ملیں گی۔''

زکریا نے پوچھا۔ ''ایک لاکھ دس ہزار کس طرح؟ کیونکہ میرے اپنے اندازے کے مطابق تقریباً چالیس ہزار ترک ہیں جو ہماری ہی طرح جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔''

صفی الدین نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''چالیس ہزار تم ہو، تقریباً ستر ہزار تلواریں ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ کل ایک لاکھ دس ہزار بنتی ہیں۔ کیا سلطان اتنی بڑی قوت کا مقابلہ کر سکتا ہے اور اس صورت میں کہ دوسری طرف سے شاہ ایران اپنی فوج بھی ہماری پشت پر لے آئے گا۔''

زکریا نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ صفی الدین نے اپنے مہمانوں سے کہا۔ ''تم لوگ شاہ ایران کے پاس واپس جاؤ اور اسے یقین دلا دو کہ اس کی خوش قسمتی اور اقبال مندی سے ہمیں چالیس ہزار حمایتی اور میسر آ گئے ہیں۔ وہ بشوق سلطان کو تہدید آمیز خط لکھ سکتا ہے۔ وہ سلطان سلیم کو لکھ دے کہ وہ غاصب ہے اور اس کا بھتیجا مراد جو ان دنوں شاہ ایران کا مہمان ہے، عثمانی تخت و تاج کا اصل حق دار ہے۔ سلطان سلیم اگر اپنے حقدار اور مستحق بھتیجے کے حق میں خود ہی دستبردار ہو جائے گا تو اس کو معاف کر دیا جائے گا اور اس کی گزربسر کے لیے معقول اور باعزت وظیفہ مقرر کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ اپنی زیادتیوں اور ناانصافیوں پر ہٹ دھرمی سے ڈٹا رہا تو شاہ ایران اپنا فرض پورا کرے گا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک غاصب کو اس کے کیے کی سزا نہ دی جائے اور حق دار کو اس کا حق نہ دلا دیا جائے۔''

مہمانوں نے کہا۔ ''یہ ساری باتیں شاہ کے نام مکتوب میں لکھ دی جائیں تو مناسب ہو گا۔''

صفی الدین نے اسی وقت اس مفہوم کا ایک خط لکھ دیا۔ اس خط پر زکریا اور اس کے خاص خاص آدمیوں کے دستخط بھی کروا لیے گئے۔ یہ مہمان چند گھنٹوں کے بعد واپس چلے گئے۔ اس دن صفی الدین اتنا خوش تھا کہ اس نے نوجوان زکریا کو اپنے بیوی بچوں کے سامنے کھڑا کر دیا اور فرطِ جذبات میں اعلان کر دیا کہ زکریا کو وہ اپنے خاندان ہی کا ایک فرد سمجھتا ہے اور اس کا مرنا جینا زکریا کے ساتھ ہو گا۔

زکریا نے صفی الدین کی تین بیویوں کو دیکھا، ان میں دو بہت خوب صورت تھیں اور پچیس اور تیس سال کی درمیانی عمروں کی رہی ہوں گی لیکن تیسری بیوی چالیس پینتالیس سال کی تھی اور بہت موٹی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کی چھ چھ سات سات اولادیں تھیں اور ان میں چھوٹی سے چھوٹی اولاد

تقریباً چار سال کی رہی ہوگی۔ صفی الدین نے زکریا کو اپنے خاص کنبے کے سامنے کھڑا کر کے اعلان کیا کہ یہ زکریا اور اس کے ساتھی اب اسی کے قبیلے میں شمار کیے جائیں گے اور زکریا اور اس کے آدمیوں کو رشتۂ مواخات میں جکڑ دیا جائے گا۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "میں اس رشتۂ مواخات کو شکریہ کے ساتھ قبول کرلوں گا۔"

تقریباً شام سے ذرا پہلے صفی الدین نے اعلان کردیا کہ آج رات اس خوشی میں ایک جشن برپا ہوگا اور اس جشن میں لوگ خوب خوب کھائیں پئیں گے۔

شام کو میدان کے ایک بڑے ٹکڑے کو کنکر پتھر سے صاف کردیا گیا۔ اس پر پانی کا چھڑکاؤ ہوا۔ مویشیوں کو ذبح کرکر کے ڈال دیا گیا۔ پتھروں کے ٹکڑوں سے چولہے بنائے گئے اور ان پر دیگیں چڑھا دی گئیں۔ دیگوں میں گوشت اور مسالے ڈال کر چولہوں میں آگ دکھا دی گئی۔ پکانے والوں کے ڈوے اور دوسرے آلات مطبخ تیزی سے حرکت میں آگئے۔ آگ نے بھاپ اڑائی تو ناکوں میں خوشگوار اور لطیف خوشبوؤں کا جھونکا گھسا چلا گیا۔ بھوکوں کی آنتیں قل ھواللہ پڑھنے لگی تھیں۔

رات کو کھانے پر بڑی ہلڑبازی ہوئی اور مہمانوں اور میزبانوں کو یکساں لطف حاصل ہوا۔ صفی الدین اور اس کی قوم کے لوگ بہت خوش تھے کہ انہیں سلطان کے خلاف چالیس ہزار بے نیام شمشیریں ہاتھ آگئی تھیں اور زکریا اس لیے بہت خوش تھا کہ سلطان کی خدمات بہ احسن انجام دے رہا تھا اور اپنے اور سلطان کے مخالفوں کا اعتماد حاصل کرنے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرلی تھی۔

اس رات زکریا اور صفی الدین نے ایک ہی چھت تلے اپنا وقت گزارا۔ صفی الدین نے اپنے برابر والے کمرے میں اس کے سونے کا انتظام کردیا تاکہ باہمی دوری کو بالکل ہی ختم کیا جائے۔

اب ان کے کام اور روزمرہ کے مشاغل مشترک ہوگئے تھے ان کی بیگانگی یگانگی میں بدل چکی تھی۔ نمازیں ایک جگہ ادا ہوتیں، روزگار میں ایک دوسرے کا تعاون حاصل رہتا، کھانا ایک جگہ کھایا جاتا۔ دوسروں کی بہ نسبت زکریا، صفی الدین اور اس کے خاندان میں زیادہ گھل مل گیا تھا۔ جب صفی الدین کا تین بیویوں اور ان کی اولاد پر مشتمل کنبہ ہنستے مسکراتے زکریا سے مخاطب ہوتا تو اس کے دل کی عجیب سی حالت ہوجاتی۔ تینوں بیویوں کی دو جوان اور پانچ دس دس بارہ بارہ سال کی لڑکیاں تھیں۔ ان لڑکیوں کے کیا

کیا نام تھے، اسے یاد نہیں رہتا تھا، یہاں تک کہ وہ کسی کا نام کسی سے منسوب کرلیتا لیکن ان میں ایک ایسی بھی لڑکی تھی جس کے نام اور شکل میں وہ ذرا بھی دھوکا نہ کھاتا تھا۔ اس لڑکی کا نام ناہید تھا۔ زکریا کو ناہید کی صورت و شکل، ناز و انداز اور آواز کے ترنم میں فلکی ناہید کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ یہ صفی الدین کی سب سے عمر رسیدہ بیوی کی بیٹی تھی۔ تقریباً تیرہ چودہ سال کی یہ لڑکی مسکراتی تو زکریا کے رگ و پے میں کیف و مسرت کی لہریں رواں ہوجاتیں۔ بولتی تو کانوں میں مترنم نغمے گونجنے لگتے۔ چلتی تو آہوئے صحرا کی طرح، اک شانِ دلنوازی اور ساحری سے۔ وہ غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر ناہید کی طرف کھنچا چلا گیا۔ وہ جب بھی زکریا کے سامنے آتی تو وہ سب کچھ بھول جاتا لیکن اس کیف و مسرت میں اس کو سلطان اور استاد ارسلان کی نصیحتیں اور ہدایتیں بہت پریشان کرنے لگتیں۔ سلطان کی تاکید کہ سنان پاشا کی مکمل وفاداری اور کچھ نہیں۔ استاد ارسلان کی ہدایت کہ لڑکیوں اور عورتوں سے دور رہنا کیونکہ جن مردوں اور نوجوانوں کو عورتیں اور لڑکیاں فتح کرلیتی ہیں، وہ زندگی کے بیشتر محاذوں پر ناکام ہی رہتے ہیں۔ اس کو بحیرۂ مارمورا کے شمالی ساحلوں کے خانقاہی سلسلوں میں آباد راہب یاد آتے جو دنیاداروں کو دنیا سے فرار اور عورتوں سے بیزار رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ سلطان، استاد ارسلان اور تارک الدنیا راہب ان معماروں اور ہندسوں کی طرح تھے جو شباب کی سرکش اور بلاخیز امواج کے سامنے بند باندھ دیا کرتے ہیں۔ ناہید کی موجودگی ان تینوں کے باندھے ہوئے بند کو ہلائے دے رہی تھی۔ وہ ناہید کو شجرِ ممنوعہ سمجھنے پر مجبور کردیا گیا تھا لیکن یہ شجرِ ممنوعہ اس کو پوری شدت اور قوت سے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

اسی دوران سنان پاشا کا ایک آدمی آگیا اور اس نے زبانی بتایا کہ سنان پاشا نے زکریا سے سلطانی منصوبے پر عمل درآمد کی تفصیل مانگی ہے۔ وہ بڑے پس و پیش میں پڑ گیا۔ صفی الدین اس کا خاندان، ناہید، ان کی قوم کے لوگوں کا اخلاق، میل محبت، یہ ساری باتیں زکریا کے کردار اور ارادوں میں تزلزل پیدا کررہی تھیں۔

سنان پاشا کے قاصد نے زبانی صاف صاف بتادیا تھا کہ اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا۔ سلطانی منصوبے پر آخری اور قطعی عمل درآمد کا وقت آچکا ہے۔

زکریا نے اسے دو دن کے لیے روک لیا کیونکہ سنان پاشا کو تفصیلی اور تحریری جواب دینا تھا۔ صفی الدین نے

سنان پاشا کے قاصد کی بابت دریافت کیا۔ ''یہ کون ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''یہ بھی میرے ہی جیسا سلطانی معتوب اور آوارہ وطن ہے جو اپنے قبیلے والوں کا یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ سلطان کو سبق دینے کے لیے ہر وقت تیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ پتا نہیں کس وقت یہ معرکہ پیش آجائے۔''

صفی الدین نے کہا۔ ''تو اپنے آدمی سے کہہ دے کہ ہم بھی تیار ہیں اور یہ معرکہ جس وقت بھی پیش آئے گا، انہیں تقریباً ستر ہزار بے نیام تلواریں اپنی مدد کو تیار ملیں گی۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کی طرف سے انہیں یہ یقین دلا دیا ہے۔''

صفی الدین کسی کام سے چلا گیا۔ زکریا ذرا فاصلے پر بیٹھی ہوئی ناہید کو دیکھنے لگا وہ کسی کام میں مشغول تھی۔ اس کی زلفیں داہنی طرف شانے پر سے گزر کر سینے پر آگئی تھیں۔ چہرہ جھکا ہوا تھا۔ زکریا سوچ رہا تھا کہ کیا یہ فاصلہ ہمیشہ قائم رہے گا یا کبھی ختم بھی ہوسکتا ہے یا اس میں اور اضافہ ہوجائے گا؟ وہ ناہید میں موجود غیر مرئی لیکن اس سحر انگیز اور پرکشش قوت کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا جو مقناطیس کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس کے دل میں میٹھا میٹھا درد ہورہا تھا اور کائنات میں ناہید سے زیادہ اچھی اور حسین شے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

کسی کسی لمحے ناہید بھی اسے دیکھ لیتی تھی۔ زکریا اپنی جگہ سے اٹھا اور ناہید کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا ناہید کھانا پکانے کی تیاری کررہی تھی۔ زکریا اس کی صورت دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ آس پاس کا کچھ ہوش نہ رہا۔ ناہید نے زکریا کی موجودگی کو محسوس کرلینے کے باوجود اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہ آٹا گوندھنے میں مشغول رہی۔ کچھ دیر بعد ناہید آٹا گوندھ چکی اور ہاتھ پانی سے دھو کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے سرسری نظروں سے زکریا کی طرف دیکھا اور بے اعتنائی سے کہا۔ ''تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کیا تم رسوائی سے نہیں ڈرتے؟''

زکریا ناہید کی آواز سن کر اپنے آپ میں نہیں رہا۔ وہ چونک کر اپنی دنیا میں واپس آگیا، بولا۔ ''لڑکی! اگر میں غلطی پر نہیں ہوں اور میری یادداشت مجھے دھوکا نہیں دے رہی تو میں یہی کہوں گا کہ شاید تیرا نام ناہید ہے اور تو اپنے باپ کی سب سے بڑی بیوی کی لڑکی ہے؟''

ناہید نے منہ پھیر کر بے مروتی سے جواب دیا۔ ''یہ سب فضول باتیں ہیں۔ میرے پاس ایسی ویسی باتوں کی گنجائش نہیں۔ تم یہاں تک جس کام سے آئے ہو جلد از جلد انجام دو اور اپنی جگہ واپس جاؤ۔''

زکریا نے گھبراہٹ میں کہا۔ ''تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ کیا تیرا نام ناہید نہیں ہے؟''

ناہید نے پھٹی پھٹی نظروں سے زکریا کو دیکھا اور جواب دیا۔ ''اگر میرا نام ناہید ہے تو اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟ تم کو اس وقت تو بس یہ سوچنا چاہیے کہ تمہاری اپنی فلاح کس کام میں ہے۔ تمہاری طرح عورت یا کسی لڑکی کو گھورتے رہنا بداخلاقی میں داخل ہے۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ناہید! میں پیاسا ہوں، میں یہاں پانی پینے آیا ہوں۔''

ناہید نے بے رخی سے کہا۔ ''جھوٹ! تم یہاں میرے پاس پانی پینے ہرگز نہیں آئے۔ میں جانتی ہوں تم یہاں کیا لینے آئے تھے اور تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ تم نے میرے پاس آنے کی جرأت کیوں کی ہے؟''

زکریا نے کہا۔ ''اگر تو دلوں کا حال پوچھے بغیر ہی جان سکتی ہے تو شاید ولی ہے، اب میں اور کیا کہوں۔''

ناہید اس کو چھوڑ کر کہیں غائب ہوگئی۔ زکریا ہاتھ ملتا رہ گیا لیکن اسی وقت اس کو اپنے پیچھے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ زکریا جیسے ہی مڑا، اپنے سامنے صفی الدین کو دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ صفی الدین بالکل سنجیدہ تھا۔ زکریا نے کوشش کی صفی الدین سے نظریں ملائے بغیر ہی چپ چاپ چلا جائے لیکن صفی الدین نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا۔ ''زکریا تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟''

زکریا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا بولا۔ ''پتا نہیں میں یہاں کیا لینے آیا تھا، شاید پانی کی طلب میں۔''

صفی الدین نے کہا۔ ''نہیں غلط...... تو ذرا سی دیر کے لیے میرے ساتھ چل۔ میں تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

زکریا اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ وہ صفی الدین کی ان جلی کٹی باتوں کا مطلب ہی نہ سمجھتا ہو۔ لیکن فرار کی بھی کوئی راہ نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے صفی الدین کے ساتھ اس کی چوپال میں چلا گیا۔ اس وقت چوپال میں صفی الدین کے تین چار بچے کھیل رہے تھے۔ صفی الدین نے ان سب کو ڈانٹا۔ ''تم سب باہر جاؤ اور اس کا خیال رکھو کہ کوئی شخص چوپال میں نہ آنے پائے۔ میں اس نوجوان سے چند ضروری باتیں کررہا ہوں۔''

بچے چلے گئے۔ صفی الدین کے بگڑے ہوئے تیور

بتا رہے تھے کہ زکریا کے پورے منصوبے پر پانی پھر جائے گا اور اس نے اپنے قائم کردہ اعتماد کو ایک لڑکی کی وجہ سے ضائع کر دیا ہے۔

چوپال میں سکوت طاری تھا۔ اچانک صفی الدین نے پوچھا۔ ''زکریا! کیا تجھے اب بھی پانی کی طلب محسوس ہو رہی ہے؟''

زکریا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''نہیں، اب بالکل پیاس نہیں لگ رہی۔''

لیکن فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، جلدی جلدی بات بناتے ہوئے کہا۔ ''میں پیاسا تو اب بھی ہوں لیکن میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ اس سلسلے میں آپ کو تکلیف دوں۔''

صفی الدین نے کہا۔ ''زکریا تو مجھ سے اڑنے کی کوشش نہ کر۔ میں انسانوں کی پرکھ کا غیر معمولی سلیقہ رکھتا ہوں۔ تیرے جواب میں کھوٹ ہے جھوٹ ہے۔ اگر تھوڑی دیر پہلے پیاسا تھا تو تجھے اب بھی پیاسا ہی ہونا چاہیے۔''

زکریا نے اپنا سر پکڑ لیا بولا۔ ''محترم سردار! آپ یقین فرمائیں اس وقت میں بہت پریشان ہوں۔ میں آپ کا بے حد احسان مند ہوں گا اگر آپ اس وقت مجھے سوال جواب کے بغیر ہی یہاں سے چلا جانے دیں گے۔''

صفی الدین نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں یہ نہیں کر سکتا۔ میں تجھ کو یہاں تک رعایت دے سکتا ہوں کہ گفتگو میں طوالت نہ آئے۔ میں جو بات بھی کروں گا، صاف صاف کروں گا۔ اسی طرح میں تجھ سے بھی یہی امید کروں گا کہ تو بھی کسی قسم کی لگی لپٹی نہیں رکھے گا اور ہر بات صاف صاف کھول کر میرے سامنے رکھ دے گا۔''

زکریا نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ''ایسی ویسی کوئی بات ہے تو ہونے دیجیے کیونکہ وہ بڑی تکلیف دہ بات ہے، ہم دونوں کے لیے۔''

اتنا کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ صفی الدین بھی کھڑا ہو گیا پوچھا۔ ''یہ چلے کہاں؟ میں تو تجھ کو یوں ہی نہیں جانے دوں گا۔ نوجوان تو نے میری بیٹی ناہید کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کی، تیرے خیال میں کیا میں اتنا ہی بے وقوف ہوں جتنا کہ نظر آتا ہوں......'' کچھ دیر خاموش رہ کر پھر بولا۔ ''نوجوان! آج تجھے یہ اقرار کرنا ہوگا کہ تو میری بیٹی ناہید میں بڑی دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کے پاس جانا یا جانے کی تدبیریں سوچنا غلط ہے؟ کیا یوں ہی بے سبب؟ ہرگز نہیں۔''

زکریا بے حد شرمندہ تھا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''سردار! میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دیجیے۔''

لیکن صفی الدین کے لہجے میں غصہ یا تڑپ نہیں تھی جس کا وہ اندازہ لگا رہا تھا۔

صفی الدین نے کہا۔ ''میں نے تجھ کو اپنے کنبے میں شامل کر لیا ہے، کیا تو یہ میرا احسان بھول گیا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں نے آپ کا احسان بھلایا نہیں ہے......''

صفی الدین نے قدرے گرمی دکھائی، بولا۔ ''تو کس بات کا احسان مند ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''سردار کے پاس میں سر تا پا احسان مند بن کر اٹھتا بیٹھتا ہوں اور اسی کرم گستری اور ذرہ نوازی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج میں اور میرے ساتھی خود کو بے سہارا نہیں سمجھتے۔''

صفی الدین نے طنزاً کہا۔ ''زیادہ باتیں نہ بنا، میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ اب تیرے کیا ارادے ہیں؟ کیا تو ناہید کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتا؟ وہ اپنے چچا کے لڑکے سے منسوب ہے۔ تیری ذرا سی بے اصولی اور بے راہ روی ناہید کے ساتھ ساتھ مجھے بھی الجھنوں میں ڈال دے گی۔''

زکریا نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا، بولا۔ ''محترم سردار! آپ مطمئن رہیں۔ میں آپ کو اور آپ کی بیٹی کو کسی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔''

صفی الدین کی نظریں زکریا پر گڑ کر رہ گئی تھیں اور زکریا کی نظریں زمین میں گڑ گئی تھیں۔ دونوں ہی کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئے آخر زکریا ایک بار پھر بولا۔ ''اب مجھے جانے کی اجازت دیجیے محترم سردار۔ میں آپ سے یہ وعدہ کر کے جا رہا ہوں کہ آپ کو آئندہ مجھ سے کسی قسم کی شکایت نہیں ہوگی۔''

صفی الدین نے پوچھا۔ ''اس کا مطلب؟ بات صاف صاف کر۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ ناہید کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لاؤں گا۔ میں نے اس سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی اختیار کر لی۔''

صفی الدین کے چہرے کا رنگ بدل گیا، غصے میں بولا۔ ''بزدل کہیں کا...... میں ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تجھ کو بہادر اور اصولی نوجوان سمجھ رہا تھا لیکن تو نہ تو اصولی ہے اور نہ ہی بہادر کیونکہ بہادر لوگ اگر کہیں محبت کرتے ہیں تو اس راہ میں اپنی جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں اور اگر تو ایک اصولی نوجوان ہوتا تو اپنی محبت کے اصول کو اتنی آسانی سے بالائے طاق نہ رکھ دیتا۔'' پھر بڑے طنز سے کہا۔ ''جو

نوجوان اپنی محبت میں شدت اور حدت سے محروم ہو، وہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں شدید اور حدید نہیں ہوسکتا۔ تجھ سے کسی بڑے کام کی امید نہیں کی جاسکتی۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''محترم سردار! آپ مجھ کو سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں۔ میرے دل میں بھی محبت کی شدید آگ روشن ہے اور میں اتنا ہی اصولی انسان ہوں جتنا کوئی بڑے سے بڑا انسان ہوسکتا ہے لیکن جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ ناہید اپنے چچا کے بیٹے سے منسوب ہے تو میں نے اپنے لیے یہ پسند کرلیا کہ عشق کی آگ میں جل کر بھسم ہوجاؤں مگر ناہید کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں۔''

صفی الدین نے مسکرا کر کہا۔ ''نوجوان! محبت... خودغرض ہوتی ہے اور اصول ہر جگہ اصول نہیں رہتے اور پھر یہ کہ تو نے میری اس بات پر بڑی آسانی سے یقین کیوں کرلیا کہ ناہید اپنے چچا کے بیٹے سے منسوب ہوچکی ہے۔''

زکریا گھبرا گیا مگر وہ لاجواب ہوچکا تھا۔ پریشانی اور بوکھلاہٹ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

صفی الدین نے کہا۔ ''نوجوان میری یہ خواہش ہے کہ میں تجھ کو اپنے خاندان میں داخل کردوں۔ میں کئی دنوں سے یہ بات محسوس کر رہا تھا کہ تو میری بیٹی ناہید میں بڑی دلچسپی لے رہا ہے۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں تیری محبت کا امتحان لوں گا اگر تو اس میں پورا اترا تو میں ناہید کو تیرے حوالے کردوں گا۔''

زکریا نے سر اٹھایا اور ملتجی نظروں سے صفی الدین کو دیکھنے کی کوشش کی مگر نظریں نہ ملا سکا۔

صفی الدین ذرا دیر چپ رہ کر پھر بولا۔ ''بظاہر یہ کتنی بے غیرتی کی بات ہے کہ باپ اپنی بیٹی کی بابت کسی نوجوان سے اس قسم کی باتیں کرے لیکن میں عام لوگوں سے مختلف ہوں۔ میں نے تیرا امتحان لیا افسوس کہ تو......''

زکریا کو ایسا لگا گویا دل کے بے پایاں سمندر کو ضبط و احتیاط...... اور حزم وصبر کے جن چٹانوں سے محصور کیا گیا۔ وہ صفی الدین کی پرامید باتوں کے ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے تھے۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا میں آپ کے اس امتحان میں واقعی ناکام ہوچکا ہوں......''

صفی الدین نے جواب دیا۔ ''نوجوان ایک بار تو تو ناکام ہو ہی چکا۔ ایک موقع تھا جس کو تو نے ضائع کردیا، اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا؟ تجھ کو کوئی اور موقع ملے گا یا نہیں بہرحال دیکھا جائے گا۔ میری تو یہی خواہش تھی کہ میں تجھ کو اپنے خاندان میں شامل کرلیتا۔''

زکریا کی الجھنوں میں صفی الدین نے کچھ اور اضافہ کردیا تھا۔ سلطان، استاد ارسلان اور خانقاہوں کے راہب یہ کہتے تھے کہ جو مرد یا نوجوان عورتوں کے ہاتھوں مفتوح ہوجاتے ہیں، وہ زندگی کے ہر میدان میں مفتوح رہتے ہیں لیکن صفی الدین اس کے برعکس بات کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جو نوجوان اپنی محبت میں شدت اور حدت سے محروم ہو، وہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں شدید اور حدید نہیں ہوسکتا اس سے کسی بڑے کام کی امید نہیں کی جاسکتی۔

صفی الدین نے کہا۔ ''نوجوان تو کس سوچ میں پڑ گیا؟ جا اطمینان سے سوچتا رہ، سوچنے کے لیے بڑا وقت پڑا ہے۔ میں تیرے فیصلے کا منتظر رہوں گا۔''

زکریا نے پوچھا۔ ''محترم سردار! کس فیصلے کا؟''

صفی الدین نے جواب دیا۔ ''اب تو جن بھول بھلیوں میں گھرا کھڑا ہے، اس سے کس طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے اس سے نکلنے کا فیصلہ کس نوع کا ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس کے علاوہ بھی میری بات کوئی مطلب ہے تو تو اس کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے گا۔''

زکریا کے سر میں درد اٹھ کھڑا ہوا۔ دل و دماغ پر اتنا بوجھ... آچکا تھا کہ وہ اس میں دبا چلا جا رہا تھا۔ وہ بار بار قلق محسوس کرتا کہ افسوس اس نے ذرا سی کوتاہی اور ناسمجھی میں ناہید کو کھودیا۔ سریع الحصول ناہید کو ضائع کردیا لیکن پھر جیسے ہمت عود کر آئی اور اس نے ایک نئی امنگ ایک نیا ولولہ اور ایک نئی تڑپ محسوس کی۔ ناہید نے ایک بار پھر اس کے دل میں انگڑائی سی لی اور وہ اس کے کیف وسرور میں ڈوبتا چلا گیا۔

چند دنوں بعد سنان پاشا کا ایک قاصد اور آگیا۔ وہ سنان پاشا کا چند سطری پیغام لے کر آیا تھا۔ سنان پاشا نے لکھا تھا۔ ''سلطان کے خلاف ایک مربوط اور منظم منصوبہ اس طرح ترتیب دیا جاسکتا ہے کہ ترکی اور ایرانی سرحدوں پر آباد قبائلیوں کو اعتماد میں لے کر بھرپور ضرب لگائی جائے۔ ایک ہی دن اور ایک ہی وقت پر بھرپور ضرب۔ ہم سب اپنا کام پورا کرچکے، تو کیا کر رہا ہے؟ بالتفصیل بتا تاکہ کوئی لائحہ عمل ترتیب دیا جائے۔''

زکریا سنان پاشا کو تفصیل سے لکھنا چاہتا تھا مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ آخر صفی الدین چند دنوں کے لیے کسی کام سے تبریز چلا گیا تو زکریا نے پہلا کام یہ کیا کہ بیک وقت دو خط لکھے۔ ایک سنان پاشا کے نام دوسرا استاد ارسلان کے نام۔ سنان پاشا کو اس نے لکھ دیا تھا۔

''فصل تیار ہے اس کو کب اور کس طرح کاٹنا ہے،

آپ ہی طے کریں گے۔ میں نے اپنے پڑوسیوں اور سلطان کے درپردہ باغیوں کا مکمل اعتماد حاصل کرلیا ہے۔''

لیکن استاد ارسلان کو تفصیل سے لکھا تھا۔

''استاد محترم! آپ نے مجھ کو عورت کے بارے میں جو درس دیا تھا، میں نے کوشش کی کہ اس پر کاربند رہوں اور میں اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہا لیکن ایک ایشیائی بوڑھے نے آپ کے قول کی نفی کر کے مجھ کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے جو نوجوان اپنی محبت میں شدید اور حدید نہیں ہوسکتا اس سے کسی بھی بڑے کام کی امید نہیں کی جاسکتی۔ استاد محترم! اب آپ ہی بتایئے میں اس کو کیا جواب دوں اور اس بارے میں کیا رائے قائم کروں؟ ویسے حقیقت یہ ہے کہ میرا میزبان چاہتا ہے کہ میں اس کی بیٹی سے محبت کروں تاکہ وہ مجھے اپنے خاندان میں داخل کرسکے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ میں بھی اس کی بیٹی ناہید کی محبت میں گرفتار ہوچکا ہوں۔ اب ان حالات میں مجھ کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ آپ ہی بتایئے؟''

اب ایک بار پھر وہ ناہید کی محبت میں گلے گلے پھنس چکا تھا۔ ناہید کئی بار اس کے پاس سے گزری چلی گئی، ایک آدھ بار خفگی بھی لیکن زکریا کی ہمت نہ پڑی۔ آخر ایک دن وہ تبریز سے آیا ہوا اپنے باپ صفی الدین کا خط لے کر آئی اور زکریا سے کہا۔ ''میرے باپ کے خط کو خوب غور سے پڑھ لے اور اس کا اسی وقت جواب بھی لکھ دے۔ ورنہ قاصد چلا جائے گا۔''

زکریا نے صفی الدین کا خط تو لے لیا لیکن اس کے ساتھ ہی ناہید کا ہاتھ پکڑ لیا بولا۔ ''ناہید! تو مجھ سے بے زار کیوں رہتی ہے؟''

ناہید نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ اپنا ہاتھ اسی کے ہاتھ میں رہنے دیا سر جھکا کر شرما کر بولی۔ ''میں کہاں بے زار ہوں؟ یہ کس نے کہہ دیا تجھ سے۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''تیرے رویے اور تیری روش نے...... کچھ جانتی ہے کہ اس سلسلے میں تیرے باپ نے مجھ سے کیا کہا؟''

ناہید نے پلک جھپکائے بغیر پوچھا۔ ''کیا کہا؟ کچھ مجھے بھی تو بتا؟''

زکریا نے کہا۔ ''تیرے باپ نے کہا کہ تو، تو اپنے چچا کے بیٹے سے منسوب ہوچکی ہے۔''

ناہید نے ہنس کر کہا۔ ''شاندار جھوٹ، ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

زکریا نے آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ مسلنا شروع کردیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تیرے باپ نے کہا کہ وہ تیری شادی کسی ایسے نوجوان سے کریں گے جو معاملاتِ محبت میں شدید اور حدید ہو۔''

ناہید نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ زکریا نے مزید کہا۔ ''ناہید! میں مسائل اور مشکلات میں گھرا ہوا ہوں۔ میں ایک بازی تو ہار چکا ہوں اب دیکھیے دوسری بازی کا کیا حشر ہوتا ہے۔''

ناہید نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور کہا۔ ''مسائل اور مشکلات ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ ان پر قابو پایا جائے۔''

''مگر کس طرح؟''

''یہ تو سوچ کیونکہ یہ میرا کام نہیں۔''

زکریا نے پوچھا۔ ''ناہید، ایک بات اور...... میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں اپنے بارے میں۔''

ناہید نے کہا۔ ''پھر پوچھ، اگر وہ بات مجھ کو معلوم ہے تو میں ضرور جواب دوں گی۔''

زکریا نے پوچھا۔ ''ناہید! میں تجھ سے بڑی محبت کرتا ہوں لیکن کیا تو بھی میرا مطلب ہے کہ کیا تو بھی مجھ سے...... یا پھر یہ کہ بس یوں ہی؟''

ناہید ایک دم ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ ہنستی ہوئی منہ ٹیڑھا کر کے بولی۔ ''ایسی بات تو بھی کرنا بھی نہیں۔ اگر یہ باتیں کسی اور نے کی ہوتیں تو میں اس کا جبڑا توڑ دیتی۔''

زکریا نے اس کی سنی ان سنی کردی۔ ''لیکن تیرا باپ نیم راضی ہے۔ وہ مجھ کو اپنے خاندان میں داخل کرلینا چاہتا ہے۔''

ناہید نے شوخی سے کہا۔ ''باوا جان اپنے خاندان میں تجھ کو شامل کرلیں تو اس میں کسی اور کو کیا شکایت ہوسکتی ہے لیکن اگر باوا جان کی جگہ میں ہوتی تو میرا فیصلہ اس کے برعکس ہوتا۔''

زکریا نے محسوس کیا کہ ناہید جانے کے لیے تیار کھڑی ہے، بولا۔ ''ناہید کچھ دیر تو اور بیٹھ۔''

ناہید نے جواب دیا۔ ''اب میں نہیں بیٹھ سکتی۔'' پھر جاتے ہوئے کہنے لگی لیکن اے ناقابل یقین اور غیر معتبر نوجوان! تو میری ایک بات پر زندگی بھر غور کرتا رہ۔''

زکریا نے پس و پیش سے پوچھا۔ ''کس بات پر؟''

ناہید نے جواب دیا۔ ''میں اس نوجوان کو ترجیح دوں گی جو مجھ سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ کوئی یادگار کارنامہ بھی انجام دے گا۔ تیری محبت تو کوئی چیز نہیں۔''

زکریا کا چہرہ فق ہوگیا، زرد پڑگیا، بولا۔ ''ناہید میری

کوشش تو یہی ہے کہ میں کوئی یادگار کارنامہ انجام دوں لیکن کوئی ایسا موقع نہیں ہاتھ آرہا۔" پھر اچانک اسے کچھ یاد آگیا، بولا۔" شاید ایک موقع آبھی گیا ہے۔ اگر میں اس میں کامیاب ہوگیا تو تجھے فخریہ بتاسکوں گا کہ میں نے بھی ایک عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے۔"

ناہید نے منہ چڑا کر اپنی راہ لی، بولی۔" بڑا آیا کارنامہ انجام دینے والا۔ کارنامہ انجام دینے والوں کی ایسی ہی شکلیں ہوا کرتی ہیں۔"

زکریا اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے دل پر چوٹ لگی تھی۔ وہ ابھی تک تو ناہید کو سیدھا سادہ اور معصوم سمجھ رہا تھا مگر یہ تو چھلاوا ثابت ہو رہی تھی۔

ناہید کے چلے جانے کے بعد زکریا دل گرفتہ اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں صفی الدین کا خط تھا جس کو وہ ناہید کی باتوں میں پڑھ بھی نہیں سکا تھا۔ وہ کچھ دیر تو گم صم ٹہلتا رہا۔ آخر صفی الدین کا خط پڑھنے لگا۔

صفی الدین نے لکھا تھا۔" زکریا! خدا تجھے خوش رکھے۔ تو اپنے آدمیوں کو فوجی تربیت میں مشغول کردے کیونکہ جنگ کے بادل گھرتے چلے آرہے ہیں۔ سخت دل سلیم شاہِ ایران کے دربار میں پناہ حاصل کرنے والے شہزادوں کی فکر میں ہے اور شاہ ایران سلیم کی فکر میں۔ یہ دونوں شیر کسی بھی وقت معرکہ کارزار گرم کردیں گے۔

"اے خدا کے نیک اور سیدھے سادے نوجوان! شاہ ایران نے وعدہ کرلیا ہے کہ جب سلطان سلیم کی فوجیں سیواس میں داخل ہوجائیں گی تو شاہ ایران اسی دن اپنی آزمودہ، تجربہ کار اور جنگجو فوج کے ساتھ ہمارا حلیف ہوگا۔

"زکریا! میرے بیوی بچے تیری توجہ کے مستحق ہوں گے۔ یہ جنگ جو ایشیائے کوچک میں کہیں بھی لڑی جاسکتی ہے، بڑی فیصلہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ اس میں جس کسی کی بھی ہار ہوگی، وہ مستقل ہار ہوگی اور جس کی جیت ہوگی بہت بڑی جیت ہوگی۔"

خط پڑھ چکنے کے بعد وہ اپنے آدمیوں میں چلا گیا اور انہیں مطلع کردیا کہ وہ وقت آچکا ہے جس کا عرصے سے انتظار تھا۔

کچھ عرصے بعد جب صفی الدین تبریز سے واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ اس وقت زکریا گھڑسواری کی مشق کررہا تھا۔ صفی الدین نے گھر میں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار نہیں کیا بلکہ گھڑدوڑ کے میدان میں پہنچ گیا۔ وہاں زکریا کے علاوہ بھی کچھ لوگ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار گردوغبار اڑاتے پھر رہے تھے۔ صفی الدین کے منہ پر ذرا سی دیر میں دھول کی تہ چڑھنے لگی۔

زکریا نے دور ہی سے صفی الدین کو پہچان لیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے گھوڑے سے اتر کر اس کی لگام ہاتھ میں لے لی اور صفی الدین کی طرف چل پڑا۔ دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے پھر وہ اسی حال میں اپنے گھر واپس آئے۔ صفی الدین بہت خوش تھا۔ اس نے کہا۔" زکریا! میں نے تیرا اور تیری قوم کا ذکر شاہ ایران سے کیا تھا۔ اس نے کہا سلطان سلیم کے ستائے ہوؤں کی مدد کرنا ایران کا فرض ہے۔"

زکریا نے جواب دیا۔" میں نے بھی اپنے آدمیوں کو سمجھا دیا ہے، وہ شاہ ایران پر اپنی جانیں قربان کردیں گے۔"

صفی الدین نے کہا۔" میں نے سلطان کے بھتیجے مراد سے بھی ملاقات کرلی۔ جب اس کو یہ بات معلوم ہوئی کہ سلطان کے ہزاروں معتوب جھیل وان کے کنارے پڑے ہوئے ہیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے اسی وقت یہ قسم کھائی کہ جب تک میں ظالموں سے اپنی قوم کو نجات نہیں دلالوں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔" صفی الدین نے مزید کہا۔" مراد نے تو یہاں تک وعدہ کرلیا ہے کہ وہ برسراقتدار آنے کے بعد سلطان کے معتوبوں میں اپنے عہدہ دار منتخب کرے گا تو گویا اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس میں تو بھی کسی بلند منصب پر فائز ہوجائے گا۔"

زکریا نے کہا۔" خدا آپ کی زبان مبارک کرے، آمین۔"

اب صفی الدین کی پوری کوشش یہ تھی کہ سلیم کے مخالفوں اور معتوبوں کو یکجا ہوجانا چاہیے۔ اس نے زکریا کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے جیسے دوسرے معتوب اور مظلوم ترکوں کو وان جھیل کے کنارے بلالے تاکہ حملہ آور سلطان سلیم پر مجموعی قوت سے حملہ کیا جاسکے۔ یہی بات زکریا نے صفی الدین سے کہی کہ ایسے تمام قبائل جو شاہ ایران کے وفادار اور سلطان سلیم سے بیزار ہیں یکجا ہوجائیں اور پھر سب مل جل کر متحدہ کارروائی کریں۔

وان جھیل کے آس پاس دور دور تک انسانوں کا جنگل اگا ہوا تھا۔ سنان پاشا ان میں خود تو موجود نہیں تھا مگر اس کے زیرنگرانی پوری فوج آچکی تھی۔ صفی الدین نے اس لشکرِ عظیم کو دیکھا تو خوشی سے آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے زکریا سے کہا۔" نوجوان! اب میں دیکھوں گا کہ سلطان اس انسانی جنگل کو عبور کرکے کس طرح ایران میں داخل ہوتا ہے؟"

زکریا نے جواب دیا۔" محترم سردار! میں آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ہمیں کسی حال

میں بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنی طاقت پر ناز کریں۔ دشمن کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، آخر دشمن ہوتا ہے۔''

صفی الدین نے زکریا کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر گلے لگا لیا، بولا۔ ''نوجوان! تیری باتوں میں جوانی کے بجائے بڑھاپے کی بو محسوس ہوتی ہے۔ یہ اتنی کم عمری میں کہن سالی باتیں کرنا کہاں سے سیکھ لیا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''آپ جیسے باشعور، تجربہ کار اور صاحب تدبیر بزرگوں کی صحبت میں اٹھ بیٹھ کر۔''

صفی الدین بہت خوش تھا، بولا۔ ''خوب خوب اگر میں زندہ رہا تو میں تجھے ایک نہ ایک دن کسی بلند منصب پر فائز ضرور دیکھ لوں گا کیونکہ تیری باتوں میں بڑوں کی عظمت پائی جاتی ہے۔''

زکریا نے انکساری سے سر جھکا لیا۔ صفی الدین نے زکریا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا کر انسانوں کے جنگل کا معائنہ کرنے لگا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا، بے حد بشاش۔ اس نے ان لوگوں میں ایک لگن، جوش و خروش، ولولہ، امنگ اور سرمستی سی محسوس کی۔ ان میں سے ہر شخص کوئی نہ کوئی کام کرتا دکھائی دیتا تھا۔

کوئی کھانا پکانے میں مصروف تھا، کوئی ہتھیاروں کو سان چڑھا رہا تھا۔ کوئی گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ بہت کم ایسے تھے جو کام کے بجائے باتوں میں مشغول تھے۔ صفی الدین حاکمانہ شان سے ان کا معائنہ کرتا رہا۔ اس نے فخریہ زکریا سے کہا۔ ''نوجوان! کیا اب بھی کوئی شبہ کر سکتا ہے کہ ہم سلطان کو شکست نہیں دے سکتے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''محترم بزرگ فتح و شکست خدا کا عطیہ ہے۔ ہمیں اپنی طاقت پر ناز نہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔''

صفی الدین نے جز بز ہو کر منہ بنایا۔ ''میں اپنی طاقت پر نازاں کب ہوں نوجوان...... کیا اتنی بڑی فوج کی موجودگی میں میں اپنے رب کی عنایات اور مہربانیوں پر فخریہ اظہار بھی نہ کروں نوجوان جب میں یہ کہتا ہوں کہ اب بھی کوئی شبہ کر سکتا ہے، ہم سلطان کو شکست نہیں دے سکتے تو اس کا صرف یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو اس وقت بھی میرے سامنے انسانی جنگل کی طرح حد نظر تک پھیلے ہوئے ہیں بلکہ اس وقت میرے ذہن میں شاہ اسمٰعیل صفوی کی وہ جنگجو اور تجربہ کار فوج بھی ہوتی ہے جو سلطانی حملے کے وقت میری پشت پر موجود ہوگی۔''

دنیا میں سب سے پہلے

☆ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب سے پہلے پانی کو بنایا۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے ہر نبی نے توحید کی تعلیم دی۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام تھے۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے عربی رسم الخط حضرت اسماعیلؑ نے رائج کیا۔

☆ فرشتوں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ حضرت جبرائیلؑ نے کیا۔

☆ دنیا میں سب سے پہلا قتل حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے کیا۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے توبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرت آدم علیہ السلام کی قبول ہوئی۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے لاش کو دفن کرنے کا طریقہ کوے نے قابیل کو بتایا۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے کھجور کا درخت حضرت شیث علیہ السلام کے فرزند انوش نے لگایا۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے برائیوں کے خلاف جہاد حضرت ادریس علیہ السلام نے شروع کیا۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے ناپ تول کے اوزار حضرت ادریس علیہ السلام نے بنائے۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے اسلحہ سازی حضرت ادریس علیہ السلام نے کی۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے بڑھئی کا پیشہ حضرت ادریس علیہ السلام نے شروع کیا۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے سوئی حضرت ادریس علیہ السلام نے بنائی۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے کشتی حضرت نوح علیہ السلام نے بنائی۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے سرمہ لگانے کی شروعات حضرت نوح علیہ السلام نے کی۔

☆ دنیا میں سب سے پہلے نماز کی ابتدا حضرت نوح علیہ السلام نے کی۔

انتخاب۔ رانا حبیب الرحمٰن، سینٹرل جیل، لاہور

زکریا نے پوچھا۔ ''محترم سردار! میں اور میری قوم تو سلطان کے ستائے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف انتقامی جذبات رکھتے ہیں مگر آپ اور آپ جیسے ستر بہتر ہزار لوگ تو سلطان کی رعایا ہیں اور ان پر بظاہر سلطان نے کوئی ظلم بھی نہیں کیا پھر آپ لوگ ہمارا اور شاہ ایران کا ساتھ کیوں دیں گے؟''

صفی الدین نے جواب دیا۔ ''نوجوان! یہ کیا سوال ہورہا ہے' بات مفادات کی ہے۔ ہمارا فائدہ اس میں ہے کہ شاہ ایران کی حمایت اور سلطان کی مخالفت کریں۔ اپنے علاقائی محلِ وقوع سے ہم لوگ ایران سے زیادہ قریب ہیں اس لیے ہم ساتھ بھی شاہ ایران کا ہی دیں گے۔''

زکریا اور صفی الدین بڑی دیر تک انسانی جنگل کا مشاہدہ کرتے رہے۔ اس ہجوم سے صفی الدین کو یہ خبر بھی مل گئی کہ سلطان نے اپنا مستقر چھوڑ دیا ہے اور ایران کی طرف بڑھ رہا ہے۔ صفی الدین نے اسی دن بعجلت اپنے قاصد ان لوگوں کے پاس روانہ کردیے جنہیں صفی الدین کے ساتھ سلطان کی فوجوں سے برسرپیکار ہونا تھا اور جن کی شمولیت کے بعد ان کی اپنی کل تعداد بہتر ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ صفی الدین کے خیال میں اب اتحادیوں کو یک جا ہوکر متحدہ فوجی کارروائیاں کرنا ہوں گی۔

کئی دن بعد سنان پاشا بھی پہنچ گیا۔ زکریا نے سنان پاشا کا صفی الدین سے تعارف کروایا اور اسے بتایا کہ ترکی کے آوارہ وطن اور منتشر قبائل کا سب سے بڑا قائد یہی ہے۔ صفی الدین نے سنان پاشا سے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔ ان دونوں کے درمیان بڑی دیر تک سلطان کے خلاف لشکر کشی کا لائحہ عمل طے پاتا رہا۔ اس میں زکریا کو معمولی نائب بلکہ کارکن جیسی حیثیت حاصل رہی۔ صفی الدین نے سنان پاشا کو بتایا کہ زکریا نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے آدمیوں کے دلوں کو کس طرح اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔

سنان پاشا نے صفی الدین کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اتحادیوں کے لشکر کی کمان کسی ایک ہی کمانڈر کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ صفی الدین، سنان پاشا اور اس کے آدمیوں کی لیاقت اور حربی صلاحیتوں کا دل سے قائل ہوچکا تھا۔ چنانچہ کسی لمبی چوڑی بحث کے بغیر ہی ان میں یہ بات طے پا گئی کہ پورے لشکر کی کمان سنان پاشا کے ہاتھ میں رہے گی مگر میمنہ ویسار اور قلب پر دوسرے کمانڈر بھی متعین کردیے جائیں گے اور یہ کمانڈر دونوں ہی طرف سے لیے جائیں گے۔

وان جھیل کے مغرب اور شمال اور جنوب میں میلوں تک اتحادی لشکر خیمہ زن ہوگیا۔ جھیل کے جنوبی سرے پر صفی الدین اور اس کے عزیزوں رشتے داروں کے مکانات تھے۔ سنان پاشا کو صفی الدین کی میزبانی کا شرف قبول کرنا پڑا۔ سنان پاشا زکریا کے کمرے میں مقیم ہوگیا۔ ابھی تک وہ زکریا سے بطورِ خاص مخاطب نہیں ہوا تھا لیکن اب وقت نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے زکریا سے پوچھا۔ ''صاحبزادے! اب یہ بتاؤ کہ تم نے کیا کام کیا؟ کیا ہمیں اپنے منصوبے پر آسانی سے عمل درآمد کرنے کا وقت مل جائے گا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''میں ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ اب اس کے بعد ہمارا کام بہت آسان ہوجاتا ہے۔''

سنان پاشا نے پوچھا۔ ''اور وہ لڑکی ناہید کہاں ہے، میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

زکریا گھبرا گیا، بولا۔ ''سنان پاشا آپ اسے دیکھ لیں اور اپنی رائے سے ضرور نواز دیجیے گا۔ ویسے میں نے انتہائی جبر اور شدید قوتِ ارادی سے کام لے کر اس لڑکی کو اپنے نہاں خانۂ دل سے باہر نکال دیا ہے۔''

سنان پاشا نے اس کو نرمی سے سمجھایا۔ ''صاحبزادے! کسی عجلت یا گھبراہٹ کی ضرورت نہیں ہے لیکن میں اس لڑکی کو ایک نظر دیکھنا ضرور چاہتا ہوں کیونکہ دربارِ عالی سے مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس لڑکی پر کڑی نظر رکھوں۔''

صفی الدین نے سنان پاشا کے اعزاز میں ایک دعوت کردی' اس پرتکلف دعوت میں زکریا کو بھی مدعو کرلیا گیا اور صفی الدین کی طرف سے اس کے پورے خاندان نے شرکت کی۔ یہیں سنان پاشا نے ناہید کو بھی دیکھ لیا اور اسے دل ہی دل میں زکریا کے پسند کی داد دینی پڑی۔ چالاک صفی الدین بھی زکریا اور سنان پاشا کے اشاروں کنایوں کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ناہید نے ان دونوں کا بطور خاص خیال رکھا اور گرم جوشی میں پیش پیش رہی۔ سنان پاشا نے ایک موقع پر ناہید کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔ ''لڑکی! میں تیری پیشانی پر شاندار مستقبل کی روشنی دیکھ رہا ہوں۔ کیا میں تیرا نام معلوم کرسکتا ہوں؟''

ناہید نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، بولی۔ ''سردار! میں میزبان صفی الدین کی بیٹی ناہید ہوں۔ آپ کو اس طرح میرا ہاتھ پکڑ لینا کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ میرا ہاتھ چھوڑ دیجیے۔''

سنان پاشا نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا، بولا۔ ''تو میرے میزبان صفی الدین کی بیٹی ہی نہیں میری بھتیجی بھی ہے، میں تیری عزت کرتا ہوں۔''

ناہید شرما گئی مگر سنان پاشا کا شکریہ ادا کیے بغیر نہ رہ

سکی۔ وہ زکریا کے پاس چلی گئی اور اس کو مخاطب کیے بغیر آہستہ سے کہا۔

''تیرے پاشا نے بھری محفل میں میرا ہاتھ پکڑلیا۔ جب میں نے اس کو ٹوک دیا اور ایسا کرنے سے منع کردیا تو اس نے مجھے اپنی بیٹی بنالیا۔ یہ پاشا بھی عجیب آدمی ہے۔''

زکریا کو رقابت محسوس ہوئی مگر وہ برملا سنان پاشا کی مذمت بھی نہیں کرسکتا تھا، بولا۔ ''ناہید! وہ ہماری متحدہ فوج کا سپہ سالار ہے اور میرے اپنے قبائل کا سردار اعلیٰ بھی۔ وہ ایک پاک باطن شخص ہے، اس پر کسی قسم کا شبہ نہ کر۔''

صفی الدین دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا مگر ان کی باتیں نہیں سن سکا تھا۔ وہ ان کے سامنے سے ہٹ کر اندر چلا گیا اور ناہید کو وہیں بلوالیا۔ اس نے ناہید سے پوچھا۔ ''بات کیا تھی ناہید...... کیا تیرے ساتھ کسی قسم کی زیادتی ہوگئی ہے؟''

ناہید نے پوری بات بتادی، بولی۔ ''پاشا کہتا ہے کہ اسے میری پیشانی پر شاندار مستقبل کی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔''

صفی الدین ہنسنے لگا، بولا۔ ''تو میری بیٹی ہے شاندار مستقبل کی روشنی تو میں خود بھی دیکھتا رہتا ہوں۔ اس میں حیرت یا انکشاف کی کیا بات ہے؟'' پھر پوچھا۔ ''اور وہ زکریا، تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟''

ناہید نے کہا۔ ''وہ میری برہمی دور کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ پاشا ہماری متحدہ افواج کا سپہ سالار ہے اور وہ ایک پاک باطن شخص ہے، اس پر کسی قسم کا شبہ زیب نہیں دیتا۔''

صفی الدین مسکرانے لگا۔ کسی اندرونی خوشی کے احساس نے اس کے انگ انگ کو خوشی بخش دی تھی، بولا۔ ''یہ نوجوان بھی خوب ہے، میں اس سے بہت متاثر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تجھ کو پسند کرتا ہے اور شاید پسند سے بھی آگے بڑھ گیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کے ضبط اور احتیاط کی داد دینا پڑتی ہے، اس کا مستقبل روشن ہے۔ بالکل تیری پیشانی پر موجود شاندار مستقبل کی طرح۔''

ناہید شرما گئی، باپ نے پوچھا۔ ''نوجوان زکریا کی بابت تیری کیا رائے ہے؟''

ناہید جواب دینے کے بجائے سامنے سے ہٹ گئی۔

ضیافت کے بعد صفی الدین اپنے معزز مہمان سنان پاشا کو ایک ہال میں لے گیا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''پاشا! آپ نے میری بیٹی ناہید کو اس کے روشن اور شاندار مستقبل کی بابت جو کچھ بتایا ہے، میں اس سے بہت خوش ہوا اور آپ کا شکریہ ادا کررہا ہوں۔''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''بزرگ سردار! میں نے آپ کی بیٹی کو جو کچھ بتایا ہے، وہ کوئی حیرت انگیز نہیں ہے۔''

صفی الدین نے کہا۔ ''نوجوان زکریا اور ناہید دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس مبارک موقع پر اگر میں یہ مبارک کام بھی کرگزروں تو کیسا ہے؟''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''یہ زکریا کا اپنا معاملہ ہے، میں کیا رائے دے سکتا ہوں لیکن میری ذاتی رائے کے مطابق یہ باتیں قبل از وقت ہیں اور ابھی انہیں طاقِ نسیاں میں سجا دینا چاہیے۔''

صفی الدین کا خیال تھا کہ سنان پاشا اس بات کو یوں ہی ختم نہیں کردے گا بلکہ اس کو اور بڑھائے گا لیکن اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا بلکہ ناہید کے معاملے میں حوصلہ شکنی سے کام لیا۔

سنان پاشا نے باہر نکل کر زکریا کو تلاش کیا اور ایک طرف لے جاکر سرگوشی میں کہا۔ ''زکریا! ابھی ابھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ ناہید کا باپ تجھے اپنی فرزندی میں قبول کرنے کو تیار ہے اور یہ کہ ناہید اور تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہو، کیا یہ درست ہے؟''

زکریا پریشان ہوگیا، پوچھا۔ ''یہ آپ سے کس نے کہا؟''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''ناہید کے باپ صفی الدین نے۔''

زکریا نے کہا۔ ''لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہیں، میں نے اس سے تو ایسی کوئی بات آج تک نہیں کی۔''

سنان پاشا نے بے مروتی سے کہا۔ ''میری اپنی رائے محفوظ ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ تم یہاں شادی کرنے نہیں آئے ہو اور یہ کہ شادی کرلینے سے تمہاری شناخت جاتی رہے گی اور سلطان کے معتوب کہلاؤ گے۔''

زکریا کھسیایا ہوا تھا، بولا۔ ''پاشا! میں جانتا ہوں کہ میں یہاں شادی کرنے نہیں آیا۔ آپ مطمئن رہیں۔''

ابھی یہ باتیں جاری ہی تھیں کہ وہیں صفی الدین بھی پہنچ گیا۔ سنان پاشا اس کو دیکھتے ہی چلا گیا۔ صفی الدین نے ازرلو اخلاق سنان پاشا سے پوچھا۔ ''پاشا! کہاں چل دیے؟''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''میں پھر حاضری دوں گا۔ ابھی کئی ضروری کام انجام دینے جارہا ہوں۔ بعد میں ملاقات تو ہوتی ہی رہے گی۔ میں تو جناب چل دیا۔''

صفی الدین اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ سیدھا زکریا کے پاس پہنچا اور نہایت شفقت سے کہا۔ ''تیرے پاشا نے

میری ناہید کی پیشانی پر شاندار مستقبل کی روشنی دیکھ لی ہے، اس سلسلے میں میں تجھ سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔"

زکریا نے کہا۔ "بہتر ہے مانگیے اگر میرے پاس وہ چیز ہوئی تو میں انکار نہیں کروں گا۔"

صفی الدین نے پوچھا۔ "کیا ناہید اور تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو؟"

زکریا کے جی میں آئی کہ صفی الدین سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ ناہید کو ذرا بھی پسند نہیں کرتا کیونکہ یہاں کے اقرار یا انکار کی خبر سنان پاشا کو ضرور ہوجائے گی۔ اگر یہ خبر اقرار کی شکل میں ہوگی تو اس کے ناخوشگوار اثرات سلطان تک پہنچ جائیں گے اور اگر وہ انکار کردے گا تو اس کے مضر اور اذیت ناک اثرات صفی الدین اور ناہید پر مرتب ہوں گے اور وہ ان دونوں کی نظروں سے گر جائے گا۔

صفی الدین نے کہا۔ "نوجوان! تو کیا سوچنے لگا؟ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا؟"

زکریا نے آہستہ سے کہا۔ "محترم سردار! میں ناہید کو پسند کرتا ہوں مگر یہ نہیں جانتا کہ ناہید بھی مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں۔ سوال کے اس حصے کا ناہید ہی جواب دے سکتی ہے۔"

صفی الدین نے جواب دیا۔ "میں ناہید کا باپ ہوں اور جانتا ہوں کہ اس سوال کا وہ کیا جواب دے گی۔"

کچھ دیر کے لیے ماحول پر سکوت طاری ہوگیا۔ شاید وہ زکریا سے کچھ سننا چاہتا تھا مگر جب زکریا نے زبان نہ کھولی تو صفی الدین خود ہی بولا۔ "نوجوان! سننے میں آیا ہے کہ سلطان نے اپنے لشکر کے ساتھ اپنا مستقر چھوڑ دیا ہے اور ہماری طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ عنقریب جب ہم دونوں ایک دوسرے سے متصادم ہوں گے تو پتا نہیں ہم میں سے کون زندہ بچے گا اور کون مارا جائے گا۔ میں ایک دور اندیش انسان ہوں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ناہید کا فیصلہ اسی وقت کردوں۔"

زکریا نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

صفی الدین نے جواب دیا۔ "میں ناہید کو تیرے حوالے کردینا چاہتا ہوں۔"

زکریا نے صاف انکار کردیا۔ "لیکن محترم سردار! ابھی میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں ناہید سے محبت کرتا ہوں لیکن ابھی اس سے شادی نہیں کرسکتا۔"

صفی الدین نے زکریا کے انکار میں اپنی اہانت محسوس کی۔ چیں بہ جبیں ہوکر مخاطب ہوا۔ "نوجوان! کیا تو جانتا ہے کہ اس وقت تو کس سے مخاطب ہے؟ کیا تو مجھ سے انکار کرسکتا ہے...... اگر تو ناہید کو پسند کرتا ہے تو شادی سے انکار کا کیا مطلب ہے؟"

زکریا نے جواب دیا۔ "سردار! میں نے شادی سے انکار نہیں کیا لیکن فوری اور ہنگامی شادی سے انکار ضرور کردیا ہے۔ جب تک سلطان سے صف آرائی کا کوئی خوشگوار نتیجہ برآمد نہ ہو، میں شادی کی ہامی نہیں بھر سکتا۔"

صفی الدین نے غصے میں حکم دیا۔ "تب پھر تو یہاں سے دفع ہوجا۔ میری نظروں سے دور ہوجا۔"

زکریا کے جی میں آیا کہ صفی الدین کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لے لیکن ایسا نہیں کرسکا۔ چپ چاپ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا اور صفی الدین اس کے جاتے ہی ابل پڑا۔ "میں نے اپنی بیٹی کا رشتہ خود ہی طے کر کے رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کیا تھا۔ اس نوجوان کو میری بے عزتی نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

باہر زکریا نے ناہید کو اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی اسی ہال میں نمودار ہوئی تھی جہاں سے وہ خود نکلا تھا۔ ناہید نے اس کا راستہ روک لیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت کرب سے پوچھا۔ "اندر کیا باتیں ہوئیں؟"

زکریا نے جواب دیا۔ "یہ سوال تو اپنے باپ سے کرسکتی ہے اس کا وہی جواب دے سکتا ہے۔"

ناہید نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "اس کا جواب میں تجھ سے لوں گی۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "ناہید! میں اس وقت، ابھی فوری طور پر شادی نہیں کرسکتا، مجھ کو وقت درکار ہے۔"

ناہید نے پوچھا۔ "کتنا وقت؟"

زِکریا نے جواب دیا۔ "سردست اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"

ناہید نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور ایک طرف جاتے ہوئے بولی۔ "اب میں تجھ سے نہ ملوں گی اور نہ ہی تجھے اپنی صورت دکھاؤں گی۔"

زکریا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بگڑے ہوئے حالات میں انہیں سنبھالنا بہت مشکل بلکہ ناممکن نظر آرہا تھا۔

☆☆☆

ایک فرضی قاصد نے سنان پاشا کے پاس سلطان کا یہ پیغام پہنچایا کہ ترکی اور ایران کی سرحدوں پر جو کچھ ہورہا ہے، سلطان کو اس کی خبریں برابر پہنچ رہی ہیں۔ اس لیے سلطان یہ ضروری تصور کرتا ہے کہ ان غداروں اور باغیوں کو فوراً ہی سلطانی افواج کے حوالے کردیا جائے ورنہ اس کے

بہت برے نتائج نکلیں گے۔

سنان پاشا نے سلطان کا یہ خط خود بھی پڑھا اور دوسروں کو بھی پڑھوا دیا۔ ان میں صفی الدین بھی شامل تھا، اس نے پوچھا۔ ''اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ جواب ہے میدانِ جنگ میں سلطان کا استقبال کرنا۔ میں سلطان سے جنگ کے لیے تیار ہوں۔''

صفی الدین نے سنان پاشا کی پشت تھپتھپائی، بولا۔ ''میں تجھ سے یہی امید کرتا تھا۔ شکر ہے خدا نے میری لاج رکھ لی۔''

ان میں کئی دن تک اس مسئلے پر گرما گرم بحث ہوتی رہی کہ اتحادیوں کو آخر کس طرح ایک جھنڈے تلے کھڑا کر دیا جائے۔ آخر طے یہ پایا کہ آنے والے جمعے کو نماز کے بعد سب ایک جگہ اکٹھا ہو جائیں اور وہیں اس مسئلے پر غور کر کے خدا سے مدد کی درخواست کی جائے۔

جمعے سے پہلے زکریا نے صفی الدین کو راستے میں روک لیا اور معذرت کرنے لگا لیکن صفی الدین نے یہ کہہ کر جھڑک دیا۔ ''نوجوان! اب میں تجھ سے جنگ کے بعد بات کروں گا۔''

زکریا نے ازراہِ طنز کہا۔ ''محترم سردار! کیا آپ میں اتنی ہمت ہے کہ سلطان کے ینی چری لشکر کا مقابلہ کر لیں؟''

صفی الدین نے جواب دیا۔ ''نوجوان! شاید تیرا دماغی توازن درست نہیں رہا۔ سلطان اور اس کے ینی چری ہمارے ایک لاکھ دس ہزار جنگجو لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

زکریا نے کہا۔ ''میں آپ کی باتوں پر کس طرح یقین کر لوں۔ بہرحال دورانِ جنگ سلطان کے ینی چری آپ کے اور آپ کی قوم کے حق میں بلائے جان بلکہ ملک الموت ثابت ہو سکتے ہیں۔''

صفی الدین نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں تجھ سے زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ میرے سوالوں اور جوابوں کی حقیقت میدانِ جنگ میں واضح ہو جائے گی۔''

سنان پاشا نے اپنے خاص خاص آدمیوں کو ایک مختصر سا پیغام بھیج دیا۔

''نمازِ جمعہ کے فوراً بعد نہتوں کو ہتھیار اٹھانے کا موقع نہ دو اور سلطانی غداروں کو جو جہاں ہو، وہیں ہلاک کر دو۔ ٹھیک نمازِ جمعہ کے بعد۔''

لیکن سنان پاشا نے زکریا کو بطورِ خاص زبانی سمجھایا۔ ''زکریا! کیا تو ناہید سے محبت کرتا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایک بار نہیں ہزار بار نہیں۔''

لیکن جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا، نبضیں ڈوبی جا رہی تھیں۔

سنان پاشا نے بشاش لہجے میں کہا۔ ''اگر تو جھوٹ نہیں بول رہا تو یہ نئی ذمے داری قبول کر۔ صفی الدین پر تجھے تعینات کیا گیا ہے، یاد رکھ صفی الدین پر۔''

زکریا کے دل پر ایک بار پھر چوٹ سی لگی۔ جھنجلاہٹ میں جواب دیا گیا۔ ''اگر آپ اسی میں خوش ہیں تو میں آپ کی خوشی ضرور پوری کروں گا۔''

سنان پاشا نے کہا۔ ''اس میں میری یا تیری خوشی کی کیا بات ہے۔ اس سارے مجموعی عمل سے سلطان خوش ہو گا اور اسی میں ہماری خوشی پنہاں ہے۔ زکریا میں تیری جذباتیت کی وجہ سے آگاہ ہوں لیکن تو یہ کیوں بھولا جا رہا ہے کہ ینی چری خاندان نہیں رکھتے، ان کا کوئی کنبہ نہیں ہوتا۔ ان کا کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں ہوتا۔''

زکریا نے سنان پاشا کی باتیں اس طرح سنیں گویا یہ آواز کہیں دور سے آ رہی تھی یا پھر وہ گہری نیند میں تھا اور اس کے پاس کوئی بیٹھا بول رہا تھا۔

سنان پاشا کے ہزاروں آدمیوں نے حیرت انگیز طور پر صفی الدین کے ہزاروں آدمیوں سے خود کو الگ کر لیا تھا۔ صفی الدین کے آدمی غیر مسلح تھے اور سنان پاشا کے لوگ مسلح ہتھیار بند۔ وہ جب نماز سے فارغ ہو کر اپنی اپنی صفوں سے الگ ہوئے تو انہوں نے وہاں ایک عجیب ناقابلِ فہم اور بھیانک عمل جاری دیکھا۔ ہزاروں مسلح لوگ غیر مسلح لوگوں کو ہلاک کرنے میں مشغول تھے۔ صفی الدین کے آدمیوں کی بھاگنے کی راہیں مسدود کر دی گئی تھیں۔

چند گھنٹوں میں سبھی کا صفایا کر دیا گیا۔ زکریا نے کچھ دیر صفی الدین کو تلاش کیا۔ چالاک بوڑھا نکل بھاگنے میں بس اس حد تک کامیاب ہوا تھا کہ وان جھیل کے کنارے کنارے پیدل سفر کرنے میں مشغول تھا اور یہ سنان پاشا کے ہتھیار بند آدمیوں کی پشت پر تھا۔ زکریا نے معلوم نہیں کس طرح صفی الدین کو تلاش کر لیا اور وہ دوڑ کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ زکریا نے برہنہ شمشیر ہوا میں لہرائی۔ دھوپ میں آئینے جیسی چمک سے نظروں میں چکاچوند پیدا ہو گئی۔ زکریا نے چیخ کر کہا۔ ''او سلطان کے غدار ٹھہر جا۔ ورنہ میں تجھے تیر سے ہلاک کر دوں گا۔''

صفی الدین زکریا کی آواز سن کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دوڑ کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ صفی الدین نے اپنے دونوں ہاتھ

دفاع کے لیے اوپر اٹھائے اور زکریا سے پوچھا۔ ”نوجوان! یہ کیا ہوگیا؟ یہ کون لوگ ہیں جو ہمیں دھوکے سے ہلاک کررہے ہیں؟“

زکریا نے جواب دیا۔ ”سلطان کے وفادار ینی چری سلطان کی غدار رعایا کو ہلاک کررہے ہیں کیونکہ انہیں سلطان کا یہی حکم ملا تھا۔“

صفی الدین کی آنکھیں فرطِ خوف سے ابل پڑیں، بے اختیار بولا۔ ”گویا تو خود بھی ینی چری......“

زکریا نے صفی الدین کی گردن پر ایک بھرپور وار کیا۔ ”ہاں میں بھی سلطان کی ینی چری فوج سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا کوئی کنبہ نہیں، میرا کوئی خاندان نہیں۔“

زکریا کی تلوار صفی الدین کی گدی میں اتر گئی۔ وہ چیخ مار کر ڈھیر ہوگیا۔ زکریا اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ گو کہ اس کا کوئی کنبہ نہیں تھا نہ خاندان لیکن صفی الدین کی گدی کا زخم وہ براہِ راست اپنے دل و دماغ پر محسوس کررہا تھا۔ اس نے صفی الدین کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ ”محترم سردار! اے کاش آپ غدار نہ ہوتے۔ اے کاش آپ کی قوم کے لوگوں نے ایران سے ساز باز نہ کی ہوتی۔“

صفی الدین کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ زکریا پریشان تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب صفی الدین کی ہلاکت کے بعد اس کے خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟

اس نے اپنے پیچھے آہٹ محسوس کی۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو سنان پاشا کو چند ینی چری جوانوں کے ساتھ اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ سنان پاشا صفی الدین کی لاش دیکھ کر خوش ہوا۔ بولا۔ ”زکریا! تو اپنے منصوبے میں کامیاب ہوا۔ اب میرے ساتھ چل اور میں جو حکم دوں اس پر عمل کر۔“

زکریا کا ذہن صاف نہیں تھا، پوچھا۔ ”لیکن پاشا! اس سردار کی موت کے بعد اس کے خاندان کا کیا حشر ہوگا؟“

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ”یہ سوچنا تیرا کام نہیں ہے۔ کیا تجھ کو یاد نہیں سلطان نے ہم دونوں کی بابت کیا کہا تھا۔ سنان پاشا کی مکمل تابعداری اس کے سوا کچھ نہیں۔ میں سلطان کی بات تجھے یاد دلا رہا ہوں۔“

زکریا نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”مجھے سلطان معظم کی بات یاد ہے۔ میں آپ کا تابعدار ہوں، حکم دیجیے تاکہ میں اس کی تعمیل کروں۔“

سنان پاشا اس کو اپنے خیمے میں لے گیا۔ وہاں ایک خط پہلے ہی سے لکھ کر تیار رکھا گیا تھا۔ اس میں سنان پاشا نے اپنے کارنامے کی نہایت مختصر روداد لکھی تھی۔

”سلطان معظم کے وفادار ینی چری، سلطان کے ہزاروں غداروں کو ذرا سا زخم کھائے بغیر ہی صفایا کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اب سلطان کی مشرقی سرحدیں غداروں سے پاک کردی گئی ہیں۔“

یہ مختصری تحریر زکریا کو دے کر سنان پاشا نے بطورِ خاص ہدایت کی۔ ”یہ اہم خوش خبری تو کسی طوفان جیسی تیز رفتاری سے قسطنطنیہ لے جائے گا۔ یہی خوش خبری چند دوسرے ینی چری بھی لیے جارہے ہیں لیکن سلطان کی نظروں میں بس ایک ہی شخص عزت اور مقام حاصل کرسکے گا۔ وہ شخص جو یہ خوش خبری دوسروں سے پہلے سلطان تک پہنچادے گا۔“

زکریا نے اسی وقت اچھل کر گھوڑے کی پشت سنبھالی اور کسی زادِ راہ کے بغیر ہی سلطان کی خدمت میں روانہ ہوگیا۔

صفی الدین اس کا خاندان، ناہید اور صفی الدین کی قوم کے وہ لوگ جن کے ساتھ وہ کچھ عرصہ گزر بسر کرچکا تھا کبھی خواب و خیال کی طرح یاد آرہے تھے۔ ان کی محبتیں زکریا کے دل میں نشوونما پارہی تھیں اور وہ ان کی جدائی کا غم اپنے دل میں محسوس کررہا تھا لیکن ان سب پر سلطان، استاد ارسلان اور سنان پاشا کی یہ باتیں غالب آرہی تھیں۔

سلطانی حکم ...... سنان پاشا کی مکمل تابعداری اس کے سوا کچھ نہیں۔

استاد ارسلان کی نصیحت ...... ینی چری کوئی کنبہ نہیں رکھتے' ان کا کوئی خاندان نہیں ہوتا۔

سنان پاشا کی ہدایت ...... یہ خوش خبری چند دوسرے ینی چری بھی لیے جارہے ہیں لیکن سلطان کی نظروں میں بس ایک ہی شخص عزت اور مقام حاصل کرسکے گا، وہ شخص جو یہ خوش خبری دوسروں سے پہلے سلطان تک پہنچادے گا۔

ان باتوں نے مہمیز کا کام کیا اور زکریا طوفان جیسی تیز رفتاری سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

جاری ہے

کہانی کے تاریخی ماخذ

بھولا بھالا

کاشف زبیر

قدرت نے انسان کی سادہ فطرت میں جتنا ٹیڑھا پن مخفی رکھا ہے اتنا کسی ٹیڑھے انسان میں بھی شاید ممکن نہ ہو کیونکہ... سادہ انسان اصولوں کا پابند ہوتا ہے اور پابندی پر کاربند رہنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی لہٰذا... ثابت ہوا کہ سادہ انسان بہت مشکل فطرت کا مالک ہوتا ہے اور وہ بھی اتنا آسان ہرگز نہیں تھا جتنا کہ دکھائی دیتا تھا۔

صراط مستقیم کے پیچ وخم اور مشکلات کا سبق آموز قصہ

میرا نام ناصر ہے مگر گھر والے بھولا کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے سب اس لیے بھولا کہتے ہیں کہ میں شکل سے سادہ اور معصوم نظر آتا ہوں۔ میں نے انٹر تک پڑھا ہے اور ہر کلاس میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہوں۔ پھر میں رحیم کریم بھائی کے پاس کام کرنے لگا۔ رحیم کریم بھائی کے لیدر کی مصنوعات کے شوروم ہیں۔ شہر میں ان کے شوروم کی چار برانچیں ہیں۔ جہاں لیدر سے بنی اشیا فروخت کی جاتی ہیں۔ جیسے جوتے، چپل، لیڈیز بیگ، ہینڈ بیگز، پرس،

بیلٹ اور اسی طرح کی بے شمار آرائشی اشیا جو لیدر یا اس کے ساتھ کچھ آرائشی چیزوں سے مل کر تیار ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اور مرکزی شوروم طارق روڈ والا ہے۔ رحیم کریم بھائی دوسرے اسٹوروں کا چکر بھی لگاتے رہتے ہیں لیکن ان کی اصل بیٹھک طارق روڈ والے اسٹور میں ہوتی ہے۔

ساٹھ سال کی عمر میں سر کے سفید بال، سرخ وسفید رنگت، جھریوں سے پاک پرکشش چہرہ، درمیانی جسامت اور ہمیشہ سفید رنگ کے کرتے پاجامے میں ان کی شخصیت بہت اچھی لگتی تھی۔ میرے اباجی ان کی فیکٹری میں... سپروائزر تھے جہاں لیدر کا سامان تیار ہوتا تھا۔ اباجی ویسے تو ان کے بارے میں زیادہ اچھے خیالات نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ جب رحیم کریم بھائی کے بارے میں بات کرتے تو ان کی باتوں میں کڑواہٹ اور الفاظ میں غیر شائستگی نمایاں ہوتی تھی۔ مگر ایک دن وہ فیکٹری سے آئے تو بہت خوش تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''بھولے تیار ہوجا...... کل تجھے سیٹھ رحیم سے ملواؤں گا۔ تیری نوکری لگ جائے گی۔ ذرا اچھی طرح تیار ہونا اور کوئی بے وقوفی کی بات مت کرنا۔''

''جی اباجی۔'' میں نے دبے لفظوں میں کہا۔ مجھے ان کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کیونکہ میں بے وقوفی کی بات کرتا ہی نہیں تھا۔ مجھے انٹر کیے ہوئے دو سال ہو گئے تھے اور اباجی نے کوشش کی کہ میری کہیں نوکری لگ جائے اور ایک دو جگہ میں نے کچھ عرصے کے لیے کام بھی کیا مگر وہاں ٹک نہ سکا تھا۔ ہمارے گھر میں زیادہ تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ میرے دو بڑے بھائی ملازمت کر رہے تھے، دونوں اباجی کے ساتھ لیدر فیکٹری میں تھے اور مجھ سے چھوٹا ایمپریس مارکیٹ میں ٹھیلا لگاتا تھا۔ اباجی اسے فیکٹری سے سستا مال دلوادیتے تھے اور وہ ٹھیلے پر رکھ کر فروخت کرتا تھا۔

تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ وہی کماتا تھا مگر بہت ہوشیاری سے ظاہر کرتا کہ اس کی آمدنی زیادہ نہیں ہے۔ گھر میں کم دیتا اور باہر زیادہ اڑاتا تھا۔ ایک طرح سے اس کا روزگار بھی رحیم کریم بھائی کے توسط سے چل رہا تھا۔ گویا ہمارا پورا گھر ہی ان کی وجہ سے کما رہا تھا اور اب میری بھی نوکری رحیم کریم بھائی کے پاس لگنے والی تھی۔ میں گھر کا واحد فرد تھا جو بائیس سال کی عمر میں بھی بے روزگار تھا۔ اگلے دن میں صبح سویرے اٹھ گیا۔ اچھی طرح نہایا دھویا اور اپنا سب سے اچھا لباس پہن لیا مگر جب اباجی نے دیکھا تو بولے۔ ''ابے کیا شادی میں جارہا ہے۔''

''اباجی آپ نے ہی تو کہا تھا اچھی طرح تیار ہونا۔'' صحن میں ناشتا کرتے ہوئے میرے بھائی ہنس پڑے اور اباجی نے اماں سے کہا۔ ''آخر میں یہی ایک پیس پیدا کرنا تھا۔''

''ارے تو کیا خرابی ہے میرے بچے میں۔'' اماں نے ہمیشہ کی طرح میری حمایت کی۔ ''سیدھا ہے پاگل تو نہیں ہے۔ تم بھی پوری بات کیا کرونا؟''

''اسے بتایا تو تھا کہ سیٹھ رحیم سے ملوانا ہے۔'' اباجی نے غصے سے کہا۔ ''مگر اس کی عقل ٹھکانے ہو تو...... اب دیکھو یہ ریشمی کرتہ پہن کر ملازمت کے انٹرویو کے لیے جائے گا۔''

اماں نے بحث کرنے کے بجائے یہ کام کیا کہ مجھے اندر لائیں اور ایک پینٹ شرٹ نکال کر دی۔ ''یہ پہن اور اپنے اباجی کے ساتھ جا۔''

میری بچپن سے عادت تھی کہ اماں اور ابا کا کہنا بلا بےچون چرا...... مانتا تھا۔ جبکہ میرے بھائی اس کے الٹ کرتے تھے۔ اس کے باوجود اباجی کے نزدیک وہ ہوشیار تھے اور میں بھولا تھا۔ میں تیار ہوکر آیا تو اباجی ناشتا کر چکے تھے۔ اماں ٹفن میں ان کا دوپہر کا کھانا رکھ رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے ناشتا کیا اور اباجی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وہ مجھے فیکٹری لے گئے۔ رحیم کریم بھائی سے وہیں ملاقات ہونا تھی۔ جب میں نے پہلی بار رحیم کریم بھائی کا نام سنا تو مجھے ذرا عجیب سا لگا۔ عام طور سے اس قسم کے نام سننے میں نہیں آتے ہیں۔ مگر جب میں نے انہیں دیکھا تو یہ نام ان پر بالکل فٹ لگا اور اس کے بعد مجھے کبھی ان کا نام عجیب نہیں لگا۔ فیکٹری میں آکر اباجی نے مجھے رحیم کریم بھائی کے آفس بھیج دیا جہاں میں ویٹنگ روم میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ اباجی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سیٹھ کے آنے کا کوئی ٹائم نہیں ہے۔ میں انتظار کرتا رہوں۔ وہ جب آئے گا مجھے بلالے گا۔

بعد میں مجھے پتا چلا کہ رحیم کریم بھائی عام طور سے صبح سویرے آتے ہیں اور پھر یہاں سے طارق روڈ والے شوروم چلے جاتے ہیں جو گیارہ بجے کھل جاتا ہے۔ مگر اس روز وہ لنچ کے بعد آئے اور اندر آنے کے آدھے گھنٹے بعد انہوں نے مجھے بلالیا۔ میں کسی قدر خوفزدہ تھا۔ میں سوچ رہا

تھا کہ اباجی ان کے بارے میں جس طرح سے بات کرتے تھے تو وہ سخت مزاج شخص ہوں گے مگر رحیم کریم بھائی کا پہلا تاثر ہی بہت نرم اور مشفقانہ تھا۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''بیٹھو......تم یاسر کے بیٹے ہو؟''

''جی۔'' میں ان کے سامنے کرسی پر ٹک گیا۔

''کہاں تک پڑھا ہے؟''

''انٹر کیا ہے؟''

''اس کے بعد کیوں نہیں پڑھا؟''

''ہمارے ہاں تعلیم کا رواج نہیں ہے۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا۔ ''میرے بھائی بھی میٹرک، انٹر ہیں۔''

رحیم کریم بھائی نے سر ہلایا۔ ''اس سے پہلے کہیں جاب کی ہے؟''

''جی مگر زیادہ عرصے نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ملازمت چھوڑ دی تھی؟''

''نہیں جی انہوں نے نکال دیا۔'' میں نے صفائی سے اعتراف کیا۔ ''مالک کا کہنا تھا میں اس کام کا اہل نہیں ہوں۔''

رحیم کریم بھائی نے چونک کر مجھے دیکھا اور دلچسپی سے پوچھا۔ ''کام کیا تھا؟''

''گارمنٹ فیکٹری میں کوالٹی کنٹرول میں رکھا تھا' میرا کام خراب پیس الگ کرنا تھا۔''

''تم ٹھیک اور خراب پیس میں پہچان نہیں کر سکتے؟''

''بالکل کر سکتا ہوں جی۔ اسی لیے تو نکال دیا۔ سپر وائزر نے کہا کہ شپ منٹ جانے والی ہے اور دوسرے پیس بنانے کا وقت نہیں ہے اس لیے میں خراب پیس بھی پاس کر دوں پر میں نے انکار کر دیا۔ یہ تو غلط ہوتا مجھے جس کام کے لیے رکھا تھا' میں اس کے الٹ تو نہیں کر سکتا تھا۔''

رحیم کریم بھائی نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے۔ میں مزید سوالوں کا منتظر تھا مگر انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے تم باہر بیٹھو اور ٹھنڈا پیو آج موسم گرم ہے۔''

میں باہر آیا تو پیون نے مجھے کولڈ ڈرنک لا کر دی۔ آفس فل اے سی تھا اور بہت ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ آرام دہ صوفے تھے۔ میں مزے کرتا رہا۔ حتیٰ کہ رحیم کریم بھائی کی سیکریٹری نے آ کر کہا۔ ''مسٹر ناصر! آپ جا سکتے ہیں۔ آپ کو جاب کے بارے میں بتا دیا جائے گا۔''

میں فیکٹری میں اباجی کے پاس آیا' انہوں نے مجھے اپنے پاس روک لیا کہ اتنی گرمی میں کہاں پبلک ٹرانسپورٹ میں دھکے کھاتا جاؤں گا۔ شام کو ان کے ساتھ بائیک پر آرام سے چلا جاؤں گا۔ اباجی نے شام گھر جاتے ہوئے انٹرویو کا پوچھا اور میں نے بتا دیا کہ رحیم کریم بھائی نے کیا سوالات کیے تھے اور میں نے کیا جواب دیے۔ اباجی نے سن کر ٹھنڈی سانس لی اور بولے۔ ''تو ساری عمر بھولا ہی رہے گا۔''

''ابا میں نے ٹھیک جواب تو دیے ہیں۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''اس میں غلط بات کون سی ہے؟''

''یہی تو فن ہے کہ آدمی غلط صحیح نہیں' وہ بات کرے جس میں اس کا فائدہ ہو۔''

میں فکر مند ہو گیا۔ ''تو کیا رحیم کریم بھائی نوکری نہیں دیں گے؟''

''اس انٹرویو کے بعد تو مشکل ہے۔'' اباجی نے کہا۔ ''خیر دیکھتے ہیں، اللہ مالک ہے۔ کہیں اور کوشش کرتے ہیں۔''

مگر اباجی کو کہیں اور کوشش کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ تیسرے دن اباجی کو رحیم کریم بھائی نے اپنے دفتر میں بلایا اور ان سے کہا۔ ''تمہارے لڑکے کو ایک مہینے کے لیے ٹرائل پر رکھ رہا ہوں۔ اسے کل صبح گیارہ بجے طارق روڈ والے شوروم بھیج دینا۔''

ٹرائل والی بات پر اباجی مایوس ہوئے۔ انہوں نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''سیٹھ وہ بھولا ہے پر اپنی ذمے داری پوری کرنا جانتا ہے۔''

''تم فکر مت کرو' میں اسے سمجھ گیا ہوں۔ اب یہی دیکھنا ہے کہ وہ اپنی ذمے داری پوری کرتا ہے یا نہیں۔''

شام کو اباجی نے گھر آ کر اماں اور مجھے یہ سب بتایا اور اگلے دن مجھے طارق روڈ والے شوروم پہنچنے کو کہا۔ اگلے دن میں گیارہ بجے سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ شوروم یا اسٹور ایک بہت بڑے شاپنگ مال کے گراؤنڈ فلور پر کافی بڑے حصے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس میں مختلف شعبے الگ الگ تھے۔ شوروم گیارہ بجے کھلتا تھا اور اس کے انچارج فخری بھائی تھے۔ وہی آ کر تالے کھولتے تھے۔ وہاں فخری بھائی سمیت ایک درجن افراد کام کرتے تھے۔ مجھے ایک ملازمت چھوڑ جانے والے نوجوان کی جگہ رکھا گیا تھا۔ فخری بھائی نے بتایا کہ میرا کام شوروم میں موجود چھوٹے گودام میں سامان کو دیکھنا اور کسی کمی کی صورت میں گودام سے منگوانا اور لگانا تھا۔ شوروم کے اوپری حصے میں چھوٹا گودام

تھا جہاں فوری ضرورت کا مال رکھا جاتا تھا۔ اگر کوئی گاہک ڈسپلے میں رکھی چیز کو پسند کرتا تو اسے اسی گودام سے چیز نکال کر دی جاتی تھی۔

اشیا اتنی زیادہ تھیں کہ تقریباً پورا شوروم ہی ڈسپلے پر تھا۔ اس لیے فروخت ہونے والا مال مسلسل چھوٹے گودام سے آتا اور بڑے گودام سے مال اس چھوٹے گودام میں منتقل کیا جاتا تھا۔ بڑا گودام شاپنگ مال کی بیسمنٹ میں تھا۔ وہاں اسی مقصد کے لیے گودام بنائے گئے تھے اور ان میں سے ایک رحیم کریم بھائی کے شوروم کا بھی تھا۔ میرا تعلق ہی گوداموں سے تھا اس لیے فخری بھائی نے خاص طور سے مجھے ان دونوں جگہوں کا دورہ کرایا اور مجھے تفصیل سے سمجھایا کہ میری ذمے داری کیا ہے۔ شام تک میں عملی کام بھی کرتا رہا اور چند دن بعد میں اتنا تیز ہوگیا کہ صرف ایک نظر دیکھ کر مجھے پتا چل جاتا کہ کس سامان کی کتنی ضرورت ہے اور اسے کب یہاں آجانا چاہیے۔

چھوٹے گودام میں میرے ساتھ ایک آدمی امتیاز بھی کام کرتا تھا اور اس نے یہاں خاصا کباڑ پھیلایا ہوا تھا۔ وہ آنے والے سامان کو بے ترتیبی سے رکھتا تھا جس سے ضرورت کے وقت چیز کے حصول میں مشکل پیش آتی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں برابر کے تھے اس لیے کسی کام میں ایک دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے امتیاز سے کہا۔ ''ایسا کرتے ہیں گودام بانٹ لیتے ہیں۔ دو حصوں میں کرنے سے کام آسان ہوجائے گا۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ جلدی سے بولا۔

''نیچے والوں کو آسانی ہوگی۔ انہیں معلوم ہوگا کس چیز کے لیے کس کے پاس آنا ہے۔''

''بھاڑ میں ڈالو نیچے والوں کو۔'' اس نے... بےپروائی سے کہا۔ ''ہمیں ان سے کیا؟''

میں سمجھ گیا کہ اسے کام کرتے ہوئے موت آتی ہے۔ اس لیے میں نے یہ کیا کہ اپنے طور پر چیزوں کو منظم کر کے رکھنے لگا تاکہ نیچے سے کوئی لینے آئے تو اسے جلد از جلد... اور آسانی سے مطلوبہ چیز مل جائے۔ ایک مہینے میں، میں نے خاصی حد تک چھوٹا گودام سیٹ کر دیا تھا اور فخری بھائی میری کارکردگی سے خوش تھے۔ مگر جب رحیم کریم بھائی نے اچانک مجھے بلایا تو ان کا موڈ کچھ خراب تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''سنا ہے تم نے چھوٹے گودام میں اپنا طریقہ شروع کر دیا ہے؟''

میں نے سادگی سے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں سر۔''

''تم نے چھوٹے گودام میں اپنی مرضی سے سیٹنگ کی ہے؟''

''جی سر۔'' میں نے سر ہلایا۔

''کیوں؟'' ان کا لہجہ کسی قدر سخت تھا۔

''سر! میں وضاحت نہیں کر سکتا آپ کو دکھا سکتا ہوں۔''

رحیم کریم بھائی کے کان امتیاز نے بھرے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ اس لیے انہوں نے فخری بھائی سے پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ وہ مجھے گھر تک پہنچانے کی نیت سے میرے ساتھ چھوٹے گودام تک آئے۔ جہاں میں نے چیزوں کو ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔ میں نے رحیم کریم بھائی کو عملی طور پر دکھایا کہ پہلے چیزیں کیسے رکھی ہوتی تھیں اور ان میں سے اپنی مطلب کی چیز تلاش کرنے میں کتنی دیر لگتی تھی۔ اب یہ کام منٹوں سیکنڈوں میں ہوجاتا ہے۔ عملی طور پر دکھا کر میں نے فخری بھائی سے سامنا کرایا اور انہوں نے اعتراف کیا کہ میرے آنے کے بعد چھوٹے گودام کی حالت بہت بہتر ہوئی ہے۔ رحیم کریم بھائی ذرا حیران ہوئے تھے۔ جیسے انہیں مجھ سے اس کام کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے فخری بھائی سے میری رپورٹ لی اور اس کے بعد مجھے بلالیا۔ سیٹھ ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ سے معذرت کی۔

''میں، غلط سمجھا تھا اس لیے تم سے اس طرح بات کی۔''

''سر! میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو کس طرح بتایا گیا ہوگا مگر اب میں امتیاز کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے روم میں لگا دیں؟''

''نہیں تم چھوٹا گودام دیکھو گے۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ ''میں امتیاز کو نیچے لگا رہا ہوں اور تمہارے ساتھ اب کوئی اور کام کرے گا مگر چھوٹے گودام کے انچارج تم رہو گے۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''شکریہ سر۔''

''آج سے تمہاری جاب پکی ہے اور اب تمہاری تنخواہ گیارہ ہزار روپے ہوگی۔''

رحیم کریم بھائی نے مجھے ایک مہینے کے ٹرائل پر رکھا تو اس وقت انہوں نے آٹھ ہزار طے کیے تھے۔ ایک مہینے بعد تین ہزار کا اضافہ ہوا تو میں خوش ہوگیا مگر جب میں نے گھر آ کر آپا جی کو بتایا تو وہ بولے۔ ''احمق تم فوراً کیوں مان گئے۔ سیٹھ تمہیں تیرہ چودہ ہزار بھی دیتا۔''

میں حیران ہوا۔ ''تیرہ چودہ ہزار۔''

''ہاں تم اہم ترین جگہ لگے ہو۔ تمہاری وجہ سے اسے

نہیں زیادہ فائدہ ہوگا۔ اس کام کے تو پندرہ ہزار بھی کم ہیں مگر۔'' اباجی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''تم نے فوراً مان کر بے وقوفی کر دی ہے۔''

یہ اباجی کا خیال تھا میرے خیال میں، میں نے کوئی بے وقوفی نہیں کی تھی۔ ابھی مجھے ملازمت کرتے ہوئے ایک مہینا بھی نہیں ہوا تھا اور میں اپنی مرضی کی تنخواہ کیسے مانگ سکتا تھا؟ گیارہ ہزار بھی برے نہیں تھے۔ آج سے دس سال پہلے یہ خاصی رقم تھی۔ مگر ان دنوں ملک کے حالات بہت اچھے تھے۔ لوگوں کو اچھی تنخواہیں مل رہی تھیں۔ شاید اس لحاظ سے اباجی کو تنخواہ کم لگی تھی۔ مگر اس ملازمت میں اور فائدے بھی تھے۔ جیسے لنچ مجھے اسٹور کی طرف سے ملتا تھا اور ہر روز کوئی نہ کوئی زبردست چیز ہوتی تھی۔ کبھی بریانی، کبھی پیزا اور کبھی بروسٹ وغیرہ۔ شوروم میں منرل واٹر اور کولڈ ڈرنک کی فراوانی تھی۔ ملازمین بھی بے حساب پیتے تھے۔ چائے جتنی بار چاہو ملتی تھی۔ پورا شوروم مکمل اے سی تھا۔ ملازموں کے لیے واش روم اور ریسٹ روم کی سہولت بھی تھی۔ کام کا ماحول بہت اچھا تھا۔ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں مشکل سے چار گھنٹے رش والے ہوتے تھے ورنہ باقی وقت میں آرام سے بیٹھا رہتا تھا۔ مجھے ماتحت دیا جانے والا لڑکا میری ہدایت پر کام کرتا رہتا تھا۔ مجھ پر سے یہ بوجھ بھی کم ہوگیا۔ فخری بھائی اور رحیم کریم بھائی مجھ سے خوش تھے۔ امتیاز جیسے لوگ کم تھے اور اب میرا اس سے واسطہ بھی نہیں تھا۔

شوروم کے اوقات صبح ساڑھے گیارہ سے رات آٹھ بجے تک ہوتے تھے۔ کیونکہ میرا کام صرف سہولت دینا تھا اور میں جو چیزیں منگواتا یا دیتا تھا، اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا تھا۔ ریکارڈ گودام اور سیل کاؤنٹر پر ہوتا تھا۔ اس لیے مجھے سات بجے چھٹی مل جاتی تھی۔ البتہ رمضان میں یہ اوقات بڑھ جاتے تھے اور صبح دس سے رات بارہ بجے تک ہو جاتے تھے۔ اتفاق سے میری آمد کے دو مہینے بعد ماہِ رمضان آگیا۔ مگر اس میں بھی شفٹیں ہو جاتی تھیں۔ ان دنوں اضافی ملازمین رکھے جاتے تھے۔ مستقل ملازم آٹھ اور نو کے بجائے دس اور گیارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کرتے تھے۔ اس اضافی وقت کا معاوضہ تنخواہ میں لگا کر دیا جاتا تھا۔ سیلز والوں کو کمیشن ملتا تھا۔ مگر یہاں آمد کے کچھ عرصے بعد میں نے محسوس کیا کہ ملازمین تنخواہ کے حوالے سے مطمئن نہیں تھے۔ سوائے مجھے اور فخری بھائی کو چھوڑ کر سب ہی غیر مطمئن تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آس پاس کے... روزمرہ اپنے ملازمین کو اس سے زیادہ تنخواہ دے رہے ہیں۔

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے مگر وہ یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ آس پاس کے شوروم ملازمین سے کام بھی کہیں زیادہ لے رہے تھے۔ ان کی ڈیوٹی عام دنوں میں بھی دس گیارہ گھنٹے ہوتی تھی۔ پھر کھانے، پینے اور آرام کی ایسی سہولتیں بہت کم دکان والے اپنے ملازموں کو دے رہے تھے۔ فخری بھائی رحیم کریم بھائی کے خاص آدمی تھے۔ وہی شوروم چلا رہے تھے۔ باقی سب آتے جاتے رہتے تھے۔ ان کی کوئی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اگر کوئی کم تنخواہ کی وجہ سے چھوڑ کر جانا چاہتا تو اسے روکتے نہیں تھے۔ بے روزگاری اتنی تھی کہ ایک ملازمت کے لیے درجنوں لوگ آجاتے تھے۔ نیا بندہ ایک گھنٹے کے نوٹس پر مل جاتا تھا۔ اگر کوئی تنخواہ بڑھانے کو کہتا تو اسے فارغ کر دیا جاتا۔ اس لیے اب لوگ تنخواہ بڑھانے کا کہنے کے بجائے اس موقع میں رہتے تھے کہ کہیں زیادہ تنخواہ کی نوکری ملے تو یہاں سے چھوڑ.... کر چلے جائیں۔

میری آمد کے دو سال کے اندر سوائے فخری بھائی کے باقی تمام ہی ملازمین بدل گئے تھے جو میری آمد کے وقت یہاں کام کر رہے تھے۔ پہلے سال میری تنخواہ میں ہزار روپے کا اضافہ ہوا۔ دوسرے سال بھی ہزار روپے کا اضافہ ہوا۔ اب میں تیرہ ہزار لے رہا تھا۔ اب تک میں مزے میں تھا۔ میں بائیک لینے کا سوچ رہا تھا۔ اس وقت پیٹرول سستا تھا مگر تیسرے سال سے مہنگائی کا جن جیسے پھر بوتل سے نکل آیا۔ ہر چیز کے دام تیزی سے بڑھنے لگے۔ میرے دو بڑے بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ ہمارا گھر کرائے کا اور چھوٹا تھا اس لیے اباجی نے شادی کے بعد بھائیوں کو الگ کر دیا تھا۔ اب میری باری تھی مگر اباجی کا کہنا تھا کہ تیرہ ہزار تنخواہ میں آدمی اپنا گزارہ کرے یا بیوی بچوں کو پالے۔ وہ مجھ سے کہتے کہ میں رحیم کریم بھائی سے بات کروں اور اپنی تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کروں۔

مگر مجھے جھجک ہوتی تھی اور میرے خیال میں رحیم کریم بھائی کو خود بھی اس کا خیال تھا جبھی تو وہ ہر سال ایک ہزار بڑھا رہے تھے۔

میرے پاس باقاعدہ ریکارڈ تو نہیں تھا مگر سامان کی آمد و رفت سے مجھے پتا چل جاتا تھا کہ سیل کم ہوئی یا پہلے کے مقابلے میں بڑھی ہے۔ روزمرہ کی بنیاد پر اتار چڑھاؤ ہوتا تھا مگر مجموعی سیل میں اضافہ ہوا تھا۔ سامان پہلے کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے ختم ہوتا اور منگوانا پڑتا

تھا۔ نئے آنے والے ملازموں میں سے ایک مجھے ملا تھا کیونکہ یہاں کی ضرورت بڑھ گئی تھی۔ شروع میں رحیم کریم بھائی سے کم واسطہ پڑتا تھا کیونکہ وہ نیچے شوروم میں ہوتے تھے مگر کچھ عرصے کے بعد وہ زیادہ وقت اوپر چھوٹے گودام میں گزارنے لگے۔ یہاں ایک چھوٹا سا آفس تھا۔ آفس میں، میں بیٹھتا تھا مگر رحیم کریم بھائی آتے تو وہ بھی یہیں بیٹھتے تھے۔ ان کے آنے پر میں باس والی سیٹ ان کے لیے خالی کر دیتا تھا۔ اس بیٹھک کے دوران وہ مجھ سے کام کے علاوہ بھی گپ شپ کرتے تھے۔ عام طور سے وہ ملازموں سے ذرا سخت اور کھردرے لہجے میں بات کرتے تھے مگر مجھ سے وہ نرمی سے اور بعض اوقات تو شفیق لہجے میں بات کرتے تھے۔ اکثر حال احوال دریافت کرتے اور پوچھتے کہ مجھے ملازمت میں کوئی مشکل تو نہیں ہے؟

میں نے بتایا کہ رحیم کریم بھائی کے بارے میں ان کے ملازموں کی رائے اچھی نہیں تھی۔ اکثر انہیں پیٹھ پیچھے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔ میرے ابا جی جو تیس برس سے ان کی فیکٹری میں کام کر رہے تھے وہ بھی انہیں بہت کچھ کہتے تھے۔ مگر مجھے ان میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی بلکہ ایسی بہت سی اچھائیاں تھیں جنہیں دوسرے نظر انداز کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ صدقہ خیرات بھی دل کھول کر کرتے تھے۔ میری ملازمت کے پہلے رمضان میں انہوں نے شوروم کے سامنے افطار... کرانے کا انتظام کیا تھا۔ انہوں نے مخصوص پیکٹ بنوا لیے تھے جو افطاری کے وقت وہاں سے گزرنے والے افراد میں بلا امتیاز تقسیم کیے جاتے تھے۔ اس میں پانی، کھجور، چھوٹا پیزا، رول اور سموسے ہوتے تھے۔

یہ انتظام صرف اس شوروم میں نہیں بلکہ ان کے تمام شورومز کے سامنے ہوتا تھا۔ روزانہ کوئی چار ہزار پیکٹ آتے تھے اور ان کی مالیت دو لاکھ روپے بنتی تھی۔ میں دنگ رہ گیا کہ رحیم کریم بھائی صرف افطاری کرانے پر ایک مہینے میں ساٹھ لاکھ سے زیادہ خرچ کر رہے تھے۔ صدقہ خیرات اور دوسرے خرچے اس کے علاوہ تھے۔ یہ کام وہ برسوں سے کر رہے تھے۔ ہم ملازموں کے لیے بھی بہترین افطاری اور کھانے آتے تھے۔ زکوٰۃ اور صدقے میں وہ اپنے غریب ملازموں کا خاص خیال کرتے تھے اور انہیں رمضان سے پہلے رقم کے لفافے مل جاتے تھے۔ ایک لفافہ مجھے بھی ملا تھا۔ مگر یہ پہلے رمضان میں نہیں بلکہ دوسرے رمضان میں ملا تھا۔ رحیم کریم بھائی نے خود دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''سر! یہ کیا ہے؟''

''کچھ رقم ہے۔'' وہ بولے۔ ''اپنے ملازموں کو دیتا ہوں اس بار تمہیں بھی دی ہے۔''

میں حیران ہوا جب میں نے لفافے میں پندرہ ہزار کی بڑی رقم پائی اور میں نے گھر آ کر ابا جی کو لفافہ دیا اور رحیم کریم بھائی کی سخاوت کا بتایا تو ابا جی نے کہا۔ ''وہ صدقہ خیرات کرتا ہے۔ اپنے ملازموں کو دے کر ایک طرح سے انہیں اپنا احسان مند کر لیتا ہے۔''

مجھے یہ تو اچھا نہیں لگا کہ کوئی مجھے صدقہ خیرات دے۔ مگر ابا جی کی بدظنی بھی اچھی نہیں لگی۔ رحیم کریم بھائی نے یقیناً خلوصِ نیت سے مجھے اور دوسرے ملازموں کو یہ رقم دی تھی اگرچہ سب سے نچلے درجے کے ملازمین سب سے زیادہ انہیں برا بھلا کہتے تھے۔ اگر وہ صدقہ خیرات کرتے تھے تو سب سے زیادہ ان ہی ملازموں کو جاتا تھا۔ اچھا نہ لگنے کے باوجود میں نے اس رقم کو استعمال کیا۔ بلکہ ابا جی نے استعمال کیا اور مجھے ایک سیکنڈ ہینڈ بائیک کچھ پیسے اور شامل کر کے دلا دی۔ دیکھنے میں تو کھٹارا لگتی تھی مگر چلنے میں اچھی تھی۔ ابا جی نے کہا۔ ''اس شہر میں ایسی بائیک اچھی ہے کوئی چھینے گا نہیں اور نہ ہی شوشا پر خرچ کرنا پڑے گا۔ بس انجن اور چلنے والی چیزیں ٹھیک رکھنا۔''

میں ابا جی کی بات سے متفق تھا کیونکہ چند دن پہلے ہی شوروم سے جاتے ہوئے ڈاکوؤں نے فخری بھائی کو لوٹا، مارا اور جاتے ہوئے بائیک بھی لے گئے۔ نئی چمکتی دمکتی بائیک انہوں نے چند مہینے پہلے ہی لی تھی۔ اگرچہ فخری بھائی کا نقصان رحیم کریم بھائی نے پورا کر دیا تھا۔ انہیں نئی بائیک دلا دی مگر ان کے زخم دیکھ کر میں نے عبرت پکڑی تھی۔ جب ابا جی نے کھٹارا بائیک دلائی جو چلنے میں اچھی تھی تو میں اس پر دل و جان سے راضی ہو گیا تھا۔ اس کا فائدہ چند دن بعد ہی نظر آ گیا۔ جب شوروم سے آتے ہوئے ایک ٹریفک جام میں دو لڑکوں نے مجھے روکا اور ایک نے کہا۔ ''جو کچھ ہے نکال دے۔''

میرے اوسان خطا ہو گئے کیونکہ وہ کُرتے کی جیب سے پستول کی نال دکھا رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنا پرس اور موبائل اس کے حوالے کرتا اس کے ساتھی نے کہا۔ ''چھوڑ اسے اس کھٹارا کے پاس کیا ہوگا...... وہ دیکھ۔'' اس نے ذرا دُور ایک نئی اور بڑی بائیک والے کی طرف اشارہ کیا اور دونوں لپک کر اس کی طرف بڑھ گئے۔

میری جان چھوٹی اور جیسے ہی رش ذرا کم ہوا میں نے بائیک

دوڑائی تھی۔ اس کے بعد سے میں یہ احتیاط کرنے لگا کہ رش کے اوقات میں گلیوں سے چلا جاتا تھا۔ یہ راستہ مجھے طویل پڑتا تھا مگر میں حفاظت سے اور جلدی گھر پہنچ جاتا تھا۔ اس کے بعد رحیم کریم بھائی ہر سال مجھے لفافہ دینے لگے۔ ہر سال اس رقم میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ اس رقم سے میرے اور گھر کے بہت سے کام نمٹ جاتے تھے۔

رحیم کریم بھائی کے بارے میں میری معلومات میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہا۔ وہ خاندانی کاروباری لوگ تھے۔ رحیم کریم بھائی کے باپ کی چمڑا رنگنے کی فیکٹری تھی۔ مگر انہوں نے باپ کے بزنس میں شراکت نہیں کی تھی۔ بلکہ انہوں نے چند سال ایک اور فیکٹری میں ملازمت کرنے کے بعد ...... اپنا ایک لیدر گارمنٹ کا یونٹ لگایا۔ اس کا خام مال وہ بڑی لیدر فیکٹریوں کی کٹنگ کے بعد بچ جانے والے مال سے حاصل کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا پہلا شوروم کھولا۔ اس بزنس کے لیے پیسا ان کے باپ نے فراہم کیا تھا۔ مگر رحیم کریم بھائی نے چند سالوں میں یہ ساری رقم واپس اپنے باپ کو لوٹا دی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انہوں نے سب کچھ اپنے بل بوتے پر کیا تھا۔

شوروم چل نکلا تو ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا شوروم کھولا۔ پھر وہ اپنے والد کی فیکٹری سے چمڑا لینے لگے۔ انہوں نے جوتے اور سینڈل سازی کا یونٹ لگایا اور اس میں روایتی ڈیزائنوں کے بجائے جدید ترین ڈیزائن کے جوتے اور سینڈل اور دیگر چمڑے کی کئی اشیا بنوانے لگے۔ اسی طرح ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو پہلے یہاں بنتی نہیں تھیں۔ ماہر کاری گروں کو تلاش کر کے اپنے پاس ملازمت دی ساتھ ساتھ انہوں نے بیرونِ ملک کے لیے بھی مال تیار کرنا شروع کر دیا۔

مگر وہ آرڈر نہیں لیتے تھے بلکہ چیز تیار کر کے دبئی کے راستے اسے دنیا بھر کے بڑے اسٹورز کو فروخت کرتے تھے۔ مال یہاں سے دبئی کی ایک کمپنی خریدتی تھی جو اصل میں رحیم کریم بھائی کی کمپنی ہی تھی۔ دبئی سے یہ مال دنیا میں کہیں بھی جا سکتا تھا اس پر کوئی پابندی نہیں تھی کیونکہ دبئی فری پورٹ تھی۔ رحیم کریم بھائی کی شادی کم عمری میں ہو گئی تھی۔ وہ بیس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے جب وہ پہلے بیٹے کے باپ بن گئے تھے اور اس وقت وہ اپنا بزنس کر رہے تھے۔ ان کے چار بیٹے ہیں۔ جو فیکٹری اور شوروم بھی دیکھتے ہیں۔ ایک دبئی میں ہوتا ہے اور باقی تین یہاں ہوتے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر بزنس مکمل طور پر رحیم کریم بھائی کے ہاتھ میں ہے۔ سارے فیصلے وہی کرتے ہیں۔

کچھ عرصے بعد مجھے پتا چلا کہ کاغذات میں ان کے تمام شورومز اور فیکٹری الگ الگ کمپنیوں کے نام پر تھے اور ان کے مالکان بھی الگ تھے۔ یعنی ان کی بیوی اور بچے۔ خود ان کے نام پر صرف طارق روڈ والا شوروم تھا۔ یہ سب باتیں مجھے وقفے وقفے سے معلوم ہوتی رہی تھیں کیونکہ جب سے رحیم کریم بھائی نے چھوٹے گودام والے دفتر میں بیٹھنا شروع کیا تھا تو وہ بہت سی باتیں میرے سامنے کر جاتے تھے۔ ان کے خیال میں، میں یہ باتیں غور سے نہیں سنتا تھا یا اگر سنتا تھا تو میں کسی کو بتاؤں گا نہیں۔ حقیقت میں، میں ساری باتیں سنتا تھا مگر یہ بھی سچ ہے کہ میں نے کبھی کسی کو کچھ بتایا نہیں۔ رحیم کریم بھائی کے بارے میں جو سنا تھا وہ میں نے کبھی گھر میں بھی نہیں بتایا تھا۔ حد یہ کہ اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا۔ میری شادی رحیم کریم بھائی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جب انہوں نے اوپر بیٹھنا شروع کیا تو مجھ سے بعض اوقات گپ شپ بھی کرتے تھے اور میرے بارے میں پوچھتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اچانک پوچھ لیا۔

”میاں ناصر تمہاری شادی کب تک ہوگی؟“

”پتا نہیں سر۔“ میں نے جواب دیا تو وہ چونکے۔

”کیا مطلب پتا نہیں، تم ماشاءاللہ ستائیس برس کے ہو چکے ہو اور لڑکوں کی شادی کے لیے یہ مناسب ترین عمر ہے۔ ہمیں دیکھو انیس برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ پکڑ کر سہرا پہنا دیا تھا۔“ وہ بولے۔ ”کیا ماں باپ شادی نہیں کرنا چاہ رہے تمہاری؟“

”ابا جی اور اماں تو کرنا چاہ رہے ہیں، میرے بڑے بھائیوں کی شادی کو کئی سال ہو گئے ہیں۔ اب تو چھوٹا والا بھی پچیس برس کا ہو گیا ہے اور اس کے لیے لڑکی دیکھی جا رہی ہے۔“

رحیم کریم بھائی کو تعجب ہوا۔ ”چھوٹے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھ رہے ہیں اور تمہارا خیال نہیں ہے؟“

”سر وہ سب سے چھوٹا ہے مگر سب سے زیادہ کماتا ہے۔“ میں نے سادہ لہجے میں کہا۔ ”میری تنخواہ اتنی نہیں ہے کہ میں بیوی بچوں کو پال سکوں۔ ابا جی جس لڑکے کی شادی کرتے ہیں اسے الگ کر دیتے ہیں۔ ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔“

رحیم کریم بھائی کچھ دیر خاموش ہوئے۔ مجھے ان کے

پاس ملازمت کرتے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے اور ابھی تک میری تنخواہ اٹھارہ ہزار تھی۔ انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''کیا شادی کر کے تم بھی الگ ہو جاؤ گے؟''

''ابا جی نے کر دیا تو ہو جاؤں گا مگر خود سے نہیں ہوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بھی شادی ہو گی تو الگ ہونے کا سوال پیدا ہو گا نا۔''

''مایوس کیوں ہوتے ہو۔'' انہوں نے بے تکلفی سے کہا۔ ''جس نے پیدا کیا ہے اسی نے تمہارا جوڑ بھی بنایا ہو گا۔''

''اس کا تو مجھے پورا یقین ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پر یہ نہیں معلوم کہ جوڑ ملے گا کب؟''

''مل جائے گا اور جلد ملے گا۔'' رحیم کریم بھائی نے یقین سے کہا۔ اس وقت میں سمجھا نہیں تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے؟ مگر اس گفتگو کے دو مہینے بعد نئے سال کے آغاز میں جب تمام ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جاتا تھا تو مجھے پتا چلا کہ میری تنخواہ میں یک مشت سات ہزار کا اضافہ ہوا ہے اور اب مجھے ہر مہینے پچیس ہزار روپے ملیں گے...

شوروم کے سارے ملازمین سمیت میں حیران رہ گیا کیونکہ رحیم کریم بھائی نے آج تک کسی ملازم کی تنخواہ میں اتنا اضافہ نہیں کیا تھا۔ یہی نہیں انہوں نے اس کا باقاعدہ اعلان بھی کیا اور اس اضافے کی وجہ میری مسلسل محنت، کارکردگی اور شوروم کے ساتھ خلوص کو قرار دیا۔ میں نے گھر آ کر بتایا تو اماں خوش ہو گئیں اور ابا جی کو یقین نہیں آیا انہوں نے شک سے پوچھا۔

''تجھے کسی نے بے وقوف بنایا ہے۔ مذاق کیا ہے تیرے ساتھ۔''

''نہیں ابا جی، سر نے خود بتایا ہے اور اعلان بھی کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ اضافہ میری محنت اور کام سے لگن کی وجہ سے کیا گیا ہے۔''

ابا جی کو بہ مشکل یقین آیا اور انہوں نے کہا۔ ''حیرت ہے میں نے سیٹھ کو آج تک ایسا کرتے نہیں دیکھا۔ وہ تو کسی کی تعریف بھی مشکل سے کرتا ہے۔''

''ابا جی تعریف تو وہ میری بھی نہیں کرتے مگر مجھ سے ہمیشہ نرمی سے بات کرتے ہیں اور آج تک مجھے ان سے ڈانٹ نہیں پڑی ہے۔''

''میرا بیٹا محنتی اور لائق ہے۔'' اماں نے فخر سے کہا۔ میں خوش ہوا تھا کہ اماں کے دوسرے جملے نے میری ساری خوشی پر پانی پھیر دیا۔ ''چالاک نہیں ہے تو کیا ہوا؟'' میں نے احتجاج کیا۔ ''اماں میں بے وقوف نہیں ہوں۔''

''بے وقوف تھوڑی کہہ رہی ہوں۔'' اماں نے کہا۔ ''میں تو ان چالاکیوں کی بات کر رہی ہوں جو آج کل انسان دکھاتا ہے مگر یہ بھول جاتا ہے کہ مقدر سے بچ نہیں سکتا اور اپنے حصے سے زیادہ پا نہیں سکتا۔ مگر یہ بتا کہ سیٹھ نے اضافہ کیسے کیا؟''

اماں کے سوال پر مجھے یاد آیا کہ دو مہینے پہلے میری رحیم کریم بھائی سے کیا بات ہوئی تھی اور میں نے شرما کر اماں کو بتایا۔ مگر ابا جی کو یقین نہیں آیا کہ رحیم کریم بھائی صرف میری شادی کرانے کے لیے تنخواہ میں اتنا اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس دوران میں ابا جی نے ایک وجہ بھی سوچ لی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ سیٹھ نے اس ڈر سے تیری تنخواہ بڑھائی ہے کہ تو اسے چھوڑ کر کہیں اور ملازمت نہ کر لے۔''

''ابا جی ملازمت ہے کہاں؟'' میں نے کہا۔ ''ہمارے ہاں ایک ملازمت نکلتی ہے تو اس کے لیے سو لڑکے آ جاتے ہیں۔''

ابا جی نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تیرے لیے تو اور بھی مشکل کام ہے یہ۔''

مجھے ذرا دیر سے احساس ہوا کہ ابا جی نے بھی.... بے عزتی کی ہے۔ ان کا مطلب تھا کہ میں دوسری ملازمت تلاش کرنے کا اہل نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو یہ بات سچ تھی مگر اپنی کمزوری کون مانتا ہے؟ بہرحال اس گفتگو کا فائدہ یہ ہوا کہ اماں کو احساس ہو گیا کہ اب میری آمدنی بھی شادی لائق ہو گئی ہے۔ انہوں نے چھوٹے بھائی کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی لڑکی تلاش کرنی شروع کر دی اور اتفاق کی بات ہے کہ انہیں ایک ہی گھر سے دو لڑکیاں مل گئیں۔ نعیمہ اور سیما سگی بہنیں تھیں۔ نعیمہ بڑی لیکن گوری چٹی تھی جب کہ سیما چھوٹی اور کسی قدر سانولے رنگ کی تھی۔ میرے چھوٹے بھائی صغیر نے شرط لگائی تھی کہ لڑکی گوری چٹی اور خوب صورت ہو تو اماں نے صغیر کے لیے نعیمہ کو مانگ لیا اور میرے لیے سیما کو۔ ان کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ نعیمہ اکیس برس کی تھی اور سیما انیس برس کی۔ اس لیے یہ عجیب نہیں لگا کہ بڑے کے لیے چھوٹی لڑکی اور چھوٹے کے لیے بڑی عمر کی لڑکی لی گئی تھی۔

ہمارا مکان کل تین کمروں کا تھا۔ ایک کمرا اماں ابا جی کے پاس تھا۔ ایک میں ہم بھائی ہوتے تھے اور ایک بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کل رقبہ سوگز تھا۔ چھوٹے سے صحن کے ساتھ کچن تھا اور بیڈ رومز کے ساتھ اٹیچ باتھ

تھے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اباجی گھر سے جانے کو کہیں گے کیونکہ شادی کر کے ایک ہی دلہن یہاں آسکتی تھی۔ مگر خلافِ توقع اباجی نے صغیر سے کہا کہ وہ اپنا بندوبست کر لے۔ وہ خوشی سے مان گیا اور مجھے بھی خوشی ہوئی کیونکہ میں اباجی اور اماں کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ شاید میں اکیلا رہ نہیں سکتا تھا اور مجھے تو ان دونوں سے محبت تھی۔ لڑکی والوں کو بھی جلدی تھی اس لیے بات طے ہونے کے چار مہینے بعد ہی ہماری شادی ہوگئی۔ میں نے پہلی بار رحیم کریم بھائی سے ایڈوانس لیا اور انہوں نے ایک لاکھ روپے کا ایڈوانس دیا جو ہر مہینے پانچ ہزار روپے کر کے کاٹا جاتا۔

سچی بات ہے میں فضول خرچی اور پیسے کے زیاں کے خلاف تھا مگر اماں چاہتی تھیں کہ جیسی چیزیں ایک بہو کے لیے جائیں ویسی ہی دوسری کے لیے بھی جائیں۔ صغیر ویسے تو تنگی کا رونا روتا تھا مگر جب شادی کا وقت آیا تو اس نے روپیا یوں خرچ کرنا شروع کیا جیسے درختوں سے توڑ کر لا رہا ہو۔ اس نے نزدیک ہی ایک دو کمروں کا اچھا فلیٹ کرائے پر لے کر اسے سامان سے بھر دیا۔ وہ نعیمہ کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک جوڑے لایا تھا۔ اس لیے اماں چاہتی تھیں کہ سیما کے لیے اچھے جوڑے جائیں۔ ولیمہ اباجی کرتے۔ انہوں نے بڑے بیٹوں کا بھی ولیمہ اپنے خرچ پر کیا تھا۔ اماں کے مجبور کرنے پر میں نے ایک لاکھ ایڈوانس لیا۔ بلکہ میں نے تو پچاس ہزار بولے تھے مگر رحیم کریم بھائی نے ایک لاکھ دے دیے۔ البتہ جب بری کا وقت آیا تو میں حیران رہ گیا کہ سیما کے لیے صرف سات جوڑے تھے۔ یعنی شادی اور ولیمے کے جوڑوں کے علاوہ۔ ان میں سے چار کام والے اور تین سادہ تھے۔

میں آزردہ ہوگیا کہ اماں نے پہلے مجبور کر کے مجھے قرض لینے پر مجبور کیا اور پھر کچھ لیا بھی نہیں مگر میں نے اماں سے یہ بات نہیں کی۔ شادی ہوئی اور سیما میری زندگی میں آئی تو یہ افسردگی پہلی رات یوں غائب ہوئی کہ اس کا شائبہ تک نہیں رہا۔ وہ سانولی ضرور تھی مگر میرے تصور سے بھی زیادہ حسین اور پرکشش نکلی تھی۔ مگر اس کی اصل خوب صورتی اس کی ذہانت اور سمجھداری میں تھی۔ اس نے پہلی رات ہی مجھے بتا دیا کہ اس نے اماں کو مجبور کیا تھا کہ وہ اس کے لیے بری میں بس اتنے ہی جوڑے لائیں۔ وہ فضول خرچی کے سخت خلاف تھی۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ میں نے شادی کے لیے ایک لاکھ قرض لیا ہے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ بڑی رقم یوں ہی ضائع ہو جائے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ

اس نے اتنی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا اور اماں نے بھی اس کی بات مان لی تھی۔ جوڑوں پر مشکل سے بیس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے اور باقی رقم اماں کے پاس تھی۔

رحیم کریم بھائی میرے ولیمے میں آئے تھے۔ اگرچہ وہ زیادہ دیر نہیں رکے تھے مگر انہوں نے سیما کو منہ دکھائی میں پانچ ہزار روپے دیے تھے۔ ابا جی پھر حیران ہوئے تھے کیونکہ رحیم کریم بھائی شاذ ہی کسی ملازم کی شادی میں جاتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”لگتا ہے سیٹھ تجھ پر مہربان ہے۔ ورنہ وہ کسی پر مہربان ہونے والا آدمی نہیں ہے۔“

مگر میرا تجربہ مختلف تھا۔ رحیم کریم بھائی بہت سے لوگوں پر مہربان ہوتے تھے مگر ان میں ان کے ملازمین کی تعداد کم تھی۔ میں چند ایک خوش نصیبوں میں سے تھا۔ میں نے بتایا کہ وہ بے سہارا عورتوں اور یتیم بچوں کا خیال رکھتے تھے۔ شوروم میں ضرورت مند لوگ ان سے ملنے آتے تھے تو ملاقات چھوٹے گودام کے دفتر میں ہوتی تھی۔ مگر فلاح کے یہ کام رحیم کریم بھائی اس طرح کرتے تھے کہ بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوتا تھا۔

البتہ رحیم کریم بھائی کے بزنس کے طریقوں کا سوائے ان کے اور ان کی اولاد کے کسی کو پورا پتا نہیں تھا۔

پہلے وہ دھوراجی سوسائٹی کے ایک چار سو گز کے بنگلے میں رہتے تھے۔ انہوں نے ڈیفنس میں بارہ سو گز پر نیا بنگلا بنوایا۔ اتفاق سے مجھے وہاں کئی بار جانے کا موقع ملا۔ رحیم کریم بھائی چھوٹے موٹے کاموں سے مجھے وہاں بھیجتے رہتے تھے جیسے کچھ سامان بجھوانا ہو یا کسی ٹھیکیدار کو چھوٹی ادائیگی کرنی ہو تو وہ مجھے بھیج دیا کرتے تھے۔ بنگلا بہت ہی خوب صورت جدید انداز کا تھا۔ پھر ساحل سمندر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے رشک آیا کہ اللہ نے انہیں اتنا شاندار مکان دیا ہے اور ہم کرائے کے چھوٹے سے مکان میں دھکے کھا رہے تھے۔ یہ میری شادی کے چند مہینے بعد کی بات تھی۔ ایک بار میں نے واپس آ کر رحیم کریم بھائی کے سامنے ان کے نئے بنگلے کی تعریف کی تو وہ خوش ہو گئے۔ ”تمہیں پسند آیا ناصر میاں؟“

”پسند کیا جناب۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”ہماری تو اتنی اوقات بھی نہیں کہ اسے پسند کریں۔“

وہ چونکے۔ ”تم نے بتایا تھا کہ تم کرائے کے مکان میں رہ رہے ہو؟“

”جی کریم بھائی۔“ میں نے کہا۔ ”ہم لائنز ایریا میں رہتے ہیں۔“

”یاسر اور اس کے سارے بیٹے کماتے ہیں تو مل کر ایک مکان کیوں نہیں بنا لیتے؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں خود کئی بار میں نے ابا جی سے کہا کہ سب مل کر زمین لے کر مکان بنا لیتے ہیں اور پھر جیسے جیسے رقم آتی رہے گی ہم اوپر بناتے جائیں گے مگر بھائی نہیں مانتے۔ سب اپنی اپنی دیکھتے ہیں۔ اس لیے سب کرائے پر رہ رہے ہیں۔“

”یاسر کے ساتھ تم رہ رہے ہو؟“

”جی ویسے تو ابا جی شادی کے بعد الگ کر دیتے ہیں مگر مجھے الگ نہیں کیا اور اگر کرتے تو بھی میں الگ نہ ہوتا۔“

”یہ تو اچھی بات ہے تم ماں باپ کے ساتھ رہنا چاہتے ہو ورنہ آج کل ساتھ رہنے کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ کہتے ہوئے کسی قدر افسردہ ہو گئے۔ اس وقت میں نہیں سمجھا تھا مگر کچھ عرصے بعد مجھے پتا چلا کہ ان کا جو بیٹا باہر تھا وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی وہیں لے گیا تھا اور جو بیٹے یہاں تھے ان میں سے بھی دو اب الگ رہ رہے تھے صرف ایک بیٹا ان کے ساتھ تھا۔ میں حیران ہوا۔ ہمارا والا معاملہ تھا مگر یہاں تو یا شیخ اپنی اپنی دیکھ تھی۔ سب اپنا کماتے اور اپنا کھاتے تھے۔ ایک میں تھا جو اب تک تنخواہ لا کر اماں کے ہاتھ پر رکھتا تھا۔ میری شادی کے بعد اماں نے لینے سے انکار کیا مگر مجھ سے زیادہ سیما نے انہیں مجبور کیا کہ وہ خرچ اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ تو اماں نے یہ کیا کہ گھر کے خرچ کی رقم نکال کر باقی تنخواہ مجھے واپس کرنے لگیں۔ اس سے میں اپنا اور سیما کا خرچ پورا کرتا تھا۔ سیما نے خرچ نہیں لیا تھا مگر گھر پورا سنبھال لیا تھا اور ایک طرح سے اماں کو بٹھا دیا تھا۔ اس نے ان سے کہا۔

”آپ نے ساری عمر کام کیا ہے بیٹی بھی نہیں ہے جو ہاتھ بٹاتی۔ اب سمجھ لیں کہ ایک مستقل بیٹی آ گئی ہے اور آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے۔“

اماں خوش ہو گئی تھیں۔ وہ اور ابا جی سیما کو دعائیں دیتے نہیں تھکتے تھے۔ میری باقی بھابیاں ٹھیک تھیں مگر انہوں نے کبھی ہمارے گھر آ کر کچھ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اماں اور ابا جی کو اپنے ہاں بلایا۔ اماں سیما سے بہت خوش تھیں کیونکہ انہیں آج تک کوئی بات کرنے والی نہیں ملی تھی۔ سیما نے یہ کمی بھی پوری کر دی تھی۔ میں جتنا کم گو تھا وہ اتنا ہی بولتی تھی۔ سیما کے آنے سے گھر میں رونق

ہو گئی تھی۔ یہ بات میں نہیں اماں اور اباجی کہتے تھے۔ ایک رات ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے اور نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سیما برتن سمیٹ کر چائے بنا لائی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے اچانک کہا۔

''اباجی آپ لوگوں نے آج تک اپنا گھر بنانے کا سوچا؟''

''بہت سوچا بیٹا۔'' اباجی نے جواب دیا۔ ''مگر میں اکیلا تو نہیں بنا سکتا۔''

''پہلے آپ اکیلے تھے اب ناصر بھی آپ کے ساتھ ہیں۔'' سیما نے ترغیب دینے والے انداز میں کہا۔ ''کوشش کریں تو اللہ سبب بنانے والا ہے۔''

اماں نے بھی تائید کی۔ ''میرے پاس تین لاکھ روپے جمع ہیں ناصر کے۔''

ہم سب چونک گئے۔ ''اماں میں نے تو لاکھ روپے قرض لیا تھا یہ تین لاکھ کہاں سے ہو گئے۔''

''میرے بچے تو اپنی ساری تنخواہ ہمیں دیتا تھا تو میں نے اس رقم کو ضائع نہیں کیا، کمیٹیاں ڈالتی رہتی تھی۔ اب تک دو لاکھ روپے جمع کیے ہیں۔''

''تو، تو بہت ہوشیار نکلی۔'' اباجی نے پر تحسین انداز میں کہا۔ ''مگر تین لاکھ میں کیا ہو گا۔ اتنے میں تو آج کل پلاٹ نہیں آتا ہے۔''

''اباجی قرض لے سکتے ہیں۔'' سیما بولی۔ ''ہم یہاں آٹھ ہزار کرایہ دے رہے ہیں۔ قسط کی صورت میں دس ہزار بھی دے سکتے ہیں۔''

اباجی سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں نے سر ہلایا۔ ''چلو دیکھتے ہیں۔''

اباجی کی تنخواہ پینتیس ہزار تھی۔ اوور ٹائم ملا کر چالیس تک مل جاتے تھے۔ پچیس ہزار تنخواہ میری تھی۔ چار آدمیوں کے لیے یہ خاصی تھی اور ہم اس میں سے بچت کر سکتے تھے۔ اب تک کمیٹیاں ڈالتے رہے تھے مگر وہ نکلتی تھیں اور کسی نہ کسی کام میں خرچ ہو جاتیں۔ اباجی نے مجھ سے بھی کہا کہ میں دیکھوں اگر کوئی سستی جگہ مل رہی ہو۔ جہاں ہم رہتے تھے۔ یہاں چھوٹا سا مکان بھی بیس بائیس لاکھ سے کم نہیں تھا کیونکہ یہ جگہ مین شہر کے نزدیک پڑتی تھی۔ اس گفتگو کے چند دن بعد میں نے رحیم کریم بھائی سے ایسے ہی ذکر کر دیا کہ ہم اب اپنا مکان تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''کوئی جگہ دیکھی ہے؟''

''اباجی دیکھ رہے ہیں مگر ابھی تک وارے والی کوئی جگہ نہیں ملی ہے۔''

''ایک جگہ ہے۔'' وہ سوچتے ہوئے بولے۔ ''ادھر کورنگی روڈ پر ندی کے ساتھ جو سڑک انڈسٹریل ایریا کی طرف جا رہی ہے۔ اس پر اوور سیز کمرشل پٹی ہے۔ ندی کی دیوار کے ساتھ ساتھ اسی گز کے پلاٹ کاٹے گئے تھے۔ تقریباً سب پر چار دیواری ہے اور بہت سوں نے چھوٹے موٹے مکان بنا کر وہاں لوگ بٹھائے ہوئے ہیں کہ قبضہ نہ ہو جائے۔ ابھی وہاں پانی بجلی گیس نہیں ہے۔ سنا ہے پانچ ساڑھے پانچ لاکھ میں تھوڑا بہت بنا ہوا مل جاتا ہے۔''

''مگر پانی بجلی گیس کے بغیر آدمی کیسے رہ سکتا ہے؟''

''دیکھ لو لوگ وہاں رہ رہے ہیں۔ چند سالوں بعد اس جگہ کی قیمت ہی کچھ اور ہو جائے گی۔ تب بیچ کر کسی اور جگہ لے لینا۔''

میں نے گھر آکر اباجی کو بتایا۔ وہ چونک کر بولے۔ ''میرا روٹ یہی ہے، اسی کچی سڑک سے گزر کر فیکٹری تک جاتا ہوں۔''

اباجی نے کہا کہ وہ دیکھیں گے۔ چند دن بعد انہوں نے بتایا کہ سڑک سے ذرا دور ایک جگہ مل رہی ہے۔ اس پر بری کاسٹ دو کمروں کا مکان بنا ہوا ہے۔ باورچی خانہ، غسل خانہ اور واش روم الگ سے ہیں۔ خاص بات یہ تھی کہ اسی گز کے پلاٹ کے پیچھے ندی کے پشتے تک تقریباً دو سو گز کی خالی جگہ بھی اس میں شامل کر لی گئی تھی۔ صرف اسی پلاٹ کے ساتھ نہیں بلکہ تمام ہی مالکان نے پیچھے زمین پر قبضہ کیا ہوا تھا اور مستقبل میں یہ پکا ہو جاتا۔ کچھ لوگوں نے اس زمین پر مکانات بنا کر ان میں رہنا بھی شروع کر دیا تھا اور آگے والا حصہ کرائے پر دیا ہوا تھا۔ آمدورفت کے لیے پشتے کے ساتھ سڑک تک راستہ آتا تھا۔ لوگوں نے سامنے والی آبادی سے پانی اور بجلی کی سہولت لی تھی۔ گیس ابھی اس علاقے میں نہیں آئی تھی۔

''پر وہ چھ لاکھ مانگ رہا ہے۔'' اباجی نے کہا۔ ''ہمارے پاس تین لاکھ روپے ہیں۔''

''ناصر پہلے ہی قرض لے چکے ہیں۔'' سیما نے کہا۔ ''اباجی آپ کوشش کریں۔''

میری شادی کو چھ مہینے ہو گئے تھے اور میں اب تک تیس ہزار روپے کٹوا چکا تھا۔ ستر ہزار ابھی باقی تھے اور ایک قرض کے ہوتے ہوئے دوسرا قرض ملنا مشکل تھا۔ اباجی نے فیکٹری میں بات کی مگر انہیں بتایا گیا کہ

انہیں ایک لاکھ سے زیادہ قرض نہیں مل سکتا ہے۔ انہوں نے مایوسی سے ہمیں بتایا تو سیما نے تسلی دی۔ ''چلیں ایک لاکھ تو مل رہا ہے۔ باقی کے لیے کچھ... ہو جائے گا۔'' سیما نے میری طرف دیکھا۔ ''آپ سیٹھ سے دوبارہ بات نہیں کر سکتے؟''

میں ہچکچایا۔ ''کر تو سکتا ہوں پر شاید وہ نہ مانیں۔ دو لاکھ خاصی رقم ہوتی ہے۔''

''آپ بات تو کر کے دیکھیں۔'' سیما نے اصرار کیا تو میں مان گیا۔ اگلے دن میں نے موقع دیکھ کر رحیم کریم بھائی سے بات کی۔ وہ بولے۔

''میاں ابھی تو تمہارا پچھلا قرض ادا نہیں ہوا ہے۔''

''یہ میں ادا کرتا رہوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''دو لاکھ پر میں دس ہزار کٹوا سکتا ہوں۔''

''پندرہ ہزار کٹ جائیں گے تو گزارہ کیسے کرو گے؟''

''اللہ مالک ہے پھر ابا جی بھی ساتھ ہیں۔'' میں نے دبے لفظوں میں کہا۔ رحیم کریم بھائی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ اس وقت انہوں نے جواب نہیں دیا تو میں مایوس ہوا تھا۔ مگر دو دن بعد انہوں نے دفتر میں مجھے ایک لفافہ دیا۔

''یہ دو لاکھ روپے ہیں۔ اب مکان کی مٹھائی کب کھلا رہے ہو؟''

''انشاء اللہ بہت جلد سر۔'' میں خوش ہو گیا۔ ''سر! یہ آپ کا مجھ پر احسان ہے۔''

میں نے گھر آ کر دو لاکھ روپے دکھائے تب بھی ابا جی کو بہ مشکل یقین آیا تھا۔ اگلے دن انہوں نے بھی لاکھ روپے قرض کی درخواست دے دی۔ بیعانہ دے کر معاہدہ کر لیا اور جیسے ہی فیکٹری سے قرض کی رقم ہاتھ میں آئی انہوں نے پوری ادائیگی کر کے پلاٹ اپنے نام لیز کرا لیا۔ اوپری اخراجات کے لیے ہمیں مزید کچھ رقم ادھار لینی پڑی تھی۔ اس کی ادائیگی کے لیے کچھ عرصہ ہمیں تنگی میں رہنا پڑا۔ پھر یہاں سہولت نہیں تھی۔ بجلی کنڈے کی تھی اور پانی کے لیے سامنے سے لائن لینی پڑی تھی۔ گیس پورے علاقے میں نہیں تھی اس کے لیے سلینڈر استعمال کرتے تھے۔ پھر دو کمرے تھے اور پری کاسٹ کی چھت تھی جو گرمی میں بہت گرم ہو جاتی تھی۔ باہر کی دیواریں بغیر پلاستر کی تھیں اور مکان پر میں نے خود سفید رنگ کیا تھا۔ صحن کچا پکا تھا اور عقب میں دو سو گز کا حصہ تو بالکل ہی کچا تھا۔

مگر ہمارا اپنا گھر ہو گیا تھا۔ سیما نے اسے ہی سنوارنا شروع کیا۔ اس نے سامنے والے حصے اور صحن میں بیلیں اور پھولدار پودے لگائے تھے۔ عقبی حصے میں زمین ہموار کر کے اور روڑی پتھر نکال کر اس نے وہاں سبزیاں لگا لیں۔ چند مہینے بعد ہم گھر کی سبزی کھانے لگے تھے۔ یہ بھی ایک اچھی بچت تھی۔ گرمی میں ندی کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔ لائٹ جاتی یا گرمی زیادہ لگتی تو وہاں چارپائیاں ڈال لیتے تھے۔ ایک سال مشکل وقت گزرا۔ ابا جی اور میرا پہلا قرض ختم ہوا تو ہم نے کمیٹیاں ڈال کر مکان کی حالت سدھارنا شروع کی۔ باہر پلاستر کرایا۔ نیا رنگ و روغن کرایا۔ چھت پر سریا ڈال کر موٹا پلاستر کرایا اس سے گرمائش کم ہوئی تھی۔ کچن، باتھ روم وغیرہ نیا بنایا بجلی اب بھی کنڈے کی تھی۔ البتہ سامنے والے علاقے میں گیس آ گئی تھی اور ہم نے ایک گھر سے بات کر کے ان سے گیس کا کنکشن بھی لے لیا تھا۔ دو سال کے اندر ہمارا گھر سیٹ ہو گیا تھا۔ یہ جگہ ابا جی کو کام کے لحاظ سے بالکل پاس تھی وہ چند منٹ میں فیکٹری پہنچ جاتے تھے اور مجھے بھی شوروم یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں پڑتا تھا۔

☆☆☆

میں چھوٹے گودام میں سامان چیک کر رہا تھا کہ رحیم کریم بھائی نے طلب کر لیا۔ ''ناصر کیا کر رہے ہو؟''

''سر! سامان دیکھ رہا تھا۔''

''اسے چھوڑو، تم پورٹ جاؤ اور وہاں سے ٹرک لے کر آؤ۔''

اس سے پہلے بھی میں ایک بار پورٹ جا کر سامان لا چکا تھا اور مجھے علم تھا کہ یہ کام کیسے کرنا ہے۔ ''ٹھیک ہے سر کب جانا ہے اور کہاں جانا ہے؟''

''میرا ڈرائیور لے جائے گا اور ابھی جانا ہے۔'' وہ بولے۔ ''مگر سامان تمہیں اپنی نگرانی میں بڑے گودام میں رکھوانا ہے ممکن ہے اس میں رات ہو جائے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے سر! بھلے کل صبح ہو جائے میں سامان رکھوا کر جاؤں گا۔''

''بس تو روانہ ہو جاؤ۔''

ملازمت کے سات آٹھ سالوں میں رحیم کریم بھائی کو اب مجھ پر مکمل اعتماد ہو گیا تھا۔ وہ کئی کام میرے سپرد کرنے لگے تھے۔ جیسے بندرگاہ سے سامان لانا۔ فیکٹری میں مال تیار ہونا بہت کم ہو گیا تھا اور اب زیادہ تر باہر سے سامان آ رہا تھا۔ یہ سامان چین، تھائی لینڈ اور ویت نام سے آتا تھا۔ تھائی لینڈ اور ویت نام سے سانپوں اور مگرمچھ کی کھال کی بنی اشیا آتی تھیں اور چین سے نارمل لیدر سے بنے آئٹم

آتے تھے۔ ہر مہینے ایک دو کنٹینرز آتے تھے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ پورٹ پہنچا جہاں سارا کام ایجنسی والے کر چکے تھے۔ انہوں نے ضروری کاغذات اور کنٹینر والے ٹرکس میرے حوالے کیے۔ یہ بڑے ٹرک تھے اور رات بارہ بجے سے پہلے شہر میں ان کا داخلہ بند تھا۔ مگر میرے ساتھ آنے والے ڈرائیور کے پاس ایک خصوصی اجازت نامہ تھا۔ راستے میں جہاں ہمیں روکا جاتا وہ یہ اجازت نامہ دکھاتا اور ٹرکوں کو جانے کی اجازت مل جاتی۔

شام کے وقت ہم جب شاپنگ مال کی عقبی سڑک پر پہنچے تو بے پناہ رش کی وجہ سے ٹرک بڑی مشکل سے وہاں تک آئے تھے۔ پھر وہ رکے تو ان کی وجہ سے پوری سڑک بند ہوگئی اور وہاں سے گزرنے والوں کو گلیوں سے گھوم کر آگے جانا پڑ رہا تھا۔ مگر یہ یہاں کا معمول تھا تاجر اور دکان والے اسی طرح اپنا سامان لاتے تھے۔ شام سات بجے تک رش بہت کم ہو جاتا تھا۔ میں نے شوروم کے ملازموں کو بھی بلوا لیا اور وہ کنٹینرز سے سامان اتار کر اندر گودام میں پہنچانے لگے۔ میں کاغذات کے ہمراہ دیکھ رہا تھا کہ کس کارٹن میں کیا ہے اور اسے اس کی جگہ رکھوا رہا تھا۔ یہ خاصا مشکل اور دماغ گھما دینے والا کام تھا۔ یہ مشکل رات ایک بجے جا کر ہم فارغ ہوئے اور میں... گودام بند کروا کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سردیوں کے دن تھے اور میں نے جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ گھر پہنچا تو پتا چلا کہ کنٹینرز کے ساتھ آنے والے کاغذات میرے ساتھ آگئے ہیں۔ میں نے بے دھیانی میں انہیں جیکٹ میں رکھ لیا تھا۔ میں نے گھر میں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دیر سے آؤں گا مگر سیما میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

اس عرصے میں اللہ نے ہمیں بیٹا دیا تھا۔ اماں نے اس کا نام انصار رکھا تھا۔ میں نے اسے سوتے میں پیار کیا اور سیما سے کہا۔ ''کھانے کو ہے؟''

''کیوں نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''آج میں نے بھنڈی گوشت بنایا ہے۔''

''بس تو لے آؤ۔''

''میں گرم روٹی ڈالتی ہوں جب تک آپ منہ ہاتھ دھولیں۔''

میں منہ ہاتھ دھو کر آیا اور ایسے ہی کاغذات دیکھنے لگا۔ اس میں فہرست تھی کہ کون کون سے آئٹم آئے تھے اور ان کی کیا مالیت تھی اور ان پر کیا ڈیوٹی ادا کی گئی تھی؟ میں سرسری سی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ مگر یہ سب میرے ذہن میں

نہلے پہ دہلا

استاد۔ ''اگر دو میں سے دو نکال دیے جائیں تو کیا باقی بچے گا؟''

شاگرد۔ ''استاد جی نہایت مشکل سوال ہے، بالکل بھی سمجھ نہیں آیا۔''

استاد۔ ''چلو میں سمجھاتا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ فرض کرو تمہارے پاس دو مالٹے ہیں، اگر تم وہ دونوں کھالو، تو تمہارے پاس کیا باقی بچے گا؟''

شاگرد۔ ''جی چھلکے۔''

استاد۔ ''اوہو..... آخر تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ فرض کرو تمہارے پاس دو عدد نئے سوٹ ہیں۔ تم نے وہ دونوں کسی ضرورت مند کو دے دیے، تو تمہارے پاس باقی کیا بچا؟''

شاگرد۔ ''جی پرانے کپڑے۔''

استاد۔ ''عقل کے ناخن لو، چاہے مہنگے داموں ہی کیوں نہ خریدنے پڑیں..... میں ایک مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں اور یاد رکھو اب جو مثال میں دینے لگا ہوں، اس سے آسان مثال کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا امید ہے کہ تم اب درست جواب دو گے۔ فرض کرو تمہارے پاس دو روٹیاں تھیں، تم نے وہ دونوں کھالیں، اب بتاؤ دونوں روٹیاں ختم ہوجانے کے بعد تمہارے پاس کیا باقی بچا؟''

شاگرد۔ ''جی سالن۔''

استاد۔ ''دل کی اتھاہ گہرائیوں سے در فٹے منہ، اے منحوس انسان! سالن کو بھی چمچے سے کھا کر ختم کردے، دفع ہوجا، تے میری جان چھڈ۔''

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

بیٹھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سیما کھانا لے آئی اور میں کھانے میں لگ گیا۔ کیونکہ رات بہت دیر سے گھر پہنچا تھا اس لیے صبح گیارہ کے بجائے میں بارہ بجے شوروم پہنچا تو رحیم کریم بھائی آچکے تھے۔ میں نے کاغذات ان کے حوالے کیے۔ ''کل غلطی سے جیکٹ میں رکھ لیے تھے۔''

''ناصر اتم کون سے غیر ہو اپنے ہی آدمی ہو۔'' وہ بولے۔ ''سامان چیک کر لیا تھا؟''

''ایک ایک کارٹن سر۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر کھول کر نہیں دیکھا تھا۔''

"اس کی فکر مت کرو سامان پورا ہوگا۔" وہ بولے اور مجھ سے لیے کاغذات دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے اپنے بریف کیس سے ایک فائل نکالی اور اس کا موازنہ ان کاغذات سے کرنے لگے۔ اچانک نیچے سے ان کی کال آگئی اور وہ سب چیزیں یونہی چھوڑ کر نیچے چلے گئے۔ میں میز پر نزدیک ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے یونہی وہ فائل اٹھالی اور اسے دیکھا تو مجھے اس میں لکھی چیزیں کاغذات کی چیزوں سے میچ کرتی نظر آئیں۔ یعنی تعداد اور کوڈ نمبر یکساں تھے۔ فرق صرف قیمت میں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ فائل میں لکھی قیمتیں کاغذات میں لکھے آئٹمز کی قیمتوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ بعض آئٹمز کی قیمت میں تو دس گنا کا فرق آرہا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔ اتنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ رحیم کریم بھائی اپنے کاروباری معاملات سخت راز میں رکھتے تھے۔ وہ کچھ دیر بعد آئے اور انہوں فائل اور کاغذات اپنے بریف کیس میں رکھے اور اسے لاک کر دیا۔

شوروم میں چیزوں کی قیمت فکس ہوتی تھی اور ایک روپے کی کمی بھی نہیں کی جاتی تھی۔ اگرچہ میں نیچے ڈسپلے میں کم ہی جاتا تھا اور وہاں پر بھی چیز کی قیمت لکھی نہیں ہوتی تھی بلکہ ہر آئٹم کے ساتھ ایک کوڈ اسٹیکر ہوتا تھا جسے مشین کے آگے کرنے سے وہ قیمت بتاتی تھی۔ اس کا یہ فائدہ بھی تھا کہ گاہک چیز پسند کر لیتا اور اسے قیمت کا علم نہیں ہوتا تھا اس لیے جب وہ کاؤنٹر پر لے کر آتا تو قیمت سن کر شرما شرمی میں اسے لے ہی لیتا تھا۔ دو دن بعد ایک آئٹم جو حال میں ہی آیا تھا اور اس کنٹینر کا حصہ تھا جو میں لے کر آیا تھا۔ اس کی نیچے سے مانگ ہوئی۔

اتفاق سے میرے دونوں ماتحت وہاں نہیں تھے۔ اس لیے میں خود آئٹم لے کر نیچے سیلز کاؤنٹر پر آیا اور جب دے کر جانے لگا تو مشین پر اتفاق سے اس کی قیمت دیکھ لی۔ یہ مخصوص لیدر سے بنی ہوئی سوفٹ چپل تھی اور مشین اس کی قیمت ساڑھے تین ہزار روپے بتا رہی تھی۔ جب کہ مجھے اچھی طرح یاد تھا فائل میں اس کی قیمت جو ڈالرز میں تھی صرف دو ڈالرز اور بارہ سینٹ فی پیس تھی جب کہ بندرگاہ کے کاغذات میں اس کی قیمت ستاسی سینٹ دکھائی گئی تھی اور یہاں یہ تقریباً سینتیس ڈالرز میں بک رہی تھی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک پیس پر اتنا نفع بھی کمایا جاسکتا ہے۔ یعنی پندرہ سولہ گنا نفع۔ تبھی رحیم کریم بھائی اتنے دولت مند تھے۔ میں رشک کرتا ہوا واپس چھوٹے گودام میں آگیا۔

چند دن بعد رحیم کریم بھائی فخری بھائی پر گرج برس رہے تھے کہ شوروم کا بجلی کا بل اتنا زیادہ کیسے آیا۔ فخری بھائی بے چارے سر جھکائے کھڑے تھے اور دھیمی آواز میں وضاحت دینے کی کوشش کر رہے تھے مگر رحیم کریم بھائی ان کی ایک سننے کو تیار نہیں تھے۔ میں نے سن لیا کہ فخری بھائی کہہ رہے تھے کہ اس بار میٹر ریڈر کوئی دوسرا آیا تھا اور وہ اپنی مرضی سے ریڈنگ لے گیا تھا۔ اس وجہ سے بل اتنا زیادہ آیا تھا۔ رحیم کریم بھائی نے بل فخری بھائی کی طرف پھینکا اور بولے۔ "میں کچھ نہیں جانتا اسے ٹھیک کراؤ۔ حرام کا پیسا نہیں ہے میرے پاس بل بھرنے کے لیے۔"

بل اڑ کر میز سے نیچے میرے نزدیک گرا تھا اور میں نے جھک کر اسے اٹھایا تو میری نظر رقم پر گئی، یہ کل بتیس ہزار روپے کا بل تھا۔ میں حیران ہوا رحیم کریم بھائی اسے زیادہ کہہ رہے تھے۔ شوروم مکمل اے سی تھا اور اسے ٹھنڈا رکھنے کے لیے ڈیڑھ ٹن والے سات اے سی صبح گیارہ سے رات آٹھ بجے تک مسلسل کام کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ بل بھی کم تھا اور رحیم کریم بھائی اسے زیادہ کہتے ہوئے فخری بھائی سے اسے ٹھیک کرانے کو کہہ رہے تھے۔ تب کم بل کتنا آتا ہوگا۔ میں نے آج تک شوروم کا بجلی کا بل نہیں دیکھا تھا۔ میرا اس سے تعلق ہی نہیں تھا۔ میں نے بل فخری بھائی کو تھما دیا اور وہ بے چارے سر جھکا کر چلے گئے۔ میرے گھر میں تین پنکھے، ایک فریج، ایک ٹی وی اور ایک واشنگ مشین تھی۔ ان سب چیزوں کو استعمال کرنے پر کنڈے کا بل ڈھائی ہزار روپے آتا تھا اور یہ بھی مناسب تھا، اگر میٹر لگا ہوتا تو یہی بل ساڑھے تین ہزار سے کم نہیں آتا۔ رحیم کریم بھائی نے کسی قدر غصے سے کہا۔

"غضب خدا کا، اتنا بل کس خوشی میں ادا کروں ان لوگوں کو، ان کے منہ تو خون لگ گیا ہے۔ یہ فخری بھی نکما ہوتا جارہا ہے اسے معلوم ہی نہیں کہ میٹر چیک کرنے والا بدل گیا ہے۔"

"سر! انہیں کیسے پتا چلتا؟" میں نے دبی زبان میں کہا۔

وہ بھڑک کر بولے۔ "کیوں نہیں پتا چلتا، یہ اس کی ذمے داری ہے۔"

اگلے دن میں نے فخری بھائی سے پوچھا۔ "میٹر چیک کرنے والے سے آپ کیا کہیں گے؟"

"یہی کہ ریڈنگ بدل دے۔" وہ بولے۔ "لیکن

اس بار تو یہ بل ٹھیک گیا ہے اگلی بار میں اسے سیٹ کرلوں گا۔‘‘
’’وہ کیسے؟‘‘
’’یار کھلا پلا کر۔‘‘ وہ بولے۔
’’اس طرح بل کم آئے گا؟‘‘
’’بہت کم یوں سمجھ لو کہ ہمارا بل ستر اسی ہزار روپے آنا چاہیے مگر بیس ہزار سے زیادہ نہیں آتا ہے۔‘‘ فخری بھائی نے کہا تو میں حیران رہ گیا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم ایک چوتھائی بل ادا کر رہے تھے۔ مجھے ایک بار پھر رحیم کریم بھائی کی ذہانت پر رشک آیا۔

ان ہی دنوں رحیم کریم بھائی کی بیوی بیمار ہوگئیں۔ وہ ان کے علاج کی بھاگ دوڑ میں لگ گئے۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا مگر سننے میں آیا کہ انہیں کینسر ہوگیا تھا۔ جب یہاں ان کا علاج نہیں ہوسکا تو رحیم کریم بھائی انہیں باہر لے گئے۔ پر ان کا مرض لاعلاج ہوگیا تھا۔ دو مہینے بعد وہ انہیں آخری دموں پر واپس لائے کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ وہ آخری سانس اپنے گھر میں اور اپنے بچوں کے ساتھ لیں۔ واپس آنے کے ایک ہفتے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اس دوران میں رحیم کریم بھائی ایک بار بھی شو روم نہیں آئے تھے۔ طارق روڈ والے شو روم کے معاملات ان کے چھوٹے صاحبزادے صمیم بھائی دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں جنازے کے موقع پر دیکھا۔ تمام شو رومز اور فیکٹری کے سارے ملازمین جنازے میں شریک تھے۔

ان چند مہینوں میں رحیم کریم بھائی اچانک ہی اپنی عمر سے دس سال بڑے نظر آنے لگے تھے۔ وہ دلاسا دینے والوں سے گلے مل کر رو رہے تھے۔ جنازے کے بعد مجھے موقع ملا اور میں نے تعزیت کی تو وہ بولے۔ ’’بس ناصر میاں جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب تو بس مغفرت کی دعا ہی کرسکتا ہوں۔ پتا نہیں وہ بھی مجھ گناہ گار کی قبول ہوتی ہے یا نہیں۔ ناصر تم اچھے انسان ہو تم دعا کرنا۔‘‘

’’سر! اچھے انسان تو آپ ہیں۔‘‘ میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ’’نہ جانے کتنی نیکیاں روز کرتے ہیں۔ مجھ پر آپ کے کتنے احسانات ہیں۔‘‘

اس دوران میں کوئی اور صاحب آگئے اور رحیم کریم بھائی ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میں نے یہ دل سے رحیم کریم بھائی کو کہا تھا۔ ان کی وجہ سے آج ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مکان کے لیے جو قرض لیا تھا وہ اتار دیا تھا۔ مکان کی حالت بھی ایک حد تک بہتر ہوگئی تھی کیونکہ یہ کمرشل جگہ تھی اور یہاں مستقل مکان بنانا بیکار تھا۔ قیمت

خاصی بڑھ گئی تھی مگر آنے والے چند سالوں میں جب یہ جگہ پوری طرح آباد ہو جاتی تو اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہو جاتی اور تب ہم اس جگہ کو بیچ کر کسی اچھی جگہ مکان لے سکتے تھے۔

سوئم کے بعد رحیم کریم بھائی شوروم آئے تھے۔ دکھ ہلکا ہوا تھا اس لیے کاروبار کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ مگر بیٹھے ہوئے اچانک کھو سے جاتے تھے۔ انہوں نے اچانک کہا۔ ''ناصر! تم خوش قسمت ہو، تمہارے پاس مکان ہے بیوی ہے بچہ ہے ماں باپ ہیں۔''

''اللہ کا کرم ہے سر۔''

''میرے پاس اب سوائے ایک خالی مکان کے اور کچھ نہیں ہے۔''

''ایسا نہ کہیں سر! آپ کے ماشاءاللہ چار بچے ہیں ان کی بھی اولادیں ہیں۔''

''ہاں کہنے کو تو سب ہیں۔'' وہ کسی قدر تلخ لہجے میں بولے اور پھر کہا۔ ''چھوڑو میاں، یہ بتاؤ کہ مکان تمہارے نام پر ہے؟''

''نہیں ابا جی کے نام پر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ چونکے۔ ''وہ کیوں پیسا تو تمہارا لگا ہے؟''

''سر! بات یہ ہے کہ میرے لیے تو اماں اور ابا جی ہی سب سے بڑی دولت ہیں۔ اللہ ان کا سایہ ساری عمر سر پر رکھے اور باقی سب بھی ان کا ہی ہے۔''

میری بات پر رحیم کریم بھائی چپ ہو گئے تھے۔ یہ سچ تھا مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ مکان ابا جی نے اپنے نام کرایا ہے۔ میں تو سیدھا آدمی ہوں۔ سیما کے ذہن میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا۔ اس کے نزدیک بھی اہمیت انسانوں اور رشتوں کی تھی ان چیزوں کی نہیں تھی۔ اس گفتگو کے چند دن بعد میرا بڑا بھائی عامر ملا تو طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اماں ابا جی کو خوب پھانس رکھا ہے تم میاں بیوی نے۔''

میں چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ابا جی ہمیں تو رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور مکان بہو کو گفٹ کر دیا ہے۔''

''سیما کو؟'' میں ہکا بکا رہ گیا۔ ''مجھے اس بارے میں علم نہیں ہے۔''

''بھولے آج تم زیادہ ہی بھولے بن رہے ہو۔'' وہ ہنسا۔

میں نے گھر آ کر سیما سے پوچھا تو وہ بھی حیران ہوئی اور پھر ہم نے اماں اور ابا جی سے پوچھا تو ابا جی بولے۔ ''عامر نے ٹھیک کہا ہے، میں نے مکان سیما کے نام گفٹ کر دیا ہے۔''

''مگر کیوں ابا جی؟'' سیما بولی۔ ''سب آپ کا ہے ہم بھی آپ کے ہیں تو یہ کیوں کیا؟''

''یہ تو ہے بیٹا لیکن دنیا بہت ظالم ہے اور جہاں پیسا آ جائے وہاں خون خون کا دشمن بن جاتا ہے۔ میں نے احتیاطاً یہ کام کیا ہے۔ وہ لوگ ابھی سے اس جگہ پر نظر لگا رہے تھے اور یہ جگہ ناصر اور تمہاری ہے۔ اس لیے تمہارے نام گفٹ کر دی ہے۔ ویسے بھی چند سال کی بات ہے اسے بیچ کر جو جگہ لیں گے وہ پکی تم دونوں کے نام ہوگی۔''

میں نے اور سیما نے بہت منع کیا مگر ابا جی فیصلہ کر چکے تھے، انہوں نے گفٹ کے کاغذات اور پاور آف اٹارنی بھی ہمارے سپرد کر دی۔ میں نے رحیم کریم بھائی کو یہ بات بتائی تو وہ خوش ہو گئے۔ ''یاسر بہت اچھا اور سمجھدار آدمی ہے میں نے بھی اس لیے کہہ دیا تھا کہ تم سیدھے آدمی ہو کوئی تمہارے ساتھ زیادتی نہ کر جائے۔''

''میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا اس لیے کوئی میرے ساتھ بھی نہیں کر سکے گا۔ اللہ تو سب دیکھنے والا ہے۔''

رحیم کریم بھائی چونکے اور پھر انہوں نے زیر لب کہا۔ ''ہاں اللہ سب دیکھنے والا ہے۔''

رحیم کریم بھائی بیوی کے بعد بہت اکیلے اور اداس ہو گئے تھے۔ بیٹے اپنی فیملی اور زندگی میں مگن تھے۔ انہیں رحیم کریم بھائی کی تنہائی کا احساس نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے خود کو کاروبار میں مگن کر لیا۔ پہلے وہ شام چھ بجے گھر چلے جاتے تھے مگر اب وہ شام کے وقت کسی اور شوروم کا چکر لگاتے تھے۔ صبح کے وقت وہ فیکٹری میں ہوتے تھے۔

ویسے بھی رمضان کا سیزن نزدیک تھا اور صرف ایک مہینے میں سارے سال کی سیل کا چوتھا حصہ حاصل ہوتا تھا۔ اس لیے رحیم کریم بھائی ان دنوں نہ صرف خود بہت الرٹ ہوتے تھے بلکہ وہ ملازمین کو بھی الرٹ رکھتے تھے۔ ان دنوں نہ صرف نیا مال آتا بلکہ پرانا مال جو کسی وجہ سے فروخت ہونے سے رہ جاتا تھا اسے بھی نکال کر شروع دنوں میں اس کی سیل لگا دی جاتی تھی۔ اس بار بھی سیل لگی تھی۔ سیل میں چیز پر قیمت کی چٹ لگائی جاتی تھی تاکہ گاہک قیمت سے متاثر ہو کر خرید لے۔

ویسے قیمت کی چٹ لگانے کا کام نیچے ہوتا تھا مگر اس بار شوروم کی تزئین و آرائش کی وجہ سے یہ کام اوپر چھوٹے گودام میں ہو رہا تھا۔ مجھے یہاں کام کرتے ہوئے دس

سال ہونے کو آئے تھے اس لیے اگر کسی چیز کی درست قیمت کا علم نہ بھی ہو تب بھی مجھے آئیڈیا ہو جاتا تھا کہ یہ چیز اتنے کی ہے اور وہ اتنے کی ہی نکلتی تھی۔ مگر یہاں بہت سی چیزیں جن پر قیمت لگائی جارہی تھی، میں جانتا تھا کہ پہلے یہ کس قیمت پر نیچے ڈسپلے میں رکھی گئی تھیں اور میں حیران ہوا کہ یہ سیل میں ڈسپلے سے زیادہ قیمت میں فروخت کی جارہی تھیں۔ عام طور سے اشیا سال دو سال پرانی ہوتی تھیں جنہیں فروخت نہ ہونے کی وجہ سے گودام میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس طرح سیزن میں نکال کر فروخت کیا جاتا تھا۔ بعض چیزوں پر تو تین گنا زیادہ قیمت کی چٹ لگائی جارہی تھی۔ میں نے فخری بھائی سے کہا تو وہ بولے۔ ”یار یہی تو وقت ہوتا ہے ایسی چیزیں نکالنے کا، نئے آئٹمز کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اس لیے لوگ اسے ہی سستا سمجھ کر لے لیتے ہیں۔“

”حالانکہ یہ دو سے تین گنا زیادہ قیمت پر بیچی جارہی ہیں۔“

انہوں نے شانے اچکائے۔ ”اسی کا نام بزنس ہے۔“

میرا ابھی یہی خیال تھا کہ یہ بزنس ہے اور رحیم کریم بھائی کبھی کبھی کہتے تھے کہ محبت اور بزنس میں سب جائز ہے۔ سب چلتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ سیزن کا آغاز ہوتا اچانک ہی ریونیو کی ٹیم نے چھاپا مارا اور رحیم کریم بھائی کے تمام شورومز پر اپنے آدمی بٹھا دیے۔ مجھ جیسے ملازمین نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ سب کیوں ہو رہا تھا مگر جو سمجھتے تھے وہ کفِ افسوس مل رہے تھے اور سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے کہ اس بار سیزن تو گیا۔ سیل جو ان دنوں بعض اوقات دسیوں لاکھ میں چلی جاتی تھی، اچانک وہ گر کر لاکھ سے بھی نیچے رہ گئی تھی۔ شوروم میں ادائیگی کے لیے تین کاؤنٹر تھے اور ان میں سے دو بند کر دیے گئے تھے۔ صرف طارق روڈ والے ہی نہیں، تمام ہی شورومز کا یہی حال تھا اور صرف رحیم کریم بھائی کے بزنس کا نہیں بلکہ بہت سے معروف برانڈ شورومز میں یہی ہو رہا تھا....

شوروم شام کو جلد بند کر دیے جاتے تھے اور سات بجے ملازمین کو چھٹی دے دی جاتی تھی جبکہ ان دنوں شوروم کم سے کم بھی گیارہ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ ایک شام میں نکل رہا تھا فخری بھائی کی بائیک خراب ہو گئی تھی اور وہ کے سی ایچ ایس میں رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ جاتے ہوئے انہیں چھوڑتا جاؤں۔ راستے میں، میں نے پوچھا۔

”فخری بھائی! یہ کیا چکر ہے ریونیو والے کیوں آ کر بیٹھ گئے ہیں؟“

”تاکہ سیل جان سکیں۔“ فخری بھائی نے بتایا۔ ”ان کو سیل کے حساب سے ٹیکس جاتا ہے۔“

”تو کیا ٹیکس پورا نہیں دیتے؟“

فخری بھائی ہنسے۔ ”کون پورا دیتا ہے اور کیوں دے ان چوروں کو، یہ پیسا تو ان کے پیٹ میں جاتا ہے جو ہمارے حکمران بنے ہوئے ہیں۔“

”ٹیکس کتنا ہوتا ہے؟“

”ہوتا تو سمجھو کروڑوں میں ہے لیکن سیٹھ لاکھوں میں دیتا ہے۔ اب ان کی شامت بھی آئی ہے۔“

ریونیو والے دس دن رہے اور بہ قول فخری بھائی کے سیزن کا بیڑا غرق کر کے گئے تھے۔ ابھی اس صدمے سے نہیں سنبھلے تھے کہ صدر والے شوروم پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی اور کریکر پھینک گئے جس نے آگ لگا دی اور شوروم کا بڑا حصہ آگ نے تباہ کر دیا۔ رحیم کریم بھائی نے نامعلوم افراد کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی۔ ملازمین آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے کہ یہ بھتہ مانگنے والوں کی کارروائی ہے۔ رحیم کریم بھائی اور ان کے بیٹے ان دنوں بہت پریشان تھے۔ انہوں نے سیکیورٹی بڑھا دی تھی مگر یہ مسئلے کا حل نہیں تھا کیونکہ نجی سیکیورٹی گارڈ تو بالکل ناکارہ ہوتے ہیں۔ یہ مزاحمت کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ رحیم کریم بھائی جیسے اچھے آدمی پر ایک کے بعد ایک آفت آرہی تھی۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب عید سے ایک ہفتہ پہلے ان کا بیٹا جو فیکٹری دیکھتا تھا، اسے فیکٹری سے نکلتے ہی نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا۔

اغوا کرنے والوں نے بھاری تاوان مانگا اور رحیم کریم بھائی کے باقی بیٹے اتنے خوف زدہ ہوئے.... کہ انہوں نے شورومز میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ اکیلے رحیم کریم بھائی سب دیکھ رہے تھے اور اغوا ہونے والے بیٹے کی بازیابی کے لیے بھی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ عید آئی اور ان کے لیے سوگ کے ساتھ آئی۔ کیونکہ بیٹے کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ میں ایک سیدھا سا آدمی ہوں میرے گھر والے مجھے بھولا کہتے ہیں۔ میں نے بہت سوچا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ مگر میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ رحیم کریم بھائی کے ساتھ یہ کیوں ہو رہا ہے؟

شیش محل

اسماء قادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کرڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

"جولی! بریک فاسٹ ریڈی ہے ڈارلنگ! یو ہیو ٹو ٹیک اٹ، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔" کچن میں موجود جوزفین نے جب محسوس کیا کہ جولیٹ تیار ہو چکی ہے اور گھر سے نکلنے کے لیے پر تول رہی ہے تو وہیں سے آواز لگا کر اسے روکنے کی تدبیر کی۔ وہ درمیانی قامت کی گندمی رنگت والی عورت تھی جس کے بال سرخی مائل کتھئی تھے۔ متناسب جسم کے ساتھ چہرے کے اچھے نقوش سے ظاہر ہوتا تھا کہ جوانی میں وہ خاصی خوش شکل رہی ہو گی۔ وہ خوش اطوار بھی تھی اور اس کی سلیقہ مندی اس چھوٹے سے دو کمروں کے گھر سے پوری طرح ٹپکتی تھی۔

"او کے مام! یو ڈونٹ وری۔ میں بریک فاسٹ لے کر ہی گھر سے نکلوں گی۔" ناشتے کے لوازمات تیزی سے ٹرے میں رکھتے ہوئے اسے جولیٹ کی آواز سنائی دی تو چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ ٹرے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے وہ کچن سے باہر نکلی تو کمرے کے سامنے چھپر ڈال کر بنائے گئے برآمدے میں رکھی چار کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل پر اسے جولیٹ اور جوزف اپنے منتظر نظر آئے۔

"بہت زبردست خوشبو آرہی ہے، لگتا ہے آج تم نے بریک فاسٹ میں کچھ خاص تیار کیا ہے۔" اس کے ٹرے ٹیبل پر رکھنے سے پہلے ہی جوزف نے ناک سکیڑ کر خوشبو سونگھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"یس! آج میں نے لوکی کا حلوا بنایا ہے۔" جوزفین نے مسکرا کر اس کے اندازے کی تصدیق کی اور دونوں کے سامنے ناشتے کے لوازمات سجانے لگی۔ توس، آملیٹ اور چائے پر مشتمل ناشتے کے ان لوازمات کے درمیان لوکی کا حلوا بہت نمایاں نظر آرہا تھا۔ کش کی ہوئی لوکی کو معیاری گھی میں بھون کر اس میں بڑی مقدار میں کھویا شامل کیا گیا تھا۔ بادام کی گری اور چاندی کے ورق سے کی گئی سجاوٹ نے حلوے کی شان کچھ اور بڑھا دی تھی۔

"تھینک گاڈ کہ میں نے بغیر بریک فاسٹ لیے گھر سے نکلنے کی حماقت نہیں کی، ورنہ آپ کی اس اسپیشل سویٹ ڈش کو مس کرنے پر پچھتاتی۔" پیالے میں سجے حلوے کو دیکھ کر جولیٹ کی آنکھیں بھی چمکنے لگی تھیں۔ اس نے ناشتے کے لوازمات میں سے ہر شے کو نظر انداز کر کے حلوے والا پیالہ اپنے قریب کھینچا اور چھوٹی پلیٹ میں حلوا نکالنے کے بعد ایک چمچ منہ میں رکھا۔

"مارویلس مام! اٹس سو ڈیلیشیس۔ اس حلوے پر آ کر تو آپ کی ککنگ ختم ہے۔ میں نے اپنی لائف میں اس سے زیادہ ٹیسٹی چیز... کبھی نہیں کھائی۔ اس کو پکانے میں تو لگتا ہے آپ کوئی جادو کرتی ہیں۔ سچ بتائیں آپ نے یہ جادو کہاں سے سیکھا؟" پہلے لقمے کے ساتھ ہی اس نے حسب معمول تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیے تھے۔ جوزفین اس حلوے کے لیے اس کی پسندیدگی سے واقف تھی۔ چنانچہ باوقار انداز میں مسکراتے ہوئے تعریفیں سنتی رہی لیکن آخر میں جولیٹ کے کیے گئے سوال پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جوزف نے اس کے چہرے کا یہ تاثر فوراً محسوس کر لیا چنانچہ جولیٹ کی توجہ ہٹانے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوا اور ٹوکنے والے انداز میں بولا۔

"یو آر گیٹنگ لیٹ جولی۔ جلدی سے اپنا بریک فاسٹ فنش کر کے نکلو ورنہ آفس کو لیٹ ہو جائیں گا۔ تمہارا نیا نیا جاب ہے ابھی سے لیٹ جانے لگا تو تمہارا وہ نیوز پیپر کا آنر تمہارے ہاتھ میں ٹرمینیشن لیٹر پکڑا دیں گا۔"

"او کے ڈیڈ! آئی ایم گوئنگ پر یاد رکھنا کہ میری واپسی تک یہ حلوا ختم نہیں ہونا چاہیے۔ شام میں واپس آ کر مجھے یہ کھانا ہے۔" وہ اپنی پلیٹ میں موجود حلوے کا آخری چمچ منہ میں رکھتے ہوئے جوزف کو تنبیہ کرنے کے انداز میں بولی اور نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"یو نو میں چاہوں بھی تو یہ حلوا فنش نہیں کر سکتا۔ تمہاری مام خزانے کے سانپ کے مافق تمہاری واپسی تک اس کی حفاظت کرے گی۔" جوزف نے جوزفین کو چھیڑنے والے انداز میں کہا تو جولیٹ نے ہنستے ہوئے اپنا شولڈر بیگ کندھے پر لٹکایا اور دونوں کو "بائے" کہتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ اپنے ماں باپ کی خود سے بے تحاشا محبت سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ وہ دونوں ہی اس کی ہر خواہش اور تمنا پوری کرنے کے لیے ہر دم دل و جان سے تیار رہتے ہیں۔ حقیقتاً اکلوتی بیٹی ہونے کے ناتے جولیٹ ہی ان کی کل کائنات تھی اور انہوں نے اپنی بساط کے مطابق اسے ہمیشہ اچھے سے اچھا لباس، غذا اور تعلیم فراہم کرنے کی کوشش کی تھی۔ جولیٹ نے بھی ان کا مان رکھا تھا اور پوری دل جمعی سے صحافت میں ڈگری لینے کے بعد ایک اخبار کے دفتر میں نوکری کر رہی تھی۔ وہ ممبئی کے جس علاقے میں رہتے تھے وہ خاصا قدیم تھا اور ملی جلی آبادی پر مشتمل تھا۔ گھر سے نکل کر باہر قدم رکھتے ہی اس کی نظر للیتا موسی پر پڑی۔ وہ اپنے گھر کے سامنے گلی میں صفائی کر رہی تھی۔ یہ ایک قدرے تنگ گلی تھی لیکن للیتا موسی کی طرح محلے کی دوسری عورتیں بھی بڑی

پابندی سے اپنے گھروں کے سامنے سے کچرا صاف کرنے کی عادی تھیں چنانچہ جگہ کی تنگی کے باوجود گلی سے گزرتے ہوئے بھی الجھن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پھول دار لانگ اسکرٹ میں سفید رنگ کا آدھی آستینوں والا بلاؤز پہنے جولیٹ بھی پورے اطمینان سے قدم اٹھاتی آگے بڑھتی رہی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی جس کے نقوش میں اپنی ماں کی شباہت تھی لیکن اس کا رنگ جوزفین سے صاف اور قد دراز تھا۔ اس کے بالوں کی رنگت بھی سیاہ تھی اور یہ سیاہ بال اس کے کھلتے ہوئے رنگ پر خوب جچتے تھے۔ بال اگرچہ بہت لمبے نہیں تھے لیکن اپنے گھنے پن اور چمک کی وجہ سے دلکش لگتے تھے۔ موسم قدرے گرم ہونے کی وجہ سے آج اس نے اپنے بالوں کو اونچی پونی ٹیل کی شکل میں باندھ رکھا تھا تاکہ گردن وغیرہ پر ہوا لگتی رہے۔ گردن کو پسینے سے بچانے کے لیے گلابی رنگ کا اسکارف پیچھے کی طرف ڈھلکا کر ذرا بے پروائی سے شانوں پر ڈالا گیا تھا۔ وہ مختلف انداز کے ملبوسات پہنا کرتی تھی اور ان ملبوسات کو خریدتے وقت بھی اس بات کو دھیان میں نہیں رکھا تھا کہ کون سا لباس کس قوم یا مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ پہنتے ہیں۔

البتہ جوزفین نے اسے ابتدا سے ایسا لباس پہننے کی عادت ڈالی تھی جس میں جسم کو ڈھانپنے کا اہتمام ہو۔ وہ خود بھی اسی طرح کے کپڑے پہنتی تھی اور اپنی ہی طرح جولیٹ کو بھی لباس کے ساتھ اسکارف کا استعمال کرواتی تھی۔

”گڈ مارننگ موسی۔“ للیتا کے قریب پہنچ کر اس نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

”سکھی رہو۔ بھگوان لمبی عمر دے۔“ للیتا جو اسے دیکھ کر پہلے ہی جھاڑو والا ہاتھ روک چکی تھی، محبت سے دعائیں دینے لگی۔ اس محلے کا یہی رواج تھا۔ مذہب اور رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر بزرگ محلے کے ہر بچے کو اپنی محبت سے نوازتے تھے۔ للیتا کی ان محبت بھری دعاؤں کے جواب میں جولیٹ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اب وہ گلی کے آخری مکان کے قریب پہنچ چکی تھی۔ یہ دو منزلہ مکان تھا اور اپنے مکینوں کی نوعیت کے اعتبار سے پورے محلے میں سب سے منفرد قرار پاتا تھا۔ اس مکان میں کوئی عورت نہیں رہتی تھی بلکہ دنیا جہاں کے مردوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ عام فہم الفاظ میں وہ مکان ایک اڈا تھا جہاں ممبئی کے مختلف داداؤں اور ان کے چیلوں کا ٹھکانا تھا۔ محلے کے عام لوگ اڈے سے تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اڈے والوں نے کبھی محلے داروں کو تنگ نہیں کیا تھا۔ ان کی اپنی ہی دنیا تھی اور وہ اس میں مگن رہتے تھے۔ اس محلے میں انہیں آباد ہوئے ابھی سال بھر بھی نہیں گزرا تھا۔ محلے والے اگرچہ ان کی یہاں موجودگی کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ابھی تک ان کے ہاتھ ایسی کوئی وجہ بھی نہیں آئی تھی کہ وہ اڈے والوں کو یہاں سے نکلنے کا مطالبہ کرسکتے۔ تمام عام لوگوں کی طرح جولیٹ بھی اپنے محلے میں اس اڈے کی موجودگی کو ناپسند کرتی تھی اور اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے ناگواری کا احساس ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی احساس کے تحت تھی کہ ناگواری کچھ اور بڑھ گئی۔ اضافے کی وجہ معمول کے مطابق اڈے کے بڑے دروازے کے سامنے کھڑا شخص تھا۔ خاکی پتلون پر چیک دار شرٹ میں ملبوس اس شخص کا قد دراز اور جسم مضبوط تھا۔ شکل و صورت بھی بے شک اچھی تھی لیکن جولیٹ نے اسے کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اڈے کا آدمی تھا، اس کے برا لگنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ حالانکہ اس نے کبھی جولیٹ کے ساتھ کوئی اوچھی حرکت نہیں کی تھی۔ جولیٹ وہاں سے گزرتی تو وہ اس پر ایک خاموش نگاہ ڈالتا اور نظریں جھکا لیتا لیکن اس ایک خاموش نگاہ میں ہی جانے کیا تھا کہ جولیٹ جھنجلا جاتی۔ اس کا دل چاہتا کہ اس شخص کے یہاں کھڑا ہونے پر پابندی لگا دے یا خود کسی دوسرے راستے سے چلی جایا کرے لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ گلی کا دوسرا سرا بند تھا اور اسٹاپ تک پہنچنے کے لیے اسے ہر حال میں یہاں سے گزرنا تھا۔ اس ناپسندیدہ صورتِ حال پر کوفت زدہ وہ گلی سے باہر نکلی تو فٹ پاتھ پر ڈیرا ڈال کر بیٹھے فقیر نے دستِ طلب دراز کردیا۔ وہ عجیب فقیر تھا۔ زبان سے کبھی سوال نہ کرتا تھا بس کبھی کبھار کسی راہ گیر کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتا اور ایسا بھی شاذونادر ہی ہوتا تھا۔ جولیٹ کے سامنے بھی اس نے آج پہلی بار ہاتھ پھیلایا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنے بیگ کی زپ کھول کر اس میں سے ریزگاری نکالی اور فقیر کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دی۔

”رب بہت دے گا۔ بہت نوازے گا پر پہلے آنکھیں کھول کر دیکھنا سیکھ۔ جس راستے پر چلتی ہے وہ تیری منزل تک نہیں جاتا۔“ وہ قدم آگے بڑھا چکی تھی جب فقیر کی آواز نے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا لیکن وہ تو یوں سر نیہوڑا کر بیٹھ چکا تھا جیسے اردگرد سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ جولیٹ ذرا تذبذب کا شکار ہوئی لیکن آفس سے دیر ہو جانے کے خیال نے قدم آگے بڑھانے پر مجبور کردیا۔ بس میں سوار ہوکر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتے ہوئے وہ فقیر

کے جملے کو دیوانے کی بڑ سمجھ کر ذہن سے جھٹکنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

فاروق نے اسے دور سے ہی آتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اس نے سفید بلاؤز کے ساتھ پھول دار لانگ اسکرٹ اور گلابی اسکارف پہن رکھا تھا اور صبح صبح کھلنے والے کسی خوب صورت پھول ہی کی طرح تروتازہ لگ رہی تھی۔ دراز قامت کے ساتھ سانچے میں ڈھلا بدن اس کی شخصیت کو مزید نمایاں کرتا تھا۔ اس کی چال میں ایک طرح کی تمکنت اور وقار تھا اور اسے دیکھ کر بالکل بھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس عام سے محلے کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے والی لڑکی ہے۔ وہ تو یہاں اس ماحول میں ایسی لگتی تھی جیسے کوئی محلوں کی شہزادی راستہ بھٹک کر بھولے سے اس طرف آنکلی ہو۔ فاروق پچھلے ایک سال سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہر صبح لگ بھگ اسی وقت گھر سے نکلا کرتی تھی۔ اس عرصے میں اس میں اگر کوئی فرق آیا تھا تو صرف اتنا کہ پہلے وہ کتابیں سینے سے لگائے گلی سے گزرتی تھی اور ایک طالبہ تھی جبکہ اب وہ ایک ملازمت پیشہ لڑکی تھی جس کے چہرے پر پہلے کے مقابلے میں زیادہ اعتماد نظر آتا تھا۔ فاروق کے دیکھتے دیکھتے وہ للیتا موسی کے مکان تک پہنچی اور چند پل وہاں ٹھہر کر موسی سے بات کی۔ دور ہونے کے باوجود فاروق جانتا تھا کہ موسی سے بات کرتے ہوئے وہ اپنی عادت کے مطابق دھیرے سے مسکرائی ہوگی اور مسکرانے کے نتیجے میں اس کے بائیں رخسار پر ایک من موہنا سا ڈمپل پڑ گیا ہوگا۔ جولی کی شخصیت میں یہ ڈمپل اسے سب سے زیادہ پرکشش لگتا تھا اور...۔ بے اختیار ہی اس کا دل مچل جاتا تھا کہ اس ننھے سے گڑھے کو اپنی شہادت کی انگلی سے چھو کر دیکھے لیکن دل میں مچلنے والی اس خواہش کی حیثیت ایک ایسے خواب کے مانند تھی جس کے نصیب میں تعبیر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ سچ یہ تھا کہ چھونا تو دور کی بات فاروق تو اس ڈمپل کے دیدار کے لیے بھی ترس جاتا تھا اور کوئی اتفاق ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ جولیٹ کو مسکراتے ہوئے دیکھ لے۔ اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے تو جولی کے چہرے پر ہمیشہ بے پناہ سنجیدگی چھا جاتی اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اگر یہ گلی سے نکلنے کا واحد راستہ نہ ہوتا تو وہ کبھی اس کے سامنے سے نہ گزرتی۔ اپنی رہائش گاہ کے مضبوط دروازے کے سامنے کھڑے فاروق کو اس کے دلی جذبات پہچاننے میں ملکہ حاصل تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی محض ایک دید کی خواہش سے بھی دامن نہیں چھڑا سکا تھا۔ گلی میں آگے بڑھتی جولی اب اس کے اتنے قریب آچکی تھی کہ وہ اس کے قدموں کی چاپ سن سکتا تھا اور پسینے کے ان ننھے منے قطروں کو بھی دیکھ سکتا تھا جو موسم خاصا گرم ہونے کی وجہ سے گھر سے نکل کر چند قدم چلنے پر ہی اس کے ماتھے اور ہونٹ سے اوپر نمودار ہو گئے تھے۔ جولی کی گلابی رنگت پر ابھرے ان شفاف قطروں کو دیکھ کر اسے گلاب کی پتیوں پر موجود شبنم کی روایتی تشبیہ ہی یاد آسکی اور وہ اپنی آنکھوں میں شوق اور چاہت کے سارے رنگ لیے یک ٹک اسے دیکھتا ہی چلا گیا۔ اپنی اس... بےخودی کا اسے اس وقت احساس ہوا جب اس نے جولی کی پیشانی پر نمودار ہونے والی ناگواری کی لکیر دیکھی۔ اس لکیر نے یکدم ہی اس کے دل کو بوجھل کر دیا اور وہ جولی کے نکڑ پر غائب ہوتے ہی اپنے پیچھے موجود دروازے کو دھکیل کے مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر کی طرف جاتے ہوئے اس نے دروازے کو دوبارہ بند کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ یہ کام قریب موجود گولو نے انجام دیا۔ پستہ قامت اور فربہ گول مٹول سا گولو دروازہ بند کر کے پلٹا تب تک وہ اوپر کی منزل پر جاتی سیڑھیوں پر قدم رکھ چکا تھا۔

''آپ کے لیے باداموں والا حریرہ لے کر آؤں فاروق بھائی؟'' گولو کسی فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔

''نہیں۔'' فاروق نے یک لفظی جواب دیا اور تیزی سے باقی کی سیڑھیاں بھی چڑھ گیا۔ گولو کچھ اداس اور مایوس سا واپس پلٹا۔ سامنے ہی تخت پر شوخ و چنچل راموگاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز وہ حقہ گڑگڑانے میں مصروف تھا جسے کچھ دیر قبل ہی گولو نے تازہ کر کے اس کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اداس سا گولو رامو کے تخت کے پائے سے پشت لگا کر زمین پر ہی بیٹھ گیا۔

''کیا ہے رے، یہ اداس بلبل کی سی صورت کیوں بنالی ہے؟'' راموجس نے سارا منظر خود دیکھا تھا اسے چھیڑے بغیر نہیں رہ سکا۔

''فاروق بھائی نے اپنے کو کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ صبح اذانوں سے بھی پہلے سے اٹھ کر کسرت میں لگے ہوئے تھے۔ اپن نے خاص طور پر ان کے لیے باداموں والا حریرہ تیار کروایا تھا لیکن انہوں نے صاف منع کر دیا۔'' گولو کو بھی کسی غمگسار کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ فٹ روہانسی آواز میں اپنا دکھ کہہ ڈالا۔

''ابے چل جا سالے، دیکھتا نہیں کہ تیرے فاروق

بھائی ابھی ابھی شربتِ دیدار پی کر آئے ہیں۔ اب انہیں بھلا تیرا بادا موں والا حریرہ پینے کی کیا ضرورت رہ گئی ہے۔ چل جا وہ حریرہ میرے لیے لے آ۔ تیرے فاروق بھائی جتنی نہ سہی پر دو چار بیٹھکیں تو اپن نے بھی لگائی ہیں۔ اپن کو بھی حریرے کی ضرورت ہے۔'' رامو نے شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا تو گولو بدک گیا۔

''بالکل نہیں۔ وہ حریرہ تو اپن صرف فاروق بھائی کو ہی پلائے گا۔ اگر آپ کا من کرتا ہے تو سجو کو بلا کر اپنے لیے آرڈر کر دو۔'' ساجد عرف سجو کی حیثیت اڈے پر باورچی کی سی تھی اور وہ اپنے دھان پان سے وجود کے ساتھ یہاں موجود افراد کی فوج ظفر موج کے لیے بلا تکان فرمائشی کھانے تیار کر کے فراہم کرتا رہتا تھا۔

''وہ سجو بھی تو تیری طرح حرام کا جنا ہی ہے۔ آرڈر پر حریرہ بنا تو دے گا پر ویسا نہیں بنائے گا جیسا تیرے فاروق بھائی کے لیے بناتا ہے۔'' رامو نے مصنوعی حسد کا اظہار کیا۔

''کوئی فاروق بھائی جیسا ہوئیں گا تو اس کی ویسی خدمت بھی ہوئیں گی نا۔ ماں قسم بابا کے بعد بس فاروق بھائی ہی تو ہے جس پر جان وارنے کو من کرتا ہے۔ اوپر والے نے جانے انہیں کیسی مٹی سے بنایا ہے کہ من آپ ہی آپ ان کی طرف لپکنے لگتا ہے۔'' گولو نے پوری سچائی سے اپنے دل کی بات کہی تو رامو کو بھی قائل ہونا پڑا۔ گولو سے چھیڑ چھاڑ اپنی جگہ مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ خود بھی اپنے دل میں فاروق کے لیے گہری محبت رکھتا تھا اور اس محبت کے باعث ایک نظر میں ہی یہ بات بھانپ گیا تھا کہ باہر سے اندر آنے والا فاروق بہت دل گرفتہ تھا۔ اس بات کو وہ گولو کے سامنے ظاہر کر کے اسے مزید اداس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے چھیڑ چھاڑ کر کے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔

''یہ جو تم کہہ رہے تھے کہ فاروق بھائی کوئی شربت پی کر آئے ہیں۔ کیا نام ہے اس شربت کا؟ اپن نے پہلے بھی سنا نہیں دوبارہ بتا دو۔ اگر فاروق بھائی کو پسند ہے تو اپن سجو سے کہہ کر ان کے لیے وہی شربت بنوا دے گا۔'' حسبِ توقع گولو کی ذہنی رو مڑ چکی تھی۔ رامو اس کی بات سن کر گلا پھاڑ کر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ اسے یوں ہنستا دیکھ کر پہلے تو گولو کا منہ حیرت سے کھلا پھر اس پر ناراضگی کا رنگ نظر آنے لگا۔

''ایسے گلا پھاڑ کر کیوں ہنس رہے ہو؟ شربت کا نام ہی تو پوچھا ہے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا اپن نے۔'' آخر جب گولو سے برداشت نہیں ہوا تو قدرے تیز لہجے میں اسے ٹوک بیٹھا مگر رامو پر پڑا ہنسی کا دورہ ختم نہیں ہوا۔ اسی وقت سیڑھیوں پر بے چاپ قدموں سے چلتا ایک لگ بھگ پینتالیس سال کا رعب دار آدمی نمودار ہوا۔

''بابا......!'' آنے والے پر پہلے گولو کی نظر پڑی اور اس نے دھیمی آواز میں بے تحاشا ہنستے رامو کو خبردار کیا۔ رامو کی ہنسی کو جیسے فوراً ہی کسی نے لگام کھینچ لی اور وہ کسی سدھے ہوئے گھوڑے کے مانند نظر آنے لگا۔

''کیا ہے بے! کیوں لوٹ پوٹ ہوا جا رہا ہے؟'' آنے والے کی شخصیت کی طرح اس کی آواز بھی رعب دار اور گونجیلی تھی۔ وہ مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا جس کے سانولے چہرے پر موجود بڑی بڑی آنکھوں میں بے حد گہرائی تھی اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ آسانی سے کسی پر کھلنے والا آدمی نہیں ہے۔ اس کے بائیں رخسار پر قریباً ڈھائی انچ لمبا چاقو کے زخم کا نشان تھا لیکن اس نشان کی موجودگی نے اسے بدوضع یا بدصورت نہیں بنایا تھا۔ وہ بس ایک پختہ کار آدمی کے ماتھے پر پڑی تجربے کی لکیر کا سا تھا جو سامنے والے کو اس کی زندگی سے گہری وابستگی اور دنیا کی پرکھ سے آگاہ کرتا خود ہی سمجھا دیتا تھا کہ اس کے سامنے ذرا سنبھل کر رہنا ہے کیونکہ وہ کوئی اناڑی نہیں جسے زندگی کو برتنے کا گر نہ آتا ہو۔ رامو بھی اسے سامنے پا کر سنبھل گیا اور مؤدب ہو بیٹھا۔

''بابا! دیکھو یہ رامو بھیا اپن کا مجاق (مذاق) اڑاتا ہے۔ ابھی اپن سے بولا کہ فاروق بھائی باہر سے کوئی شربت پی کر آیا ہے اس لیے حریرہ نہیں پیے گا۔ اپن بولا تم نے جو ابھی شربت کا نام لیا تھا وہ دوبارہ بتا دو تو اپن سجو سے کہہ کر فاروق بھائی کے لیے ادھر ہی بنوا دے گا لیکن یہ بجائے اپن کو شربت کا نام بتانے کے زور زور سے ہنسنے لگا۔'' رامو کے کوئی جواب دینے سے قبل ہی گولو ربن دادا کے قریب آ کر منہ بسورتے ہوئے اس سے شکایت کرنے لگا۔

ربن نے اسے قریب کر لیا اور اس کے شانے پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''کیوں بے رامو! یہ میرا چھوٹا شہزادہ کیا کہہ رہا ہے۔ تو نے اسے کس لیے ناراض کیا ہے؟'' ربن کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ رامو کی گوشمالی سے زیادہ گولو کی دل داری مقصود ہے ورنہ وہ بھی یہ بات سمجھ چکا ہے کہ گولو سے کوئی بے وقوفی سرزد ہوئی ہے جس پر رامو نے اسے مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ پندرہ سالہ گولو جواب سے تقریباً آٹھ سال قبل صرف سات سال کی عمر میں اڈے پر اس کے ساتھ آیا تھا، اسے دل و جان سے عزیز تھا۔ گولو کی ذہنی استعداد ذرا کم تھی اس لیے اتنے برس اڈے پر گزارنے

کے باوجود اس نے یہاں سے کوئی فن نہیں سیکھا تھا۔ اس کی انگلیوں کو نہ تو چاقو پکڑنے کا ہنر آتا تھا اور نہ ہی وہ لاٹھی اور بلم چلانا جانتا تھا۔ حد تو یہ کہ اس میں اڈے کے لوگوں کی سی جی داری بھی نہیں تھی کہ کسی کے بھی سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ بہت سیدھا سادہ اور معصوم تھا جو بنا کہے بھی دوڑ دوڑ کر ہر ایک کی خدمت بجا لانے کو تیار رہتا تھا۔ حالانکہ یہ خدمت اس کے یہاں رہنے کی شرط نہیں تھی۔ وہ ربن دادا کا لاڈلا اور نورِ نظر تھا اس لیے خود بخود ہی اڈے کے ہر آدمی کے لیے اہم ہو گیا تھا۔ شروع میں تو ہر شخص اس سے کوئی خدمت لیتے ہوئے جھجکتا تھا کہ کہیں دادا کو یہ بات بری نہ لگے لیکن ایک دن ربن دادا نے خود ہی کہہ دیا کہ اگر گولو اپنی مرضی اور خواہش سے کوئی کام کرنا چاہے تو اسے روکا نہ جائے۔ اصل میں دادا آدمی کے بیکار رہنے کا قائل نہیں تھا اور اس کا کہنا تھا کہ ہر شخص کو اپنی اپنی اہلیت کے مطابق کچھ نہ کچھ کام انجام دیتے رہنا چاہیے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والا اس کے نزدیک ''مردے'' کے برابر ہوتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ مردے کی جگہ زمین کے اوپر نہیں بلکہ زمین کے نیچے ہوتی ہے۔ سو گولو بھی اس کا لاڈلا ہونے کے باوجود بیکار نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ہاں کوئی بھی کام کرنے کے لیے اس کی مرضی کی شرط البتہ ضرور لاگو ہوتی تھی۔ اگر گولو بھی کسی کام سے انکار کر دیتا تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے زبردستی کر سکے۔ ویسے وہ بہت فرمانبردار اور تابعدار طبیعت کا لڑکا تھا اور شاذ ہی ایسی نوبت آتی تھی کہ وہ کسی کے کہے کو ٹال دے۔ وہ تو خود ہی بڑھ بڑھ کر سب کی خدمت کرتا رہتا تھا۔
اس کی وجہ تسمیہ بھی خوب تھی۔ رامو نے اس کے گول مٹول بدن کو دیکھتے ہوئے پہلی بار اسے گولو کہہ کر پکارا تھا اور اس کے بعد سب کی زبان پر یہی نام چڑھ گیا تھا۔ اب تو شاید کسی کو یاد بھی نہیں تھا کہ آٹھ سال قبل جب وہ دادا کے ساتھ یہاں آیا تھا تو اس نے اپنا نام صابر بتایا تھا۔ ہاں اس کی ذات سے وابستہ کہانی سب کو یاد تھی۔ وہ ربن دادا کو ایک ایسے ویران ریلوے اسٹیشن پر ملا تھا جہاں ریل مشکل سے منٹ بھر کے لیے رکتی تھی۔ دادا جو اپنے ایک ساتھی کے ساتھ کسی کام کی غرض سے وہاں چکراتا پھر رہا تھا ایک سات سالہ بچے کو پانی کی صراحی ہاتھ میں لیے ٹرین کے پیچھے بھاگتا دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ گولو اس وقت بھی گول مٹول تھا اور صراحی ہاتھ میں لیے بہت مشکل سے بھاگ رہا تھا۔
ربن کو ڈر ہوا کہ کہیں وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھی کو اس کے پیچھے دوڑا دیا۔ اس کا ساتھی جب گولو کو پکڑ کر اس کے سامنے لایا تو گولو ہچکیوں سے رو رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ ناک اور منہ سے بھی پانی بہہ رہا تھا۔ روتے ہوئے وہ جو کچھ بول رہا تھا، اس میں سے واحد لفظ ''اماں'' ہی ربن کی سمجھ میں آ رہا تھا اور اس نے اپنے طور پر سمجھ لیا تھا کہ گزر جانے والی ریل میں اس بچے کی ماں سوار تھی جس سے وہ بچھڑ گیا تھا۔ اس نے سمجھا بجھا اور پچکار کر بڑی مشکل سے گولو کو خاموش کروایا اور جب وہ اس لائق ہو سکا کہ کچھ بول سکے تو اس سے اس کی داستان پوچھی۔ گولو اتنا ذہین نہیں تھا کہ روانی کے ساتھ اپنی پوری داستان سنا دیتا۔ ربن دادا نے اپنے نپے تلے سوالوں کے ذریعے اس کی کہانی سنی اور اس معصوم بچے پر حالات کی سختی جان کر دم بخود رہ گیا۔ گولو کے جوابات کی روشنی میں جو کہانی سامنے آئی تھی، اس کے مطابق وہ کسی چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا جہاں اس کا باپ خوش حال زمیندار تھا۔ گولو نے بتایا کہ پہلے وہ اپنے گھر میں اپنے باپ اور دادی کے ساتھ رہتا تھا لیکن ایک دن اس کی دادی مر گئی اور باپ اس کے لیے ماں لے آیا۔ سجی سنوری بھاری زیورات سے لدی یہ جوان ماں گولو کو بوڑھی ہر دم کھانستے رہنے والی دادی کے مقابلے میں بہت اچھی لگی۔ باپ نے بھی اسے یہی بتایا تھا کہ اب دادی کی جگہ ماں اس کا خیال رکھے گی۔ وہ ماں سے محروم تھا اور دوسرے بچوں کو اپنی ماؤں کے ساتھ لاڈ کرتے دیکھ کر کچھ محرومی محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اپنے لیے ماں پا کر بہت خوش ہوا اور بڑے لاڈ سے اسے اماں پکارنے لگا۔
لیکن اماں کو جانے یہ پکار اچھی کیوں نہیں لگتی تھی۔ باپ کے سامنے تو وہ پھر بھی نرم لہجے میں اسے جواب دے دیتی لیکن تنہائی میں تو نظر بھی نہ ڈالتی۔ گولو کھانے پینے کا شوقین تھا اور گھر میں فراوانی کی وجہ سے اس شوق کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ وہ ملازمہ سے جو کچھ مانگتا، وہ کھانے کے لیے حاضر کر دیتی اور اسے کھاتے دیکھ کر ماں اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتی رہتی۔ گولو جو شروع میں اس کے آنے سے بہت خوش تھا بعد میں اس سے خوف زدہ رہنے لگا اور خوف کی وجہ سے دور دور بھی لیکن جب ماں نے ایک ننھے سے وجود کو جنم دیا تو وہ اپنے چھوٹے سے بھائی کی محبت میں دوبارہ اس کے اردگرد منڈلانے لگا۔ آنے والے چھوٹے بھائی سے اسے اس درجے محبت تھی کہ جب ماں چالیس دن کا پانی نہا کر اپنے میکے کے لیے روانہ ہونے لگی تو وہ بھی اس کے ساتھ جانے کو بہ ضد ہو گیا۔ پہلے تو ماں نے انکار کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر راضی ہو گئی۔

گولو کا باپ اس سفر میں ساتھ نہیں جارہا تھا۔ اس کے کھیتوں میں فصل کٹائی کے لیے تیار کھڑی تھی اور اس کا ان دنوں گاؤں میں رہنا بہت ضروری تھا۔ اس نے سفر میں بیوی اور بچوں کو سنبھالنے کے لیے ایک ملازمہ اور مرد ملازم کو ساتھ کردیا۔ ملازمہ کو ان کے ساتھ ساتھ ہی رہنا تھا جبکہ مرد ملازم مردانہ ڈبے میں سفر کررہا تھا۔ جب کسی اسٹیشن پر گاڑی رکتی تو وہ آکر ان کی خیر خیریت دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ ضرورت کی اشیا بھی اسٹیشن پر سے خرید کر فراہم کردیتا۔ گولو اس سفر میں بہت خوش تھا۔ یہ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ ریل سے اتنا طویل سفر کررہا تھا۔ ریل کی کھڑکی سے باہر دوڑتے مناظر کو دیکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کے لیے خوشی کی ایک بات یہ بھی تھی کہ ماں سفر میں اس کے ساتھ اچھا سلوک کررہی تھی۔ اس نے گولو کو حلوے کے ساتھ کھانے کے لیے پوریاں بھی دل بھر کر دی تھیں اور کبابوں کے لیے بھی اس کا ہاتھ نہیں روکا تھا جب ہی وہ دوپہر کے کھانے کے بعد لمبی تان کر سو گیا اور اتنی دیر تک سوتا رہا کہ اندھیرا ہوجانے پر ہی ملازمہ نے اسے جگایا۔ جاگنے پر وہ کچھ دیر چھوٹے بھائی کے ساتھ کھیلا اور پھر رات کا کھانا کھا کر کھڑکی کے قریب جا بیٹھا۔

دن میں ضرورت سے زیادہ سو لینے کی وجہ سے اسے نیند نہیں آرہی تھی جبکہ اس کے ساتھ موجود ماں اور ملازمہ کھانے کے بعد سو چکی تھیں۔ رات مزید آگے سرکی تو ماں نیند سے اٹھ کر اس کے قریب ہی سیٹ پر آبیٹھی اور محبت سے اسے پکارا۔ اس کی پکار پر گولو اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے دھیمی آواز میں بولتے ہوئے پانی کی صراحی گولو کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ پانی ختم ہوگیا ہے اس لیے اب جو اسٹیشن آئے اس پر اتر کر گولو صراحی میں پانی بھر لائے۔ گولو پیچھے بھی ایک اسٹیشن پر ملازم کے ساتھ اترا تھا اور اس نے دیکھا تھا کہ ملازم اسٹیشن پر لگے نلکے سے صراحی بھر کر لایا تھا چنانچہ اسے یہ کام مشکل نہ لگا اور ماں کے کہنے پر وہ راضی ہوگیا۔ ریل رکی تو ماں خود اسے لے کر دروازے تک گئی۔ گولو کو اندھیرے ویران اسٹیشن پر اترتے ہوئے کچھ ڈر محسوس ہوا لیکن ماں نے یہ کہہ کر اسے حوصلہ دیا کہ وہ وہیں دروازے پر کھڑی اسے دیکھتی رہے گی اور ممکن ہے کہ ساتھ آنے والا ملازم نظیر بھی اسے مل جائے۔ گولو کو یہ تو معلوم تھا کہ نظیر ہر اسٹیشن پر اتر کر ان لوگوں کی خیریت دریافت کرنے آتا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس اسٹیشن پر ریل صرف ایک منٹ کے لیے رکے گی اور اپنے ڈبے میں سویا پڑا نظیر ہرگز بھی یہاں نہیں اترے گا۔ وہ تو اسٹیشن پر پانی کا نلکا بھی تلاش نہیں کرسکا تھا کہ ریل چل دی اور پہلے دروازے میں کھڑی ماں، پھر ان کا ڈبا اور بتدریج پوری ریل اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

ربن نے یہ ساری داستان سنی تو سمجھ گیا کہ ایک عورت نے اپنا منصب بھلا کر ہی روایتی سوتیلی ماں کا کردار ادا کیا ہے اور نہایت چالاکی سے کام لے کر آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے والے سوتیلے بیٹے سے جان چھڑالی ہے۔ بعد میں شوہر سے سامنا ہوتا تو وہ کیا کرتی۔ روتی دھوتی اور خوب واویلا کرتی کہ وہ تو سوئی پڑی تھی رات کو جانے کس پہر اور کہاں صابر ریل سے اتر گیا، اسے خبر ہی نہ ہوسکی۔ صابر کا باپ کیا کرتا۔ چیختا چلاتا، بیوی کو برا بھلا کہتا اور زیادہ امکان یہی تھا کہ ان ملازمین کو عتاب کا نشانہ بناتا جنہیں اس نے خدمت اور خیال داری کے خیال سے اپنے خاندان کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ آخر کو تو اسے اس دکھ کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہی تھا۔ بیوی اگر رات کے وقت گہری نیند سوگئی تھی تو یہ اس کا جرم نہیں فطرت کا تقاضا تھا۔ ظاہر ہے غم کے ان لمحات میں نہایت چالاکی سے ساری منصوبہ بندی کرنے والی شاطر عورت ہر طرح سے شوہر کی دلجوئی کرتی۔ غم زدہ شوہر کا دل بہلانے کے لیے اس کے پاس بیٹے کی صورت ایک زبردست کھلونا بھی موجود تھا۔ صابر کا باپ اپنے غبی اور ناکارہ بیٹے کی جدائی کا غم اگر پوری طرح بھولتا نہیں تب بھی اسے سمجھوتا تو کرنا ہی تھا۔ طویل رات میں بیٹا کہاں اور کس جگہ اترا تھا اسے کیسے خبر ہوسکتی تھی۔ وہ اپنے وسائل استعمال کرکے اسے ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتا تو ایک ویران اسٹیشن پر اترنے والے صابر کے ملنے کا امکان بہت کم تھا۔ اس قسم کے بچوں کو تو اسٹیشن پر پھرتے آوارہ گرد اور مجرم فوراً ہی اچک لیتے ہیں اور تیزی سے ادھر ادھر منتقل کرکے انہیں ان کی صلاحیت کے مطابق چور، گرہ کٹ یا گداگر بنا ڈالتے ہیں۔ صابر کی سوتیلی ماں نے یقیناً اس کے مستقبل کا یہی نقشہ سوچا ہوگا لیکن قسمت کی مہربانی سے وہ ربن دادا کو مل گیا۔

دادا نے صابر سے اس کے باپ اور گاؤں کا اتا پتا جاننے کی کوشش کی۔ باپ کا نام تو صابر نے چودھری ناصر بتا دیا لیکن گاؤں کے بارے میں ڈھنگ سے کچھ نہ بتا سکا۔ ربن نے بھی بہت زیادہ کھوج نہیں کی۔ اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ جو ظالم عورت ایک سات سالہ بچے کو اندھیری رات میں ویران اسٹیشن پر اتار سکتی ہے وہ اپنی اس چال کی ناکامی کے بعد سیدھے سیدھے اسے قتل کرنے کا

بھی بندوبست کرسکتی ہے۔ یوں فیصلہ ہوگیا کہ صابر ہمیشہ اس کے ساتھ ہی رہے گا اور اب وہ پچھلے آٹھ سال سے گولو بن کر اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اڈے کے لوگوں کی بے لوث محبت نے اس کے دل سے اپنے گھر کی یاد مٹائی تھی یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہوا تھا کہ پہلے سال کے بعد اس نے گھر اور گھر والوں کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا اور یہیں رچ بس گیا تھا۔ وہ ربن دادا کے ساتھ جہاں جہاں رہا تھا۔ وہاں اسے گھر تو بے شک نہیں ملا تھا لیکن گھر سے زیادہ محبت ضرور ملی تھی اور محبتوں کو چھوڑ کر جانا کسی بھی ذی نفس کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ صابر عرف گولو کو بھی یہاں کی محبتوں نے اپنے ساتھ باندھ لیا تھا۔ اپنے گاؤں کی بولی بھول کر اب وہ ممبئی کی زبان بولنے لگا تھا اور کھیت کھلیانوں کی تازہ ہوا کو چھوڑ کر ممبئی کی دھوئیں بھری فضا میں سانس لینے کا عادی ہوگیا تھا۔

''ہاں بھئی رامو کیا پوچھا ہے اپن نے۔ کون سے شربت کی بات ہو رہی تھی یہاں؟'' اپنے سوال کے جواب میں رامو کو خاموش پا کر ربن دادا نے دوبارہ اسے مخاطب کیا۔

''دادا! اصل میں یہ اپنا گولو، فاروق کے حریرہ نہ پینے پر اداس ہو رہا تھا تو اپن نے ذرا مجاق میں ایسے ہی بول دیا تھا کہ تیرے فاروق بھائی شربتِ دیدار پی کر آ رہے ہیں اس واسطے اور کچھ نہیں پئیں گے۔ یہ اپن کے سر ہو گیا کہ شربت کا نام دوبارہ بتاؤ تاکہ بجو سے فاروق کے لیے یہ شربت بنوا سکے۔ اب تم ہی بتاؤ دادا کہ اس شربت کا ذکر شاعروں کے کلام کے سوا کہیں ملتا ہے کیا؟'' نہایت سنجیدگی سے دھیمی آواز میں ربن دادا کو جواب دیتے رامو کے لہجے میں شوخی کی جو نامحسوس سی جھلک تھی، اسے دادا جیسا زیرک آدمی ہی محسوس کر سکتا تھا۔ پوری بات سن کر اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی لیکن بس لحہ بھر کے لیے پھر وہ فوراً سنجیدہ ہو کر گولو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔

''تجھے پتا ہے نا کہ یہ رامو کیسا مخولیا ہے۔ ایسے ہی تجھ سے مذاق کر رہا تھا اور جھوٹ موٹ کے شربت کا نام لے ڈالا تھا۔ تو اس کی باتوں میں نہ آیا کر۔''

''اسے بھی سمجھا دو بابا کہ یہ اپن کے ساتھ ایسے مجاق نہیں کیا کرے ورنہ اپن صرف رامو استاد کا گلا کاٹنے کے لیے ایک دن چاقو پکڑنا سیکھ لے گا۔'' گولو ناراض سے لہجے میں کہنے کے بعد گیند کی طرح لڑھکتا ایک اندرونی دروازے میں غائب ہوگیا۔ اس بار رامو کھل کر مسکرایا۔ اسے معلوم تھا کہ گولو کی یہ ناراضگی وقتی ہے اور وہ ذرا سی کوشش سے اسے منانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

''نہ تنگ کیا کر اسے رامو! چھوٹے دل کا ہے زیادہ سہہ نہیں پاتا۔'' ربن دادا نے اسے تنبیہ کی۔

''کیا کروں دادا! بس کبھی کبھی اسے چھیڑنے کو من مچل جاتا ہے ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ سالا اپن کو کتنا پیارا ہے۔ ادھر اپنے من میں بستا ہے سالا لاڈلا۔'' رامو کے لہجے میں اس کے اندر کی سچائی تھی۔ ربن دادا نے اس کے بعد اسے کچھ نہ کہا اور موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے بولا۔

''وہ سالے سارے حرام خور ابھی تک بستروں پر پڑے اینڈ رہے ہیں کیا؟ ابھی تک کسی حرام کے پلے کی چیاؤں میاؤں سنائی نہیں دی۔''

''سالے سارے چاندنی بائی کے کوٹھے پر تھے رات۔ فجر کے قریب آ کر سوئے ہیں۔ حسن اور شراب کے نشے میں دھت ہو کر اتنی جلدی آنکھ کدھر کھلنے والی ہے۔ دو چار جو ساتھ نہیں گئے تھے انہیں میں نے دھندے سے لگا دیا ہے۔ اس لیے کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔'' رامو نے فوراً اسے رپورٹ پیش کی۔ گانا سننا اور ناچ دیکھنا اس اڈے کے لوگوں کی وہ واحد عیاشی تھی جس پر کبھی قدغن نہیں لگائی گئی تھی۔ پہلے وہ لوگ فرمائش کر کے گانے والیوں کو اڈے پر بھی بلوالیا کرتے تھے لیکن یہ پچھلے اڈے کی بات تھی۔ جب سے وہ ٹھکانا بدل کر اس آبادی میں آ کر بسے تھے، گانے ناچنے والیوں کی آمد پر پابندی تھی اور اڈے کے لوگ دل پشوری کے لیے خود کوٹھوں کا رخ کرتے تھے۔ ہاں اس بات کا ضرور خیال رکھا جاتا تھا کہ سارے کے سارے ایک ہی وقت میں غائب نہ ہو جائیں بلکہ کچھ اڈے کی حفاظت اور نظم و نسق کے لیے یہیں موجود رہیں۔ گزشتہ رات بھی ایسا ہی ہوا تھا اور ربن کی اجازت شامل رہی تھی لیکن اپنے آدمیوں کا دن چڑھے تک سوتے رہنا اسے برہم کر گیا تھا۔ ویسے یہ بھی اس کے موڈ کی بات تھی ورنہ کبھی وہ انہیں اس سے بھی زیادہ چھوٹ دے دیتا تھا۔

''لات مار کر اٹھا ان سارے سالوں کو اور دھکیل دے پچھلے صحن میں۔ کہہ دینا آج ڈبل کسرت کرنی ہے سب نے۔ کسی کو ایک منٹ کی بھی ڈھیل مت دینا۔'' اس نے قہربار لہجے میں حکم سنایا تو رامو فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ حکم کی تعمیل میں ذرا بھی تاخیر یا ڈھیل کی گنجائش نہیں۔ رات عیاشی کر کے آنے والوں کو آج اس گرم ترین دن میں عیاشی کی پوری قیمت ادا کرنی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ ربن دادا کا اپنے آدمیوں کو تربیت دینے کا ایک انداز ہے۔ ایسی سختیوں سے گزار کر وہ

معروف اور مقبول قلم کار
طاہر جاوید مغل
کی نئی سلسلے وار کہانی
انگارے
جاسوسی ڈائجسٹ
میں پیش کی جارہی ہے
زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں
اپنے دامن میں سمیٹے
ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانی
جسے قارئین ایک ہی نشست میں پڑھنے پر
خود کو مجبور پائیں گے

اپنے آدمیوں کو اتنا سخت جان بنا ڈالا تھا کہ ممبئی کے دوسرے اڈوں پاڑوں کے آدمی ان کی گرد کو بھی نہ چھو پاتے تھے اور وہ سب میں نمایاں نظر آتے تھے۔ رامو کے روانہ ہونے کے بعد دادا خود بھی تخت پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا دھیان فاروق کی طرف تھا اور آنکھوں میں فکر کی پرچھائیاں اتر آئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ فاروق محبت کی راہ پر چل پڑا ہے اور اڈے سے وابستہ کسی شخص کو یہ جذبہ راس نہیں آتا تھا۔ وہ بہت سخت جان ہو کر بھی اس لطیف جذبے کا بوجھ اٹھانے میں عموماً ناکام ہی رہتے تھے۔

☆☆☆

''گڈ مارننگ۔'' دفتر پہنچتے ہی جولیٹ کی عارف سے ملاقات ہوگئی تو مزاج خود بخود ہی خوش گوار ہوگیا۔

''اللہ کرے کہ یہ مارننگ اور اس کے بعد کا باقی ڈے گڈ ہی رہے ورنہ آج گرمی جس طرح مزاج پوچھ رہی ہے لگ نہیں رہا کہ کچھ بھی گڈ رہے گا۔'' عارف نے رومال سے ماتھے پر آیا پسینا پونچھتے ہوئے بیزاری سے تبصرہ کیا۔

''ایک تو تم بہت جلدی ہر مشکل سے گھبرا جاتے ہو۔ چیزوں کا پوزیٹو ویو بھی دیکھنے کی کوشش کیا کرو۔ جیسا کہ میں سوچ رہی ہوں کہ یہ اتنی گرمی اور حبس بارش کے اشارے ہیں۔ تم دیکھنا آج بارش ضرور ہوگی اور گرمی کا زور ٹوٹ جائے گا۔'' اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے اس نے عارف کو ٹوکا۔ عارف سے اس کی جان پہچان اس دفتر میں نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ زمانہ طالب علمی سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ساتھ ہی ماسٹرز کیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست بھی تھے بلکہ حقیقتاً یہ دوستی سے بھی کچھ آگے کا تعلق تھا۔ عارف واضح طور پر اس سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکا تھا اور جولی نے بھی اسے مثبت ہی جواب دیا تھا البتہ ان کا فوری شادی کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ عارف کو بہت سے گھریلو مسائل درپیش تھے۔

''تم جانتی ہو کہ میری زندگی میں اتنی بہت ساری چیزیں نیگیٹو ہیں کہ میرے لیے پازیٹو سوچنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔'' عارف کچھ الجھا ہوا سا لگ رہا تھا۔ جولی نے غور سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے اور بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی میز کی طرف بڑھ گئی۔ اس بڑے سے کمرے میں ان کے علاوہ مزید دو افراد کے لیے بھی میزیں موجود تھیں لیکن ان کے باقی دونوں ساتھی ابھی دفتر نہیں پہنچے تھے اس لیے وہ کھل کر ایک دوسرے سے گفتگو کر سکتے تھے۔

''کیا ہوا ہے عارف؟ کوئی پرابلم ہے کیا؟'' عارف کے سامنے والی کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے نرمی سے اس سے دریافت کیا۔ جواب میں عارف نے محض ایک ٹھنڈی سانس بھری اور زبان سے کچھ نہیں کہا۔

''مجھ سے اپنی پرابلم شیئر نہیں کرو گے کیا؟'' جولی کے لہجے کی نرمی کچھ اور بڑھ گئی۔

''تم سے ہمیشہ اپنی پرابلمز ہی شیئر کرتا ہوں حالانکہ دل چاہتا ہے کہ کبھی تم سے اچھی اور خوب صورت باتیں بھی کروں۔ لڑکیاں تو ایسی ہی باتیں سننا چاہتی ہیں نا؟'' وہ یاسیت کا شکار تھا۔

''کریکٹ۔ ایسا ہوتا ہے لیکن کیا تم مجھے ان لڑکیوں میں کاؤنٹ کر سکتے ہو جو صرف خوشی کی ڈیمانڈ کرتی ہیں اور دکھ شیئر نہیں کرنا چاہتیں۔ آئی ایم آ میچور گرل اینڈ آئی نو کہ لائف میں صرف خوشی نہیں ہوتی اس میں دکھ اور پرابلمز بھی ہوتے ہیں اور جو سینئر فرینڈ ہوتا ہے وہ ہر طرح کے حالات میں ساتھ دیتا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولتی عارف کو بہت پیاری اور اپنی سی لگ رہی تھی۔

''تھینک یو سوچ جولی۔ تم واقعی بہت پیاری لڑکی ہو۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو خود کو خوش قسمت محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اللہ نے اگر تم جیسی دوست نہ دی ہوتی تو میری زندگی مزید تکلیف دہ ہوتی۔'' عارف نے میز پر دھرا اس کا دودھیا نرم ملائم ہاتھ تھام لیا اور جذباتیت سے بولا۔ اس کے اس جذباتی انداز پر جولی کے رخساروں پر شفق سی بکھر گئی لیکن وہ اصل مسئلے کو بھولی نہیں تھی چنانچہ جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے ذرا سنجیدگی سے بولی۔

''تھینک گاڈ کہ تم نے کسی ایک پوزیٹو بات کو تو ایکسپیٹ کیا۔ اب پلیز جلدی سے مجھے یہ بھی بتا دو کہ تم اتنے ڈسٹرب کیوں ہو؟''

''کل شام بڑی خالہ ہمارے گھر آئی تھیں۔''

''وہی نا جن کے بیٹے سے تمہاری بہن عابدہ کی میرج فکس ہے؟'' عارف کا واحد جملہ سنتے ہی وہ بے اختیار بول پڑی۔ عارف اور اس کے کئی سالوں کے ساتھ میں وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے خاندان کے افراد اور مسائل سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ جانتی تھی کہ عارف کی چاروں چھوٹی بہنوں میں سے سب سے پہلے نمبر کی عابدہ کی بات چیت اس کے خالہ زاد بھائی سے طے ہے۔

''وہ ہمارا خیال تھا جس کی خالہ کل تردید کرنے آئی تھیں۔'' عارف نے تلخی سے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' جولی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔
''خالہ کل اطلاع دینے آئی تھیں کہ انہوں نے اپنے بیٹے کا رشتہ ایک تاجر کی بیٹی سے طے کر دیا ہے اور بڑی عید کے بعد شادی ہونے والی ہے۔''
''تم لوگوں نے انہیں یاد نہیں دلایا کہ وہ اپنے بیٹے کا رشتہ پہلے ہی عابدہ سے طے کر چکی ہیں۔'' عارف کے انکشاف پر اس نے اچنبھے سے پوچھا۔
''اماں نے کہا تھا۔ سن کر وہ ہنسنے لگیں اور بولیں، کمال ہے قمرالنسا! تم اتنی پرانی بات کو ابھی تک دل میں لیے بیٹھی ہو۔ ایسا تو میں نے عابدہ کی پیدائش پر اس کی پیاری صورت دیکھ کر یونہی کہہ دیا تھا۔ ورنہ بعد میں میرے ذہن میں اس بات کا خیال تک نہ رہا تھا۔ بھلا میں نے کوئی باقاعدہ رسم کر ڈالی تھی جو تم یہ امید دل میں لیے بیٹھی رہیں؟ اماں بے چاری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولیں کہ آپا میں نے آپ کی ایک بار کی خواہش کو ہی حکم جانا تھا اور یہی سوچا تھا کہ اپنوں میں باقاعدہ رسم وغیرہ کرنے کا کیا تکلف...... خیر سے جب آپ صفدر میاں کو بیاہنے کھڑی ہوں گی تو سیدھی میری دہلیز پر ہی پہنچیں گی۔ آپ بھی تو عابدہ سے ہمیشہ اتنی چاہت جتلاتی رہیں۔ اس کی پیدائش کے بعد سے کوئی عید برات ایسی نہیں گزری کہ آپ نے اس کے لیے جوڑا اور دوسری چیزیں نہ بھجوائی ہوں۔ آپ کے اس رویے سے میں نے یہی جانا کہ آپ عابدہ کو اپنی ہونے والی بہو سمجھ کر یہ سب کرتی رہی ہیں۔ اسے آپ کی امانت خیال کر کے میں نے تو کبھی کہیں اس کی بات بھی چلانے کی کوشش نہیں کی۔ اماں کی یہ باتیں سن کر خالہ بدک گئیں اور تڑ سے بولیں، تمہارا دماغ تو نہیں سٹھیا گیا تھا قمرالنساء جو تم نے خالہ بھانجی کی محبت کو اپنی مطلب کا رنگ دے دیا۔ ٹھیک ہے عابدہ بھانجی ہونے کی وجہ سے مجھے بہت پیاری ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں اپنے سگے بیٹے سے زیادتی کر جاؤں۔ تم خود ہی ایمان سے بتاؤ کہ میرے چھ فٹ کے بیٹے کے ساتھ تمہاری ناٹی موٹی عابدہ بھلا جچے گی کیا؟ مانا کہ شکل کی بہت پیاری ہے لیکن قد کاٹھ کے حساب سے تو گزارے لائق بھی نہیں ہے۔ میں بھلا اپنے بیٹے کی ایسی بے جوڑ شادی کیسے کر سکتی ہوں؟ اماں خالہ کی باتیں سن کر روتی رہیں اور خالہ ان کے آنسو پونچھے بغیر اپنے گھر روانہ ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد سے اماں بستر سنبھال کر لیٹی ہوئی ہیں۔ انہیں سخت بخار ہے۔ چاروں بہنیں بھی اداس ہیں۔ عابدہ کو میں نے خود باورچی خانے میں چھپ کر روتے دیکھا تھا اور اپنی بے بسی پر تلملا کر رہ گیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ جب ابا کو یہ بات پتا چلے گی تو وہ طعنے دے دے کر اماں کا جینا اور مشکل کر دیں گے کیونکہ خالہ، اماں کی بہن ہیں اور ابا کو اماں کے سارے رشتے دار سخت برے لگتے ہیں۔''

عارف نے پورا قصہ تفصیل سے کہہ سنایا۔ سب سن کر تو وہ بھی چند لمحے ششدر سی بیٹھی رہ گئی۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ عارف کے گھر میں اس وقت کیا حالات ہوں گے۔ عارف کی بہنوں کی شادی اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے پہلے ہی مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ عابدہ اور اس سے چھوٹی زاہدہ اور شاہدہ سب ہی کوتاہ قامت تھیں اور یہ چھوٹا قد انہوں نے اپنی اماں سے ورثے میں پایا تھا جبکہ عارف اور سب سے چھوٹی بہن ماجدہ مناسب قد و قامت کے مالک تھے۔ وہ دونوں اپنے والد پر گئے تھے۔ عارف کی زبانی حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق عارف کی والدہ اس کے والد کی ماموں زاد بہن تھیں اور عارف کے والد کو اپنی پسند کے برخلاف صرف اپنی والدہ کی خواہش پر قمرالنساء سے شادی کرنی پڑی تھی۔ زبردستی کی اس شادی کو انہوں نے کبھی خوش اسلوبی سے نہ نبھایا اور بیوی بچوں کے لیے سراپا قہر بنے رہے۔ مالی آسودگی میسر آ جاتی تو شاید پھر بھی ان کے مزاج کی تلخی میں کوئی فرق آ جاتا لیکن انہیں ساری زندگی کپڑے کی ایک دکان پر ملازمت کرتے اور گھٹ گھٹ کر جیتے گزارہ کرنا پڑا تو مزاج اور بھی خراب ہوتا چلا گیا۔ بس صرف عارف ہی تھا جو واحد اولاد نرینہ ہونے کی وجہ سے ذرا رعایت کا حق دار ٹھہرا اور اسے اس کے والد نے حسب خواہش تعلیم دلوائی۔ اب عارف کو اپنے باپ کی اس مہربانی اور ماں بہنوں کی محبت کا حق ادا کرنا تھا اسی لیے جولی کو چاہنے کے باوجود وہ اپنے فرائض کی ادائیگی تک شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے مسائل کو سمجھتی جولی اس بات کے لیے راضی تھی بلکہ اس کے حساب سے یہی مناسب تھا۔ وہ خود بھی اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ اس کی شادی کے بعد وہ دونوں تنہا رہیں۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ عارف کی بہنوں کی شادی کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے والدین کے ساتھ آرام سے ایک گھر میں اکٹھا رہ لیں گے لیکن یہ ساری تو بعد کی پلاننگ تھی۔ ابھی تو عارف کو درپیش مسائل کی بات تھی اور فی الحال اسے اس کا حوصلہ بڑھانے کا فرض انجام دینا تھا۔ وہ پوری تندہی سے یہ کام کرنے لگی۔

''ڈونٹ وری عارف، گاڈ سے اچھی ہوپ رکھو۔ وہ

کہتے ہیں ناکہ جب ایک ڈور بند ہو جائے تو اس کی جگہ گاڈ دس ڈور کھول دیتا ہے۔ عابدہ کے لیے بھی وہ کچھ اچھا ہی کرے گا۔ بلکہ اب بھی اچھا ہی ہوا۔ ایسے سیلفش لوگوں کے ساتھ ساری لائف گزارنی پڑتی تو وہ کون خوش رہ پاتی۔'' حسبِ عادت اس نے معاملے کا مثبت رخ دکھانے کی کوشش کی۔

''تمہیں یہ سب جان کر برا نہیں لگا جولی؟'' عارف نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''برا کیسے نہیں لگے گا؟ تمہیں اور تمہاری فیملی کو دکھ پہنچا ہے تو مجھے برا تو لگے گا نا لیکن میرا ماننا ہے کہ گاڈ سب کچھ ہمارے بھلے کے لیے ہی کرتا ہے۔'' اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

''میرا مطلب تھا کہ تمہیں یہ جان کر برا نہیں لگا کہ پہلے ہی میرے لیے اپنی بہنوں کی شادی کرنا مشکل ہے اور عابدہ کا رشتہ ختم ہو جانے سے مسئلہ اور بھی بڑھ گیا ہے تو ہماری شادی تو پتا نہیں کتنی لیٹ ہو جائے گی۔'' عارف نے اس بار کھل کر اپنا مطلب بیان کیا۔

''واٹ ربش عارف، میں تم کو ایسی سیلفش لڑکی لگتی ہوں کیا؟ میں نے ایک بار تم سے جو کمٹمنٹ کر لی ہے اس پر ساری لائف قائم رہوں گی۔ اصل چیز ہماری کمٹمنٹ اور ایک دوسرے پر ٹرسٹ ہے۔ یہ ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ نہیں۔ شادی کا کیا ہے کبھی نہ کبھی ہو ہی جائے گی۔'' وہ اپنایت بھری ناراضی سے اسے سمجھا رہی تھی۔ اسی وقت ان کے ساتھ کام کرنے والا مترا اندر آیا اور بولا۔

''بڑی زوردار بارش ہو رہی ہے۔ میں تو منٹوں میں بھیگ کر رہ گیا۔'' اس کی آواز پر وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ واقعی وہ بری طرح بھیگ چکا تھا۔ مترا سے ہٹ کر ان دونوں کی نظروں نے کھڑکی سے باہر تک کا سفر ایک ساتھ طے کیا۔ واقعی زوردار بارش ہو رہی تھی لیکن اپنی محویت میں انہیں علم ہی نہیں ہو سکا تھا۔

''اوہ رئیلی اٹز ریننگ کم آن عارف، آؤ باہر چل کر انجوائے کرتے ہیں۔'' برستی بارش کو دیکھ کر جولیٹ کا موڈ یکسر بدل گیا اور وہ چہک کر بولتی ہوئی فوراً ہی حرکت میں بھی آ گئی۔ ناچار عارف کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ وہ دونوں کمروں کے سامنے بنے برآمدے میں آ کھڑے ہوئے۔ یہاں بارش کا پانی صرف بوچھاڑ کی صورت آ رہا تھا۔ جولیٹ نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس بوچھاڑ میں کر دیے۔ فوراً ہی اس کے دودھیا بازو پانی کے ٹھنڈے اور لطیف قطروں سے بھیگ گئے۔ کچھ چھینٹے اس کے چہرے اور گردن پر بھی پڑے۔ سرشاری کے احساس کے ساتھ وہ کسی ننھی بچی کی طرح کھلکھلا کر ہنسی۔ اس کی ہنسی کی آواز پر عارف نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔ آنکھوں میں دھنک رنگ لیے وہ زندگی کی ایک ایسی تصویر کے مانند نظر آ رہی تھی جس سے صرف پیار کیا جا سکتا تھا۔ عارف کے دل پر چھائی دھند بھی چھٹنے لگی اور ایک خوش گوار سے احساس کے زیر اثر وہ اپنی جگہ سے دو قدم آگے بڑھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو یکجا کر کے اس نے اپنی اوک میں بارش کا پانی جمع کیا اور یک دم ہی پلٹ کر جولیٹ کی طرف اچھال دیا۔ بارش کے شفاف ہیرے جیسے قطرے اس کے سیاہ بالوں اور اجلی جلد پر ٹھہر کر یوں رنگ بکھیرنے لگے کہ وہ پور پور ان دھنک رنگوں میں بھیگی خود بھی قوس قزح کے مانند ہی نظر آنے لگی۔ ایک ایسی جیتی جاگتی قوس قزح کے مانند جس کی ہنسی کی جلترنگ میں زندگی کے مدھر گیت گونج رہے تھے۔

☆☆☆

''صورت کیوں اتری ہے رے تیری؟'' بارش کے بعد آسمان کا رنگ بہت نکھرا نکھرا تھا۔ دن بھر کھل کر برسنے کے بعد بادل منتشر ہو گئے تھے اور اب محض ٹکڑیوں کی صورت میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ شدید گرمی کے ساتھ شروع ہونے والے دن کی شام نہایت خوش گوار تھی اور بدن سے ٹکراتے ہوا کے جھونکے فرحت بخش محسوس ہو رہے تھے۔ موسم کی خوش گواری نے انسانی مزاج پر بھی اچھا اثر ڈالا تھا۔ کئی من چلے پتنگیں اٹھائے کوٹھوں پر چڑھ گئے تھے۔ نیلے آسمان اور سفید بادلوں کے پیش منظر میں اڑتی یہ رنگ برنگی پتنگیں ایک سماں سا باندھ رہی تھیں۔ منظر میں وہ پرجوش آوازیں بھی شامل تھیں جو بھی پیچ لڑانے والے اپنے ساتھی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بلند ہوتیں تو کبھی مخالف کو گڑبڑانے اور اس کا حوصلہ پست کرنے کے لیے۔ اڑتی ہوئی رنگ برنگی پتنگوں میں سے جب کوئی پتنگ کٹتی اور ڈولتی ہوئی نیچے آنے لگتی تو ''بوکاٹا'' کی زوردار آوازیں دور دور تک پھیل جاتیں اور لڑکوں میں کٹی ہوئی پتنگ کو لوٹنے کے لیے ایک ہڑابڑی سی مچ جاتی۔ ایک نیواڑی پلنگ پر نیم دراز فاروق عجب گم صم سی کیفیت میں آسمان پر نظریں ٹکائے ساری آوازیں سن رہا تھا لیکن عالم یہ تھا کہ جیسے خود اس منظر میں شامل نہ ہو۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ اس کے تصور کے پردے پر تو بس وہ دو خوب صورت آنکھیں ہی لہرا رہی تھیں جن میں اس کے

لیے ناگواری تھی۔ ناگواری کا یہ تاثر اس کے دل کے لیے تکلیف دہ تھا لیکن اس کی بے بسی تھی کہ وہ ان آنکھوں کو اپنے تصور سے جھٹک دینے پر بھی قادر نہیں تھا۔ عجب بیٹھے درد کی صورت وہ آنکھیں ہر دم اس کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ اب بھی ان آنکھوں کی سنگت میں لمحے بتاتے اسے احساس نہ ہو سکا کہ کوئی لکڑی کا زینہ چڑھ کر اوپر آیا ہے اور اس کے پلنگ کے قریب ہی پڑے دوسرے پلنگ پر بیٹھ گیا ہے۔ آنے والا ربن دادا تھا۔ اس کے بیٹھنے سے پلنگ بہت زور سے چرچرایا تھا، اس کے باوجود فاروق کی نظریں آسمان سے نہ ہٹیں تو وہ اپنی رعب دار آواز میں فاروق سے مخاطب ہوا۔ اس کی آواز پر فاروق بری طرح چونکا اور پلنگ پر سیدھا ہو بیٹھا لیکن اس کی آنکھوں میں ناسمجھی کا سا تاثر تھا۔ یقینی طور پر اس نے دادا کی آواز تو سنی تھی لیکن الفاظ سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔

''ابے میں پوچھ رہا ہوں کہ صبح سے یہ بوتھا لٹکائے کیوں پھر رہا ہے؟ وہ سارے تیرے چاہنے والے حرام زادے پریشان ہو رہے ہیں کہ فاروق بھائی کو جانے کیا ہو گیا ہے۔''

ذرا چڑچڑے پن سے بولتا ربن دادا اس سے کتنی محبت کرتا ہے، یہ بات فاروق اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ اس کے لہجے کا ذرا برا نہ مانا اور عاجزی سے بولا۔

''بس دادا ایسے ہی طبیعت گری گری سی ہے کچھ بولنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ ویسے بھی کیا بولوں؟ میرے پاس بولنے کے لیے ہے ہی کیا؟'' بولتے بولتے اس کے لہجے میں یاسیت اتر آئی تھی۔

''دیکھ شہزادے! اتنے سال میں نے تیرے اوپر اتنی محنت اس لیے نہیں کی کہ تو ذرا ذرا سی باتوں پر منہ لٹکا کر بیٹھ جائے۔ تو تو شیر ہے میرا اور شیروں کو یہ انداز جچتے نہیں ہیں۔'' ربن کے لہجے کی تیزی کم نہ ہوئی۔

''مجھے تمہاری محنت کا پاس ہے دادا لیکن ہوں تو آدمی ......اور آدمی بعض اوقات بڑا بے بس ہوتا ہے۔ اپنی طرف اٹھتی تیز نگاہ کو پھوڑ ڈالنے کی طاقت رکھنے والے کے ہاتھ پیر بھی کبھی کبھی بغیر زنجیروں اور رسیوں کے بندھ جاتے ہیں۔ میں بھی بس ایسی ہی بے بسی کا شکار ہوں۔'' اس نے سر اوپر اٹھایا اور نہ ربن دادا سے آنکھ ملائی، سر جھکائے دھیمی آواز میں بس بولتا ہی چلا گیا۔ اس کے الفاظ اور لہجے نے مضبوط اعصاب دادا کے دل پر ایک گھونسا سا رسید کیا اور وہ تڑپ کر اپنے پلنگ سے اٹھ کر اس کے ساتھ اس کے قریب جا بیٹھا

پھر بازو پھیلا کر اسے خود سے لگا لیا۔

''میں تیرے دل کا حال اچھی طرح جانتا ہوں لیکن سوچتا ہوں کہ تجھے کیسے یہ بات سمجھاؤں کہ یہ عشق محبت کے کھیل ہم جیسوں کے لیے نہیں ہیں۔ ہم تو بس چاقو، خنجر، بلم اور لاٹھی سے کھیلنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارا چاقو کبھی اگلے کی سانسیں چھین لیتا ہے تو کبھی زندگی میں وہ لمحہ آ جاتا ہے جب ہم خود کسی کے چاقو کی زد پر آ کر ہمیشہ کے لیے مٹ جاتے ہیں۔ اب تو ہی بتا کہ ہم جیسوں کی بے بھروسا زندگی میں ساتھ نبھانے کے لیے کون عورت آنا چاہے گی؟ عورت تو اپنے لیے شانتی سے بھرا ایک گھر اور پیارے پیارے بچے مانگتی ہے نا اور ہم جیسے بھلا کسی کو یہ سب کیسے دے سکتے ہیں۔ تو نے اپنے ان ساتھیوں کو بھی دیکھا ہے نا جن کے گھر بسے ہوئے ہیں۔ کیسی مصیبت میں مبتلا نظر آتے ہیں وہ۔ ایک طرف اپنے بیوی بچوں کے لیے پریشان رہتے ہیں سالے تو دوسری طرف سکھ کے لیے گھر میں لائی جانے والی زنانیاں جینا حرام کر کے رکھتی ہیں۔ مشکل سے دو چار ہی ہوں گے جن کی گھر والیاں ان کے ساتھ بھلے طریقے سے بسر کرتی ہوں۔ تو جو پہلے ہی اتنا بےکل رہتا ہے، کیا اپنے لیے ایسی مصیبت مول لے سکتا ہے۔ پھر وہ تو ہے بھی پڑھی لکھی آزاد خیال لڑکی۔ وہ کہاں تیرے ساتھ بیاہ پر راضی ہوگی۔ پر تو کہے تو تیری خاطر میں اس کے ماں باپ کے سامنے اپنا دامن پھیلا کر چلا جاتا ہوں۔ میں ان سے کہوں گا کہ میرا فاروق رہتا تو اڈے پر ہے لیکن ہے بالکل کسی شہزادے کے مافق۔ اسے جاہل جپاٹ سمجھ کر بھی ٹھکرانے کی غلطی نہ کرنا کہ بے شک اس کے پاس کالج، یونیورسٹی سے لی گئی ڈگریاں موجود نہیں ہیں لیکن سارے زمانے کی انگریزی اور اردو کی کتابیں گھول کر پی رکھی ہیں میرے شہزادے نے۔ اڈے سے تعلق کا کیا ہے۔ یہ تعلق تو ایک دن میں ٹوٹ سکتا ہے۔ ہم تمہاری لونڈیا کو بیاہ کر لانے سے پہلے ہی اس کے لیے ایک الگ گھر لے کر سجا سنوار دیں گے اور جب وہ اس گھر میں آ کر بس جائے گی تو نہ اڈے کا کوئی آدمی وہاں قدم رکھے گا اور نہ ہمارا فاروق پلٹ کر ہماری طرف آنے کی غلطی کرے گا۔ ہمیں تو ہمارا شہزادہ اتنا پیارا ہے کہ ہم دور بیٹھے بھی اس کی خوشیوں کا سوچ کر خوش ہوتے رہیں گے اور اپنے ان گناہ گار لبوں سے رب کو اپنی گنتی کی چند نیکیوں کا واسطہ دے کر اس کے اور اس کے بیوی بچوں کے لیے خوشیاں مانگتے رہیں گے۔ میری اس منت اور عاجزی پر بھی اگر وہ لوگ ہاں نہ کریں تو پھر تو مجھے بتانا، تیری

خاطر میں اپنے اصولوں سے بھی ہٹ جاؤں گا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ربن نے عزت دار گھروں کی عورتوں کو تو دور کی بات، کبھی کوٹھے والیوں کو بھی زبردستی مجبور نہیں کیا پر تیری خاطر اپن یہ بھی کرسکتا ہے۔ تیرے لیے اپن اس لونڈیا کو یہاں لے آئے گا اور تیرا اس سے نکاح پڑھا دے گا۔ بس پھر تو خوش رہیو۔'' ربن دادا بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

پورے دن سے بے حس مجسمے کی طرح ادھر ادھر پڑ کر وقت گزارتا فاروق اس کے الفاظ پر ہل کر رہ گیا اور بری طرح اس کے ساتھ چمٹ کر رونے لگا۔

''بس کردو دادا! بس کردو، اب اتنا بھی مجھے میری نظروں میں مت گراؤ۔ تم اور اس اڈے پر بسنے والے دوسرے ساتھی میرے لیے کیا ہیں، یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ اس اڈے سے میرا ناتا ہمیشہ کے لیے ختم کردینے کا وعدہ کر کے اسے میرا بنادو گے تو سن لو کہ تم لوگوں کو چھوڑ کر تو میں خود اپنا بھی نہیں رہوں گا۔ تمہارے بغیر تو میں ادھورا ہوں اور میرا ادھورا وجود کسی کو کیا خوشی دے سکے گا۔ رہی میرے لیے اپنے اصولوں کو توڑ کر اسے یہاں اٹھا لانے کی بات تو یہ بات تم نے سوچی کیسے؟ تمہارے اصول اور اس کی عزت دونوں مجھے اپنی جان سے بڑھ کر پیارے ہیں۔ میں جو اس سے محبت کا دعوے دار ہوں، کیا اسے رسوا کرنے کی غلطی کرسکتا ہوں؟ میں نے کبھی بھولے سے بھی ایسا سوچا ہوتا تو خود کو ہلاک کر ڈالتا۔ پانے کے خیال سے تو میں نے کبھی اسے چاہا ہی نہیں۔ میرے لیے تو بس سویرے دکھ جانے والی اس کی ایک جھلک ہی کافی ہوتی ہے۔ اسے ایک بار دیکھ لوں تو پھر سارا دن سرشاری میں کٹتا ہے۔ میرا اللہ میرے دل کی حالت کا گواہ ہے۔ اس سے زیادہ کی تو میں نے کبھی چاہ کی ہی نہیں۔ وہ میرے لیے شاخ پر کھلا ایسا پھول ہے جسے شاخ پر لہلہاتا دیکھ کر ہی میرا دل خوش ہوجاتا ہے اور میں اپنی اوقات سے بڑھ کر بھی اسے شاخ سے توڑ کر اپنے کالر میں سجانے کا نہیں سوچتا۔''

بھرائی ہوئی آواز میں دی گئی اس کی صفائی میں اتنی سچائی تھی کہ ربن دادا کے لیے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ فاروق کا مزاج آشنا تھا اور جانتا تھا کہ وہ کبھی جھوٹ، مکروفریب سے کام نہیں لیتا چنانچہ... دل جوئی کے انداز میں ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا اور خود بھی رقت آمیز لہجے میں بولا۔ ''جب ایسے سوچتا ہے تو پھر یوں اداس کیوں ہوجاتا ہے رے۔ تجھے نہیں معلوم کہ تیری مسکراہٹ سے یہاں سب کے دل بندھے ہیں۔ تو مسکراتا

چھوڑتا ہے تو وہ سارے سالے بھی اجڑ کر رہ جاتے ہیں۔''
اپنے چیلوں سے بہت سختی سے پیش آنے والا ربن دادا درحقیقت ان سے محبت بھی بہت کرتا تھا اور فاروق کے ساتھ ساتھ اسے ان کا بھی بہت خیال رہتا تھا۔

''بخدا میں جان کر ایسا نہیں کرتا پر کیا کروں کبھی کبھی بے اختیار ہوجاتا ہوں۔ لاکھ بے طلب سہی لیکن سینے میں اتنا بڑا دل نہیں رکھتا کہ اس کی ناگوار نگاہ سہہ کر بھی مسکراتا رہوں۔ وہ اپنی آنکھوں میں نفرت اور حقارت لیے مجھے دیکھتی ہے تو میں پاتال میں دھنس جاتا ہوں۔ ایسی حقارت تو میں نے کبھی کسی خاکروب کے لیے بھی اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بھی میں نے اسے عزت دیتے دیکھا ہے لیکن میں تو جیسے اس کے نزدیک آدمی ہی نہیں ہوں۔ اتنی نفرت کیوں کرتی ہے وہ مجھ سے دادا؟''

وہ گویا چھوٹا بچہ بن گیا اور نہایت معصومیت سے پوچھنے لگا۔ ربن نے پل بھر کے لیے اپنی آنکھیں اذیت سے بھینچ لیں پھر سنبھل کر بولا۔ ''دیکھ فاروق! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ عزت دار لوگ ہم اڈے والوں کو سچ مچ آدمی نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک ہم گلی میں پھرتے آوارہ کتے ہیں جنہیں وہ یا تو نظرانداز کریں گے یا پتھر مار کر بھگا دیں گے لیکن اپنے قریب کبھی نہیں آنے دیں گے۔ اب تو اچھی طرح سوچ کر یہ فیصلہ کرلے کہ تجھے ہمارا ساتھ چاہیے یا ان لوگوں سے عزت کیونکہ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ نہیں مل سکتیں۔ تجھے ایک کی قربانی تو دینی ہی ہوگی۔ اپن تجھ سے پھر بولتا ہے کہ تو اپنا ساتھ چھوڑ کر الگ دنیا بسالے، ماں قسم اپن ذرا دل میں میل نہیں لائے گا۔ تیرا اپنا اتنا کچا بندھن نہیں ہے کہ ایک تیرے ساتھ چھوڑ جانے سے دلوں میں فرق آجائے۔ اپن تیری مجبوری کو بڑی خوشی سے سہنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔''

''پھر وہی بات دادا۔ ایسا بول کر کیوں مجھے میری نظر میں رسوا کرتے ہو۔ جب ایک بار کہہ دیا کہ تم سے جدائی کسی صورت گوارا نہیں تو یہ بار بار کی تکرار کیسی؟ کہو تو چاقو سینے میں اتار کر یہیں اپنی جان دے دوں پھر تم اڈے کے صحن میں میری لاش دفنانا اور یقین کرلینا کہ فاروق نے کبھی تم کو چھوڑ کر جانے کا نہیں سوچا تھا۔'' اس بار اس کا لہجہ ذرا تیز تھا۔

''ایسا مت بول رے۔ اپنے سینے میں جو پتھر مافق دل ہے نا وہ بھی ایسی بات سن کر تڑپنے لگتا ہے۔'' ربن دادا نے ایک بار پھر پوری قوت سے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ دونوں کی آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو بہنے لگے پھر کچھ

دیر بعد یہ چڑھا سمندر اترا تو پہلے دادا نے ہی خود کو سنبھالا۔

"چل، اب نیچے چل۔ وہ سارے تیرے بغیر رات کا کھانا نہ کھانے کا عہد کیے بیٹھے ہیں۔ بجو تو رونے والا ہو رہا ہے کہ تو نے اس کے بنائے ساون کے پکوان چکھے تک نہیں۔ چل میرے ساتھ۔ جب ان کا ساتھ چھوڑنے کا حوصلہ نہیں ہے تو ان کا دل بھی نہ توڑا کر۔ ایسے محبت کرنے والے بھی کسی قسمت والے کو ہی ملتے ہیں۔" دادا نے پہلے اس کے آنسو پونچھے پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے نیچے کی طرف لے جانے لگا۔ رونے کے بعد فاروق کا دل بھی برسات کے بعد والے آسمان کی طرح ہی کھل کر نکھر گیا تھا۔ چنانچہ وہ ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ لیے دادا کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے چہرے کو سیڑھیوں پر سے طلوع ہوتے دیکھ کر نیچے کی خاموش فضا میں ہلچل سی مچ گئی۔

"آیا بھئی آیا۔ اپنا بانکا شہزادہ آیا۔" کسی ایک نے اسے دیکھ کر ہانک لگائی تو باقی سب بھی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ پل بھر میں بڑا سا ہال نما کمرا اتنی آوازوں سے بھر گیا کہ کان پڑی آواز سننی مشکل ہوگئی۔ آخر رین دادا کو ہی دخل اندازی کرنی پڑی۔

"یہ کیا نوٹنکی لگا رکھی ہے حرام زادو۔ اتنا شور مچاؤ گے تو یہ شہزادہ گلفام گھبرا کر بھاگ جائے گا۔ پھر بیٹھ کر روتے رہیو۔" اس کی دہاڑ سے مشابہ گونجیلی آواز نے سب کے ہونٹوں پر تالے لگا دیے اور جو جہاں جس حالت میں تھا، ویسے ہی ساکت ہوگیا۔ کموجو اس کی صورت دیکھ کر خوشی سے باقاعدہ ٹھمکے لگا رہا تھا اس حالت میں ساکت ہوگیا کہ اس کے کولھے پیچھے کی طرف اور سر آگے کو جھکا ہوا تھا جبکہ دونوں ہاتھ فضا میں بلند تھے۔ اس کی اس ہیئت کو دیکھ کر فاروق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"بھگوان بری نظر سے بچائے اپنے راج کمار کو۔ ماں کی سوگند ہنستا ہے تو لگتا ہے چاند بدلی سے نکل آیا ہے۔" راموجو اوروں کی نسبت رین دادا سے زیادہ قریب تھا اور اس کے سامنے حد میں رہتے ہوئے بولنے کی جرأت کر لیتا تھا اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اسے وارنے والے انداز میں فاروق کے گرد گھمانے کے بعد قریب کھڑے گولو کے ہاتھ میں تھما دی۔

"یہ لے اپنے راج کمار کی مسکان کا صدقہ دے دینا۔"

"ابھی دے دیتا ہوں۔" گولو سرشاری سے بولا اور اپنی جگہ سے حرکت کر کے پہلے فاروق کے قریب پہنچا۔ قریب پہنچ کر اس نے فاروق کے دونوں ہاتھ تھامے اور ان کی پشت کو والہانہ انداز سے چومنے لگا۔ فاروق نے جھک کر اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ گولو اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ خود وہ بھی بھولے بھالے گولو کو کم نہیں چاہتا تھا بلکہ باقیوں کی نسبت وہ اسے کچھ بڑھ کر ہی عزیز تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آٹھ سال قبل وہ اور گولو تقریباً ایک ساتھ ہی رین دادا کی چھاؤں میں آئے تھے اور دونوں خانماں برباد وں نے سکھ پالیا تھا۔ اس کی اور گولو کی عمروں میں پورے دس سال کا فرق تھا لیکن سچ یہ تھا کہ ان دنوں وہ ایک جتنے ہی ہراساں رہتے تھے بلکہ شاید وہ گولو کی نسبت زیادہ ہی خوف زدہ تھا۔ اپنی کم عمری اور فطری سادگی کی وجہ سے گولو کو تو احساس بھی نہیں تھا کہ وہ کن لوگوں کے درمیان آگیا ہے۔ وہ تو بس زیادہ سے زیادہ اپنے گھر، باپ اور چھوٹے بھائی کو یاد کر کے رویا کرتا تھا لیکن فاروق کے ذہن میں غموں سے زیادہ خدشات کا انبار تھا۔ وہ خوف زدہ تھا کہ ممبئی کا یہ دادا جانے اپنے کن مقاصد کے حصول کے لیے اسے اپنے ساتھ یہاں لے آیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن اپنے خالی ہاتھوں اور جیب سے عاجز تھا۔ وہ دل میں سوچا کرتا تھا کہ جیسے ہی یہ مسئلہ حل ہوا، وہ ایک پل یہاں نہیں ٹھہرے گا لیکن وہ چند دنوں کا رکنا ہی اسے ہمیشہ کے لیے اڈے سے باندھ گیا۔ اس نے یہاں زندگی کو بالکل مختلف رنگ میں دیکھا اور جانا کہ وہ کتنے خالص لوگوں کے درمیان آگیا ہے۔ یہ نہیں کہ یہاں رہنے والے سب فرشتے تھے۔ نہیں وہ سب بھی عام سے انسان تھے جو لڑتے جھگڑتے، گالم گلوچ کرتے لوگوں کی جیبیں کاٹتے اور مال داروں سے بھتے وصول کرتے لیکن ان کی یہ خوبی کیا کم تھی کہ وہ جیسے تھے، ویسے ہی دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے چہروں پر نقابیں نہیں چڑھا رکھی تھیں اور فاروق جن لوگوں کے درمیان سے آیا تھا ان کی سب سے بڑی خامی ہی یہ تھی کہ ان کا اصل لوگوں کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لوگ گمان ہی نہیں کر سکتے تھے کہ قیمتی اور اجلے لباسوں میں ملبوس خوب صورت دمکتے چہروں والے ان افراد کے دل کتنے سخت اور سیاہ ہیں۔ وہ ان لوگوں کا ہی خون تھا ان کے درمیان پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا اور زندگی کے سترہ سال گزارے تھے لیکن کبھی خود کو ان کے ساتھ اس طرح سے بندھا ہوا محسوس نہیں کیا تھا جیسے ان آٹھ سالوں میں اس اڈے کے لوگوں کے ساتھ بندھ گیا تھا۔ یہ تعلق ایسا مضبوط تھا کہ اب وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ جانتا تھا کہ کسی کو چھوڑنا کبھی سہل

نہیں ہوا کرتا۔ جن لوگوں کو وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا، وہ بھی ناپسندیدہ ہونے کے باوجود آج تک اسے پیارے تھے اور راتوں کی تنہائی میں اسے یاد آیا کرتے تھے۔ بس ان یادوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اسے واپس پیچھے کی طرف کھینچ کر لے جائیں یا پھر یہ اس کی رگوں میں دوڑتے ضدی خون کا اثر تھا کہ سارے راستوں سے واقف ہونے کے باوجود اس نے کبھی پلٹنے کا نہیں سوچا تھا۔

''اپن تم سے نہیں بولے گا فاروق بھائی۔ تم اپن کو بہت ستاتا ہے۔'' اس کے سینے سے لگا گولو روٹھے لہجے میں ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

''تم ہم سے بات نہیں کرو گے تو پھر تو میرا اڈے پر رہنا ہی بیکار ہے۔ تم سے بات کیے بغیر میں یہاں رہ کر کیا کروں گا۔ ایسے میں تو میرا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' گولو کا چہرہ اس کے فراخ سینے میں چھپا ہوا تھا اس لیے وہ اردگرد کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ فاروق نے آنکھوں اور ہاتھ کے اشارے سے وہاں موجود دیگر لوگوں کو تحمل کی تلقین کی اور گولو کے جذبات کو چھیڑنے لگا۔ اس کی بات سن کر گولو کو یوں جھٹکا لگا جیسے بجلی کا ننگا تار اس کے بدن کو چھو گیا ہو۔

''کک... کیا بولا آپ اپن سے؟'' اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور فاروق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں پوچھنے لگا جیسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔

''میں کیا بولوں گا۔ میں تو بس تمہیں بتا رہا ہوں کہ تمہاری ناراضگی سہہ کر یہاں رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔'' فاروق نے اپنی بات دہرائی۔

''اپن کہیں نہیں جانے دے گا آپ کو۔ اپن آپ کو یہاں ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے مانگتا ہے۔'' حسبِ توقع وہ جذباتی ہو چکا تھا۔

''تم بات نہیں کرو گے تو میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟'' ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ چھپا کر وہ منہ لٹکا کر بولا۔

''وہ تو اپن ایسے ہی بول دیا تھا۔ ایسے کیسے اپن آپ سے نہیں بولے گا۔ بولے گا، ہنڈرڈ پرسنٹ بولے گا۔ بس آپ بھی اپن کو چھوڑ کر جانے کی بات مت کرنا۔'' اس کے اتنی تیزی سے پلٹی کھانے پر وہاں موجود ہر شخص کے لبوں پر ہنسی آگئی۔

''چل چھوڑ دے رے، مت ستا میرے چھوٹے شہزادے کو۔'' آخر ربن دادا کی محبت نے ہی جوش مارا اور اس نے فاروق کے شانے پر ہاتھ مار کر اسے اشارہ کیا۔ اس بار فاروق بھی کھل کر ہنس دیا اور نہایت محبت سے گولو کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

''تو تو اپنا جانِ جگر ہے گولو۔ تجھے چھوڑ کر میں کہاں جا سکتا ہوں۔ میرا جینا مرنا سب تم لوگوں ہی کے ساتھ ہے۔''

اس کی اتنی سی بات سن کر گولو کھل اٹھا اور باورچی خانے کی طرف منہ کر کے زور سے چلایا۔ ''سجو بھائی جلدی سے گرما گرم کھانا نکالو۔ میں یہ روپے بانٹ کر بس ابھی آیا۔'' یہ حکم جاری کرنے کے بعد وہ رکا نہیں اور فٹ بال کی طرح اچھلتا کودتا بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔

''آجاؤ لوگو...... اپنے فاروق بھائی کے سر کا صدقہ لے لو۔'' باہر گلی میں لگائی جانے والی اس کی صدا اندر بھی سب کو سنائی دی۔ اس صدا پر کان دھرنے والے وہاں بہت تھے۔ کئی فقیر اور گداگر نکڑ پر یونہی منڈلاتے رہتے تھے جبکہ گلی میں بھی کئی ایسے گھرانے بستے تھے جہاں کئی کئی وقت کے فاقے ہوتے تھے۔ ایسے میں گولو کے ہاتھ میں موجود گڈی کا منٹوں میں ختم ہو جانا کوئی کمال نہیں تھا۔

''مجھ سے زیادہ تجھ پر جان دیتا ہے سالا۔ تو نے کھانا نہیں کھایا تو خود بھی پورے دن سے بھوکا بیٹھا ہے۔'' ربن دادا نے مسکراتے ہوئے فاروق کو آگاہ کیا۔ اس اطلاع پر اس نے اپنے دل میں شدید ندامت محسوس کی۔ کسی کی نظر کی ذرا سی ناگواری کی خاطر اس نے خود کو بے حد چاہنے والوں کو بڑا دکھ دیا تھا۔ بہ ظاہر وہ سپاٹ چہرہ لیے کھڑا رہا لیکن اس کا دل اشکِ ندامت بہا رہا تھا۔ ربن دادا نے اس کی کیفیت سمجھ لی۔

''ٹھیک ہے شہزادے! ادھر سب چلتا ہے۔ ابھی ہنس کر ان سب کے درمیان بیٹھ اور کھانا کھالے تو بات ختم ہو جائے گی۔'' اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے دادا نے سرگوشی میں دلاسا اور مشورہ ایک ساتھ دیا تو وہ محض اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔ سارے میں نہاری کی مہک اور روغنی روٹیوں کی سوندھی خوشبو چکراتی پھر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہیں ہال میں فرشی دسترخوان بچھا کر اس پر کھانے کے برتن سجا دیے گئے تھے۔ نہاری کے ڈونگوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی طشتریوں میں کٹا ہوا ہرا دھنیا، ہری مرچیں اور لیموں کی قاشیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ نمک دانیوں میں نمک اور پسا ہوا گرم مسالا بھی موجود تھا کہ زیادہ تیکھا کھانے کی خواہش رکھنے والے حسبِ پسند اضافہ کر سکیں۔

''آپ کی پسند کا لوکی کا حلوا بھی بنایا ہے آج سجو بھائی نے۔'' وہ ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آ کر بیٹھا تو گولو نے اس کے بائیں جانب خالی جگہ پر بیٹھتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

یہ جگہ بطورِ خاص اسی کے لیے خالی چھوڑی گئی تھی۔

''بنایا تو ہے پر اپن کو پریکٹس نہیں ہے۔ ابھی نیا نیا بنانا سیکھا ہے۔ پتا نہیں آپ کو پسند بھی آوے گا یا نہیں۔'' جھک کر دسترخوان پر روٹیوں کی قاب رکھتے سجو نے گولو کی بات سن لی تھی اس لیے ذرا عاجزی سے قبل از وقت ہی تمہید باندھ دی کہ اگر فاروق کو حلوا پسند نہ آئے تو اسے قصور وار نہ سمجھا جائے۔ فاروق کے لیے یہ بھی کیا کم تھا کہ ممبئی کے ایک باورچی نے اس کی پسند کو ملحوظ رکھتے ہوئے حیدرآباد سے تعلق رکھنے والا ایک پکوان اتنی چاہت سے بنایا ہے۔ چنانچہ جب کھانے کے بعد چاندی کے ورقوں اور بادام کی گریوں سے سجے لوکی کے حلوے کی قاب اس کے سامنے لاکر رکھی گئی تو اس نے خوب خوب تعریف کر کے اسے تناول کیا۔ اس کی تعریفوں پر سجو کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ یوں خوش نظر آنے لگا جیسے اسے کوئی ایوارڈ دے دیا گیا ہو۔ لوکی کے حلوے کی تعریف میں رطب اللسان فاروق کو علم نہیں تھا کہ آج کسی اور نے بھی اس کا پسندیدہ پکوان اسی ذوق و شوق سے کھایا ہے اور عین اس وقت بھی وہ اپنے گھر کی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی صبح کی طرح ہی اس حلوے کی شان میں بالکل اسی کی طرح تعریفی کلمات ادا کر رہی ہے۔ دو مختلف دنیاؤں کے باسیوں کے درمیان کوئی ایک قدر تو مشترک تھی۔

☆☆☆

''مس جولیٹ! آپ کو رندھاوا صاحب اپنے روم میں بلا رہے ہیں۔'' وہ نہایت توجہ سے اپنے ہی اخبار میں چھپنے والا ایک سینئر صحافی کا آرٹیکل پڑھ رہی تھی کہ چپڑاسی نے اسے پیغام پہنچایا۔ اس پیغام کے ملتے ہی وہ آرٹیکل ادھورا چھوڑ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ رندھاوا اس اخبار کا مدیر اور مالک تھا اس لیے اس کی طرف سے ملنے والے پیغام کو ایک پل کے لیے بھی نظر انداز کرنے کی غلطی نہیں کی جاسکتی تھی۔

''گڈ آفٹر نون سر۔'' رندھاوا کے کمرے میں باقاعدہ اجازت لے کر داخل ہونے کے بعد اس نے خوش گوار لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''گڈ آفٹر نون، آؤ جولیٹ بیٹھو۔'' رندھاوا نے ایک نظر میں اس کا مکمل جائزہ لینے کے بعد اس سے کہیں زیادہ خوش گوار موڈ میں اسے جواب دیا۔ وہ پچاس سال سے متجاوز، زمانے کے سرد و گرم سے واقف ایک زیرک آدمی تھا اور اس نے جولیٹ کو اس کی تعلیمی قابلیت کے علاوہ شخصی... دل کشی کی وجہ سے بھی اس ملازمت پر رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا

کہ جو کام مردوں کے لیے دشوار ثابت ہو، وہ خواتین اور خاص طور پر حسین خواتین کے ذریعے زیادہ آسانی سے انجام پا جاتا ہے۔ وہ جولیٹ کو اخبار کے دیگر کاموں سے زیادہ اہم شخصیات سے انٹرویو لینے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں دلکش خواتین سامنے والے سے آسانی سے جوابات اگلوانے میں کامیاب ہوجاتی ہیں اور لوگ ان سے ذرا کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ جولیٹ کی باقاعدہ تربیت کرتا رہا تھا اور اسے انٹرویو لینے کے کئی گر سکھائے تھے۔ اس سے حاصل کردہ تربیت سے استفادہ کرتے ہوئے جولیٹ نے کچھ فلمی اداکاروں اور کھلاڑیوں کے انٹرویو لیے تھے جو خاصے پسند بھی کیے گئے تھے اور رندھاوا کو ناز تھا کہ اس کی تجربہ کار نگاہ نے ایک بہت درست انتخاب کیا ہے۔ فیروزی رنگ کے لانگ اسکرٹ کے ساتھ گلابی اسکارف شانوں پر ڈالے اپنے کمرے میں داخل ہونے والی جولیٹ کے سحر انگیز حسن نے اسے ایک بار پھر یقین دلایا تھا کہ یہ لڑکی بہت سی کامیابیاں سمیٹ کر اس کے اخبار کی مقبولیت میں اضافے کا سبب بنتی رہے گی۔

''یہ تصویر دیکھو اور بتاؤ کہ کیا تم ان صاحب کو جانتی ہو؟'' اس کے کرسی سنبھالنے کے بعد رندھاوا نے ایک پوسٹ کارڈ سائز بلیک اینڈ وائٹ تصویر اس کی طرف بڑھائی۔ جولیٹ نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہ تقریباً پینتیس چھتیس سالہ ایک بارعب مرد کی تصویر تھی جو اپنی آنکھوں کے سرد مہر تاثر سے ہی قدرے بے رحم شخصیت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ اس پر سے اس کی اوپر کی طرف مڑی ہوئی بڑی بڑی نوک دار مونچھیں بھی اس کے مغرورانہ مزاج کا پتا دے رہی تھیں۔ بہرحال جولیٹ کے لیے وہ چہرہ غیر شناسا نہیں تھا۔ ملک کے ایک اہم سیاست داں اور جاگیردار کی حیثیت سے وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی بلکہ اس شخص کی پہچان کا اس کے پاس ایک ذاتی حوالہ بھی تھا۔ اس ذاتی حوالے کا ذکر کیے بغیر اس نے رندھاوا کو اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

''یس سر! میں انہیں جانتی ہوں۔ یہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک جاگیردار ہیں جن کی کانگریس کے ساتھ گہری سیاسی وابستگی ہے۔''

''گڈ، تمہاری اس جانکاری نے مجھے انسپائر کیا۔ ایک جرنلسٹ کو اتنا ہی باخبر ہونا چاہیے۔'' رندھاوا اس کا جواب سن کر شاباش دینے والے انداز میں بولا۔

''ڈیلی نیوز پیپر ریڈ کرنے سے انسان کو خودبخود ہی بہت کچھ معلوم ہوجاتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔'' اگرچہ جولیٹ کو اپنی تعریف اچھی لگی تھی پھر بھی اس نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔

''یس، یو آر رائٹ لیکن مجھ سے یہ بھی تو پوچھو کہ میں نے تمہیں یہ فوٹو کیوں دکھائی ہے؟''

''سامنے کی بات ہے سر، آپ اپنے نیوز پیپر کے لیے مسٹر دلدار آغا کا انٹرویو لینا چاہتے ہوں گے لیکن آئی تھنک یہ خاصا مشکل ہوجائے گا۔ ہم میں سے کسی کو یہاں سے پنجاب جانا پڑے گا۔ وہاں جا کر انٹرویو کا ٹائم طے کرنے اور انٹرویو لینے میں خاصا وقت لگے گا۔'' اس نے بے نیازی سے شانے اچکا کر رندھاوا کی بات کا جواب دینے کے ساتھ سامنے نظر آتے مسئلے کا بھی ذکر کردیا۔ اپنے بلاوے سے اسے یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ دلدار آغا کے انٹرویو کے لیے رندھاوا کی نظرِ انتخاب اس پر پڑی ہے لیکن فی الحال وہ اتنے لمبے سفر کے موڈ میں نہیں تھی۔ اسے رندھاوا کی کنجوسی کا بھی علم تھا۔ اگر وہ اسے پنجاب بھیجنے کا فیصلہ کرتا تو دفتر کی طرف سے زیادہ سے زیادہ اسے سیکنڈ کلاس میں سفر کی سہولت ہی مہیا کی جاتی اور یہ بھی وہ زیادہ سے زیادہ کے بارے میں سوچ رہی تھی ورنہ رندھاوا کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ وہ اسے تھرڈ کلاس سے ہی روانہ کر دیتا۔ گرمی کے اس موسم میں تھرڈ کلاس میں سفر کرنے کا تصور ہی خاصا روح فرسا تھا چنانچہ اس نے اپنے طور پر پیش بندی شروع کردی تھی۔

''یہ پرابلم نہیں ہوگی پریٹی گرل کیونکہ دلدار آغا کانگریس کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ آج کل بمبئی آیا ہوا ہے۔ بمبئی میں اس کا سسرال ہے اور آج کل وہ اپنے سسرال میں ہی ٹھہرا ہوا ہے۔ بس تمہیں کسی طرح اسے اپروچ کر کے ہمارے نیوز پیپر کے لیے انٹرویو دینے پر ایگری کرنا ہوگا۔ آج کل ملک میں جو سیاسی حالات چل رہے ہیں، اس کے حساب سے ہمارے نیوز پیپر کے لیے آغا کا انٹرویو بہت اچھا ثابت ہوگا۔ کچھ سرکلز میں ہمارے نیوز پیپر کے لیے پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ ہمارا پیپر صرف ہندوؤں کو سپورٹ کرتا ہے اور ہمارے ہاں جانب داری سے کام لیا جاتا ہے اس لیے چاہے ہمارے کالمز ہوں یا انٹرویوز سب میں ہندو جاتی کے لوگ ہی نمایاں نظر آتے ہیں۔ آغا کا انٹرویو چھپنے سے اس تاثر کو غلط ثابت کرنے میں بھی خاصی مدد ملے گی۔'' رندھاوا نے اپنی گفتگو سے واضح کردیا کہ اسے دلدار آغا کا انٹرویو لینے کا خیال

کیوں آیا تھا۔ یہ ہینگ پھٹکری لگے بغیر رنگ چوکھا آنے والا معاملہ تھا۔ ایک طرف اس کی گرہ سے کچھ خرچ نہ ہوتا تو دوسری طرف وہ اپنے مطلوبہ مقاصد بھی حاصل کرلیتا۔

''لیکن سر! آغا صاحب کا تعلق کانگریس سے ہے اور کانگریس ہندوؤں کو لیڈ کرتی ہے اس لیے آپ کا تاثر تو وہی کا وہی رہے گا۔'' جولیٹ نے اس کی توجہ مبذول کروائی۔

''اوہ نو بے بی! اس انٹرویو کے ذریعے سب سے پہلے تو یہ تاثر ہی ختم کرنا ہوگا۔ یاد رکھو کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی سیاسی پارٹی نہیں ہے۔ اس میں مسلمان بھی شامل ہیں اور کانگریس کے لیڈرز ان کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دلدار آغا جیسا بڑا مسلمان جاگیردار کانگریس کا حصہ کیوں بنتا۔ اپنے انٹرویو میں تمہیں اسی اینگل سے سوالات کرنے ہوں گے کہ لوگوں پر ثابت ہو جائے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جارہا اور ہندو یہاں کی سب سے بڑی قوم ہونے کے باوجود مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں۔'' رندھاوا نے آہستہ آہستہ اس پر اس انٹرویو کے دیگر مقاصد بھی واضح کرنا شروع کردیے اور کافی دیر تک اس حوالے سے اسے بریف کرتا رہا۔ جولیٹ نہ ہندو تھی اور نہ ہی مسلمان، اس لیے اس نے ملک میں جاری اس سیاسی چپقلش میں بھی بہت زیادہ دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ دونوں طرف کے لوگوں میں سے کسی ایک کو درست یا غلط سمجھنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ فی الحال تو وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں نبھاتے ہوئے پوری توجہ سے رندھاوا کی ہدایات سن رہی تھی اور خاص نکات کو ایک نوٹ پیڈ پر لکھتی بھی جارہی تھی۔

''جہاں تک مجھے انفارمیشن ملی ہے دلدار آغا صرف ایک ہفتہ اور ممبئی میں ٹھہرا ہوا ہے اس لیے تمہیں اس سے انٹرویو کا ٹائم لینے میں بہت پھرتی دکھانی ہوگی۔ میں اس کام کے لیے اپنے کانٹیکٹس بھی استعمال کرسکتا ہوں۔ لیکن پہلے تمہاری صلاحیتوں کو آزمانا چاہتا ہوں۔'' تمام ہدایات جاری کرچکنے کے بعد رندھاوا نے اس پر ایک اور ذمے داری ڈال دی۔

''آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ سر۔'' جولیٹ نے اعتماد سے اسے جواب دیا اور جب وہ تقریباً ایک گھنٹا رندھاوا کے دفتر میں گزار کر باہر نکلی تو عارف کو اپنا منتظر پایا۔

''اتنی لمبی پیشی کس سلسلے میں تھی؟'' وہ سامنے بیٹھی تو عارف نے اپنے تجسس کو زبان دی۔

''ایڈیٹر صاحب کو مسٹر دلدار آغا کا انٹرویو چاہیے اور یہ انٹرویو مجھے اپنے زورِ بازو پر ایک ہفتے کے شارٹ نوٹس پر حاصل کرنا ہوگا۔'' وہ آہستہ آہستہ عارف کو تمام تفصیلات سے آگاہ کرتی چلی گئی۔

''تو پرابلم کیا ہے یار! یہ مسٹر دلدار آغا وہی ہیں نا جن سے اپنی کلاس فیلو ثنا موتی والا کی پچھلے سال شادی ہوئی تھی۔ ثنا سے تو تمہاری خاصی فرینڈ شپ تھی۔ اگر آغا سسرال میں بیوی کے ساتھ ہی ٹھہرا ہوا ہے تو کیا مشکل ہے۔ تمہارے پاس ثنا کا فون نمبر تو ہوگا ہی۔ یہیں دفتر کے فون سے اسے کانٹیکٹ کرو اور باتوں باتوں میں اسے شوہر سمیت انٹرویو کے لیے راضی کرلو۔ سنگل انٹرویو سے فیملی انٹرویوز زیادہ اچھا اور منفرد رہے گا۔ ظاہر ہے اصل انٹرویو تو تم آغا سے ہی لوگی لیکن ثنا کو شامل کرلینے سے جہاں وہ خوش ہوجائے گی وہاں لوگوں کو بھی ایک نیا ٹچ مل جائے گا۔'' عارف نے جھٹ اسے مشورہ دے ڈالا۔

''کچھ عجیب سا لگے گا ایک پروفیشنل کام کے لیے ذاتی تعلقات کا استعمال کرنا۔ پھر رندھاوا صاحب کو بھی فیملی انٹرویو پر اعتراض ہوسکتا ہے۔'' جولیٹ نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''رندھاوا صاحب کا مسئلہ نہیں، انہیں ہم مل کر قائل کرلیں گے اگر وہ نہ مانے تب بھی تم بعد میں ثنا سے ان کا نام لے کر ایکسکیوز کرسکتی ہو کہ اس کے انٹرویو والا حصہ ان کی ایڈیٹنگ کی نظر ہوگیا۔ رہی پروفیشنل کام کے لیے ذاتی تعلقات استعمال کرنے کی بات تو میری جان یہ فیلڈ ہی ایسی ہے۔ یہاں ہر طرح کے کانٹیکٹس کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اگر تم ان چکروں میں پڑیں تو کچھ نہیں کرسکو گی۔'' عارف اسے خاصی دیر تک سمجھاتا رہا اور آخر کار قائل کرکے چھوڑا کہ اس اہم انٹرویو کے لیے وہ ثنا کی دوستی کو استعمال کرے گی۔

''اوکے، میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں لیکن فرض کرو ثنا نے مجھے پہچاننے سے انکار کردیا تو کیا ہوگا کیونکہ یہ بات تم بھی اچھی طرح سمجھتے ہو کہ بے شک وہ فرینڈ تو میری تھی لیکن تم میں زیادہ انٹرسٹ لیتی تھی بلکہ جہاں تک میں سمجھتی تھی، اس نے مجھ سے بھی تمہاری خاطر ہی فرینڈ شپ کی تھی ورنہ وہ اپنی کلاس سے ہٹ کر دوستی کرنے والوں میں سے تھی نہیں۔'' عارف سے یہ سب کہتے ہوئے جولیٹ کے لہجے میں قدرے شوخی تھی حالانکہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اس کے حقیقت ہونے میں اسے زیادہ شبہ نہیں تھا۔

''اپنی پرسنالٹی ہے ہی اتنے کمال کی۔'' عارف نے اس

کے مذاق کو انجوائے کیا اور کالر جھاڑتے ہوئے اکڑ کر بولا۔

"اچھا اب زیادہ مت اتراؤ اور یہ بتاؤ کہ اگر ثنا نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تو پھر میں کیا کروں؟" جولیٹ کا ذہن پھر اپنے مسئلے کی طرف چلا گیا۔

"نہیں کرے گی انکار، اگر کرے تو تم میرا حوالہ دے کر دیکھنا۔ مذاق کی بات الگ ہے لیکن تمہارا یہ اندازہ واقعی درست ہے کہ وہ مجھ میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ میرے حوالے کو رد نہیں کر سکے گی۔" اس بار عارف نے بھی سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

"ویسے ایک بات ہے عارف! کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تمہیں اتنا لائک کرنے کے باوجود ثنا نے کبھی کھل کر تم سے اپنی پسند کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ وہ جس کلاس سے بلونگ کرتی ہے وہاں تو عورتیں بہت ماڈرن ہوتی ہیں اور اس طرح کے اظہار کرتے ہوئے Hesitate نہیں ہوتیں۔" جولیٹ کی ذہنی رو ایک بار پھر ثنا کی عارف کے لیے پسندیدگی کی طرف مڑ گئی۔

"میرے خیال میں اس کے کئی اسباب تھے۔ سب سے پہلے تو تم یہ یاد رکھو کہ وہ ایک کامیاب کاروباری فیملی سے تعلق رکھتی تھی اور پرافٹ اینڈ لاس کا حساب کتاب رکھنا ایسے لوگوں کی گھٹی میں شامل ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میری طرف مائل تو تھی لیکن یقیناً اس نے سارا حساب کتاب لگایا ہوگا۔ اس نے ایک بار باتوں باتوں میں مجھ سے میرا پورا فیملی بیک گراؤنڈ معلوم کیا تھا۔ میرے جوابات سے اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں کسی بھی اعتبار سے اسے خوش رکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے پاس دوسرا راستہ یہ تھا کہ کسی طرح مجھے اپنی کلاس میں شامل کر لیتی لیکن ظاہر ہے یہ بھی اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اسے فیملی کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہو سکتا ہے اس کی ضد کو ماننے کے بجائے اسے ہی دولت و جائداد سے محروم کر دیا جاتا۔ پھر اس کے راستے میں ایک رکاوٹ تم بھی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور میں تمہیں چھوڑ کر اس کی طرف راغب نہیں ہو سکتا۔ اگر فرض کرو دولت کا لالچ دے کر وہ مجھے راضی بھی کر لیتی تو ساری زندگی اس وہم میں مبتلا رہتی کہ میرے دل پر تمہارا قبضہ ہے۔ وہ خاصی معاملہ فہم لڑکی تھی اسی لیے جب اس کے لیے دلدار آغا کا پرپوزل آیا ہوگا تو اس نے ہر پہلو سے سوچ بچار کی ہوگی اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوگی کہ ایک قلاش آدمی کے پیچھے وقت برباد کرنے سے بہتر ہے کہ ایک مضبوط پوزیشن والے بندے کا ہاتھ تھام لیا جائے۔ اس رشتے کو قبول کرنے پر اس کی اپنی فیملی کی طرف سے بھی دباؤ ڈالا گیا ہوگا جبھی ثنا موتی والا صاحبہ نے پڑھائی اور عشق دونوں کو ادھورا چھوڑا اور خاموشی سے شادی کر لی۔" عارف نے بہت منطقی انداز میں اپنا تجزیہ پیش کیا تھا اس لیے جولیٹ کو بھی اس کی تائید کرنی پڑی۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن کبھی کبھی میرا دل اس بے چاری کے لیے دکھی ہو جاتا ہے۔ محبت کے معاملے میں کمپرومائز کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ایسا کرتے ہوئے اس بے چاری نے نہ جانے کتنی تکلیف اٹھائی ہوگی۔" وہ حساس طبیعت کی مالک تھی اس لیے رقیب کی حیثیت رکھنے والی ثنا کے لیے بھی دل میں افسوس محسوس کر رہی تھی۔

"اگر تمہیں اس سے اتنی ہی ہمدردی ہو رہی ہے تو ملاقات کے وقت اس موضوع پر بھی بات کر لینا۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے مذہب میں مرد کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ تم ثنا کو آفر دینا کہ وہ اپنے جاگیردار شوہر سے طلاق لے لے پھر تم دونوں سوتن بن کر بالکل بہنوں کی طرح میرے ساتھ ایک گھر میں گزارہ کر لو گی۔" عارف بے حد سنجیدہ لہجے میں اسے مشورہ دے رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ جولیٹ نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا اور پھر دونوں بیک وقت ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی کی آواز سن کر دوسرے ساتھیوں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ عارف یوں دیکھے جانے پر تھوڑا سا خجل ہو گیا اور اسے قدرے ڈانٹنے والے انداز میں ٹوکا۔

"اگر تم اسی طرح یہاں جم کر بیٹھی مجھ سے تبادلہ خیال کرتی رہیں تو رندھاوا صاحب کی طرف سے ہم دونوں ہی کو ڈمینیشن لیٹر مل جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنی سیٹ پر جاؤ اور دلدار آغا کا انٹرویو لینے کے لیے ثنا موتی والا کو کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کرو۔" وہ بالکل صحیح بات کہہ رہا تھا چنانچہ جولیٹ نے برا مانے بغیر اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے مصروف کار ہو گئی۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ فاروق بغل میں دو تین کتابیں دبائے پبلک لائبریری سے باہر نکلا اور پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس لائبریری میں وہ خاصے طویل عرصے سے آ رہا تھا چنانچہ نگراں سمیت دیگر عملہ اس سے اچھی طرح واقف تھا اور فاروق کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں لائبریری کے اصول کے خلاف ایک سے

زیادہ کتابیں ایشو کروا سکتا تھا۔ وہ کتابوں کو بہت حفاظت سے رکھتا تھا اور مقررہ وقت پر لازماً واپس کر دیتا تھا اس لیے کسی کو اس سے کوئی شکایت بھی نہیں ہوتی تھی۔ بعض اوقات کتاب کی حالت خراب ہونے پر وہ اپنے ہاتھوں سے اس کی نئی جلد بھی چڑھا دیتا تھا تو نگراں مزید خوش ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں موجود تینوں کتابوں میں سے ایک کی حالت خاصی خستہ ہو رہی تھی اور یہ طے تھا کہ مطالعے سے قبل وہ اس کی حالت سدھارے گا۔ جلد سازی کا سامان اس کی الماری میں ہمہ وقت موجود ہی رہتا تھا۔ کتب خانے سے پیدل گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اس کے پاس موجود رنگین جلدوں کا ذخیرہ ختم پر ہے۔ بازار سے گزرتے ہوئے اس نے انہیں خرید لینا مناسب سمجھا۔ ایک دکان سے اپنی مطلوبہ خریداری کرنے کے بعد وہ دو قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک تانگے والے نے ہانک لگائی۔

''تانگا خالی ہے۔ سواری لوگے بابو؟'' تانگے والے کی ہانک پر اس نے اس کی طرف دیکھا۔ بڑا نحیف و نزار آدمی تھا جس کے جسم پر موجود ہلکی سی قمیص پر پسلیوں کے ابھار واضح نظر آرہے تھے۔ تانگے والے کی طرح اس کا گھوڑا بھی خاصا کمزور تھا۔ اگرچہ فاروق پیدل ہی گھر تک جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن تانگے والے کی آنکھوں میں محسوس ہوتی التجا نے اسے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا اور وہ تانگے میں سوار ہو گیا۔

''اور سواریاں بھی راستے سے بٹھالوں یا آپ سالم تانگا کرو گے؟'' اس سے اس کی منزل کے بارے میں دریافت کرنے کے بعد تانگے والے نے اس سے پوچھا۔ بازار سے اڈے تک کا راستہ زیادہ نہیں تھا اور اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ تانگے والے کو اس کے سوا کوئی دوسری سواری ملے۔ چنانچہ کرایہ زیادہ ہونے کے باوجود اس نے سالم تانگا لینے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح وہ اس مدقوق سے تانگے والے کی خاموشی سے مالی اعانت کر سکتا تھا۔ روپے پیسے اس کے لیے بھی مسئلہ نہیں رہے تھے۔ بچپن سے وہ اس شے کو ہاتھ کے میل کی حیثیت سے دیکھتا آیا تھا اور اب تو اس کا طرزِ زندگی اس قدر بدل چکا تھا کہ اسے زیادہ رقم کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ ربن داد اخرچے کے نام پر بڑی پابندی سے اسے خاصی معقول رقم دیتا رہتا تھا لیکن عموماً اس کے پاس وہ روپے ایسے ہی پڑے رہتے تھے اور وہ کسی کو بھی ضرورت مند محسوس کر کے بڑی فراخ دلی سے ان روپوں کو اس پر خرچ کر ڈالتا تھا۔

''بڑا کھراب جمانہ آگیا ہے۔ آدمی کو آدمی کی چنتا نہیں رہی۔ سویرے کالج کے چار لڑکوں نے میرے تانگے پر قبضہ کر لیا اور سارے شہر میں لے کر پھرتے رہے۔ اترتے سمے میں نے ان سے کرایہ مانگا تو لگے آنکھیں دکھانے۔ میں گریب (غریب) آدمی ان سے کیسے لڑتا۔ بس بنتی کرتا رہا کہ کرایہ دے دو۔ سالے میری کمجوری (کمزوری) کا مجاق (مذاق) اڑاتے ہوئے بھاگ نکلے۔ یہ میرا گھوڑا بھی میری طرح ہی کمجور ہے۔ بنا دانے پانی کے شہر میں گھومتے گھومتے ادھ مرا ہو گیا۔ پانی پلا کر دو گھنٹے آرام کروایا تو چلنے جوگا ہو سکا اور بڑی مسکل سے ایک سواری کو اس کی منزل تک پہنچایا۔ اس بابو صاحب نے کرایہ تو دے دیا۔ پر بہوت باتیں سنائیں کہ ایسے مریل تانگے پر بیٹھنے کے بجائے اگر پیدل ہی چلا جاتا تو اس سے پہلے پہنچ جاتا۔ میں ان بابو سے کیا کہتا وہ کوئی گلت (غلط) تو کہہ نہیں رہے تھے۔ اب ان کو اس سے کیا مطبل (مطلب) تھا کہ گھوڑے کے پیٹ میں کچھ ہے یا نہیں۔ میں نے بھی دو پیسے ملنے پر بھگوان کا شکر کیا اور اس بے زبان کے لیے چارا خرید کر اسے کھلایا۔ اس کا پیٹ بھروں گا تو یہ میرے پریوار کا پیٹ بھرنے کو کام کرے گا نا۔''

سست رفتار تانگے کے مالک کی زبان میں بڑی روانی تھی۔ آدمی کو اپنا دکھڑا سنانے کے لیے کوئی مل جائے تو یہ بھی ایک نعمت ہی ہوا کرتی ہے۔ فاروق بڑی دل سوزی سے اس کی داستان سنتا رہا۔ آخر تانگے کی سست رفتاری کے باوجود بھی اس کی منزل تک کا مختصر راستہ جلد کٹ ہی گیا۔ عین اڈے کے سامنے تانگا رکوانے کے بجائے اس نے نکڑ پر ہی اتر جانا مناسب سمجھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر بنا گنے کئی نوٹ تانگے والے کی مٹھی میں تھما دیے۔ یہ کرائے کی رقم سے بہت زیادہ روپے تھے۔ حیرت زدہ تانگے والا ابھی کچھ کہہ بھی نہیں سکا تھا کہ وہ نیچے اتر گیا۔ نیچے اترتے ہی اس کی نظر دو ایسے آدمیوں پر پڑی کہ وہ چونک اٹھا۔ وہ اڈے ہی کے آدمی تھے لیکن کسی اور علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی دنیا میں ایک اڈے کے آدمیوں کا دوسرے کے علاقے میں بلاجواز جانے کا رواج نہیں تھا اور اس کے سامنے جو دو آدمی تھے ان کی شہرت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی اس لیے اس نے آگے بڑھنے کا فیصلہ ترک کر دیا اور بغل میں دبی کتابیں پلٹ کر تانگے والے کو تھماتے ہوئے بولا۔ ''ذرا دو منٹ یہاں رک کر میرا انتظار کرنا بھائی۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

تانگے والا ایسے دیالو بندے کو کیسے انکار کر سکتا تھا

چنانچہ فوراً کتابیں تھام کر اپنے رکنے کا عندیہ دے دیا۔ فاروق متوازن قدموں سے ان دونوں آدمیوں کی طرف بڑھا جن کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی اور وہ مخالف سمت میں اس طرح دیکھ رہے تھے کہ جیسے کسی کے انتظار میں ہوں۔ فاروق نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی انگلیوں نے چاقو کے لمس کو محسوس کیا اور سارے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔ وہ ان دونوں سے محض باز پرس کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس علاقے میں کیوں نظر آرہے ہیں لیکن اگر وہ کوئی ٹیڑھا پن دکھاتے تو چاقو کا استعمال بھی کرنا پڑ سکتا تھا۔ اس کی آمد سے بے خبر وہ دونوں ہنوز مخالف سمت میں دیکھ رہے تھے۔ اب فاروق نے ان کی توجہ کا مرکز بھی بھانپ لیا تھا۔ وہ محلے کی مسجد کے دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور سروں پر ٹوپیاں لیے، سینے سے جزدان میں لپٹے سیپارے لگائے چھٹی کے بعد مسجد سے نکلنے والے مختلف عمر کے بچوں کا بغور جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ ان کا یہ انداز دیکھ کر فاروق ٹھٹک گیا اور بڑھتے قدموں کو روک کر ان کے یوں کھڑے ہونے کا مقصد سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگلے چند لمحوں میں مسجد کے دروازے سے سفید کرتہ شلوار میں ملبوس سر پر سفید ہی ٹوپی لگائے ایک خوب صورت اور معصوم صورت لگ بھگ چھ سال کا بچہ برآمد ہوا۔ اس بچے کو دیکھ کر وہ دونوں فوراً ہی حرکت میں آگئے۔ بچہ انہیں سامنے پا کر ٹھٹک گیا اور ہراساں نظر آنے لگا۔ ان میں سے ایک نے فوراً ہی بچے کے دائیں بازو کو مضبوطی سے دبوچ لیا۔ اب فاروق کے لیے اپنی جگہ رکے رہنا ممکن نہیں تھا کیونکہ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ دونوں بچے کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس محلے کا کوئی بچہ اس کی نظروں کے سامنے اغوا ہو جاتا یہ وہ کیسے گوارا کر سکتا تھا چنانچہ للکارتا ہوا ان دونوں کی طرف لپکا۔

''اے جامو، اے سورتی! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس کی للکار نے ان دونوں کو چونکا دیا اور ان کی نظروں میں بھی شناسائی کی چمک لہرائی۔

''تم بیچ میں مت آؤ فاروق استاد! یہ تمہارا لفڑا نہیں ہے۔'' بچے کا بازو دبوچے جامو نامی آدمی نے بگڑے تیور سے اسے متنبہ کیا۔

''ایسے کیسے میرا لفڑا نہیں ہے۔ تم ربن دادا کے علاقے میں کھڑے ہو کر مجھ سے یہ بات کہنے کی جرأت کیسے کر سکتے ہو؟'' وہ ان کے سروں پر پہنچ گیا اور ان دونوں کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''علاقہ ولاقہ کچھ نہیں۔ مجو استاد نے اپن کو بولا ہے یہ چھورا جدھری ملے لے کر اس کے پاس آؤ۔ اپن اپنے استاد کا آرڈر پورا کرتا ہے۔ کوئی تمہاری علاقے سے بھتا لے کر نہیں جارہا جو ایسے دیدے دکھا رہے ہو۔'' فاروق کے تیوروں کے باوجود وہ دبنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دبتا بھی کیوں، وہ دو تھے اور خود اڈے پاڑے کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ ہاتھ پیر ہلانا اور چاقو چلانا انہیں بھی آتا تھا۔ فاروق ان کی راہ میں مزاحم ہوتا تو وہ بھی بھرپور مزاحمت کر سکتے تھے۔

''سورتی! تم سمجھاؤ اس عقل کے اندھے کو...... اگر تم لوگوں نے اس بچے کو ربن دادا کی مرضی کے بغیر یہاں سے لے جانے کی کوشش کی تو اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہنے کے لائق نہیں رہو گے۔'' ہاتھ چلانا فاروق کو خوب آتا تھا لیکن اس کی کوشش تھی کہ کسی پھڈے کے بغیر ہی یہ معاملہ نمٹ جائے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ اڈے کے آدمیوں کی انفرادی لڑائی دونوں اڈوں کی لڑائی بن جاتی تھی اور ایسی صورت میں خاصا خون خرابا ہوتا تھا۔ اپنی زندگی کے ان آٹھ سالوں میں اس نے کئی بار انسانی خون کی ارزانی دیکھی تھی لیکن مزاج پر یہ صورت حال اب بھی گراں گزرتی تھی۔

''اپن اسے کیا سمجھائے۔ ابھی تم اپن کی بات سمجھو اور اپنے راستے سے ہٹ جاؤ۔'' اس کی بات کو خاطر میں لائے بغیر سورتی نے بھی اپنے ساتھی کی حمایت کی اور دونوں بیک وقت اپنی جگہ سے حرکت میں آئے۔ ان کا رخ اس تانگے کی طرف تھا جو تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑا تھا لیکن فاروق پہلے اس پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔ ان دونوں کو حرکت کرتے دیکھ کر غصے سے فاروق کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے زور سے لات چلائی۔ دھکا لگنے سے سورتی پیچھے کی طرف گرا۔ جامو نے فوراً روتے ہوئے بچے کو اپنی گرفت سے آزاد کیا اور اپنے ساتھی کی مدد کے لیے چاقو تولتا ہوا اس پر حملہ آور ہوا۔ آپس کی لڑائیوں میں اتنی جلدی چاقو کھولنے کا رواج نہیں تھا اس لیے فاروق سنبھلتے سنبھلتے بھی زد میں آگیا اور جامو کے چاقو کی نوک نے اس کے بائیں بازو پر چرکا سا لگا دیا۔ زخم کھا کر دہشت زدہ ہونے کے بجائے وہ مزید اشتعال میں آگیا اور پھرتی سے پینترا بدل کر پہلے خود کو سورتی کے حملے سے بچایا اور پھر خود بھی اپنا چاقو نکال لیا۔ اب وہاں بیک وقت تین چاقو کھلے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر وہاں سے گزرتے اکا دکا راہ گیروں اور مدرسے سے نکلنے

والے بچوں کی چیخیں نکل گئیں لیکن وہاں ان چیخوں پر دھیان دینے کا اب ہوش ہی کسے تھا۔ بجلی کے کوندوں کی طرح چاقوؤں کی دھاریں چمکنے لگیں۔ چاقو پکڑنے والے تینوں ہی ہاتھ مشاق تھے اور ان کے بدن بچاؤ کے گر جانتے تھے اس لیے فاروق کو لگنے والے پہلے زخم کے علاوہ ابھی تک کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی۔

اس جھگڑے کے دوران ہی ایک جواں سالہ عورت دوڑتی اور ہانپتی ہوئی اس حال میں وہاں پہنچی کہ اس کے برقع کے پورے بٹن بھی بند نہیں تھے اور چہرے پر پڑا نقاب پریشان ہو کر اس کے بے تحاشا حسن کی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ وہاں پہنچتے کے ساتھ ہی اس نے وجہ تنازع بننے والے روتے ہوئے بچے کو اپنی آغوش میں لے لیا اور گھسیٹتی ہوئی وہاں سے لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ نقوش کی مشابہت اور اس کی بے قراری دونوں سے ظاہر تھا کہ وہ بچے کی ماں ہے۔ یقیناً مدرسے کے بچوں میں سے ہی کسی نے اس کے گھر پر واقعے کی اطلاع پہنچائی تھی اور وہ حیران و پریشان گرتی پڑتی اپنے لختِ جگر کو بچانے کے لیے وہاں پہنچ گئی تھی۔ ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر حملہ کرتے بچے کی خاطر لڑنے والے تینوں افراد میں سے کسی کو علم بھی نہ ہو سکا کہ کب بچے کی ماں بچے کو لے کر منظر سے غائب ہو گئی۔
لڑائی بھڑائی کے فن میں بے شک تینوں ماہر تھے لیکن فاروق کی مہارت اس اعتبار سے زیادہ تھی کہ وہ بیک وقت دو آدمیوں کے حملے کو روک رہا تھا۔ آخر کار ایک لمحہ ایسا آیا کہ اس کا داؤ چل گیا۔ دو مختلف سمتوں سے خود پر حملہ آور ہوئے جامو اور سورتی کے وار سے بچنے کے لیے اس نے یک دم ہی نیچے جھک کر غوطہ دیا اور برق رفتاری سے پلٹ کر جامو پر حملہ آور ہوا۔ اس کے اچانک ہٹ جانے سے وہ دونوں پہلے ہی ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے تھے اس لیے جامو کو پینترا بدل کر اس کا وار بچانے کا موقع بھی نہیں مل سکا اور اس کا چاقو جامو کی ران کو ادھیڑتا چلا گیا۔ اسی وقت فضا میں شور سا بلند ہوا۔ وہ اڈے سے تعلق رکھنے والے چھ سات آدمی تھے جو دوڑتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ اڈا یہاں سے اتنا دور تو تھا نہیں کہ انہیں خبر نہ ہوتی بس کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان سب نے جامو اور سورتی کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور جب وہ مار کھاتے کھاتے ادھ موئے ہو گئے تو انہیں انہی کے لائے ہوئے تانگے میں ڈال کر واپس مجو کے اڈے کی طرف بھجوا دیا گیا۔

یہ ساری لمحوں کی کہانی تھی۔ فاروق نے معاملہ نمٹتے دیکھا تو دور ٹھہرائے اس تانگے کی طرف بڑھا جس کے کوچوان کو اس نے کتب خانے سے جاری کروائی ہوئی کتابیں تھمائی تھیں۔ کوچوان نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے سارا جھگڑا دیکھا تھا اور اب اس کی آنکھوں میں بیک وقت حیرت اور خوف کے تاثرات تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فاروق کی خون میں بھیگ جانے والی آستین کو دیکھ رہا تھا۔
''میری کتابیں دے دو لالہ۔'' قریب پہنچ کر فاروق

نے اسے پکارا تو وہ جیسے کسی خواب سے جاگا۔
''آپ کا بہوت خون بہہ رہا ہے بابو! بولو تو کسی اسپتال لے چلوں۔'' اس کی خون آلود آستین کو تشویش سے دیکھتے ہوئے اس نے پیشکش کی۔ ویسے یہ حیرت اب بھی اس کی آنکھوں میں پڑھی جاسکتی تھی کہ نرم خو، مہربان اور کتابیں پڑھنے والے کسی آدمی کا تعلق بھلا اڈے سے کیونکر ہوسکتا ہے؟
''شکریہ لالہ! تمہاری اتنی ہی مہربانی کافی ہے کہ تم ڈر کر ان کتابوں سمیت بھاگ نہیں نکلے۔ یہ کتابیں میرے پاس لائبریری کی امانت ہیں اس لیے ان کی بڑی فکر تھی۔ باقی یہ خون اور زخموں وغیرہ سے ہم لوگ نہیں گھبراتے۔ یہ تو ہمارا روز کا کھیل ہے۔'' کوچوان کو نرمی سے جواب دیتے ہوئے اس نے اس سے کتابیں لے لیں اور سر جھکائے اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ گیا۔ جھکے ہوئے سر کے ساتھ وہ یہ دیکھنے سے قاصر رہا تھا کہ جولیٹ بھی عین اسی وقت وہاں سے گزری ہے اور اس کی خون آلود آستین کے ساتھ ساتھ گردوغبار میں اٹ جانے والے کپڑوں اور بالوں کو دیکھ کر اس کی حسین پیشانی پر کئی بل پڑ گئے ہیں۔ ایسے بل جن میں واضح ناپسندیدگی اور ناگواری کی تحریر تھی۔

☆☆☆

''تو آپ کے خیال میں کانگریس ہی ہندوستان کی کُل اقوام کی واحد نمائندہ جماعت ہے؟'' دوران انٹرویو دلدار آغا کے خیالات جاننے کے بعد اس نے پہلو بدلتے ہوئے قدرے تیکھے لہجے میں اس سے یہ سوال کیا۔ اپنے خدشات کے برعکس وہ دلدار آغا سے انٹرویو کا وقت لینے میں بہت آسانی سے کامیاب ہوگئی تھی۔ اس کی طرف سے کی جانے والی فون کال پر ثنا نے بہت گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا اور اپنی پُرجوش گفتگو سے ثابت کردیا تھا کہ وہ ایک مشہور اور بارسوخ آدمی کی بیوی بن جانے کے باوجود زمانہ طالب علمی کی دوستی کو نہیں بھولی ہے۔ اس کی خواہش پر اس نے دلدار آغا سے انٹرویو کا وقت دلانے کا بھی وعدہ کرلیا تھا اور اگلے ہی دن فون کر کے اسے دو دن بعد ملاقات کا وقت بھی دے دیا تھا۔ ثنا کے دیے گئے وقت کے مطابق وہ ٹھیک ایک بجے دوپہر اپنے کیمرامین کے ساتھ اس کی کوٹھی پر پہنچ گئی تھی۔
کوٹھی پر بھی ثنا نے اس کا پُرجوش استقبال کیا اور بتایا کہ دلدار آغا کی طرف سے اصل میں انٹرویو کے لیے تین بجے کا وقت دیا گیا ہے لیکن اس نے جولیٹ کو قبل از وقت اس لیے بلایا ہے کہ دونوں سہیلیاں مل بیٹھ کر کچھ وقت کے لیے پرانی یادوں کو تازہ کرسکیں۔ اس نے جولیٹ کے لیے بہت پرتکلف کھانے کا اہتمام کروا رکھا تھا۔
تقریباً دو گھنٹے تک دونوں سہیلیاں ایک دوسرے سے خوب باتیں کرتی رہیں۔ ثنا نے اس سے عارف کے بارے میں سرسری طور پر پوچھا اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ اب ان دونوں کو جلد از جلد شادی کرلینی چاہیے۔ مجبوراً جولیٹ کو اسے عارف کے مسائل کے بارے میں آگاہ کرنا پڑا۔ جنھیں سن کر ثنا نے خاموشی اختیار کرلی۔ ٹھیک تین بجے دلدار آغا نے انہیں جوائن کرلیا۔ وہ اپنی تصویر ہی کی طرح رعب دار شخصیت کا مالک تھا۔ جولیٹ نے اس سے درخواست کی کہ پہلے فوٹو سیشن کروا لیا جائے تاکہ دو گھنٹے سے انتظار گاہ میں خوار ہوتا فوٹوگرافر اپنے کام سے فارغ ہو کر روانہ ہوسکے۔ اس کی یہ درخواست خوش دلی سے قبول کرلی گئی۔ فوٹوگرافر کی روانگی کے بعد انٹرویو کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ دلدار آغا اپنے رعب دار لہجے میں اس کے ہر سوال کا بڑی شائستگی سے جواب دیتا رہا۔ اس کے باوجود جولیٹ کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا کہ یہ شخص اتنا شائستہ اور مہذب نہیں ہے جس قدر خود کو ظاہر کررہا ہے۔ شاید اسے ثنا کی سہیلی ہونے کے ناتے کچھ زیادہ رعایت دی جارہی تھی۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو، ایک ہوشیار صحافی کی حیثیت سے جولیٹ پورا فائدہ اٹھا رہی تھی اور سیدھے سادے سوالات کے دوران موقع پا کر کوئی تیکھا سوال بھی کردیتی تھی۔ اس وقت کیے جانے والے سوال میں بھی کچھ تیکھاپن تھا جسے دلدار آغا آسانی سے ہضم کر گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔
''کیا آپ کو اس بات میں کوئی شک ہے کہ کانگریس ہندوستان کی کل اقوام کی نمائندہ جماعت نہیں ہے؟''
''بات میرے شک کی نہیں عوامی ردعمل کی ہے۔ اگر کانگریس کل اقوام کی نمائندہ جماعت ہونے کا فرض پوری طرح ادا کررہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کے مقابل اپنی الگ جماعت بنالی ہے اور مسلسل کانگریس کی نیت پر شبہ کررہے ہیں؟'' اس نے اپنا پہلو بچاتے ہوئے سوال کو ایک بار پھر اس کی طرف لوٹایا۔
''دیکھیں بی بی! بات یہ ہے کہ سیاست میں سازشیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اگر کانگریسی راہنماؤں کی نیت میں کوئی خرابی ہوتی تو مجھ جیسے کئی مسلمان اب تک کانگریس سے جڑے نہیں رہتے۔ جو الگ ہوگئے ہیں ان کے دلوں میں جان بوجھ کر بدگمانیوں کا زہر بھرا گیا ہے تاکہ ہندوستانی عوام کی طاقت کو تقسیم کیا جاسکے۔ پہلے ہم سب ایک ساتھ

تھے اور ایک ہی مطالبہ کررہے تھے لیکن اب ہم دو الگ الگ مطالبے کررہے ہیں۔ اس صورت حال کا فائدہ کون اٹھائے گا۔ اس بات کو ہر ذی شعور انسان سمجھ سکتا ہے لیکن نہ جانے کیوں ہمارے چند مسلمان بھائیوں کی عقلوں پر پتھر پڑ گئے ہیں اور وہ اپنے ساتھ دوسرے مسلمانوں کو بھی ورغلا رہے ہیں۔''

''آپ چاہیں تو اس انٹرویو کے ذریعے مسلمان راہنماؤں کو واضح پیغام دے کر سازش کو پوری طرح بے نقاب کرسکتے ہیں۔'' جولیٹ نے اسے صلاح دی۔

''میرا پیغام واضح ہی ہے۔ کوئی خود سے نہ سمجھنا چاہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔'' دلدار آغا نے بڑی خوب صورتی سے پہلوتہی کی۔ وہ ایک جاگیردار و صنعت کار تھا جس کو اپنے معاملات چلانے کے لیے بہرحال حاکم وقت یعنی انگریزوں سے واسطہ پڑتا تھا اور جولیٹ کو حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس کے کئی بڑے بڑے انگریز افسروں سے خاصے اچھے تعلقات تھے۔ اپنے انٹرویو میں وہ ان کا نام لے کر اپنے تعلقات کو کیسے خراب کرسکتا تھا۔ جو اشارہ دیا تھا اس کو گفتگو کے داؤ پیچ کے ذریعے موقع کی مناسبت سے الجھا دیتا تو کون اسے پکڑ سکتا تھا۔ جولیٹ نے بھی اس کے بعد اسے مزید نہیں چھیڑا۔ اسے معلوم تھا کہ ایسے چبھتے ہوئے سوالات کو انٹرویو کا حصہ بنانے سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اس کا لیا گیا انٹرویو جوں کا توں شائع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رندھاوا اس انٹرویو سے کچھ خاص مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے شائع کرنے سے قبل وہ اسے بڑی عرق ریزی سے ایڈٹ کرتا اور لوگ وہی پڑھ پاتے جو وہ انہیں پڑھوانا چاہتا تھا۔

اپنی پوزیشن واضح ہونے کے باعث جولیٹ نے بھی ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا اور سوالوں کا رخ خوب صورتی سے اس کی نجی زندگی کی طرف موڑ دیا۔ اس مرحلے پر ثنا بھی انٹرویو کا حصہ بن گئی۔ ہر مشرقی بیوی کی طرح اس نے بھی اپنے شوہر کے ہر موقف کی بھرپور حمایت کی اور اسے ہر اعتبار سے ایک اعلیٰ انسان ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ جولیٹ کو اس کے سچ جھوٹ سے کوئی غرض نہیں تھی پھر بھی اس نے دلدار آغا کی آنکھیں پڑھ لی تھیں۔ تصویر میں تو وہ محض متکبر اور سفاک فطرت ہی محسوس ہوا تھا لیکن اس کے مقابل بیٹھ کر وہ اس کی آنکھوں میں چھپی ہوس کو بھی پڑھ چکی تھی۔ یہ ایک ایسے مرد کی نظریں تھیں جو کسی عورت پر اٹھتی ہیں تو پھر اس کے بدن کے ہر زاویے کو کھنگالنے کے بعد ہی پلٹتی ہیں۔ نگاہوں کی اس چبھن کو جولیٹ نے بہت اچھی طرح محسوس کیا تھا اور ثنا سے دوستی کے باوجود اس کی خواہش تھی کہ دوبارہ دلدار آغا سے بھی ملاقات نہ کرنی پڑے۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو بڑی خوبی سے چھپا لیا تھا اور انٹرویو کے خاتمے تک اپنے مزاج کو خوش گوار ہی رکھا تھا۔ چنانچہ کئی گھنٹوں پر مشتمل یہ نشست برخاست ہوئی تو وہاں موجود ہر شخص ہی مطمئن نظر آیا۔ دلدار آغا کے کہنے پر ثنا نے گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اس کی واپسی کا بندوبست کیا۔ ایک نہایت مصروف دن گزار کر شام ڈھلے اپنے محلے تک پہنچنے والی جولیٹ کو وہاں جو تماشا دیکھنے کو ملا، اس نے طبیعت کو مزید مکدر کردیا۔ گلی اور لوگوں کے ذہن دونوں تنگ ہونے کی وجہ سے اس نے گاڑی پہلے ہی رکوالی تھی اور خود پیدل چلتی ہوئی محلے میں داخل ہوئی تھی۔ وہاں جاری ہنگامہ اور فاروق کا ابتر حلیہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا تھا اور اس کے دل میں فاروق کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات کچھ اور بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

''یہ لیجیے فاروق بھائی گرما گرم یخنی۔ اسے فوراً پی ڈالیے، اگر ٹھنڈی ہوگئی تو پھر مزہ نہیں دے گی۔'' ٹرے میں اچھے خاصے بڑے سائز کا پیالہ رکھے گولو فاروق کے کمرے میں داخل ہوا اور بڑے جوش سے اسے ہدایت دی تو وہ کراہ اٹھا۔

''میرے معدے پر رحم کردے گولو یار! میں کہاں کا اتنا پیٹو ہوں کہ اس خاطرداری کو برداشت کرسکوں۔ ابھی تو تم مجھے اتنا بڑا گلاس بھر کر پھلوں کا رس پلا کر گئے تھے اور اب یہ یخنی لے آئے ہو۔ مجھ اکیلے آدمی کے پیٹ میں بھلا ایک ساتھ اتنی چیزوں کی گنجائش کیسے بن سکتی ہے؟'' اس نے گولو کی خاطرداری کے خلاف باقاعدہ دہائی دی۔ سارا ہنگامہ ختم ہونے پر وہ اڈے پہنچا تھا تو اس کی قمیص اتروا کر اس کے زخم کا معائنہ کیا گیا تھا۔ ربن دادا سمیت وہاں موجود ہر تجربے کار شخص کا خیال تھا کہ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے اور صرف اوپر کی کھال ہی کٹی ہے۔ ایسے ہلکے پھلکے زخموں کا وہ لوگ خود ہی علاج کرلیا کرتے تھے لیکن گولو نے تو اسے زخمی دیکھ کر ایک ہنگامہ بپا کردیا تھا اور یوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا کہ جیسے نہ جانے فاروق کو کیا ہوگیا ہو۔ اس کی تسلی کے لیے خاص طور پر ڈاکٹر کو بلوا کر فاروق کی مرہم پٹی کروائی گئی۔ جب ڈاکٹر نے تسلی دی کہ زخم زیادہ گہرا نہیں اور جلد

ٹھیک ہو جائے گا تب جا کر گولو کو ذرا قرار آیا اور ڈاکٹر کی روانگی کے بعد وہ اس مہم پر لگ گیا کہ فاروق کے جسم سے بہنے والے خون کے زیاں کا کم سے کم وقت میں مداوا کیا جاسکے چنانچہ اس وقت فاروق اس کی بھرپور خاطر داری کی زد میں تھا۔

''پھلوں کے رس کی کیا بات کرتے ہیں آپ۔ وہ تو پانی کے مافق ہوتا ہے اور پانی سے کیا خاک پیٹ بھرتا ہے۔ آپ کھانے پینے کے بہت چور ہو، پر اپن بتا رہا ہے ابھی اپن جو کچھ آپ کو کھلائے گا پلائے گا، وہ آپ کو ایک دم خاموشی کے ساتھ کھانا پینا پڑے گا۔ ماں قسم پانی کی طرح تو خون بہا ہے آپ کے جسم سے۔ خون کی کمی کو پورا کرنے کے لیے آپ کو اچھی غذا تو لینی پڑے گی۔ ابھی آپ یہ دیسی چوزوں کی یخنی پیجیے۔ رات کے کھانے کے لیے سجو بکرے کا شوربا اور چپاتیاں تیار کر رہا ہے اور صبح کے لیے اپن نے اسے کلیجی بھوننے کا کہہ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ مرچ مسالے سے پرہیز کریں لیکن غذا طاقت ور لیں تو جلد اچھے ہو جائیں گے۔ اس لیے آپ کان کھول کر سن لیجیے کہ آپ کی کوئی بہانے بازی نہیں چلے گی اور اپن جو کہے گا آپ کو ماننا ہوگا۔'' اس کے احتجاج کے جواب میں گولو نے اسے پورا لیکچر سنا ڈالا۔ مجبوراً فاروق کو ہار مانتے ہوئے اس جہازی سائز یخنی کے پیالے کو منہ سے لگانا ہی پڑا۔ اتنی محبت اور خلوص کو آدمی رد بھی کیسے کر سکتا ہے؟

''خوب خاطریں ہو رہی ہیں فاروق بھائی کی۔'' اسی وقت کمو اور وجے کمرے میں داخل ہوئے اور یہ منظر دیکھ کر گولو کو چھیڑا۔

''تم کو کوئی اعتراج (اعتراض) ہے کیا؟'' حسبِ توقع گولو نے برا سا منہ بنا کر جھٹکے سے کہا۔

''بھگوان نہ کرے جو اپن ایسا کرے پر یار گولو تم نے ایسی خدمت اپن کی تو نہیں کی تھی۔ یاد ہے نا پچھلے سال اس حرام جادے راجا سے لڑتے ہوئے کتنا گہرا گھاؤ لگا تھا اپن کو۔ پورے آٹھ ٹانکے لگانے پڑے تھے ڈاکٹر کو۔'' کمو نے اسے یاد دلایا۔

''سب یاد ہے اپن کو پر تم بھول رہے ہو کہ تب یہ گولو ہی تھا جو بستر پر تم کو کھانا پانی سب دیتا تھا۔'' گولو نے پھولے ہوئے منہ کے ساتھ اسے اپنی خدمت یاد دلائی۔

''اس سے تو اپن کا انکار نہیں پر سچ بول تو نے اپنی ایسی خدمت تو نہیں کی تھی جیسی ابھی فاروق بھائی کی کر رہا ہے۔'' اس کا موڈ دیکھ کر بھی کمو اسے چھیڑنے سے باز نہ آیا۔

''فاروق بھائی تو فاروق بھائی ہیں۔ تم جا کر پہلے آئینے میں اپنی صورت دیکھو پھر فاروق بھائی کی برابری کرنا۔'' اس بار گولو نے ہر مروت کو بالائے طاق رکھ کر کھری کھری سنا ڈالی۔ اس کا یہ جواب سن کر فاروق اور وجے کے حلق سے زوردار قہقہہ نکل گیا۔ کمو نے بھی جھینپی ہوئی ہنسی سے ان کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ ان تینوں کے ردِعمل سے بے نیاز گولو نے یخنی کا خالی پیالہ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

''سالے نے لٹیا ہی ڈبو دی کمو کی۔'' وجے نے پیٹ پکڑ کر ہنستے ہوئے کمو کا مذاق اڑایا۔

''لگتا ہے۔ مجھے ضرورت سے زیادہ ہی چاہتا ہے۔'' فاروق نے کمو کی جھینپ مٹانے کی کوشش کی۔

''چاہتے تو ہم سب بھی بہت ہیں استاد اسے بھی اور تمہیں بھی۔ بس اس کی صورت دیکھ کر اسے چھیڑنے کو من کرتا ہے۔'' کمو نے موقع پا کر اپنی صفائی پیش کی۔

''میں سب سمجھتا ہوں۔'' فاروق نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے بولا۔ ''ربن دادا کہاں ہے؟ بہت دیر ہوئی میں نے دادا کو دیکھا نہ آواز سنی۔''

''وہ اور رامو استاد مل کر نانا کے پاڑے پر گئے ہیں۔ آج جو لفڑا ہوا ہے اس کے بعد حالات بہت بگڑ سکتے ہیں۔ نانا کی مجو دادا سے اچھی بنتی ہے اس لیے دادا نے سوچا ہے کہ اسے بیچ میں ڈال کر لفڑے کو بڑھنے سے روکے۔'' کمو سنجیدگی سے اسے رپورٹ دینے لگا۔

''اس طرح تو مجو دادا ہمیں کمزور سمجھے گا۔ اسے لگے گا کہ ہم میں مقابلے کی ہمت نہیں اس لیے بات ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' کمو کا جواب سن کر فاروق کو غصہ آنے لگا۔

''ارے نہیں استاد۔ اپنا دادا کیا ان سب باتوں کو نہیں سمجھتا۔ وہ تو بس خون خرابا ہونے سے روکنا چاہتا ہے ورنہ نانا کے سامنے یہ تو کھل کر بولے گا کہ غلطی مجو کے بندوں کی تھی۔ ہمارے علاقے میں کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے انہیں اڈے پر آ کر بات کرنی چاہیے تھی۔ انہوں نے اصول توڑا ہے تو اس کی سزا بھی پائی ہے۔ آگے اگر مجو دادا کی سمجھ میں بات نہیں آئی تو پھر ہم نے بھی کوئی ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ سارا ممبئی دیکھ لے گا کہ ربن دادا کے آدمیوں کے بازوؤں میں کتنا دم ہے اور وہ کیسا شیر کا جگر رکھتے ہیں۔ دادا تو بس وضع داری نبھانے گیا ہے کہ کل کو

دوسرے اڈوں کے آدمی شکایت نہ کریں کہ کسی نے انہیں بیچ میں نہ ڈالا اور آپس میں سر پھٹول کرتے رہے۔''

کمو نے فوراً وضاحت پیش کی تو اس کی تسلی ہوئی۔ اس کے بعد بھی وہ اور وجے بہت دیر تک اس کے کمرے میں بیٹھ کر اس سے باتیں کرتے رہے۔ یہ بھی ان کی محبت کا ایک انداز تھا کہ اس سے اس کے زخم اور تکلیف کے بارے میں سوال نہیں کر رہے تھے لیکن گفتگو کرتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے بار بار اس کے بازو کو دیکھ لیتے تھے۔ ان کی وہاں موجودگی کے دوران ہی ربن دادا اور رامو استاد واپس آگئے۔ آتے کے ساتھ ہی انہوں نے دستر خوان لگانے کا حکم سنا دیا۔ فاروق کو، جوان سے نانا کے اڈے پر ہونے والی گفتگو جاننا چاہتا تھا مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ اس موقع پر گولو کی خواہش تھی کہ فاروق کو اس کے کمرے میں بستر پر ہی کھانا کھلا دیا جائے لیکن فاروق نے انکار کر دیا اور اسے سمجھایا کہ اس کا صرف ایک بازو زخمی ہے اور وہ چلنے پھرنے سے معذور نہیں ہو گیا کہ کمرے میں اپنے بستر تک محدود رہے۔ اس موقع پر رامو نے بھی اس کی تائید کی اور گولو کو باور کروایا کہ سب کے درمیان بیٹھ کر ہنسنے بولنے اور کھانے پینے سے فاروق کی صحت پر زیادہ اچھا اثر پڑے گا۔ آخر کار گولو کو قائل ہونا پڑا۔ ابھی دستر خوان لگا کر برتن رکھے ہی جا رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ بڑی محتاط اور دبی ہوئی دستک تھی جسے سن کر گولو دروازے پر گیا اور پھر ہکا بکا واپس لوٹا۔

''کون آیا ہے بے؟'' اس کے عجیب و غریب تاثرات دیکھ کر رامو نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''وہ......وہ......'' ہکلاتا ہوا گولو ابھی کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ برقع میں ملبوس، چہرے پر نقاب ڈالے ایک عورت بچے کی انگلی تھامے اندر داخل ہوئی۔ فاروق نے پہلی نظر میں ہی اس بچے کو پہچان لیا۔ یہ وہی بچہ تھا جسے مجو دادا کے آدمی جامو اور سواتی اپنے ساتھ زبردستی لے جانا چاہتے تھے اور انہیں ان کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے فاروق کو دخل اندازی کرنی پڑی تھی۔ بچے نے اب بھی سفید کرتہ شلوار پہن رکھا تھا البتہ اب اس کے سر پر ٹوپی نظر نہیں آرہی تھی۔

''مم...... میں......'' عورت نے زبان سے کچھ کہنا چاہا لیکن اتنے سارے مردوں کو سامنے پا کر سٹپٹا گئی اور اس کی زبان پر تالا پڑ گیا۔ ربن دادا نے اس کی یہ کیفیت بھانپ لی اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ لمحہ بھر میں فاروق اور گولو کے علاوہ سب منظر سے غائب ہو گئے۔

''اندر آجا بیٹی اور جو بولنا ہے آرام سے بول۔ ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اس سے کوئی مجبوری ہی تجھے یہاں تک لائی ہو گی۔'' ربن دادا کے نرم لہجے نے نہ جانے اس پر کیا اثر کیا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی انگلی تھامے کھڑا اس کا بچہ اس کے رونے پر بے قرار ہو گیا۔

''روتی کیوں ہے؟ رونے سے دنیا کے مسئلے حل ہوتے تو سب یہی کر لیا کرتے۔ تو کسی آس میں ہی اپن تک آئی ہو گی تو بس جلدی سے اپنی پتا بول دے۔ تیرا اس جگہ زیادہ دیر رکنا تیرے اپنے لیے اچھا نہیں ہے۔''

کچھ نرم کچھ گرم لہجے میں بولتے ربن دادا نے اسے سمجھایا تو اس کے آنسو یک دم تھم گئے۔ پر وہ فاروق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔ ''میں ان کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ ان کی وجہ سے آج میرا بچہ بچ گیا۔ اس وقت تو میں گھبرا کر بچے کو لے کر گھر کی طرف دوڑ گئی تھی لیکن بعد میں خیال آیا کہ جنہوں نے میری خاطر اتنی تکلیف اٹھائی۔ ان کا شکریہ تو ضرور ادا کرنا چاہیے۔'' اس کی آواز میں نغمگی تھی اور ایک بار بولنا شروع کیا تھا تو روانی سے بولتی ہی چلی گئی تھی۔

''شکریے کی کیا بات ہے۔ محلے کا کوئی بھی بچہ ہوتا میں اس کے لیے ایسا ہی کرتا۔'' اس بار فاروق نے لب کشائی کی۔

''پھر بھی میں نے اپنا فرض سمجھا کہ اپنی دنیا لٹنے سے بچانے والے کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ حال بھی پوچھ آؤں۔ میں نے دیکھا تھا کہ آپ زخمی ہو گئے تھے اور آپ کی پوری آستین خون سے رنگ گئی تھی۔'' اب وہ براہ راست فاروق سے بات کر رہی تھی۔ برقع میں ہونے کے باوجود محسوس کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایک جوان العمر اور خوب صورت عورت ہے اس لیے اس کی یہاں اڈے پر موجودگی فاروق کو بے چین کر رہی تھی۔

''میں نے آپ کا شکریہ اور مزاج پرسی دونوں کو قبول کر لیا۔ بہتر ہو گا کہ اب آپ اپنے گھر واپس لوٹ جائیے۔'' اس نے گویا عورت سے استدعا کی۔ ناچار عورت واپسی کے لیے پلٹی۔

''ذرا رک جا بیٹی۔'' ربن دادا نے اسے آواز دی۔ ''اگر مناسب سمجھ تو ہمیں اپنی پتا سنا دے۔ آخر ایسی کیا بات تھی کہ وہ مشٹنڈے اس معصوم بچے کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے؟''

''یہ معصوم اپنی ماں کی بے بسی و بے کسی کی زد میں آیا ہوا ہے۔ میرے جیسی جنم جلی ماں کی اولاد کے حصے میں ایسی پریشانی نہیں آئے گی تو اور کیا ہوگا۔'' اس کی آنکھیں ایک بار پھر برسنے کو تیار ہوگئیں۔

''ذرا کھل کر بتا۔ ایسے تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔'' ربن نے اسے ٹوکا۔

''بات لمبی ہے۔ کھڑے کھڑے اتنی آسانی سے نہیں سنائی جاسکتی۔'' اس نے اپنی مجبوری بیان کی۔

''تو آرام سے بیٹھ جا۔ یہاں تک چل کر آہی گئی ہے تو اب دیری سویری کیا۔ دنیا کے منہ پر بند باندھنا کب کسی کے بس میں ہووے ہے۔ ہاں اپنا فرض ہے کہ تیرا پورا حال جان لیں اور کسی کام آسکتے ہیں تو ضرور آویں۔'' ربن کی مخاطب وہ عورت ہی تھی لیکن درپردہ وہ فاروق کو بھی سمجھا رہا تھا۔ اس سے بہتر بھلا کون جان سکتا تھا کہ عورت کی یہاں موجودگی سے وہ کتنا مضطرب ہے۔ ربن کی طرف سے حکم ملنے پر وہ عورت ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اپنے بچے کے ساتھ چپلیں اتار کر سفید براق چاندنی پر بیٹھ گئی۔ ربن اور فاروق نے بھی اس کے مقابل نشست سنبھال لی۔

''میرا نام ثریا بانو ہے۔'' عورت نے اپنی خوب صورت آواز میں بولنا شروع کیا۔ بولتے ہوئے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اس نے بچے کو یوں اپنے دائیں پہلو سے لگا رکھا تھا جیسے اس کی ذات سے سہارا لے رہی ہو۔ بیٹھ جانے کے باوجود اس نے چہرے سے نقاب نہیں سرکایا تھا اور ایک طرح سے ان لوگوں پر اعتماد کر لینے کے باوجود درمیانی فاصلہ وحدود قائم رکھے ہوئے تھی۔

''میں دنیا میں آئی تو یتیم تھی۔ میرا باپ میری پیدائش سے دو مہینے پہلے ہی اس دنیا سے جاچکا تھا۔ ان حالات میں ماں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ میکے میں اپنے اکلوتے بھائی کے پاس رہتیں۔ جیسا کہ دنیا کا دستور ہے، میری ممانی کو بیوہ نند اور اس کی بیٹی کا اپنے گھر میں رہنا پسند نہیں آیا۔ ماموں کے ڈر سے وہ ہمیں گھر سے نکالنے کا تو حوصلہ نہیں رکھتی تھیں لیکن گھر کے اندر انہوں نے میری ماں اور بعد میں مجھ پر زندگی ہر طرح سے تنگ کر ڈالی۔ ہم ماں بیٹی سے دنیا جہاں کے کام اور خدمت لینے پر بھی ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی اور وہ سارا وقت ہمیں طنز اور طعنوں کا نشانہ بنائے رکھتی تھیں۔ میں تو دن میں کئی بار ان کے ہاتھوں پٹ بھی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ ہی ان کا اکلوتا بیٹا بھی مجھے اپنی شرارتوں کا نشانہ بنائے رکھتا تھا۔ میں ممانی اور اپنے ماموں زاد دونوں سے بہت ڈرتی تھی۔ چنانچہ جب سولہ سال کی عمر میں یہ خبر سنی کہ ماموں مجھے اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں تو لرز کر رہ گئی لیکن اماں اس فیصلے سے بہت خوش تھیں۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ میری جیسی یتیم یسیر لڑکی کو بہو بنانے کا فیصلہ کر کے ماموں نے ہم پر بہت احسان کیا ہے ورنہ ان کی تو نیندیں اڑی ہوئی تھیں کہ بغیر جہیز کے وہ مجھے کیسے بیاہ سکے گی۔ اماں کی مجبوری نے میرے ہونٹوں پر تالے لگا دیے۔ میری طرح میری ممانی بھی اس شادی کے لیے بہت مجبوری میں راضی ہوئی تھیں۔ گھر کی چار دیواری میں ہر طرح کی آزادی دینے کے باوجود ماموں نے فیصلوں کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے کیے فیصلے کے سامنے چوں بول سکے۔ یوں میرا نکاح اپنے ماموں زاد منور سے ہوگیا۔ اماں کو شاید بس اسی بات کا انتظار تھا۔ شادی کی رات گزرنے کے بعد صبح میں نے سب سے پہلی خبر یہ سنی کہ میری ماں رات نیند کی حالت میں ہی جان سے گزر گئی ہے۔ میں جو منور کے ساتھ گزری ایک رات میں ہی اپنی پوری زندگی کا نقشہ دیکھ چکی تھی، اس صدمے سے ادھ موئی ہوگئی۔ دنیا میں اپنی واحد غمگسار کو کھو کر میرے دل پر جو گزری تھی، وہ میں ہی جانتی تھی۔ کسی اور کو میرا حال جاننے سے غرض بھی نہیں تھی۔ دور پرے کے رشتے دار اماں کی آخری رسوم نمٹا کر اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور میں ممانی اور منور کے ظلم وستم سہنے کے لیے تنہا رہ گئی۔ ماموں جیسے بیوہ بہن کو اپنے گھر میں پناہ دینے کے بعد بے نیاز ہوگئے تھے، اسی طرح یتیم بھانجی کے فرض سے فارغ ہو کر بھی بے نیاز ہوگئے۔ گھر میں مجھ سے کیا سلوک ہوتا ہے اور کیا نہیں اس کی انہیں پروا نہیں تھی۔ ان کا دن اپنے کپڑے کی دکان پر گزرتا اور شام سے رات گئے تک دوستوں کی صحبت میں وقت گزارتے۔ منور کو بھی انہوں نے اپنی دکان پر لگا رکھا تھا۔ شام کو دکان بند ہونے کے بعد وہ آزاد ہوتا کہ جہاں اور جس کے ساتھ چاہے جائے۔ میری حیثیت اس کے لیے ایک خدمت گار سے زیادہ نہیں تھی۔ ممانی اور منور کے ظلم وستم سہتے میں نے شادی کے ایک سال بعد اپنے بیٹے تصور کو جنم دیا۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ اس کی پیدائش کے دن ماموں پر دکان پر ہی فالج کا حملہ ہوا اور وہ ہمیشہ کے لیے بستر سے لگ گئے۔ اس حادثے پر ممانی نے مجھے بہت کوسنے دیے اور مارا پیٹا کہ جیسی میں منحوس تھی، ویسی ہی منحوس اولاد پیدا کی۔ خود پیدائش سے پہلے باپ کو کھا گئی اور بیٹے نے دادا کو ڈس لیا۔ میری کیا مجال تھی کہ ان کے

طعنوں کے جواب میں کچھ کہہ پاتی ورنہ میرے کانوں تک یہ بات پہنچی تھی کہ منور نے ماموں کی خاصی بڑی رقم اڑا لی تھی اور باز پرس پر ان کے ساتھ سخت بدتمیزی کی تھی چنانچہ غصے اور دکھ کے باعث ماموں کی یہ حالت ہوگئی تھی۔

''میں نے خود ہی اپنے زخم سہلائے اور دیگر ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ ماموں کی خدمت کی ذمے داری بھی سنبھال لی۔ دکان ظاہر ہے منور کو ہی سنبھالنا تھی لیکن اس نے سنبھالنے سے زیادہ بگاڑنے کا کام کیا۔ آہستہ آہستہ یہ بات کھل گئی کہ ماموں کی زندگی میں ہی بری صحبت میں پڑ جانے والا منور اب بے خوفی سے بری راہ پر چل پڑا ہے اور دکان سے ہونے والی آمدنی شراب اور جوئے کے علاوہ بری عورتوں پر خرچ ہو رہی ہے۔ گھر میں بھی پہلی سی خوش حالی نہیں رہی اور جب تنگی ہونے لگی تو ممانی نے منور سے باز پرس کی کوشش کی لیکن وہ انہیں بھی خاطر میں نہ لایا۔ بگڑا مرد کب گھر میں بیٹھی عورتوں کی سنتا ہے البتہ ممانی نے یہ الزام بھی میرے سر رکھ دیا کہ ایسی منحوس صورت بیوی ملنے پر ان کا بیٹا بددل ہو کر غلط راہوں پر چل پڑا ہے۔ اپنی صورت کے بارے میں کیا کہوں بس اتنا بتا سکتی ہوں کہ سب ملنے جلنے والے مجھے چاند کا ٹکڑا کہتے تھے لیکن میں ایسا چاند تھی جس کو بدقسمتی کا گرہن لگا ہوا تھا۔ یہ بھی میری بدقسمتی ہی تھی کہ منور نشے کی حالت میں اپنے اوباش ساتھیوں سے جھگڑا ہونے پر اپنی جان سے چلا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان پانچ برسوں میں سب تباہ ہو چکا ہے اور مکان اور دکان دونوں گروی رکھے ہیں۔ میرے پاس تو کوئی زیور گہنے تھے نہیں، ممانی کے زیور بھی قرض خواہوں کا منہ بند رکھنے اور گھر کے اخراجات پورے کرنے میں بک گئے۔ زیور بھی کہاں تک ساتھ دیتے۔ اپنی رقم کا تقاضا کرنے والے اوباشوں نے گھر کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ ممانی نے اپنے زیور بیچ کر جو رقم دی تھی، وہ تو بس سود میں ہی چلی گئی تھی اور اصل قرضہ اپنی جگہ باقی تھا۔ ایک بستر سے لگا بوڑھا آدمی اور دو خانہ دار عورتیں ان اوباشوں سے کیسے نمٹ سکتے تھے۔ ممانی تو پھر بھی مجھے برا بھلا بول کر اور مار پیٹ کر اپنی جھنجلاہٹ نکال لیتی تھیں لیکن میرے پاس تو یہ ذریعہ بھی نہیں تھا۔

''مرے پر سو دُرّے کے مصداق ایک روز کسی طرح ان اوباشوں کے سرغنہ مجو دادا کی مجھ پر نظر پڑ گئی اور وہ میرے سر ہو گیا کہ اگر میں اس سے بیاہ کرلوں تو سارا قرض معاف ہو سکتا ہے۔ میں بھلا کیسے اس اوباش سے شادی کے لیے راضی ہو جاتی۔ کچھ رشتے داروں اور محلے داروں سے مدد کی درخواست کی لیکن ایک نامی گرامی غنڈے کے منہ لگنے سے سب ہی گھبراتے تھے۔ ممانی بھی لاکھ بری سہی لیکن یہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس اوباش سے شادی کرلوں کیونکہ بہرحال تھی تو میں اس کے گھر کی عزت ہی نا۔ ان حالات میں ایک ہمدرد پڑوسی کے مشورے پر ہم نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر اور محلہ ہی چھوڑ دیا جائے۔ اسی پڑوسی نے چوری چھپے ہماری اتنی مدد کی کہ ہمارے لیے آپ کے محلے میں ایک چھوٹا سا کرائے کا مکان دلوا دیا اور ہم راتوں رات چوری چھپے یہاں منتقل ہو گئے۔ اب میں دن رات سلائی کڑھائی کر کے گھر کا خرچہ چلاتی ہوں۔ بچے کو اسکول بھیجنے کی طاقت تو نہیں تھی اسی لیے اسے یہیں مسجد کے مدرسے میں داخل کروا دیا تھا۔ روکھی سوکھی کھا کر بھی کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو رہا تھا لیکن معلوم نہیں اس بدمعاش مجو کو کیسے ہمارا پتا چل گیا۔ اس بار اس نے مجھے راضی کرنے کے لیے یہ اوچھی حرکت کی کہ میرے بچے کو ہی لے جانے کی کوشش کی۔ اگر یہ صاحب درمیان میں نہ پڑتے تو وہ ظالم میرے بچے کو ساتھ لے جا کر نہ جانے کیا سلوک کرتے۔ اللہ کے بعد یہ انہی کا احسان ہے کہ میں اس بدترین حادثے سے بچ گئی۔''

بڑے ضبط سے اپنی داستانِ حیات سنانے کے بعد آخر میں ثریا بانو کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے بتایا تھا کہ سولہ سال کی عمر میں اس کی اپنے ماموں زاد منور سے شادی ہوئی تھی اور اس وقت وہ ایک چھ سالہ بیٹے کی ماں تھی۔ اس حساب سے اس کی عمر کسی طرح بائیس تیئس سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نوعمری میں ہی بے چاری نے دنیا جہاں کی مشکلات دیکھ لی تھیں اور یقیناً ہر تکلیف کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول بھی کر لیا تھا لیکن ایک ماں اپنے بیٹے کو مصیبت کا نشانہ بنتے دیکھ کر کیسے ضبط کر سکتی تھی۔ وہ واقعی فاروق کی شکر گزار ہوئی ہوگی کہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر اس کے بچے کو اغوا ہونے سے بچا لیا۔ موقع پر سے تو وہ ہراساں ہو کر بچے سمیت فوراً غائب ہو گئی تھی لیکن بعد میں خیال آیا ہوگا کہ اپنے محسن کا شکریہ ادا کرے۔ آس پڑوس والوں سے اسے اس بات کا بھی علم ہو گیا ہوگا کہ بچے کو بچانے والے کا تعلق کہاں سے ہے۔ اس نسبت نے ہوسکتا ہے اس کے قدم روکے ہوں اور وہ سارا دن تذبذب میں گزارنے کے بعد اس فیصلے پر پہنچی ہو کہ بہرحال اسے اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے جانا چاہیے۔ شکرگزاری کے اظہار کے علاوہ اس کی آمد کا ایک مقصد یہ بھی

ہوسکتا تھا کہ کیوں نا بدمعاشوں کے خلاف بدمعاشوں سے ہی مدد لے لی جائے۔ کیونکہ جس طرح پہلے فاروق اور بعد میں اڈے کے دوسرے آدمیوں نے مجو دادا کے بندوں کا حلیہ بگاڑا تھا، اس سے اسے یہ امید تو ہو چلی ہوگی کہ یہاں سے اسے مدد مل سکتی ہے۔ ممکن ہے اس نے دونوں اڈوں کے افراد کو آپس میں دشمن ہی تصور کیا ہو اور دشمن، دشمن کے خلاف کھڑے ہو کر اگر اسے اور اس کے بچے کو تحفظ دے دیتا تو اس میں ایسا کچھ حرج بھی نہیں تھا۔ فاروق جوں جوں سوچ رہا تھا، اپنے اس خیال پر جمتا جا رہا تھا۔ زمانے بھر سے مایوس وہ عورت اگر ان سے مدد کی امید لگا بیٹھی تھی تو اسے اس کی خودغرضی نہیں بلکہ مجبوری ہی کہا جا سکتا تھا۔ وہ دل میں اس عورت کے لیے گہری ہمدردی محسوس کر رہا تھا جو باپردہ اور عزت دار گھرانے کی فرد تھی لیکن حالات سے مجبور ہو کر اس وقت اڈے تک چلی آئی تھی۔ وہ اس عورت کو یہاں سے مایوس نہیں لوٹانا چاہتا تھا لیکن فیصلے کا اختیار بہرحال ربن دادا کے پاس تھا جو ساری داستان سننے کے بعد لب بستہ بیٹھا بلکتی ہوئی ثریا بانو کو دیکھے جا رہا تھا۔ فاروق کا دل چاہا کہ اسے جھنجوڑ ڈالے پر ہمت نہ کر سکا۔ آخر کار کسی نہ کسی طور خاموشی کے یہ اذیت ناک پل بیت گئے اور ربن نے اپنی زبان کو حرکت دی۔

''بس کر دے بیٹی! کیا رو رو کر ندیاں بہا دے گی۔ ہم نے تیری ساری بپتا سن لی۔ اب تو سکون سے اپنے گھر جا اور آرام سے سو جا۔ آج سے تیری حفاظت ہمارے ذمے ہے۔ کسی کی کیا مجال کہ تیری اور تیرے بچے کی جانب ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ بھی سکے۔ بس جا، اب اپنے گھر جا اور لوٹ کر پھر یہاں نہ آئیو۔ کبھی کوئی ضرورت ہو تو بچے کے ہاتھ کہلوا دینا۔ تجھے اپنی بیٹی کہا ہے اپن نے اس لیے تیری رسوائی نہیں چاہتے۔''

آخر کار ربن نے وہ سب کہہ ڈالا جو فاروق کے دل کی خواہش تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس فیصلے پر ربن کے گلے لگ کر اس کا شکریہ ادا کرے لیکن ضبط کیے بیٹھا رہا۔

''چل اٹھ تجھے تیرے گھر تک چھوڑ آؤں۔'' فیصلہ کرنے کے بعد ربن فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ثریا بانو اور فاروق نے بھی اس کی تقلید کی۔

''یہ لے یہ رکھ لے۔'' کھڑے ہونے کے بعد ربن نے اپنی جیب سے مٹھی میں بند نوٹ نکال کر ثریا بانو کی طرف بڑھائے۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے بابا۔'' ثریا بانو نے نم لہجے میں انکار کیا۔

''بابا بھی کہتی ہے اور انکار بھی کرتی ہے۔ بھلا کون باپ اپنے گھر آئی بیٹی کو بنا خاطر مدارات کے یوں خالی ہاتھ لوٹاتا ہے۔ اپنا تو گھر دار سب یہی اڈا ہے۔ اپن تجھے یہاں روک کر تیری خاطر مدارات کرنے کی غلطی نہیں کر سکتے، پر یہ تسلی تو رہے گی نا کہ بیٹی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔'' ربن دادا کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ثریا بانو انکار پر قائم نہیں رہ سکی اور ہاتھ بڑھا کر نوٹ تھام لیے۔ اس کے بعد وہ اور ربن باہر نکل گئے۔ اس بار بچے کا ہاتھ اس کی ماں کے بجائے ربن کے ہاتھ میں تھا۔ فاروق کا دل چاہا کہ وہ بھی ان لوگوں کے پیچھے جائے لیکن پھر مصلحت نے قدم روک لیے۔ ربن دادا جیسے پختہ عمر کے آدمی کی بات پھر بھی اور تھی لیکن اس کا ساتھ جانا ثریا بانو کے لیے مزید غضب ڈھا سکتا تھا۔ ربن بھی رات کے وقت کے علاوہ اس خیال سے ثریا بانو کے ساتھ گیا ہوگا کہ اڈے پر آتے ہوئے تو بہرحال وہ دیکھ لی گئی ہوگی لیکن اس کو دیکھ کر لوگوں کو یہ تنبیہہ ہو جائے کہ اب اس کا ہاتھ ثریا بانو کے سر پر ہے اس لیے کوئی اسے آسان ہدف سمجھ کر نشانہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔

☆☆☆

''کون ہے ممی؟ کون آیا تھا؟'' جولیٹ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب اس نے بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنی اور کمرے سے نکلنے کے بعد جوزفین سے پوچھنے لگی۔

''نام تو نہیں بتایا کوئی سوٹڈ بوٹڈ مین تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ آیا تھا۔ یہ اتنی ساری چیزیں دے کر چلا گیا۔ بولا کہ مسٹر دلدار آغا نے مس جولیٹ کے لیے گفٹس بھیجے ہیں۔'' الجھی ہوئی جوزفین نے ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا تو اس نے میز پر نظر ڈالی۔ وہاں چمک دار کاغذ میں لپٹے کئی چھوٹے بڑے ڈبوں کے علاوہ ایک مہکتا ہوا پھولوں کا گلدستہ بھی رکھا تھا۔ اس نے گلدستے کے ساتھ منسلک کارڈ کھول کر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ''ود لو فار مس جولیٹ۔'' نیچے بھیجنے والے کا نام نہیں تھا لیکن نام کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ نام تو اس سب کو یہاں تک پہنچانے والا بتا ہی گیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ دلدار آغا کو اسے یہ سب بھجوانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔

''یہ دلدار آغا کون ہے؟'' اب تک وہاں کھڑی جوزفین نے سوال کر کے اسے چونکایا۔

''میری کلاس فیلو تھی نا شنا موتی والا، اس کا ہسبینڈ ہے۔ بہت فیس پرسنالٹی ہے۔ کل میں اسی کا انٹرویو لینے شنا

کی کوٹھی پر گئی تھی۔ بٹ آئی کانٹ انڈراسٹینڈ کہ اس نے مجھے یہ گفٹس کیوں بھجوائے ہیں۔'' جوزفین کو جواب دیتے ہوئے وہ خود تذبذب کا شکار تھی۔

''ایسے ہی بھجوا دیے ہوں گے۔ پیسے والوں کو اپنے پیسے کا رعب دکھانے کے لیے ایسی حرکتیں کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ تم دفتر سے ثنا کو اس کی کوٹھی پر فون کر کے تھینکس بول دینا۔'' جوزفین نے سرسری لہجے میں تبصرہ کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا اور خود کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جولیٹ کی توجہ اگر میز پر رکھے تحائف کے بجائے اس کی طرف ہوتی تو دیکھتی کہ اس کی ماں کے لہجے کے برخلاف اس کی آنکھوں میں تشویش کی لہریں ہیں۔ وہ ناشتے کے انتظار میں کرسی پر بیٹھ کر ان تحائف کو کھول کر دیکھنے لگی۔ آج جوزف کی طبیعت کچھ ناساز تھی اور اس نے گھر پر ہی رک کر آرام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے خلافِ معمول ناشتے کی میز پر نظر نہیں آرہا تھا۔ جولیٹ نے ایک ایک کر کے تمام تحائف کھول لیے۔ قیمتی پرفیوم، ہینڈ بیگ، میک اپ کا سامان، نازک سا بریسلیٹ، خوب صورت سا ایک لباس...... کیا کچھ شامل نہیں تھا ان تحائف میں۔

''یہ سب تو بہت کوسٹلی سامان ہے۔ تم ثنا کو فون کر کے تھینکس بولنے کے ساتھ آئندہ کے لیے ایسا کرنے سے روک دینا۔ کسی سے اتنے قیمتی گفٹس لینا ہم افورڈ نہیں کر سکتے ہیں۔'' ناشتے کی ٹرے لے کر آنے والی جوزفین ان سب چیزوں کو دیکھ کر بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''آپ کہیں مام تو میں یہ سب واپس بھجوا دوں؟'' جولیٹ نے اس سے مشورہ چاہا۔

''نو نو، میں نے ایسا کبھی نہیں کہا ہے۔ گفٹس واپس کرنے سے بھیجنے والے کی انسلٹ ہوتی ہے۔ کسی کی انسلٹ کرنا اچھا نہیں لگتا ہے۔ بس تم نیکسٹ ٹائم کے لیے روک دینا۔'' جوزفین نے اسے سمجھایا اور میز پر بکھری ساری چیزوں کو سمیٹتے ہوئے اسے ناشتے کی طرف متوجہ کیا۔ جولیٹ نے حسبِ معمول مختصر ناشتا کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جوزفین نے دروازے تک ساتھ جا کر اسے رخصت کیا۔

''ثنا کو فون یاد سے کر دینا۔'' گھر سے نکلتے نکلتے بھی اس نے یاد دہانی کروائی۔

''ڈونٹ وری مام...... کر دوں گی فون۔'' جولیٹ نے ہنس کر اسے اطمینان دلایا اور ہاتھ ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ لمبی پتلی گلی میں حسبِ معمول اس کی محلے کی چند خواتین سے ہلکی پھلکی بات چیت اور علیک سلیک ہوئی اور وہ قدم اٹھاتی آگے بڑھتی چلی گئی۔ کونے والے دو منزلہ مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے اپنی مخصوص جگہ نہ پا کر اس نے سکون محسوس کیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ اسے اپنی جگہ پر کھڑا ہوا نظر نہیں آرہا تھا اور آج تو اسے ویسے بھی امید نہیں تھی کیونکہ کل جس طرح اس نے اسے خون آلود لباس میں دیکھا تھا، اس سے یہی اندازہ لگا سکی تھی کہ وہ اسپتال میں داخل نہ بھی کیا گیا تو کئی روز تک بستر پر ضرور رہے گا۔ اپنے اندازے پر یقین سے قائم وہ نہیں جانتی تھی کہ فاروق اوپری منزل کی ایک کھڑکی میں شوقِ دید لیے بہت دیر سے اس کا منتظر کھڑا ہے۔ اس کی نفرت بھری نگاہوں سے بچنے کے لیے اب اس نے یہ راستہ نکالا تھا کہ خود اس کے سامنے آنا چھوڑ دیا تھا اور چپکے سے اوپری منزل کی کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھ لیا کرتا تھا۔

''فقیر بابا کو کچھ دیتی جا۔'' وہ بدحال فقیر کے سامنے سے گزرنے لگی تھی کہ آج پھر اس نے اسے آواز دے کر دستِ طلب دراز کیا۔ اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک سکہ نکالا اور فقیر کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا لیکن اگلا ہی لمحہ اس کے لیے حیرت ناک تھا۔ فقیر نے اس کا دیا سکہ پوری قوت سے دور اچھال دیا تھا۔ سکہ دور جا کر گرنے کے بعد نہ جانے کہاں مٹی میں رل مل گیا تھا۔

''عقل کی اندھی ہے۔ کھرے کھوٹے کی پہچان نہیں رکھتی۔'' سکہ دور پھینکنے کے بعد فقیر پرجلال لہجے میں بڑبڑایا۔ اس کی بڑبڑاہٹ سے جولیٹ نے اندازہ لگایا کہ شاید اس کے دیے ہوئے سکے میں کوئی نقص تھا اس لیے فقیر نے قبول نہیں کیا۔ وہ پرس میں ہاتھ ڈال کر دوسرا سکہ تلاش کرنے لگی۔

''جا چلی جا، سب کھوٹے سکے ہیں تیرے پاس۔ تجھے تو خود کھرے کھوٹے کی پہچان نہیں ہے تو کیا کسی کو کچھ دے گی؟ کھرے کھوٹے کی پرکھ سیکھ ورنہ بہت پچھتائے گی۔'' اسے پرس میں ہاتھ ڈالتا دیکھ کر فقیر نے بڑی حقارت سے اسے ٹوکا اور منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ دل میں سخت توہین محسوس کرتی جولیٹ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ پہلے دلدار آغا کی طرف سے بھیجے گئے تحائف اور پھر فقیر کا رویہ۔ وہ اچھی خاصی ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ دفتر پہنچ کر بھی اس کا موڈ آف ہی رہا۔ عارف سے اس کی مزاج کی یہ خرابی چھپی نہیں رہی۔ ٹی ٹائم میں وہ اس کے پاس آ بیٹھا۔

''موڈ کیوں آف ہے؟'' اس کے مقابل بیٹھنے کے

باوجود وہ اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنے سامنے بکھرے کاغذوں میں الجھی رہی تو اسے پوچھنا ہی پڑا۔

"نہیں بس ذرا مصروف ہوں۔ آغا کا انٹرویو فائنل کر کے آج ہی رندھاوا صاحب کے ہینڈ اوور کرنا ہے۔" اس نے عارف کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"کیسا رہا انٹرویو؟ گپتا بتا رہا تھا کہ تم نے خاصا وقت گزارا ثنا کی کوٹھی پر۔" اس نے جولیٹ کے ساتھ جانے والے فوٹو گرافر کا حوالہ دے کر اس سے پوچھا۔

"ہاں، ٹائم تو بہت لگ گیا تھا۔ ثنا نے پرانے دنوں کی یادیں تازہ کرنے کے لیے مجھے دیر تک روکنے کا پورا بندوبست کیا ہوا تھا۔" جولیٹ نے بتایا۔

"اچھا، اب کیسی ہو گئی ہے ثنا؟ شادی کے بعد چینج تو آیا ہوگا۔" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

"پہلے سے تھوڑی Healthy ہو گئی ہے اور ذرا جاگیردارنی لگنے لگی ہے۔ باقی ویسی ہی ہے۔" اس نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

"میرا پوچھ تو رہی ہو گی؟" عارف کو تجسس تھا۔

"ہاں پوچھا تھا بلکہ مجھے ایڈوائس کر رہی تھی کہ اب تم دونوں جلدی شادی کر لو۔" اس بار جولیٹ نے ذرا مسکرا کر اس کے سوال کا جواب دیا۔

"اسے بتانا تھا کہ ہم اس کی طرح منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوئے ہیں کہ جب موڈ بنے تب شادی کر لیں جیسا کہ اس نے درمیان میں پڑھائی چھوڑ کر کر لی تھی۔" عارف ذرا تلخ ہوا۔

"مجھے کیا ضرورت تھی اسے یہ سب کہنے کی؟ وہ اپنے نصیب کی زندگی گزار رہی ہے اور ہمیں اپنے نصیب کے مطابق جینا ہے۔ کسی کے سامنے اپنے حالات کا رونا رونے سے آدمی کی اپنی پرسنالٹی ڈاؤن ہوتی ہے۔" جولیٹ نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔

"عزت کا مصنوعی بھرم رکھنے سے بھی کیا حاصل؟ کیا وہ ہمارے حالات کو نہیں سمجھتی ہو گی۔ ہمارے اور اس کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ تو پھر بھی اس کی مہربانی ہے کہ اس نے پرانے تعلق کا اتنا خیال کیا اور نہ صرف تم اس کے ذریعے اس کے شوہر کا انٹرویو لینے میں کامیاب ہو گئیں بلکہ اس نے تمہیں اپنے گھر میں اتنی عزت بھی دی۔" عارف پر قنوطیت سوار ہو چکی تھی۔ وہ ایسا ہی تھا۔ حالات کو اپنے سر پر سوار کر لینے والا اور جب سے اس کی بہن کا رشتہ ٹوٹا تھا، اکثر ہی ایسے موڈ میں آ جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو لگتا کہ وہ ان سارے لوگوں سے حسد کرتا ہے جو اس کے مقابلے میں خوش حال اور سکھی ہوں۔ جولیٹ کو اس کی یہ عادت پسند نہیں تھی لیکن یہ سوچ کر نظر انداز کر دیتی تھی کہ حالات کی سختی نے اسے تلخ کر دیا ہے۔ مسائل حل ہو جائیں گے تو وہ اپنی یہ عادت بھی ترک کر دے گا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزاریں گے۔ اسے یقین تھا کہ اس کا ساتھ عارف کے مزاج کے تمام موسموں کو خوش گوار کر دے گا۔ اب بھی وہ اپنے موڈ کی خرابی کو بھلا کر اسے سمجھانے لگی۔

"صبر و قناعت کے یہ درس مجھے مت پڑھاؤ جولی...... پیدا ہونے سے لے کر اب تک مجھے یہ اسباق ہزاروں بار پڑھائے گئے ہیں۔ شاید یہ مجھ پر اثر انداز بھی ہوتے اگر میرے شانوں پر بھاری ذمے داریوں کا بوجھ نہ ہوتا۔ تم اپنے موجودہ حالات میں بھی ایک چھوٹے سے گھر میں رہ کر خوش رہ سکتی ہو کیونکہ تمہارے سر پر کوئی ذمے داری نہیں ہے لیکن مجھ سے پوچھو کہ میں کیسے دن گزارتا ہوں۔ میں تو اتنا بے بس ہوں کہ بازار میں کوئی خوب صورت شے نظر آنے پر اسے تمہارے لیے خریدنے کا سوچوں تو جیب دیکھ کر اپنی خواہش مار لینے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ میں تو چاہتے ہوئے بھی کبھی تمہیں کوئی ڈھنگ کا گفٹ تک نہیں دے سکا۔" اس کے سمجھانے کا عارف پر الٹا اثر ہوا اور وہ مزید شدت سے اپنے ڈپریشن کا اظہار کرنے لگا۔ جولیٹ کو اندازہ ہو گیا کہ اس وقت وہ کچھ سمجھنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اچھی بات یہ تھی کہ ٹی ٹائم شروع ہوتے ہی ان کے کمرے میں بیٹھنے والے باقی دو افراد اپنی سیٹوں سے اٹھ گئے تھے ورنہ اسے ان کے سامنے خفت کا سامنا کرنا پڑتا۔

"میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں اور ایک بار پھر بتا رہی ہوں کہ میرے لیے تمہاری محبت ہی سب کچھ ہے۔ مادی چیزوں کی میرے نزدیک نہ تو کبھی اہمیت تھی اور نہ ہی آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اگر تم اس انداز میں سوچتے ہو تو یہ تمہاری حماقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔" وہ اپنے سامنے پھیلے کاغذات سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ عارف سے مزید کچھ کہنا بیکار تھا اور اسے رندھاوا کو یہ میٹر دکھانا تھا۔ وہیں سے وہ ثنا کو فون بھی کر لیتی۔ بھیجے جانے والے تحائف کا شکریہ تو بہرحال ادا کرنا تھا۔ صبح سے خراب ہو جانے والا موڈ عارف کی وجہ سے کچھ اور بھی خراب ہو گیا تھا لیکن وہ موڈ کے پیچھے اپنے کاموں کو خراب کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ کاغذات رندھاوا کے حوالے کرنے کے بعد اس کی اجازت سے فون سنبھال کر بیٹھ گئی۔

''میں مسز ثنا آغا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''
دوسری طرف سے فون اٹھائے جانے پر اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔
''آپ کون صاحبہ بات کر رہی ہیں؟'' اس کی خواہش کے جواب میں پوچھا گیا۔
''جی میں جولیٹ جوزف ہوں...... ثنا کی فرینڈ۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔
''سوری مس جولیٹ! میڈم تو اس وقت موجود نہیں ہیں۔ اگر آپ کوئی میسج دینا چاہیں تو دے سکتی ہیں۔'' اسے مہذب لب و لہجے میں بتایا گیا۔
''بس آپ انہیں میرے فون کے بارے میں بتا دیجیے گا۔ میں بعد میں دوبارہ ان سے کونٹیکٹ کرلوں گی۔'' اس نے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔
''یہ مسز ثنا آغا کہیں دلدار آغا کی بیوی ہی تو نہیں ہے؟'' رندھاوا کے کان اس کی گفتگو پر ہی لگے تھے۔
''ثنا آغا میری کلاس فیلو رہی ہے۔'' اس نے تفصیلات میں جائے بغیر مختصراً بتایا اور اٹھ کر واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ درمیانی وقفے میں اس کے دونوں کولیگز واپس آچکے تھے۔ عارف بھی بظاہر نارمل سا اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ بھی تھکے تھکے انداز میں دوبارہ مصروفِ کار ہوگئی۔ دماغ تھک سا گیا تھا اور اس پر اسے ٹی ٹائم میں چائے پینے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ وہ پی کر ہی تھوڑی فریش ہوجاتی۔ بہرحال اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔
''مس جولیٹ! آپ کے لیے فون ہے۔'' گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا گزرا ہوگا کہ چپڑاسی نے آکر اطلاع دی۔ وہ اس اطلاع پر کچھ حیران سی رندھاوا کے دفتر کی طرف بڑھ گئی۔ آج تک دفتر میں اس کے لیے کوئی فون نہیں آیا تھا اور وہ بس اتنا ہی قیاس کرسکی تھی کہ شاید ثنا نے اس کے فون کے جواب میں فون کیا ہو۔
''ہیلو۔'' رندھاوا اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا اس لیے اس نے زیادہ ریلیکس موڈ میں کال ریسیو کی۔
''آداب۔'' دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔
''جی کون صاحب بات کر رہے ہیں؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔
''خاکسار کو دلدار آغا کہتے ہیں۔ آپ تو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ہمیں بھول بھی گئیں۔ حالانکہ صبح صبح ہم نے آپ کو اپنی یاد دلانے کی کوشش بھی کی تھی۔'' دوسری طرف موجود شخص نے بولنا شروع کیا تو اس کے کان سنسنا اٹھے۔ دوسری طرف سے آتی آواز یقیناً دلدار آغا کی ہی تھی لیکن وہ شخص اس سے اس لب و لہجے میں کیوں بات کر رہا تھا، یہ بات اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔
''کیا بات ہے آپ خاموش کیوں ہوگئیں؟ ہمارے بھیجے تحائف پسند نہیں آئے کیا؟'' اس کی خاموشی پر دلدار آغا کی طرف سے استفسار کیا گیا۔
''وہ گفٹس آپ نے مجھے بھجوائے تھے مگر کیوں؟'' وہ جو جوزفین کی رائے کے مطابق ان تحائف کو ثنا کی عنایت سمجھنے لگی تھی، اس انکشاف پر تقریباً چلا پڑی۔
''اس لیے کہ آپ جیسی خوب صورت خاتون کا یہ حق بنتا ہے کہ آپ سے دوستی کی درخواست کرنے سے پہلے آپ کی نذر کچھ کیا جائے۔'' وہ پوری ڈھٹائی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ جولیٹ کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ضرور تھی لیکن جوزفین نے اس کی تربیت میں مشرق کے جو رنگ شامل کیے تھے، ان کے باعث وہ بھی ایسی بے باک لڑکی نہیں بن سکی تھی کہ کوئی بھی راہ چلتا اسے دوستی کی پیشکش کرسکے۔
''دوست میں آپ کی بیگم کی ہوں اور میرے لیے یہی کافی ہے۔ آپ سے میرا تعلق بس اس انٹرویو تک تھا جو کل ہوچکا اس لیے مزید کسی راہ و رسم کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔'' اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے اس نے سختی سے دلدار آغا کو جواب دیا۔
''کس شخص سے تعلق کو کس حد تک لے جانا ہے، یہ ہم خود طے کرتے ہیں اور آپ سے دوستی کا فیصلہ چونکہ ہم کر چکے ہیں اس لیے آپ کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' اس کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر دلدار آغا نے جس قطعی انداز میں یہ الفاظ ادا کیے اس پر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی اور تصور کے پردے پر دلدار آغا کی وہ آنکھیں لہرائیں جن میں تکبر، سفاکیت اور ہوسناکی بھری ہوئی تھی۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ خوف کیا ہوتا ہے۔ یہ سچ تھا۔ اپنی تمام تر خوداعتمادی کے باوجود وہ خوف زدہ ہوگئی تھی۔ وہ بھی اس حد تک کہ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کیے جانے کے باوجود ریسیور کان سے ہی لگا ہوا تھا۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

فراموشی کا گھاؤ

سلیم انور

دنیا میں ہر نظر کا ایک الگ انداز ہوتا ہے اور کوئی بھی نظر انداز کردینے کا دکھ نہیں جھیل پاتا... اسے جب بھی اور جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ اپنے اس دکھ کا ازالہ ضرور کرتا ہے... یہی غم اسے بھی لاحق تھا اور اس کا بدلہ لینا اس کا فطری حق تھا لہٰذا پھر وہ کیسے اپنے اس حق سے دستبردار ہوجاتی۔

ایک حسینہ کے دل سے اترنے اور نظروں سے گرنے کا عبرت انگیز ماجرا

اسپیشل ایجنٹ بینجامن دونوں ہاتھوں میں کافی کے کپ لیے انٹیروگیشن روم میں داخل ہوا اور ان میں سے ایک کپ مشتبہ مجرم چارلس آرتھر کے مقابل میز پر رکھ دیا اور پھر خود بھی میز کی دوسری جانب موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ایجنٹ جونسن نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔'' بینجامن نے کہا۔ ''بائی دا وے ہم یہ سب ریکارڈ کر رہے ہیں۔'' اس نے چھت پر لگے ہوئے کیمرے کی جانب اشارہ کیا۔

چارلس آرتھر نے نگاہ اٹھا کر کیمرے کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''رسمی بیان ہم بعد میں لے لیں گے۔'' بینجامن نے کہا۔

چارلس آرتھر نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا۔ ''سواگر میں تعاون کروں گا تو مجھ پر صرف اسلحہ رکھنے کا الزام عائد کیا جائے گا، بینک ڈکیتی کا نہیں؟''

''درست۔ تمہیں بس یہی کرنا ہے کہ تم مجھے شارلین بیومونٹ کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دو جو تم جانتے ہو۔''

''مجھے منظور ہے۔'' چارلس نے جواب دیا۔ ''تو یہ طے ہو گیا؟''

''ہاں۔'' اسپیشل ایجنٹ بینجامن نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر میں کہاں سے شروع کروں؟''

''ابتدا سے۔''

''ٹھیک ہے۔'' چارلس نے کہا اور ایک گہرا سانس لینے کے بعد گویا ہوا۔ ''شارلین بیومونٹ دنیا کی عظیم ترین بینک ڈکیت ہے۔ میں یہ بات پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ وہ حقیقت میں جینئس ہے۔ وہ کبھی پکڑی نہیں گئی اور مجھے شبہ ہے کہ کبھی پکڑی بھی نہیں جائے گی۔ میری اس بات کا مقصد دل آزاری ہرگز نہیں ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' ایجنٹ بینجامن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنی ہر واردات کے منصوبے کی ایک ایک تفصیل کا باریک بینی سے جائزہ لیتی ہے اور منصوبے میں کسی قسم کی خامی کا امکان نہیں چھوڑتی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ایک ہنگامی منصوبہ بھی تیار ہوتا ہے۔ میں جو کچھ بھی جانتا ہوں، وہ سب اسی نے مجھے سکھایا ہے۔'' چارلس نے کہا۔

''اس سے ملاقات ہونے سے پیشتر تم نے کبھی کوئی بینک نہیں لوٹا تھا؟'' اسپیشل ایجنٹ نے پوچھا۔

''نہیں، سر۔ کبھی نہیں۔'' چارلس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ''لیکن ہم نے اکٹھے ایک سال کا عرصہ بہت زبردست گزارا۔ وہ ایک شاندار، بھرپور، زبردست اور فرحت سے بھرپور سال تھا...... وارداتیں کرنا اور پھر لوٹی ہوئی رقم کے ڈھیر پر لپٹ کے سونا۔ عمدہ ترین ہوٹلوں میں کھانا پینا اور تفریح کرنا۔ یہ میری زندگی کا بہترین سال تھا۔''

''ہاؤ سویٹ!'' ایجنٹ بینجامن نے اپنی نوٹ بک پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور بولا۔ ''جب تمہاری اس سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت اس کی عمر بائیس برس تھی؟''

''درست۔ وہ اس وقت ایک پیشہ ور بینک ڈکیت بن چکی تھی۔ اس کے سابقہ بوائے فرینڈ نے اسے سب کچھ سکھا دیا تھا۔ اس کا نام مچلو تھا۔ اس نے شارلین کو بتایا تھا کہ ہمت، ذہانت یا محض ارادے سے زیادہ ایک بینک ڈکیت کو جس چیز کی سب سے اہم ترین ضرورت ہوتی ہے، وہ نظم وضبط ہے۔ دنیا میں بہترین سے بہترین منصوبہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر آپ اس پر من وعن عمل نہیں کر پاتے۔''

''بالکل صحیح۔''

''اس نے مچلو کے ساتھ مل کر سات کامیاب وارداتیں کی تھیں اور وہ سب کچھ سیکھ لیا تھا جو وہ سیکھ سکتی تھی لیکن پھر اس کو مچلو کا ساتھ چھوڑنا پڑا تھا کیونکہ وہ اکثر اوقات نشے میں دھت رہتا تھا اور وارداتوں کے دوران بے پروائی دکھاتا تھا۔ لیکن جس بات پر وہ اس سے ناراض ہوگئی تھی، وہ یہ تھی کہ مچلو اسے نظرانداز کرنے لگا تھا۔ اور آپ شارلین جیسی عورت کے ساتھ یہ رویہ اختیار نہیں کرسکتے۔ ایسی عورت نظرانداز کیے جانے کو ہرگز برداشت نہیں کرتی۔ یہ شارلین کی فطرت کا خاصہ ہے۔'' چارلس نے بتایا۔ ''اور مچلو......''

''ہم مچلو کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔'' ایجنٹ بینجامن نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بینک ڈکیتی کی کل کتنی وارداتیں کی ہیں؟''

چارلس نے کافی کا کپ اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔ ''پانچ...... پہلی چار وارداتیں بالکل پرفیکٹ ہوئی تھیں جیسا کہ شارلین نے کہا تھا کہ ہوں گی۔ البتہ پانچویں واردات اتنی پرفیکٹ نہیں رہی۔ اگر وہ بھی پرفیکٹ ہوتی تو میں یہاں موجود نہ ہوتا۔''

''کیا ہوگیا تھا؟''

''ہم واردات کے بعد بینک سے نکل رہے تھے۔ میں شارلین کے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھول کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے لوٹی ہوئی تمام رقم ایک بڑے سائز کے پرس میں ڈالی ہوئی تھی۔ اسی دوران ایک کم بخت کسٹمر دلیری دکھاتے ہوئے فرش پر سے اچانک مجھ پر جھپٹ پڑا اور مجھ سے بھڑنے کی کوشش کی۔ ہم نے بینک میں موجود گاہکوں کو فرش پر لیٹے رہنے کا حکم دیا ہوا تھا۔ میں کبھی کسی کو اپنے اتنا نزدیک رہنے کا موقع نہیں دیتا کہ وہ مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کرے۔ لوگوں کو کنٹرول کرنے کی ذمے داری میری ہوتی تھی۔ ساتھ ہی میں گھڑی اور سڑک دونوں پر کڑی نظر بھی

رکھتا تھا جبکہ شارلین کیش سمیٹ رہی ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جب میں نے کسٹمرز کی جانب سے پیٹھ پھیری تھی تو وہ کم بخت رینگتا ہوا میرے نزدیک آگیا اور مجھے اس کے قریب آنے کا قطعی علم نہیں ہو پایا تھا۔ اس نے جھپٹتے ہی میرا سر دروازے پر دے مارا تھا۔ یہ زخم دیکھ رہے ہو؟'' چارلس نے اپنی پیشانی پر بندھی ہوئی پٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایجنٹ بینجامن نے ایک نظر اس کی پیشانی پر ڈالی لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''میں نے اپنی کہنی سے اس کی کنپٹی پر وار کیا لیکن وہ نیچے نہیں گرا اور مجھ سے الجھنے کے لیے دوبارہ جھپٹنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے سر سے اوپر کی طرف ایک فائر کر دیا تاکہ وہ باز رہے اور اپنا بہادری دکھانے کا ارادہ ترک کر دے۔ یہ ایک تنبیہی فائر تھا۔ میرا پیغام فوراً اس کی سمجھ میں آگیا۔ فائر ہوتے ہی اس کی دلیری کسی جھاگ کے مانند بیٹھ گئی اور خوف کے مارے اس کی پتلون گیلی ہوگئی۔'' یہ کہتے ہوئے چارلس ہنس پڑا۔

لیکن ایجنٹ بینجامن نے اس کی ہنسی میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ بولا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''جب میں دوڑ کر بینک سے باہر نکلا تو شارلین نے کار اسٹارٹ کی ہوئی تھی اور وہ انجن کو ریس دے رہی تھی۔ ماسک کے پیچھے چھپی ہوئی اس کی آنکھوں سے درندگی جھلک رہی تھی۔ میں نے تیزی سے اس کے برابر پسنجر سیٹ سنبھال لی اور ہم وہاں سے بھاگ نکلے۔ میں اس وقت تک انتظار کرتا رہا جب تک ہم بینک کے چند بلاک کے فاصلے تک نہیں پہنچ گئے۔ پھر میں نے اپنا ماسک کھینچ کر اتارنا چاہا تو وہ چیتھڑے چیتھڑے ہوگیا۔ میں اپنی آنکھوں پر سے خون صاف کرنے لگا جو میری پیشانی کے زخم سے بہہ رہا تھا۔''

چارلس نے یہ کہہ کر کافی کا کپ ہونٹوں سے لگالیا۔ پھر ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے کے بعد اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''راستے میں ہم نے واردات میں استعمال ہونے والی کار چھوڑ دی اور دوسری کار میں منتقل ہوگئے جو ہم نے پہلے سے ایک جگہ تیار کھڑی کی ہوئی تھی۔ اس دوسری کار میں ہم ایک چھوٹے سے شاپنگ پلازا جا پہنچے اور لوٹی ہوئی تمام رقم ایک تھیلے میں ڈال کر ایک یوٹیلیٹی بکس میں چھپا دی۔ پھر ہم......''

''ایک منٹ رک جاؤ۔'' ایجنٹ بینجامن نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''یوٹیلیٹی بکس میں کیوں؟''

سرداریاں

تین سردار ایک بیڈ پر سو رہے تھے۔ تینوں کی جگہ تنگ ہو رہی تھی۔ ایک سردار بیڈ سے اتر کر نیچے فرش پر سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرے سردار نے آواز دی۔ ''اوئے اب جگہ کھلی ہوگئی ہے۔ اب اوپر بیڈ پر آجاؤ۔''

مرسلہ۔ اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ جہلم

☆☆☆

ایک سردار کا نوکر بیمار ہوگیا۔ تو اس نے دوسرا نوکر رکھ لیا۔ اگلے دن سردار نے دیکھا کہ نوکر بھینس کا دودھ دوہنے کے بعد وہی دودھ بھینس کو پلا رہا ہے۔ سردار نے غصے سے پوچھا۔

''پاگل یہ کیا کر رہے ہو۔'' نوکر نے جواب دیا۔

''ذرا بھینس نے دودھ پتلا دیا تھا۔ میں نے سوچا اسے ایک چکر اور دے ڈالو تاکہ دودھ گاڑھا ہو جائے۔''

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

☆☆☆

سردار جی اپنی بیوی کا جوتا لینے کے لیے بازار گئے، جوتا دیکھتے وقت دکاندار نے سائز پوچھا تو سردار جی نے کہا۔ جوتے کا سائز لینا بھول گیا ہوں۔ تسی اے کروں میری کمر تے نشان دیکھ لو۔''

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

''یہ آئیڈیا بھی شارلین کا تھا۔ وہ ہمیشہ ان ہی بکس کو استعمال کرتی ہے۔ آپ ان یوٹیلیٹی بکس کو اس اسٹینڈرڈ چابی سے آسانی کے ساتھ کھول سکتے ہیں جو ہر قسم کے تالوں کو کھولنے کے کام آتی ہے اور ان بکسز میں عام طور پر گنجائش بھی خاصی ہوتی ہے۔''

ایجنٹ بینجامن نے یہ بات اپنی نوٹ بک میں درج کرلی۔ ''بھلا لوٹی ہوئی رقم کو یوٹیلیٹی بکس میں چھپانے کی کیا تک تھی؟ رقم لے کر بھاگ کیوں نہیں گئے؟'' اس نے سوال کیا۔

چارلس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''یہی تو اس کے منصوبے کا حسن تھا۔ ہم نے لوٹی ہوئی رقم چھپا دی اور معاملے کے سرد ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ بالفرض اگر تم لوگ ہمارا سراغ لگا لیتے تو تب بھی ہم پر کوئی کیس نہیں بنتا تھا۔ نہ لوٹی ہوئی رقم ہمارے پاس سے برآمد ہوتی، نہ ہماری

شناخت کا کوئی ثبوت ہوتا اور نہ ہی کہیں ہماری انگلیوں کے نشانات پائے جاتے۔ تمہیں کوئی کامیابی نہیں ہوتی اور سارا معاملہ ٹائیں ٹائیں فش!''

ایجنٹ بینجامن نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''بہرحال ہم واپس اپنے موٹیل کے کمرے میں پہنچ گئے۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میرے سر پر زوردار ضربیں لگا رہا ہے لیکن شارلین نے میری مرہم پٹی کرتے ہوئے مجھے دلاسا دیا کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ پھر وہ ان کپڑوں کو جلا کر ضائع کرنے کے لیے چلی گئی جو ہم نے واردات کے دوران پہنے ہوئے تھے۔ وہ میرا پستول بھی اپنے ساتھ لے گئی کیونکہ تم لوگ اسے اس گولی سے شناخت کر سکتے تھے جو میں نے بینک میں چلائی تھی۔''

ایجنٹ بینجامن یہ سن کر معنی خیز انداز میں ہلکے سے مسکرا دیا۔

''پھر میں نے درد رفع کرنے والی گولیاں کھائیں اور بے سدھ ہو گیا۔ جب میں بیدار ہوا تو شارلین واپس آ چکی تھی۔ وہ اپنے ساتھ چائنیز ٹیک آؤٹ سے کھانا بھی لے کر آئی تھی جو کہ نہایت بدمزہ تھا۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میرے سر کا درد بدستور قائم تھا لیکن میرا خیال تھا کہ یہ گولیوں اور شراب کا اثر ہے۔ پھر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔

''اگلے روز صبح شارلین نے کہا کہ ہمیں اس کے ہنگامی منصوبوں میں سے ایک پر عمل کرنا ہوگا اور فوری طور پر شہر چھوڑ کر جانا ہوگا۔ بینک ڈکیتی کی لوٹی ہوئی رقم پوشیدہ مقام سے واپس لانا میرا کام تھا جبکہ شارلین کے ذمے ہمارا سامان بس اسٹیشن تک لے جانا اور سفر کی ٹکٹیں خریدنا تھا۔ ہمارے پاس تین گھنٹے کی مہلت تھی اور یہ ہمارے شہر سے فرار ہونے کے لیے خاصا وقت تھا۔

''جب میں شاپنگ پلازا کی اس عقبی گلی میں پہنچا جہاں یوٹیلیٹی بکس کے اندر ہم نے لوٹی ہوئی رقم کا تھیلا چھپایا تھا تو اس وقت گلی ویران پڑی تھی اور وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لہٰذا میں دوڑتا ہوا یوٹیلیٹی بکس کے پاس پہنچا اور اس میں سے رقم کا تھیلا نکال لیا۔ تب اچانک پوری گلی پولیس کی سرخ اور نیلی فلیش کرتی ہوئی روشنیوں سے نہا گئی اور سائرنوں کا شور گونجنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے۔ اس کے بعد کا تو تمہیں علم ہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے چارلس آرتھر نے اپنی بات ختم کر دی۔

ایجنٹ بینجامن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تم نے مجھے وہ تھیلا کھولتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جو چند لمحوں قبل تم نے یوٹیلیٹی بکس میں سے نکالا تھا۔ اس میں ردی اخبار بھرے ہوئے تھے اور وہ پستول بھی تھا جو تم نے بینک ڈکیتی کی واردات میں استعمال کیا تھا اور اس سے ایک کسٹمر پر فائر بھی کیا تھا۔''

''ہاں۔'' چارلس نے اقرار کیا۔ ''اور تم لوگوں کو اس کی مخبری کسی نامعلوم فرد نے کی تھی اور وہ کوئی عورت تھی۔ ایسا ہی تھا نا؟''

''بالکل درست۔ تمہیں قطعی شبہ نہیں تھا کہ وہ تم سے بے وفائی کر سکتی ہے؟'' بینجامن نے کہا۔

''قطعی نہیں! یقیناً یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس نے مجھے دھوکا دیا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ ہم بچ نکل نہیں سکتے تھے۔ ہم ایک ساتھ فرار ہو سکتے تھے۔ ہمیں اس وقت تک کسی قسم کا کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے......

بہرحال میں تو اس سے واقعی سچا پیار کرتا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے چارلس نے بدمزگی کا اظہار کرتے ہوئے منہ بگاڑ لیا اور اپنے ہاتھ میں دبے کافی کے خالی پیپر کپ کو پچکا دیا۔

''مجھے ایک گھنٹے پہلے تک کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ یہ سب کچھ اچانک اور کیوں ہو گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نچلی منزل پر ہاتھوں میں بیڑیاں پہنے بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں یونہی چاروں طرف خالی نظریں گھما رہا تھا اور اپنے آپ پر افسوس کر رہا تھا کہ میری نگاہ دیوار پر لٹکے ہوئے کیلنڈر پر پڑی جس پر گزری ہوئی تاریخوں پر کسی نے کراس لگائے ہوئے تھے۔ تب میرے ذہن میں ایک زوردار جھماکا ہوا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک جھینپی ہنسی ہنسنے لگا۔

''جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ شارلین اس ٹائپ کی عورتوں میں سے تھی جو نظرانداز کیے جانے کو کسی صورت برداشت نہیں کرتیں۔ میں پہلے یہ سمجھا تھا کہ واردات کے دوران مجھ سے کوئی کوتاہی ہو گئی تھی جس کی سزا کے طور پر اس نے مجھے پھنسا دیا تھا۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔''

''حقیقت کیا تھی؟'' ایجنٹ بینجامن نے جاننا چاہا۔

''تین روز پہلے شارلین کی سالگرہ تھی جسے میں مکمل طور پر فراموش کر بیٹھا تھا جبکہ میرا دعویٰ تھا کہ میں اس سے سچا پیار کرتا ہوں۔ اس نے مجھ سے اپنے نظرانداز کیے جانے کا یہ انتقام لیا ہے۔ مجھے اس کے ہاتھ سے کھو جانے کا زندگی بھر افسوس رہے گا۔'' یہ کہہ کر چارلس آرتھر نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔

فقدان

منظر امام

بھیڑ چال کا بھی اپنا ایک کمال ہے۔ جب قوموں کے پاس کوئی قیمتی اثاثہ نہیں رہتا تو وہ اندھوں میں کانے راجا کو تلاش کرکے اس کی پوجا شروع کردیتے ہیں... یہی حال عہد حاضر میں بہت سے ممالک کا ہے کیونکہ ہیروں کو تلاش کرنا اور انہیں تراشنا دو الگ الگ فن ہیں اور یہ کام انسان نہیں بلکہ قدرت کرتی ہے، البتہ انسان جب اس فن کی قدردانی نہیں کرتا تو رفتہ رفتہ اس سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔

پرشور ماحول سے فرار ہونے والوں کی بے بسی

پورا بغداد سخت سردی کی لپیٹ میں تھا۔

اتنی سردی برسوں کے بعد ہوئی تھی یا شاید ہر سال ایسا ہی ہوتا ہو۔ انسان کی یادداشت موسم کے معاملے میں بہت کمزور ہوتی ہے۔ ہر نئے سال میں وہ پچھلے سال کی سختیاں بھول جاتا ہے۔

عادل نے ٹیکسی سے باہر آنے کے بعد اپنے دونوں ہاتھ اپنی جیبوں میں ٹھونس لیے۔ سامنے بس ٹرمینل تھا۔ یہاں سے بسیں اور ویگنیں مختلف علاقوں کو جایا کرتی تھیں۔

بس ٹرمینل پر ویسے تو ہر وقت بھیڑ رہتی تھی لیکن آج کی بھیڑ غیر متوقع اور بہت زیادہ تھی۔ مزدور، دکاندار، طالب علم، بوڑھے، جوان اور بچے۔ بس اور ویگن میں کام کرنے والے بچے کسی بھی ٹیکسی سے مسافروں کو اترتے دیکھ کر ان کی طرف دوڑ لگا دیتے اور ان بسوں اور ویگنوں تک گھیر لاتے جو ان کی منزل ہوا کرتی۔ اس طرح ان بچوں کو کمیشن کے طور پر کچھ پیسے مل جاتے تھے لیکن آج تو ہر ایک کی منزل بس ایک ہی تھی۔ ملابی۔ ملابی (اسٹیڈیم)

عادل ان لوگوں کو دیکھتا رہا۔ بسوں میں مسافروں کو بھرنا، کشمکش، چیخ وپکار، یہ سارے مناظر اسے پریشان کر کے رکھ دیتے۔ وہ اکثر سوچا کرتا کہ اگر اس کے پاس رقم ہوئی تو وہ اپنی ایک گاڑی ضرور خرید لے گا۔ اس طرح اسے بسوں وغیرہ سے نجات مل جائے گی۔

الملابی، الملابی کی صدائیں ہر طرف گونج رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج پورا شہر اسٹیڈیم کی طرف جارہا تھا۔

بسوں اور ویگنوں کے ڈرائیور چیخ رہے تھے۔ ”آؤ، جلدی۔ بس جانے والی ہے۔ آؤ الملابی کی طرف۔ بغداد کے عظیم پہلوان فوازی ال بغداد کو دیکھنے کا سنہری موقع۔ چلو فوازی کو دیکھو۔ آجاؤ۔ بس چلنے والی ہے۔“

لوگ بسوں کی چھتوں پر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنی سخت سردی اور تیز ہواؤں کے باوجود۔ فوازی کی ریسلنگ دیکھنے کا جنون انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

”انکل......“ ایک بچے نے عادل کی آستین تھام لی۔ ”چلیں الملابی کی طرف۔ وہ نیلی والی بس جارہی ہے۔“

عادل نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی آستین بچے کی گرفت سے چھڑالی۔ ”نہیں۔ مجھے الملابی نہیں جانا۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے ال شیبا جانے والی بس بتاؤ۔“

بچے کے جواب دینے سے پہلے ایک آدمی بول پڑا۔ جو قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ ”اس کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا بھائی کیونکہ اس وقت سب اسٹیڈیم کی طرف جارہے ہیں۔ لوگ عظیم فوازی کو لڑتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم کو تو معلوم ہے کہ وہ کتنا عظیم ریسلر ہے۔ اس کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ اس نے کبھی ہار نہیں مانی۔ دشمنوں کی گردنیں توڑ دی ہیں۔ وہ ہمارا ہیرو ہے۔“

وہ آدمی فوازی کی شان میں قصیدے پڑھتا رہا۔ عادل اس کی باتوں سے اکتا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس وقت پورا بغداد گویا پاگل ہورہا تھا۔

جس کو دیکھو، فوازی، فوازی۔ عادل ان ہی باتوں سے اکتا کر اور گھبرا کر بغداد سے کہیں دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ال شیبا میں چار پانچ گھنٹے گزار کر واپس آجائے گا۔ ال شیبا بغداد کا ایک مضافاتی علاقہ تھا۔ بہت پرسکون اور خوب صورت۔ وہاں کئی خوب صورت اور پرسکون ریسٹورنٹ تھے۔ یہاں تین چار گھنٹے آرام سے گزارے جاسکتے تھے۔

عادل کو اس صورت حال پر افسوس تھا۔ جو کچھ بھی ہورہا تھا، وہ ٹھیک نہیں تھا، ایک قومی جنون کی سی کیفیت تھی۔

اس نے شور سنا۔ نوجوانوں کا ایک گروپ فوازی کی بڑی بڑی تصویریں اٹھائے ایک بس کی طرف جارہا تھا۔ ان تصویروں میں فوازی اپنی پوری شان کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ چڑھی ہوئی گھنی مونچھیں، خونخوار آنکھیں اور کسرتی بدن۔ وہ بغداد کی شان تھا۔ اپنا بغداد کا ہیرو تھا۔ عادل بہت دلچسپی سے ان نوجوانوں کو دیکھتا رہا جو فوازی کی تصویریں اٹھائے بس میں سوار ہورہے تھے۔

اچانک ایک فقیر عادل کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ ”کچھ دے دو بھائی۔“ فقیر نے کہا۔ ”ہمارا فوازی انشاء اللہ ضرور جیتے گا۔“

عادل نے برا سا منہ بنا کر اسے منع کردیا۔ فقیر کچھ بڑبڑاتا ہوا ایک طرف چلا گیا تھا۔ خدا جانے سب کو کیا ہوگیا ہے۔ عادل سوچ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ اپنے دوست ناصر کی طرف گئی۔ وہ ابھی ابھی ٹیکسی سے اترا تھا۔ عادل تیزی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ ناصر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

”کیا اسٹیڈیم کی طرف جارہے ہو؟“ عادل نے پوچھا۔

”ارے نہیں بھائی بلکہ میں تو اس صورتِ حال سے گھبرا کر ال شیبا کی طرف بھاگ رہا ہوں۔“ ناصر نے بتایا۔

”کیا عجیب اتفاق ہے۔“ عادل نے کہا۔ ”میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔“

”تنگ آچکا ہوں۔“ ناصر نے کہا۔ ”دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ کوئی پڑوسی آجاتا ہے۔ جی ناصر صاحب، کیا خیال ہے آج کی ریسلنگ کے بارے میں۔ ویسے وہ فرنچ پہلوان بھی کم نہیں ہے لیکن اپنا فوازی شیر ہے شیر۔ وہ اس فرانسیسی کو توڑ کر رکھ دے گا۔ تنگ آگیا ہوں یہ سب سن سن کر۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ وقت بغداد سے باہر ہی گزار لوں۔ چار گھنٹوں کے بعد جب واپس آؤں گا تو یہ تماشا ختم ہوچکا ہوگا۔“

”میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے دوست۔“ عادل نے کہا۔ ”میں بھی اسی لیے بھاگ رہا ہوں۔“

”پورے شہر پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔“

”ہاں۔“ عادل نے گردن ہلائی۔ ”لگتا ہے سب پاگل ہوگئے ہیں۔ یار! تم ہی بتاؤ ایسا کیوں ہورہا ہے؟“

”اس کی بہت معقول وجہ ہے۔“

”وہ کیا؟“

”اس لیے کہ اب ہمارے پاس کوئی ہیرو نہیں رہا۔“ ناصر نے کہا۔ ”کوئی سائنس دان نہیں۔ کوئی فاتح نہیں۔ کوئی جنرل نہیں۔ کوئی بڑا دانش ور نہیں۔ اب اسی قسم کے لوگ ہمارے ہیرو بن گئے ہیں۔ ہم خواب دیکھنے والی قوم ہیں۔ عملی طور پر تو ہم فرانسیسیوں یا انگریزوں کو شکست نہیں دے سکتے۔ اس لیے ہم نے اپنے خوابوں کی تعبیر پہلوانوں اور کھلاڑیوں میں ڈھونڈ رکھی ہے۔“

''ٹھیک کہتے ہو تم۔'' عادل نے اس کی تائید کی۔ ''یہ شاید پوری قوم کا المیہ ہے۔''

''یہ صرف ہمارے ملک کا نہیں بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ کا بھی حال ہے۔ ہم نے جھوٹے ہیروز کو اپنا فخر اور اپنا سرمایہ سمجھ رکھا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر فوازی جیت گیا تو پوری ملتِ اسلامیہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی۔ مسلمانوں کے پرانے دن واپس آجائیں گے۔''

''بہت ہی تلخ ہو رہے ہو۔''

''تو اور کیا ہوگا۔ وہ دیکھو۔ وہ کالج کی لڑکیوں کا گروپ بھی فوازی کی تصویریں اٹھائے بسوں کی طرف دوڑا چلا جا رہا ہے۔''

عادل نے ان لڑکیوں کو دیکھا۔ ان کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے۔

''دیکھ لیا۔'' ناصر نے کہا۔ ''یہ ہے صورتِ حال۔ ہم جھوٹے خداؤں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ انہیں ہم نے اپنا نجات دہندہ سمجھ لیا ہے کیونکہ کہیں اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ہم ایک مایوس اور شکستہ قوم ہیں۔''

''لیکن اب اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ ہم دونوں کے پاس صرف ایک ہی علاج ہے کہ ہم اس صورتِ حال سے بھاگ لیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''وہ دیکھو، وہ سامنے میرا پڑوسی محمود چلا آ رہا ہے۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تو وہ بھی اسی موضوع پر بور کرے گا۔''

''تو پھر اس طرف جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' عادل نے ایک آڑ کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ ناصر کا پڑوسی محمود ان کے برابر سے گزرتا چلا گیا۔ اس کا بھی چہرہ جوش سے تمتمایا ہوا تھا۔

''دیکھ لیا اس پاگل کو۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں دیکھ لیا۔''

''یہ وہ شخص ہے جس کو فوازی کا پورا شجرہ یاد ہے۔ کتنی کشتیاں لڑیں۔ کس کس سے لڑیں۔ کس طرح اپنے حریفوں کو شکست دی وغیرہ وغیرہ۔''

اس دوران میں خوش قسمتی سے ایک ٹیکسی ان کے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں دو آدمی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈرائیور کھڑکی سے سر نکال کر ''ال شیا، ال شیا'' کی آوازیں لگا رہا تھا۔

دونوں لپک کر اس ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

''خدا کا شکر ہے۔'' عادل نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب اس جنون سے نجات مل جائے گی۔''

التحریر پل سے گزرنے کے بعد ڈرائیور نے بلند آواز میں بولنا شروع کیا۔ ''آپ لوگوں کا کیا خیال ہے صاحب۔ اس ریسلنگ میں کون جیتے گا؟ میں تو کہتا ہوں کہ فوازی جیتے گا۔ انشاء اللہ۔''

عادل اور ناصر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

پہلے سے بیٹھے ہوئے مسافروں نے ڈرائیور سے اسی موضوع پر باتیں شروع کر دیں۔ عادل اور ناصر نے اپنے اپنے کان بند کر لیے تھے۔

خدا خدا کر کے ال شیا آیا تو دونوں کرایہ ادا کر کے جلدی سے باہر آ گئے۔

''اوہ۔ کتنا سکون ہے یہاں۔'' عادل نے ایک گہری سانس لی۔ ''چار پانچ گھنٹے آرام سے گزر جائیں گے۔''

''چلو سامنے والے ریسٹورنٹ میں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''بہت پر سکون جگہ ہے۔ میں یہاں کئی بار پہلے بھی آ چکا ہوں۔''

دونوں ریسٹورنٹ کی طرف چل دیے اور ریسٹورنٹ کے دروازے سے اندر گھستے ہی انہیں احساس ہو گیا کہ یہاں بھی سکون نہیں ہے۔

ریسٹورنٹ والوں نے ریسلنگ دکھانے کے لیے بڑا سا ٹی وی لگا رکھا تھا اور لوگ بیٹھے ہوئے ریسلنگ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ تبصرے کر رہے تھے۔ شور کر رہے تھے۔

''میرے خدا۔'' عادل کراہنے لگا۔ ''یہاں بھی وہی صورتِ حال ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ گھر ہی واپس چلتے ہیں۔''

''ایک بات بتاؤ، کیا تمہارے گھر میں بچے نہیں ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہیں؟''

''ٹی وی سیٹ نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے تو خریدا ہے۔''

''تو پھر اطمینان رکھو، اس وقت تمہارے اور میرے گھروں میں بھی ٹی وی لگا ہوا ہوگا اور سب ریسلنگ شروع ہونے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''تو پھر بتاؤ کیا کریں؟''

''میرا خیال ہے کہ اب ہم دونوں بھی اسٹیڈیم کی طرف چلتے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''ہم بھی تو امتِ مسلمہ ہی کا حصہ ہیں۔ ہم کہیں باہر سے تو نہیں آئے۔''

عادل نے خاموشی سے اپنی گردن جھکا لی۔ سردی اچانک اور بھی بڑھ گئی تھی۔

چنگاری

مرزا امجد بیگ

کبھی کبھی محبت شبنم کی پھوار بن کر نہیں بلکہ دبی چنگاری بن کر سامنے آتی ہے اور بہت کچھ جلا کر را کھ کر دیتی ہے... ان کے دلوں میں بھی محبت کی دھیمی دھیمی آنچ ان کا من جلاتی رہتی تھی جس پر یقین و اعتماد کی ٹھنڈی پھوار کی ضرورت تھی مگر اس حبس زدہ موسم میں بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ ایسے میں تو صرف بغاوت جنم لیتی ہے اور انہوں نے بھی اپنی اسی سوچ پر عمل کر ڈالا۔ بنا یہ سوچے کہ اس کے نتیجے میں وہ جیل کی گھٹن میں بھی سڑ سکتے ہیں... مگر خوش قسمتی سے انہیں بیگ صاحب کا مضبوط سہارا مل گیا جنہوں نے انتہائی ایمانداری سے ان بے گناہوں کو تحفظ فراہم کرکے قانون کی بالادستی کا احساس دلایا... بے شک ایماندار افسران ہی معاشرتی انقلاب کا سبب بن سکتے ہیں اور انہی افسران کی بدعنوانیاں بھی جانے کتنی بلاعنوان کہانیوں کو جنم دے ڈالتی ہیں۔ بہرحال یہ ایک خوش نصیب جوڑا تھا جنہیں آزاد فضا میں سانس لینا میسر ہوا۔

بیگ صاحب کے پُرجوش دلائل اور سچ کی تلاش کا

دلچسپ انداز

وہ ایک بھیگی ہوئی صبح تھی۔ ماہ جولائی اختتام پذیر ہو رہا تھا اور موسم برسات پچھلے چند روز سے خود کو منوانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ کراچی میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، مذکورہ بالا موسم صرف جھلک دکھلانے ہی آیا کرتا ہے تاہم اس کی یہ جھلک بھی خاصی دھواں دھار ہوا کرتی ہے اور شہر کے نشیب و فراز کو خوب ''مزہ چکھا'' جاتی ہے۔ اس برساتی تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

اس بھیگی ہوئی بوندا باندی بردار صبح میں سو کر اٹھا تو میرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے بیدار ہونے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ تیسری بیل پر میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ ''ہیلو......!''

''السلام علیکم بیگ صاحب!'' دوسری جانب سے ایک شناسا سا آواز ابھری۔

''وعلیکم السلام صدیقی صاحب۔'' میں نے سلام کے جواب میں کہا۔ ''آپ اتنی صبح کیسے بیدار ہو گئے؟''

''حیران نہ ہوں بیگ صاحب۔'' وہ میرے لہجے میں شامل الجھن نما حیرت کو محسوس کرتے ہوئے بولے۔ ''بیدار ہونے کی نوبت تو اس وقت آتی اگر میں ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ لگاتا۔ بس یوں سمجھیں کہ پوری رات جاگ کر گزاری ہے۔''

''خیریت......!'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''گھر میں تو سب امن و امان ہے نا؟''

''میرے گھر میں تو امن ہی ہے بیگ صاحب۔'' معظم صدیقی نے بتایا۔ ''سسرال میں رات چھوٹی سالی کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ ایمرجنسی میں اسپتال لے جانا پڑا۔ میری بیوی رات بھر اسپتال میں رکی اور ظاہر ہے، مجھے بھی بیوی کے ساتھ ڈیوٹی دینا پڑی۔ میں ابھی کوئی آدھا گھنٹا پہلے ہی گھر پہنچا ہوں۔''

معظم صدیقی ایک فلاحی تنظیم کے روح رواں تھے۔ سماجی کاموں میں ان کا بڑا دل لگتا تھا اور وہ رات گئے تک ایسی

ہی سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے تھے اس لیے وہ صبح دیر تک سونے کے عادی تھے۔ اتنی صبح ان کے فون کرنے پر میں اسی لیے حیران ہوا تھا۔ بہرحال، میری ان سے دیرینہ دوستی تھی لہٰذا میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''صدیقی صاحب! آپ کی سالی کی طبیعت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ میں اس سلسلے میں جو بھی کر سکتا ہوں، حکم کریں۔''

''نہیں بیگ صاحب! اسپتال میں تمام معاملات سیٹل ہوگئے ہیں اور کرن کی طبیعت بھی اب بہتر ہے۔'' صدیقی نے بتایا۔ ''کرن کی بیماری کا ذکر تو ضمناً نکل آیا ہے ورنہ میں نے اس وقت کسی اور مقصد سے آپ کو فون کیا تھا۔''

''پہیلیاں نہیں بجھوائیں صدیقی صاحب!'' میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ''آپ نے جس مقصد سے فون کیا ہے، وہ بیان کریں اور بتائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''بیگ صاحب! گزشتہ رات پولیس نے ایک جوڑے کو گرفتار کیا ہے۔'' صدیقی صاحب وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''دونوں کا تعلق کراچی سے نہیں ہے۔ میں رات ہی میں آپ کو ان کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر کرن کی طبیعت خراب ہوجانے کی وجہ سے میں مصروف ہوگیا اور اس جوڑے کا معاملہ ذہن سے نکل گیا۔ بہرحال......'' لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر متعلقہ تھانے کا نام بتانے کے بعد کہا۔

''آپ عدالت جاتے ہوئے تھانے جا کر اس جوڑے سے ایک ملاقات کر لیجیے گا تاکہ پتا چلے، ان کی کیا مدد کی جا سکتی ہے۔''

''آپ نے بتایا ہے کہ اس جوڑے کا تعلق کراچی سے نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب یہ بھی فرما دیں کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں اور یہاں کراچی میں کیا کرتے پھر رہے تھے۔ اس سے بھی پہلے مجھے یہ پتا چلنا چاہیے کہ پولیس نے انہیں کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

''وہ دونوں اندرونِ سندھ کے کسی علاقے کے رہنے والے ہیں اور پولیس نے انہیں حدود آرڈی نینس کے تحت گرفتار کر کے لاک اپ میں بند کیا ہے۔'' صدیقی صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اس سے زیادہ ان کے بارے میں مجھے بھی کچھ پتا نہیں۔ مجھے ان کی گرفتاری کی اطلاع ملی تھی لیکن میں ان سے مل کر تفصیل نہیں جان سکا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ بے قصور ہیں لہٰذا انہیں قانونی مدد پہنچانا میرے ادارے کا فرض ہے۔ آپ ان سے ملاقات کر کے مجھے بتائیں کہ اس سلسلے میں کیا قانونی چارہ جوئی ممکن ہے۔''

''ٹھیک ہے صدیقی صاحب!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں پہلے ان کا ''انٹرویو'' کرلوں۔ اس کے بعد آپ سے بات کروں گا۔''

''او کے......'' صدیقی صاحب نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔ ''میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔''

اختتامی کلمات کے بعد میں نے ریسیور رکھ دیا۔

تازہ دم ہونے کے بعد میں نے ناشتا کیا اور تیار ہو کر گھر سے نکل آیا۔ اس وقت بھی بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ آج عدالت میں میرا کوئی کیس نہیں تھا، مطلب یہ کہ آج کسی کیس کی پیشی نہیں تھی۔ مجھے گھر سے سیدھا اپنے آفس جانا تھا جو سٹی کورٹ کے نزدیک ہی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں واقع تھا۔ مذکورہ عمارت میں اِکا دُکا کو چھوڑ کر باقی تمام دفاتر وکلاء برادری اور قانون سے متعلق مختلف فرمز ہی کے تھے۔ صدیقی صاحب نے جس تھانے کا ذکر کیا تھا، وہ میرے راستے ہی میں پڑتا تھا لہٰذا میں نے یہی فیصلہ کیا کہ پہلے اس گرفتار شدہ جوڑے سے ملاقات کروں گا، اس کے بعد ہی آفس کا رخ کروں گا۔

جب پولیس کسی شخص کو ملزم نامزد کر کے حوالات میں ڈالتی ہے تو اس سے ملاقات کوئی آسان کام نہیں ہوتا، تاہم اس سلسلے میں کچھ ہتھکنڈے آزمانا پڑتے ہیں۔ کبھی اصول کی بات کر کے اور کبھی دھونس دھاندلی کی مدد سے انگلی ٹیڑھی کر کے گھی نکالنا پڑتا ہے۔ اس نوعیت کے طریقہ کار کی میں پہلے بھی کئی بار وضاحت کر چکا ہوں لہٰذا سر دست آگے بڑھتا ہوں۔

گاڑی کو میں نے تھانے کی دیوار کے ساتھ پارک کیا اور آرام سے ٹہلتے ہوئے ہیڈ کلرک کے کمرے میں پہنچ گیا۔ جب میں نے اپنے مطلوبہ جوڑے سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ہیڈ کلرک نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا تو آپ ان دونوں کی بات کر رہے ہیں جنہیں ہم نے پچھلی رات ایک فیملی پارک سے گرفتار کیا ہے۔ وہ پارک میں بیٹھ کر سرِعام فحش اور نازیبا حرکتیں کر رہے تھے۔''

''کیا آپ لوگوں نے گزشتہ رات ایک سے زیادہ جوڑوں کو فحش حرکات کے الزام میں گرفتار کیا ہے؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

''نن...... نہیں۔'' وہ نفی میں منڈی جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''اس قسم کا ایک ہی جوڑا پکڑ کر تھانے لایا گیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کراچی سے نہیں ہے۔''

''ہاں...... ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے

میں کہا۔ ''بس، میں اسی جوڑے سے ملنے آیا ہوں۔''

''آپ کون ہیں؟'' ہیڈ کلرک نے چونک کر محتاط انداز میں میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''ان سے کس سلسلے میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں؟''

''میں لڑکی کا رشتے دار ہوں۔'' میں نے فوری خیال کے تحت کہہ دیا۔

''اوہ......!'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن جناب! آپ نے بہت دیر کر دی۔''

''دیر کر دی......کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے آنے سے کوئی پندرہ منٹ پہلے ان دونوں کو عدالت میں پیش کرنے کے لیے تھانے سے لے جایا گیا ہے۔ آپ ان سے ملنے کے لیے یا تو عدالت چلے جائیں یا پھر شام تک ادھر ہی آجائیں۔ عدالت سے ریمانڈ حاصل کرنے کے بعد انہیں اسی تھانے میں لایا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ہیڈ کلرک سے بحث کیے بغیر تعاون آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں دوبارہ ادھر ہی آجاؤں گا۔''

''آپ خاصے عقل مند انسان ہیں۔'' وہ تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آج رات دس بجے تک میں ادھر ہی ڈیوٹی پر ہوں۔ میرا نام احسان اللہ ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا پھر پیشکش کے رنگ میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ آپ شام میں سیدھے میرے پاس آجائیں۔ میں خود حوالات میں لے جا کر آپ کو ان دونوں سے ملوادوں گا۔''

''شکریہ احسان اللہ۔'' میں نے اسے ایسی نظر سے دیکھا کہ جیسے اس نے میرا کوئی بہت گمبھیر مسئلہ حل کر دیا ہو۔

''اس میں شکریہ والی کوئی بات نہیں جناب۔'' وہ بدستور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اس دنیا میں انسان ہی دوسرے انسان کے کام آتا ہے۔ میں آپ کا خیال کروں گا تو آپ بھی......؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' اس کے ادھورے جملے کے جواب میں، میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں بھی آپ کا خیال رکھوں گا۔''

اس نے مجھے سلام کیا اور میں تھانے سے نکل آیا۔

ایک بات تو طے تھی کہ میرے عدالت پہنچنے اور اس جوڑے کو تلاش کر کے ان تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے پولیس انہیں عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ کی درخواست کر چکی ہوگی لہٰذا عدالتی کارروائی کے دوران میں میری مداخلت کا کوئی معقول جواز نہیں بنتا تھا۔ مناسب یہی تھا کہ میں شام میں تھانے جا کر ان سے ملاقات کروں۔ اسی فیصلے کے زیر اثر میں نے اپنی گاڑی کو دفتر کے راستے پر ڈال دیا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی، تھانے سے جو راستہ میرے آفس کی طرف جاتا تھا، وہ راستہ عدالت تک پہنچنے کا بھی تھا۔ یہاں میری مراد نیت سے تھی۔ یعنی میں نے تھانے سے نکل کر اپنے آفس جانے کا ارادہ کیا تھا۔

☆☆☆

دوپہر کے بعد صدیقی صاحب کا فون آگیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے استفسار کیا۔ ''جی بیگ صاحب! اس جوڑے کی کیا رپورٹ ہے؟''

میں نے صدیقی صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ ''آپ کو رات تک انتظار کرنا ہوگا۔ میں دفتر سے اٹھنے کے بعد تھانے جا کر ان سے ایک بھرپور ملاقات کروں گا پھر تب ہی آپ کو کوئی رپورٹ پیش کر سکوں گا۔''

''میں چاہتا تھا، پولیس کے عدالت سے ریمانڈ لینے سے پہلے ہی آپ کی ان سے ملاقات ہو جاتی۔ بہر حال......'' لمحاتی توقف کر کے صدیقی صاحب نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بیگ صاحب! آپ ان سے مل کر حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر میرے اندازے کے مطابق وہ بے قصور ہیں تو انہیں بھرپور قانونی مدد ملنا چاہیے اور ہاں...... آپ کی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات میرا ادارہ ادا کرے گا۔ آپ کو اس سلسلے میں چنداں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، البتہ آپ کو اپنی فیس میں مناسب رعایت کرنا ہوگی۔''

''پہلے کبھی آپ کو رعایت کے معاملے میں شکایت کا موقع دیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ہمارے درمیان کاروباری تعلقات کے علاوہ دوستانہ مراسم بھی ہیں صدیقی صاحب۔''

''جبھی تو میں کسی بھی قسم کی قانونی مدد کے لیے سب سے پہلے آپ ہی سے رجوع کرتا ہوں بیگ صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''آپ جانتے ہیں، بعض وکیل تو آپ سے آدھی بلکہ چوتھائی فیس میں بھی کیس پکڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں مگر میں نے ہمیشہ آپ کو سب پر ترجیح دی ہے اور اس کے بھی چند اسباب ہیں۔'' انہوں نے دوبارہ توقف کیا پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

"نمبر ایک، آپ میرے مخلص اور سچے دوست ہیں۔ نمبر دو، آپ ایک پیشہ ور اور تجربہ کار وکیل ہیں۔ نمبر تین، آپ اپنے پیشے سے بھی اتنے ہی سچے اور مخلص ہیں جتنا کہ مجھ سے۔ نمبر چار، آپ نے ہمیشہ حق اور سچ کا ساتھ دیا ہے۔"

"صدیقی صاحب! آپ نے مجھے اتنے زیادہ ٹائٹلز دے دیے ہیں کہ ان کا دفاع کرتے ہوئے مجھے دانتوں پسینا آجائے گا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "پتا نہیں، میں آپ کی توقعات پر پورا اتر سکوں گا یا نہیں۔"

"میں نے یہ ٹائٹلز دے کر آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی بیگ صاحب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ "میں نے آپ کو جیسا پایا ہے وہی بیان کیا ہے۔ اینی ہاؤ، مجھے امید ہے آپ کے بارے میں لگایا ہوا میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "آپ رات میں کسی وقت فون کر کے ان کے بارے میں معلوم کر لیجیے گا جب تک میں ان کی حقیقت اور ان پر عائد کردہ الزامات کی صحت کے حوالے سے ریسرچ کر لوں گا۔"

"او کے......وش یو گڈ لک۔" وہ فراخ دلی سے بولے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

جب عدالت میں میرے کسی کیس یا مختلف کیسز کی پیشیاں ہوتی ہیں تو میں عدالتی بکھیڑوں سے نمٹنے کے بعد ہی اپنے دفتر کا رخ کیا کرتا ہوں اور جب عدالتی مصروفیات نہیں ہوتیں تو میں صبح ہی آفس میں ڈیرا لگا کر بیٹھ جاتا ہوں، اس طرح بعض پینڈنگ کام نمٹانے میں آسانی ہو جاتی ہے تاہم اس برساتی دن مجھے اپنے آفس پہنچتے پہنچتے بھی دوپہر ہو گئی تھی۔

اس روز وقفے وقفے سے بوندا باندی کا سلسلہ جاری رہا جس کے سبب کلائنٹس کی آمد پر بھی اچھا خاصا فرق پڑا لہٰذا رات کو معمول سے کافی پہلے میں نے اسٹاف کو چھٹی دے کر دفتر بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ پروگرام کے مطابق مجھے آفس سے سیدھا متعلقہ تھانے پہنچنا تھا جہاں وہ غیر شہری جوڑا بند تھا جسے ایک روز پیشتر کسی فیملی پارک سے فحش حرکات کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور آج صبح انہیں عدالت میں پیش کر کے غالباً ان کا ریمانڈ بھی حاصل کر لیا گیا تھا۔

ٹھیک نو بجے رات میں دوبارہ اسی تھانے میں موجود تھا۔ ہیڈ کلرک احسان اللہ جیسے میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے مجھے "ریسیو" کیا اور اپنے ہمراہ مجھے حوالات کے اس حصے میں لے گیا جہاں ایک کمرے میں مذکورہ جوڑا بند تھا تاہم اس جوڑے تک پہنچانے سے قبل اس نے مجھ سے "سروس چارجز" مبلغ پچاس روپے پیشگی وصول کر لیے تھے اور میرا نام بھی دریافت کر لیا تھا۔ میں نے اسے اپنا نام قادر بخش بتایا تھا۔

"قادر بخش صاحب! آپ اطمینان کے ساتھ اپنے بندوں سے بات چیت کر لیں۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "میں کسی کو اس طرف نہیں آنے دوں گا۔"

میں نے سر کی خفیف جنبش سے ہیڈ کلرک احسان اللہ کو اثبات میں جواب دیا اور اس کے جانے کے بعد حوالات میں بند جوڑے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں بھی حیرت آمیز الجھن سے مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔

لڑکی کی عمر تئیس یا چوبیس سال رہی ہو گی۔ وہ گندمی رنگت، درمیانے قد اور بھرے بھرے بدن کی مالک ایک خوب صورت اور پرکشش لڑکی تھی۔ اپنی وضع قطع اور انداز و اطوار سے وہ کسی کھاتے پیتے گھر کی نظر آتی تھی تاہم ان لمحات میں وہ خاصی پریشان دکھائی دیتی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں اس کا ساتھی لڑکا قدرے سنبھلا ہوا اور پُرسکون لگتا تھا، یا اگر وہ پریشان تھا بھی تو اس کے اندر کا احوال چہرے سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق لڑکے کی عمر ستائیس کے آس پاس تھی۔ وہ عام سی شکل وصورت کا مالک اور لاابالی شخص نظر آتا تھا۔ میں نے چند سیکنڈ میں ان کا جائزہ لینے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں ان سے استفسار کیا۔

"تم دونوں سب سے پہلے مجھے اپنے نام بتاؤ اور...... یہ بھی کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

ان کے حلیوں کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا تھا کہ وہ اندرونِ سندھ کے کسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے سوال کے جواب میں لڑکے نے بتایا۔

"میرا نام شاہ نواز ہے اور یہ میری کزن سائرہ ہے......" اس نے اپنی ساتھی کی طرف اشارہ کیا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "ہم دونوں سعید آباد سے آئے ہیں مگر......آپ کون ہیں؟"

"میں آپ دونوں کا خیر خواہ، ہمدرد ہوں۔" میں نے شاہ نواز کے سوال کا جواب دیا۔ "اور آپ لوگوں کو اس مصیبت سے نکالنے آیا ہوں۔ میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔"

''اچھا......تو آپ وکیل ہیں۔'' سائرہ نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔''مگر پولیس والا تو آپ کو قادر بخش کے نام سے پکار رہا تھا اور اس نے ہمیں یہ بھی بتایا تھا کہ آپ میرے رشتے دار ہیں؟''

''پولیس والے نے آپ لوگوں سے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔''میں نے باری باری ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وضاحت کردی۔''میں نے اسے اپنے بارے میں یہی سب بتایا تھا۔ پولیس والوں سے کام نکالنے کے لیے اس قسم کی چالیں چلنا پڑتی ہیں۔ اگر میں یہ حربہ استعمال نہیں کرتا تو وہ مجھے آپ لوگوں سے ملاقات کی اجازت نہیں دیتا۔''

''اچھا......!'' شاہ نواز نے اس طرح اثبات میں گردن ہلائی جیسے میرے کہے پر ایمان لے آیا ہو۔''تو آپ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلانے آئے ہیں؟''

وہ دونوں مخصوص سندھی لہجے میں صاف اردو بول رہے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا، انہوں نے کسی حد تک تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ یہ درست ہے کہ میں تم لوگوں کو اس پریشانی سے نکالنے ہی آیا ہوں۔ کراچی کی ایک فلاحی تنظیم نے مجھے آپ دونوں کا وکیل مقرر کیا ہے لیکن......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو سائرہ نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔''لیکن......کیا وکیل صاحب؟''

''لیکن یہ کہ......میں اسی صورت میں تم...لوگوں کی قانونی مدد کرسکوں گا اگر تم دونوں مجھ سے بھرپور تعاون کروگے۔''میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''آپ کو ہم سے کس قسم کا تعاون چاہیے وکیل صاحب!'' شاہ نواز نے بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔''ہم کو تو پولیس نے تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ آج ہمیں یہ لوگ عدالت بھی لے کر گئے تھے۔ ان لوگوں نے ہم پر بڑے گندے الزامات بھی لگائے ہیں۔''

''میں ان الزامات کے بارے میں جانتا ہوں۔ اس سلسلے میں پولیس والوں سے میری تفصیلی بات ہوچکی ہے۔'' میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔''اس کے باوجود میں تم... لوگوں کی مدد کروں گا اگر تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتادو تو؟''

''میں آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گی۔'' سائرہ جلدی سے بولی۔''آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''اور تم......؟'' میں نے شاہ نواز کی آنکھوں میں جھانکا۔''کیا تم بھی سچ بولنے کے لیے تیار ہو۔''

''جج......جی......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔''جی ہاں۔''

''سچ بولنے میں تم... دونوں ہی کا فائدہ ہے۔'' میں نے باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔''وکیل اور ڈاکٹر سے غلط بیانی کرنے میں سراسر اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔''

وہ دونوں خاموشی سے مجھے دیکھتے چلے گئے۔ میں نے شاہ نواز کی طرف دیکھتے ہوئے سوال وجواب کے سلسلے کا آغاز کیا۔

''یہ سعید آباد جہاں سے تم دونوں کا تعلق ہے، سندھ میں کہاں واقع ہے؟''

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے سعید آباد کا نام پہلی مرتبہ سنا تھا۔ شاہ نواز نے جواب دیا۔

''جناب! حیدرآباد سے نواب شاہ کی طرف جائیں تو ''سعید آباد'' راستے میں پڑتا ہے۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔''اس کا مطلب ہے، تمہارا گاؤں کراچی سے زیادہ دور نہیں؟''

''جی...... جی ہاں۔'' اس نے میکانکی انداز میں گردن ہلائی۔

''شاہ نواز! تم نے سائرہ کو اپنی کزن بتایا ہے......!''

''نہیں وکیل صاحب!''میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی سائرہ بول اٹھی۔''میں شاہ نواز کی کزن نہیں ہوں۔ بس، ہم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ سائرہ تمہاری کزن ہے؟''میں نے گھور کر شاہ نواز کی طرف دیکھا۔

''جی...... وہ آپ کی وارننگ سے پہلے کا جھوٹ ہے۔'' وہ ندامت آمیز انداز میں بولا۔''میں نے وہ جھوٹ مجبوری میں بولا تھا لیکن اب آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کروں گا۔''

''سائرہ تمہاری کزن نہیں اور میرا خیال ہے، یہ تمہاری رشتے دار بھی نہیں۔'' میں نے بدستور اسے گھورتے ہوئے کہا۔''پھر تم کس تعلق اور ناتے سے اسے سعید آباد سے کراچی لے کر آئے ہو۔ تمہارا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟''

''جناب! ہم سیر وتفریح کے لیے کراچی آئے تھے۔''شاہ نواز نے بتایا۔''ادھر کینٹ اسٹیشن کے قریب ہم ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ شام کو ایک فیملی پارک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ پولیس نے ہمیں گرفتار کرکے تھانے میں بند کردیا۔''

سائرہ نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔''وکیل صاحب!

ہم نے کوئی چوری نہیں کی، کہیں ڈاکا نہیں ڈالا اور نہ ہی کسی کو قتل کیا ہے لیکن پولیس والے بھی بار بار ہم سے یہی پوچھتے ہیں کہ ہم سعید آباد سے کراچی کیوں آئے ہیں۔ کیا کراچی سندھ کا حصہ نہیں؟ کیا ہم اپنے صوبے میں آزادی سے گھوم پھر بھی نہیں سکتے؟"

"صوبے ہی نہیں بلکہ پاکستان کا ہر شہری ملک کے طول و عرض میں آزادانہ گھوم پھر سکتا ہے۔" میں نے سائرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر یہاں معاملہ دوسرا ہے۔ مجھے یقین ہے جس فیملی پارک سے تم دونوں کو گرفتار کیا گیا ہے، وہاں تم لوگوں نے کوئی بھی نازیبا اور فحش حرکت نہیں کی ہو گی لیکن تم دونوں ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہو اس لیے پولیس والوں کو تم پر ہاتھ ڈالنے میں آسانی رہی۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!" شاہ نواز تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "فیملی پارک میں ہم دونوں ایک بینچ پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے کہ پولیس نے ہمیں فحش حرکات کے الزام میں گرفتار کرلیا اور جب انہیں پتا چلا کہ ہم کینٹ اسٹیشن پر واقع ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو انہوں نے ہم پر بدکاری وغیرہ کا الزام بھی لگا یا حالانکہ خدا جانتا ہے، ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ہم تو......"

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا۔ میں نے اس کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ تم دونوں کی نیت صاف تھی اور تم شادی کرنے کی غرض سے سعید آباد سے بھاگ کر کراچی پہنچے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا......؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!" سائرہ سراسیمہ آواز میں بولی۔ "ساری گڑبڑ اس کی وجہ سے ہوئی ہے۔" بات ختم کرتے ہی اس نے شاہ نواز کی طرف اشارہ کردیا۔

"مم...... میں نے کیا کیا ہے؟" وہ الجھن زدہ نظر سے سائرہ کو تکنے لگا۔

"وکیل صاحب! شاہ نواز نے مجھے یقین دلایا تھا کہ کراچی میں اس کا ایک جگری دوست رہتا ہے۔" سائرہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "میں اپنے گھریلو حالات سے تنگ تھی۔ میرے باپ نے میری ماں کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی ہے۔ سوتیلی ماں ہر وقت مجھے اذیت دیتی رہتی تھی۔ وہ گویا میری جان کی دشمن ہے۔ میں شاہ نواز کو پسند کرتی ہوں۔ جب اس نے مجھ سے کہا کہ بھاگ کر کراچی چلے جاتے ہیں اور وہاں شادی کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں تو میں اس کی باتوں میں آگئی اور اس کے ساتھ کراچی چلی آئی لیکن یہاں آکر پتا چلا کہ شاہ نواز کا وہ دوست جس کے پاس ہمیں ٹھہرنا تھا، وہ کراچی چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی راستہ یا اشارہ نہیں تھا لہٰذا مجبوراً ہمیں ایک ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا......" اس نے سانس ہموار کرنے کی غرض سے توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"ابھی ہم اسی پریشانی میں گھرے ہوئے تھے کہ کیا کریں، کہاں جائیں۔ ظاہر ہے، واپس سعید آباد جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پریشان ذہنوں کے ساتھ ہم ہوٹل سے نکل کر فیملی پارک میں آبیٹھے اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد پولیس نے ہمیں گرفتار کرلیا۔"

"وکیل صاحب!" شاہ نواز سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آج عدالت میں جا کر پتا چلا ہے کہ پولیس نے ہمارے خلاف بڑا خطرناک مقدمہ درج کیا ہے۔ یہ آرڈی نینس وغیرہ کیا ہوتا ہے......؟"

"آرڈی نینس نہیں، حدود آرڈی نینس!" میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔ یہ قانون کی ایک نہایت ہی خطرناک قسم ہے۔ اس کی دفعات کے تحت تم دونوں کو کم از کم تیس اور زیادہ سے زیادہ سو کوڑوں کی سزا دی جاسکتی ہے۔ تم دونوں بغیر نکاح کے میاں بیوی والی ازدواجی زندگی گزار رہے تھے......"

"یہ بالکل جھوٹ ہے۔ آپ بھی پولیس والوں جیسی بات کر رہے ہیں وکیل صاحب۔" سائرہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "ہوٹل میں ٹھہرنا ہماری مجبوری تھی لیکن میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اور بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ ہوٹل کے کمرے میں شاہ نواز نے مجھے چھوا تک نہیں۔ جب تک ہماری شادی نہیں ہوجاتی، میں میاں بیوی والے تعلقات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی وکیل صاحب۔"

سچائی کی ایک اپنی ہی زبان اور انداز ہوتا ہے۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ سائرہ راست گوئی سے کام لے رہی تھی۔ میں نے اس کے اطمینان کی خاطر کہا۔

"میں نے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ میرا نہیں بلکہ پولیس والوں کا موقف ہے۔ میں نے نہیں، پولیس نے حدود آرڈی نینس کے تحت تم دونوں کے خلاف مقدمہ درج کیا ہے۔ اگر عدالت میں یہ ثابت ہوگیا کہ تم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے ہوٹل کے کمرے میں زندگی گزار رہے تھے تو

تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ عدالت تمہیں سزا سنا دے گی۔

''وکیل صاحب! سائرہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' شاہ نواز تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہم دونوں گھر سے بھاگ کر کراچی ضرور آئے ہیں مگر ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے کہ ہم پر میاں بیوی کی طرح زندگی گزارنے کا الزام لگایا جا سکے البتہ......''

''البتہ کیا؟'' میں نے اس کے رکتے ہی پوچھ لیا۔

''آپ نے کہا ہے نا کہ اگر عدالت میں یہ ثابت ہو گیا کہ ہم میاں بیوی کی حیثیت سے ہوٹل کے کمرے میں زندگی گزار رہے تھے تو عدالت ہمیں سزا سنا دے گی۔'' وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مشکل یہ ہے کہ ہم ہوٹل میں میاں بیوی کی حیثیت سے ہی سے رکے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہوٹل کے رجسٹر میں ہمارا اندراج میاں بیوی کے رشتے ہی سے ہوا ہے۔''

آج سے پینتیس چالیس سال پہلے ہوٹل میں قیام کے لیے اتنی سخت فارمیلیٹیز نہیں ہوا کرتی تھیں جیسا کہ آج کل دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مہمانوں سے متعدد سوالات کیے جاتے تھے اور نہ ہی مختلف کاغذات پر اندراج ہوا کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی حفاظت کے نام پر زندگی پیچیدہ اور مشکل ہوتی جا رہی ہے۔

''شاہ نواز!'' میں نے اس کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا۔ ''ہوٹل میں میاں بیوی کی حیثیت سے ٹھہرنا اور میاں بیوی کی طرح تنہائی میں وقت گزارنا دو مختلف صورتِ حال ہیں۔ میں نے تم دونوں کے میاں بیوی والی زندگی گزارنے کی بات کی تھی۔''

''ایسا تو بالکل نہیں ہوا وکیل صاحب!'' سائرہ جلدی سے بولی۔

''بس تو پھر تم دونوں کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''میں تم...لوگوں سے چند سوالات کروں گا۔ ان کے ٹھیک جواب دے دینا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔''

''جی......آپ جو بھی پوچھیں گے، ہم اس کا سیدھا اور سچا جواب دیں گے۔'' شاہ نواز بڑی فرماں برداری سے بولا۔

سائرہ نے اس کی تائید میں گردن ہلا دی۔

میں نے اپنا بریف کیس کھول لیا۔ میں نے دونوں کے وکالت نامے اور درخواستِ ضمانت والے کاغذات ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سوالات تو بعد میں بھی کیے جا سکتے ہیں...... پہلے تم ان پر دستخط کر دو تا کہ وکیل اور مؤکل کا رشتہ پکا ہو جائے۔ اگر وہ پولیس والا واپس آ گیا اور اسے پتا چل گیا کہ میں تم...... دونوں کا وکیل ہوں تو وہ کام بگاڑنے کے لیے کوئی بھی گند کر سکتا ہے۔ میں قادر بخش کے نام اور سائرہ کے رشتے دار کی حیثیت سے اس سے متعارف ہوں۔ میرے تعارف کا یہ بھرم قائم رہنا چاہیے۔''

میری سنجیدہ باتیں ان کی سمجھ میں آ گئیں اور انہوں نے ان تمام مقامات پر خاموشی سے دستخط کر دیے جن کی میں نے نشاندہی کی تھی۔ جب یہ اہم کام مکمل ہو چکا تو میں نے ضروری کاغذات کو واپس بریف کیس میں رکھا اور شاہ نواز کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم لوگ سعید آباد سے کب نکلے تھے؟''

''تئیس تاریخ کو۔'' اس نے جواب دیا۔

''آج چھبیس جولائی ہے۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''گزشتہ رات یعنی پچیس جولائی کو پولیس نے تمہیں گرفتار کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے، تم دو دن سے کینٹ اسٹیشن والے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے؟''

''جی ہاں۔ آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' شاہ نواز اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم تئیس جولائی کی دوپہر کو کراچی پہنچ گئے تھے۔ میں پہلے اپنے دوست کے پاس گیا مگر وہ نہیں ملا۔ ہم کافی دیر تک پریشانی میں ادھر ادھر بھٹکتے رہے پھر یہی سمجھ میں آیا کہ جب تک دوست نہیں مل جاتا، ہم ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں۔ اس فیصلے کے بعد ہم کینٹ اسٹیشن والے ہوٹل میں ٹھہر گئے......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''تئیس جولائی کی رات ہم ہوٹل میں ٹھہرے۔ چوبیس تاریخ کو بھی میں دوست کی تلاش میں کراچی کی سڑکیں ناپتا رہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پچیس جولائی کا دن بھی اسی کوشش میں گزرا اور پھر رات کو جب ہم ایک فیملی پارک میں بیٹھے اس مسئلے کو حل کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے تو پولیس نے ہمیں گرفتار کر لیا۔''

''ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''تم کراچی میں اپنے جس دوست سے ملنے آئے تھے اس کا نام کیا ہے؟''

''امتیاز۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ امتیاز کراچی کے کس علاقے میں رہتا ہے...... میرا مطلب ہے، رہتا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔ ''اور اس کا ذریعۂ معاش کیا تھا؟''

"امتیاز ادھر ڈرگ روڈ کے کینٹ بازار میں رہتا تھا۔" شاہ نواز نے بتایا۔ "وہ صدر کے علاقے میں ایک ہیئر ڈریسر کی دکان پر کام کرتا تھا۔"

"کیا تم نے صدر والی ہیئر ڈریسر کی دکان پر جا کر اس کے بارے میں معلوم کیا تھا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "جب کینٹ بازار ڈرگ روڈ والے گھر پر امتیاز نہیں ملا تو میں سیدھا صدر پہنچ گیا تھا لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ ایک ماہ پہلے کام چھوڑ کر جا چکا ہے۔ کہاں جا چکا ہے، یہ کسی کو پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ ہم امتیاز کے نہ ملنے سے پہلے ہی بہت پریشان تھے کہ یہ نئی مصیبت ٹوٹ پڑی......" بات کے اختتام پر وہ روہانسا ہو گیا۔

"وکیل صاحب! ہم کسی بھی صورت واپس نہیں جانا چاہتے۔ آپ ہمیں بچالیں، کسی بھی طرح ہمیں پولیس کے چکر سے نکال لیں۔"

"واپس جانے یا نہ جانے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوگا جب پولیس اور عدالتی معاملات سے تم.... دونوں کی جان چھوٹے گی۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"آپ ہمیں بے گناہ ثابت کر کے رہا تو کرا لیں گے نا......؟" سائرہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"انشاءاللہ......ضرور!" میں نے پورے وثوق سے کہا۔ "لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور معاملہ...... سنگین معاملہ بھی سر اٹھانے والا ہے۔"

"کون سا سنگین معاملہ وکیل صاحب......؟" وہ یک زبان ہو کر بولے اور متوحش نظروں سے مجھے تکنے لگے۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "تم دونوں اپنے اپنے گھر سے بھاگ کر کراچی آئے ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ سعید آباد میں کسی کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو۔ کیا گاؤں والوں کو تمہاری محبت کا علم تھا؟"

"جی...... کچھ لوگ ہمارے اس راز سے واقف ہیں۔" شاہ نواز نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "مگر یہ خبر عام نہیں ہے۔"

"کچھ لوگ......!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ لوگ اپنی زبان بند رکھتے ہیں جس کا زیادہ امکان نہیں ہے تو تمہارے گھر والے تم لوگوں کی گمشدگی کی رپورٹ ضرور درج کرائیں گے۔ تم دونوں کا ایک ساتھ گاؤں سے غائب ہو جانا بہت سے پراسرار اور سنسنی خیز سوالات کو جنم دے گا اور سب کا ذہن اسی طرف جائے گا کہ تم ایک ساتھ ہی کہیں گئے ہو اور اگر......" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد یوں اضافہ کیا۔

"اگر...... وہ کچھ لوگ تمہارا "محبت والا راز" افشا کر دیتے ہیں تو سائرہ کا باپ تمہارے خلاف اپنی بیٹی کے اغوا کا مقدمہ بھی درج کرا سکتا ہے۔ تمہاری پوزیشن بہت نازک ہے شاہ نواز!"

"مگر میں نے سائرہ کو اغوا نہیں کیا۔" شاہ نواز نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "سائرہ میرے حق میں گواہی دے سکتی ہے کہ یہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی تھی۔"

"سائرہ کی گواہی اور تمہاری بے گناہی کا معاملہ تو بعد میں حل ہوگا۔" میں نے حالات کی سنگینی ان پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ "کراچی میں تم لوگ زیرِ دفعہ حدود آرڈیننس ایک خطرناک مقدمے میں پھنسے ہوئے ہو۔ سعید آباد میں اگر سائرہ کے اغوا کی رپورٹ درج ہو جاتی ہے تو یہ سونے پر سہاگا والی بات ہوگی یعنی آگے کنواں، پیچھے کھائی......"

"پھر...... پھر ہم کیا کریں؟" سائرہ نے خوف زدہ لہجے میں مجھ سے پوچھا "آپ ہمارے وکیل ہیں۔ آپ جو کہیں گے ہم وہی کریں گے۔ خدا کے لیے ہمیں اس عذاب سے نکالیں۔"

"ہوں......" میں نے سائرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ تم اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے خاصی پریشان تھیں۔ تمہاری ماں کے انتقال کے بعد تمہارے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی اور سوتیلی ماں تمہاری دشمن ہے۔ لہٰذا جب شاہ نواز نے تمہیں اپنی محبت کی شکل میں روشنی کی کرن دکھائی تو تم اس کے ساتھ اپنے گھر سے بھاگنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے ناساعد گھریلو حالات کی تفصیلات کیا ہیں؟"

"وکیل صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنی ماں کی موت کا یقین ہی نہیں۔" سائرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ "وہ اچانک کہیں غائب ہو گئی تھی۔ پھر چند روز کے بعد چھوٹی نہر سے کسی عورت کی مسخ شدہ لاش برآمد ہوئی۔ اس عورت کے بدن پر میری ماں کا لباس تھا لہٰذا یہی سمجھا گیا کہ وہ میری ماں مختاراں بی بی ہے۔ مذکورہ لاش کا چہرہ اس قدر خراب ہو رہا تھا کہ پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ اس لاش کو میری ماں کی لاش کی حیثیت سے دفن کر دیا گیا۔ پورے گاؤں میں یہی مشہور ہے کہ میری ماں نے نہر میں کود کر

خودکشی کی تھی اور نہر کے اندر موجود پتھروں سے ٹکرا کر اس کا چہرہ بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اتنا خراب کہ اس کی پہچان ممکن نہیں رہی تھی۔''

''اور اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد تمہارے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی؟'' سائرہ خاموش ہوئی تو میں نے سوال داغ دیا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ابھی میری ماں کی پہلی برسی بھی نہیں ہوئی تھی کہ بابا نے ممتاز نامی ایک عورت سے شادی کر لی۔''

''یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟''

''بابا نے دو سال پہلے مختار سے شادی کی تھی۔'' سائرہ نے بتایا۔ ''اور اس سے لگ بھگ ایک سال پہلے میری ماں مختار بی بی کو سپردخاک کیا گیا تھا۔''

''اور تمہیں شک ہے کہ جس مسخ شدہ چہرے والی عورت کو تمہاری ماں کی حیثیت سے دفن کیا گیا تھا، وہ تمہاری ماں نہیں تھی؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

''شک نہیں، مجھے یقین ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''تم نے اپنے اس ''یقین'' کو احتجاج کی شکل نہیں دی تھی؟''

''آپ شاید گاؤں گوٹھ کی زندگی سے واقف نہیں ہیں وکیل صاحب!'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''وہاں طاقت ور کے سامنے کمزور کو احتجاج کا کوئی حق نہیں ہے حتیٰ کہ طاقت کے معاملے میں پولیس بھی ہاتھ نہیں ڈالتی اور میرے بابا مراد شاہ سعید آباد کے ایک بااثر شخص ہیں اس لیے نہ تو میں کوئی احتجاج کر سکی اور نہ ہی پولیس نے ماں کی خودکشی والے معاملے کو اٹھانے کی کوشش کی۔''

''ویری گڈ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

''جی...... کیا مطلب؟'' سائرہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''میرا مطلب ہے کہ تم دونوں کی بچت اور باعزت رہائی کا ایک راستہ مل گیا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تم لوگ وہی کرو گے جو میں تمہیں سمجھاؤں گا۔ بولو، منظور ہے؟''

وہ بیک زبان ہو کر بولے۔ ''ہمیں منظور ہے وکیل صاحب......!''

''تم پیار، محبت، رومانس، عشق اور شادی...... ہر چیز کو ذہن سے کھرچ کر باہر پھینک دو گے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان کی جگہ جو کہانی میں تم...... دونوں کو ذہن نشین کراؤں گا تم اسی کے مطابق اپنی زبانوں کو حرکت دو گے......''

''ہمیں آپ کی ہر بات منظور ہے وکیل صاحب!'' شاہ نواز اضطراری لہجے میں بولا۔ ''بتائیں، آخر ہمیں کرنا کیا ہوگا؟''

میں معنی خیز انداز میں اپنے ذہن میں ترتیب پانے والے فوری منصوبے سے انہیں آگاہ کرنے لگا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ میں نے اپنے وکالت ناموں کے ساتھ ہی دونوں کی ضمانت کے حوالے سے درخواستیں بھی دائر کر دیں۔ یہ کیس مجسٹریٹ کی عدالت میں لگا تھا اور وکیل استغاثہ پوری تیاری کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ اس نے ملزمان کی ضمانت رکوانے کی غرض سے بولنا شروع کیا۔

''جناب عالی! یہ معاملہ خاصا سنجیدہ اور سنگین ہے۔ شاہ نواز نامی یہ شخص سائرہ کو اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں سعید آباد سے اغوا کر کے کراچی لایا ہے لہٰذا ان کی ضمانت کی درخواست منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔''

''جناب عالی! استغاثہ کا موقف انتہائی بودا اور مبنی بر دروغ ہے۔'' میں نے اپنے مؤکلین کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ''سائرہ اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ اگر شاہ نواز اسے اغوا کر کے کراچی لایا ہے تو اس سے پوچھا جا سکتا ہے۔''

مجسٹریٹ نے گہری نظر سے اکیوزڈ باکس میں کھڑی سائرہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بی بی! تم اس معاملے میں کیا کہتی ہو؟ کیا یہ شخص واقعی تمہیں اغوا کر کے سعید آباد سے کراچی لایا ہے؟'' بات کے اختتام پر مجسٹریٹ نے شاہ نواز کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

''نہیں سر......!'' سائرہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں شاہ نواز کے ساتھ اپنی مرضی سے کراچی آئی ہوں۔''

میں نے حوالات میں طویل ملاقات کے دوران میں ان دونوں کو جو مفید پٹیاں پڑھائی تھیں، وہ اسی کی روشنی میں بات کر رہی تھی اور میری ہدایات پر عمل کرنا ہی ان کے حق میں تھا۔ یہ وقت اور حالات کا تقاضا تھا۔

''یور آنر! یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''میری سعید آباد کے پولیس اسٹیشن پر بات ہو چکی ہے۔ اس تھانے میں اس

لڑکی کے باپ مراد شاہ نے اغوا کی رپورٹ درج کرائی ہے اور اغوا کار کے خانے میں شاہ نواز کا نام لکھوایا ہے۔''

''جناب عالی! یہ سب کچھ ایک غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ حقیقت وہی ہے جو سائرہ نے بیان کی ہے۔''

''جی سر! وکیل صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' سائرہ جلدی سے بولی۔ ''مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا۔ میں اپنی مرضی سے یہاں آئی ہوں۔''

''بی بی! اگر شاہ نواز تمہیں اغوا کر کے سعید آباد سے کراچی نہیں لایا تو پھر تمہارے آبائی گاؤں کے تھانے میں، تمہارے اغوا کی رپورٹ کیوں درج کرائی گئی ہے؟'' مجسٹریٹ سائرہ سے مستفسر ہوا۔ ''اس کا تو ایک ہی مطلب ہے کہ تم اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر کراچی چلی آئی ہو۔ ہیں نا......؟''

''جی سر! یہ بات درست ہے۔'' سائرہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کیوں......؟'' مجسٹریٹ نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تم اپنے گھر والوں کے علم میں لائے بغیر ایک نامحرم کے ہمراہ کراچی کیوں چلی آئیں؟''

''اگر میں گھر والوں کو بتاتی تو وہ مجھے کراچی آنے کی اجازت نہیں دیتے۔'' سائرہ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''جناب عالی!'' میں نے سائرہ کی حمایت میں بولنا شروع کیا۔ ''سائرہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ اپنی مرضی سے ایک خاص مقصد کی خاطر، شاہ نواز کے ساتھ کراچی آئی ہے۔ اگر یہ اپنے گھر والوں کو اس مقصد سے آگاہ کر دیتی تو اس کا باپ مراد شاہ اسے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالنے دیتا۔ شاہ نواز ایک باکردار اور شریف النفس انسان ہے جو ایک نیک مقصد کی تکمیل کے لیے سائرہ کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر کراچی پہنچ کر یہ پے در پے مشکلات کا شکار ہوتے چلے گئے اور اسی پریشانی میں بالآخر پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ یہ نہ تو عشق معشوقی والا معاملہ ہے اور نہ ہی اغوا کا کیس...... اور نہ ہی یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ ان کے بیچ صرف اور صرف ہمدردی اور انسانیت کا رشتہ ہے اور مناسب وقت آنے پر میں اس بات کو ثابت بھی کر دوں گا۔''

''یور آنر! ہوٹل کا رجسٹر انہیں میاں بیوی ظاہر کرتا ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''یہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے کینٹ اسٹیشن کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ دونوں ایک ہی کمرے میں سوتے رہے ہیں۔ ہوٹل کا عملہ بھی اس بات کا گواہ ہے کہ یہ میاں بیوی ہی کی طرح آپس میں بات چیت بھی کرتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بہ دستور تیز آواز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''سب سے اہم اور چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ پولیس نے ان دونوں کو ایک فیملی پارک میں فحش حرکات کرتے دیکھ کر گرفتار کیا تھا۔ اگر یہ دونوں شریف النفس انسان ہیں اور ان کے بیچ کوئی رشتہ نہیں ہے تو پھر ان کا ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں قیام کیا معنی رکھتا ہے اور فیملی پارک میں بیٹھ کر سرعام نازیبا حرکتیں کرنے کا کیا مقصد ہے......؟''

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ اپنے دلائل دے کر خاموش ہوا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جیسا کہ میں نے عرض کیا، ایک ساتھ ہوٹل کے کمرے میں قیام ان دونوں کی مجبوری تھی۔ سائرہ جس نیک مقصد کی خاطر، شاہ نواز کے ہمراہ سعید آباد سے کراچی پہنچی ہے، اسے حاصل کیے بغیر واپس نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے انہیں ہوٹل میں قیام کرنا پڑا۔ اگر یہ دونوں الگ الگ کمروں میں ٹھہرنے کی کوشش کرتے تو سائرہ کے لیے یقیناً ایک پریشانی اٹھ کھڑی ہوتی۔ کسی اکیلی لڑکی کے لیے اور وہ بھی دوسرے شہر کے ہوٹل میں کمرا حاصل کر کے قیام کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ چنانچہ یہ دونوں ایک ہی کمرے میں ٹھہرنے پر مجبور تھے اور جہاں تک فیملی پارک سے ان کی گرفتاری کا تعلق ہے تو......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بڑے سنجیدہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو...... میں سمجھتا ہوں کہ یہ پولیس کی زیادتی ہے۔ انہیں بغیر کسی جرم کے بلاجواز گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ اپنی پریشانی میں فیملی پارک کی ایک بینچ پر بیٹھے سوچ بچار کر رہے تھے کہ پولیس نے انہیں فحش حرکات کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا۔ بعدازاں جب پولیس کو پتا چلا کہ ان کے بیچ کوئی رشتہ نہیں اور یہ دونوں کینٹ اسٹیشن کے ایک ہوٹل میں، ایک ساتھ ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو ان پر بدکاری اور بے حیائی وغیرہ کے الزامات بھی تھوپ دیے گئے۔ شاہ نواز ایک شریف النفس انسان ہے جبھی سائرہ اس پر بھروسا کر کے سعید آباد سے کراچی چلی آئی تھی۔ پولیس چونکہ پردیسیوں اور بے سہارا لوگوں کو گھیرنے اور تنگ کرنے کی ماہر ہے اور یہ دونوں شکل ہی سے مسافر اور پردیسی نظر آتے ہیں اس لیے ان بے چاروں

کو فیملی پارک سے پکڑ کر تھانے کی حوالات میں بند کر دیا۔ حوالات میں، ریمانڈ کی مدت کے دوران میں پولیس نے ان سے رشوت میں ایک بھاری رقم کا مطالبہ بھی کیا تھا اور یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اگر یہ پولیس کا تقاضا پورا کر دیں تو ان پر بہت ہلکی دفعہ لگائی جائے گی جس کی وجہ سے یہ ایک ہی پیشی میں چھوٹ جائیں گے۔ ظاہر ہے، یہ پولیس کا مطالبہ پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے اس لیے ان کے خلاف سنگین چالان تیار کر کے انہیں حوالۂ عدالت کیا گیا ہے۔ میں معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ ان پردیسیوں کی ضمانتیں منظور کی جائیں۔ یہ دونوں پولیس کی تحویل میں پہلے ہی بہت زیادہ ذہنی اذیت سہہ چکے ہیں۔''

''جناب عالی! اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ یہ دونوں نامحرم ہونے کے باوجود بھی ہوٹل کے ایک کمرے میں ایک ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اور اس امر کے نصف درجن گواہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔'' وکیلِ استغاثہ نے ضمانت کے خلاف دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ''فیملی پارک میں سے بھی انہیں نازیبا حرکات کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ادھر سعید آباد کے تھانے میں سائرہ کے باپ نے اس کے اغوا کی رپورٹ درج کرا رکھی ہے جس میں اغوا کار کی حیثیت سے شاہ نواز کا نام لکھوایا گیا ہے لہٰذا ان دونوں کی ضمانت منظور کرنا کسی بھی طور مناسب نہیں......'' پھر اس نے انگلی سے میری جانب اشارہ کیا اور مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''یور آنر! میرے فاضل دوست نے دو تین بار ملزمان کی کسی مجبوری کا ذکر تو کیا ہے لیکن اس مجبوری کی وضاحت نہیں کی جس کی بنا پر سائرہ اپنے گھر والوں کے علم میں لائے بغیر ایک نامحرم مرد کے ساتھ سعید آباد سے کراچی پہنچی تھی؟''

''وکیل صاحب!'' مجسٹریٹ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''آپ کس مجبوری کی بات کر رہے ہیں؟''

''جناب عالی!'' میں نے متحمل انداز میں کہا۔ ''جیسا کہ استغاثہ کی طرف سے ملزمان کی ضمانت رکوانے کے لیے سائرہ کے اغوا کی رپورٹ کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے، میرے فاضل دوست نے اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہوگا۔ سعید آباد کے تھانے میں سائرہ کے باپ مراد شاہ نے اس کے اغوا کی رپورٹ درج کرائی ہوگی جس میں شاہ نواز کو نامزد کیا گیا ہوگا۔ اسی بنا پر...... اسی بنا پر جناب عالی! میں سردست اس مجبوری کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے خدشہ ہے کہ اگر سائرہ کی ''مجبوری'' کیس کی باقاعدہ سماعت سے پہلے ہی منظرِ عام پر آ گئی تو اس کے ''مقصد'' کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ مراد شاہ سائرہ کے مقصد کی تکمیل نہیں چاہتا......'' تھوڑی دیر کو رک کر میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''میں معزز عدالت سے وعدہ کرتا ہوں کہ جیسے ہی عدالتی کارروائی آگے بڑھے گی، میں سائرہ کی مجبوری کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کروں گا۔''

وکیل استغاثہ نے ایک مرتبہ پھر بڑھ چڑھ کر ضمانت کے خلاف دلائل دینا شروع کیے جس میں ایک ساتھ دو نامحرم کا ہوٹل میں میاں بیوی کی حیثیت سے ٹھہرنا اور فیملی پارک میں سرِعام فحش حرکات کرنے کا ذکر زیادہ تھا۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

''جناب عالی! سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر سائرہ اور شاہ نواز میاں بیوی کی حیثیت سے ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ہوٹل کا عملہ انہیں میاں بیوی ہی سمجھتا تھا تو پھر ہر قسم کی اچھی بری حرکات کے لیے انہیں ہوٹل کا کمرا میسر تھا۔ انہیں اس بات کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ہوٹل کے محفوظ کمرے کو چھوڑ کر فیملی پارک میں سرِعام نازیبا اور فحش حرکات کرتے۔''

مزید آدھے گھنٹے تک مجسٹریٹ ہم دونوں کے دلائل سنتا رہا۔ سعید آباد کے تھانے میں سائرہ کے اغوا کی رپورٹ نے کام خراب کر دیا تھا۔ اگر شاہ نواز کے خلاف وہاں سائرہ کے اغوا کی رپورٹ درج نہ ہوئی ہوتی تو میں اپنے مؤکلین کو بہ آسانی ضمانت پر رہا کروا لیتا لیکن موجودہ صورتِ حال میں مجھے خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی اور مجسٹریٹ نے دونوں ملزمان کو جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت نے پولیس کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ اس کیس کے باقی ماندہ امور کو بھی جلد از جلد نمٹانے کی کوشش کرے، خاص طور پر آئندہ پیشی پر سائرہ کے اغوا کی رپورٹ کے حوالے سے متعلقہ تھانے سے مکمل معلومات حاصل کی جائیں اور ہو سکے تو سائرہ کے باپ مدعی مراد شاہ کو بھی عدالت میں حاضر کرنے کے انتظامات کرے۔

مجسٹریٹ کی یہ ہدایات میری حمایت میں جاتی تھیں۔ میں اپنے مؤکلین کی باعزت بریت کے لیے آگے چل کر جو کچھ کرنا چاہتا تھا، اس کے نتیجے میں مراد شاہ کو کراچی بلانا ضروری تھا اور یہ کام غیر محسوس انداز میں خود بخود ہونے

والا تھا۔

آئندہ پیشی ایک ہفتے بعد تھی۔

☆☆☆

جب میں کسی کیس کے سلسلے میں اپنی تحقیق اور تفتیش مکمل کر کے اہم نکات اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہوں تو مجھے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کیس کے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ دونوں ملزمان کا وکیل میں ہی تھا۔ معظم صدیقی صاحب نے یہ کیس اس بنا پر میرے سپرد کیا تھا کہ اگر میں شاہ نواز اور سائرہ کو بے گناہ محسوس کروں تو انہیں پولیس کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کروں لیکن جب تک میں ان دونوں پردیسیوں تک رسائی حاصل کرتا، یہ معاملہ پولیس کے ہاتھ سے نکل کر عدالت کے کمرے تک جا چکا تھا۔ بہرحال سائرہ اور شاہ نواز نے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے ساری بات سچ سچ بتا دی تھی۔ وہ سعید آباد سے کس مقصد کی تکمیل کی خاطر کراچی پہنچے تھے، یہ تفصیل پیچھے بیان کی جا چکی ہے تاہم آگے چل کر آپ جو کچھ دیکھیں، پڑھیں اور سنیں گے، وہ اس سے مختلف ہوگا۔ یعنی اسے ”سچا جھوٹ“ یا پھر ”جھوٹا سچ“ کہہ سکتے ہیں۔ بعض اوقات کسی پیچیدہ وضع کے برتن میں سے گھی نکالنے کے لیے انگلی کو ٹیڑھا کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس کیس میں دونوں ملزمان کے بیانات اور ان کے اعتماد کو خصوصی اہمیت حاصل تھی اور مجھے امید تھی کہ وہ میری ہدایات کو نظرانداز نہیں کریں گے۔

مجسٹریٹ کرسیِ انصاف پر آکر بیٹھا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ مجسٹریٹ نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ دونوں ملزمان نے باری باری صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان دونوں کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔

یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ سائرہ اور شاہ نواز نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ وہی نپا تلا بیان دیا تھا جس کی میں نے انہیں ہدایت کر رکھی تھی۔

بیانات ریکارڈ ہو جانے کے بعد وکیلِ استغاثہ نے باری باری دونوں ملزمان پر کڑی جرح کی اور چند سوالات مختلف زاویوں سے گھما پھرا کر کیے تاہم وہ دونوں بڑی دلیری کے ساتھ وکیلِ مخالف کے سامنے ڈٹے رہے اور میری بتائی ہوئی راہ سے ایک انچ ادھر ادھر ہٹنے کی غلطی نہیں کی۔ اپنی باری پر میں اکیوزڈ باکس کے قریب پہنچ گیا۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا کہ اس پیشی پر سعید آباد سے دونوں ملزمان کے ورثا بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ متعلقہ تھانے کی پولیس نے جب سعید آباد پولیس کو آگاہ کیا تھا کہ وہاں سے اغوا ہونے والی لڑکی سائرہ اور مبینہ اغوا کار شاہ نواز کو کراچی میں گرفتار کر لیا گیا ہے تو یہ خبر ان دونوں کے ورثا تک بھی پہنچی تھی چنانچہ اس پیشی پر وہ عدالت میں موجود تھے۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی۔

میں نے سب سے پہلے اپنے مؤکل شاہ نواز سے سوالات کا آغاز کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”شاہ نواز! تم سائرہ کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟“

”جناب وکیل صاحب!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں اس لیے یہی کہوں گا کہ میں اسے شروع ہی سے جانتا ہوں۔“

”جاننے سے میری مراد ہے، بات چیت......!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ظاہر ہے، جب تم دونوں کا تعلق سعید آباد سے ہے تو تم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہی ہو گے۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ تم دونوں میں میل ملاپ اور بات چیت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا تھا؟“

”جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ ہم دونوں کے بیچ میل ملاپ کا سلسلہ نہ تو کبھی تھا اور نہ ہے۔“ وہ معصومیت سے بولا۔ ”ہاں کچھ عرصے سے بات چیت ہونے لگی تھی۔“

”کتنے عرصے سے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”یہی کوئی سال بھر سے......!“ اس نے جواب دیا۔

”سال بھر ہی سے کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”یہ وجہ خاص ہے یا نہیں، میں نہیں جانتا۔“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ”لیکن جب سے میں نے دیکھا کہ سائرہ ملول اور غم زدہ رہنے لگی ہے، میں اس کی طرف مائل ہوا۔ اس کی افسردگی کو دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوتا تھا۔ میں نے جب اس سے بات چیت کا آغاز کیا تو اس کی طرف سے بھی تعاون کا مظاہرہ ہوا...... اس طرح ہم دونوں میں گاہے بگاہے بات چیت کا سلسلہ چل نکلا۔“

”سائرہ اداس اور ملول رہنے لگی تھی۔“ میں نے ملزم شاہ نواز کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”اس افسردگی اور غم زدگی کا کوئی سبب بھی یقیناً ہوگا......؟“

”جی ہاں......!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”کیا سبب تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کی مائیں......!“ اس نے گہری سنجیدگی سے

جواب دیا۔

''ماں ......!'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''میں سائرہ کی سوتیلی اور سگی ماں کا ذکر کر رہا ہوں سر!''

''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ سائرہ کے باپ مراد شاہ نے دو شادیاں کر رکھی ہیں؟'' میں نے ڈرامائی انداز کو جاری رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''رکھی تھیں۔'' وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''مگر اس وقت سائرہ کی ایک ہی ماں باقی ہے...... میرا مطلب ہے، سوتیلی ماں ممتاز۔ اس کی سگی ماں مختار بی بی کا تین سال پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ مختار بی بی کی وفات کے ایک سال بعد ہی یعنی دو سال پہلے مراد شاہ نے ممتاز سے شادی کر لی تھی......'' وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اپنی ماں کی جدائی نے سائرہ کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کو سنبھلنے میں پورا ایک سال لگا تھا۔ پھر مراد شاہ نے دوسری شادی کر لی۔ ابتدا میں کچھ عرصہ سائرہ اور ممتاز میں تعلقات کشیدہ رہے پھر مراد شاہ کے سمجھانے بجھانے پر معاملات نارمل ہو گئے لیکن سائرہ کو اس بات کا بڑی شدت کے ساتھ ہمیشہ یہ احساس رہا کہ ممتاز اس کو بالکل پسند نہیں کرتی اور یہ کہ اکثر معاملات میں مراد شاہ بھی ممتاز ہی کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ کھل کر نہ تو اپنی سوتیلی ماں کا مقابلہ کرنے کے قابل تھی اور نہ ہی باپ کی طرف سے اسے کسی انصاف کی امید تھی۔ لہٰذا وہ اندر ہی اندر گھٹنے لگی۔ اس کی ذہنی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی، انہی دنوں میری اس سے بات چیت شروع ہوئی تھی......''

''ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ سوتیلی ماں ممتاز سائرہ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتی؟''

''جی ہاں...... میرا یہی مطلب ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے اپنے مؤکلین کے حق میں راہ ہموار کرنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''سائرہ کی ماں کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟''

''ممتاز بی بی نے خودکشی کی تھی......'' اس نے بتایا۔

''خودکشی!'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے، سائرہ کی ماں کی طبعی موت نہیں ہوئی تھی؟''

''جی ہاں...... میرا یہی مطلب ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''عام تاثر یہی ہے کہ مختار بی بی نے نہر میں چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دی تھی۔ گاؤں کی نہر سے اس کی مسخ شدہ لاش برآمد ہوئی تھی۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ عام تاثر یہی ہے کہ سائرہ کی ماں نے گاؤں کی نہر میں کود کر خودکشی کی تھی۔ کیا حقیقت بھی یہی ہے؟''

''حقیقت کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے وکیل صاحب!'' وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ''البتہ سائرہ کو اس کہانی پر یقین نہیں ہے۔''

''وہ کیا کہتی ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اس کا خیال ہے کہ مختار بی بی نے خودکشی نہیں کی تھی۔'' شاہ نواز نے بتایا۔ ''بلکہ اسے ایک منصوبے کے تحت قتل کر کے نہر میں پھینکا گیا تھا۔''

''اپنی ماں کے قاتل کی حیثیت سے سائرہ کو کس پر شک ہے؟''

''اس معاملے میں اس کا ذہن کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہے۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس سلسلے میں، میں سائرہ ہی سے سوال کروں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے بھی تمہارا کراچی میں آنا ہوا ہے۔''

''جی ہاں، دو تین مہینے میں ایک چکر لگ جاتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کس سلسلے میں......'' میں نے پوچھا۔ ''یہ چکر کاروباری نوعیت کا ہوتا ہے یا محض سیر و تفریح؟''

''سیر و تفریح جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم تو کھیتی باڑی کرنے والے دیہاتی لوگ ہیں۔''

''تم جب بھی کراچی آتے ہو تو کیا کینٹ اسٹیشن پر واقع ہوٹلوں ہی میں رکتے ہو...... مطلب یہ کہ تمہارا قیام ہوٹل وغیرہ ہی میں ہوتا ہے؟''

''نہیں جناب......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہوٹل میں ٹھہرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس سے پہلے میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا کرتا تھا۔''

''دوست......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے اس دوست کا نام کیا ہے اور وہ کہاں رہتا ہے؟''

''اس کا نام امتیاز ہے جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ کینٹ بازار ڈرگ روڈ پر رہتا تھا۔''

”رہتا تھا...... کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”جناب! اس بار جب میں کراچی آیا تو میں نے سائرہ کے ساتھ سیدھا ڈرگ روڈ ہی کا رخ کیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ امتیاز نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے......“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے قطع کلامی کی۔ ”کیا تمہارا وہ دوست اکیلا ہی رہتا تھا یا اس کی فیملی بھی ساتھ تھی؟“

”نہیں جناب۔ اس کی فیملی تو اندرونِ سندھ میں ہے۔“ وہ اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے میرے سوال کے جواب میں بتانے لگا۔ ”کراچی میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ جب مجھے پتا چلا کہ اس نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے اور اس کے آس پاس والوں کو پتا نہیں کہ وہ گیا کہاں ہے تو میں سیدھا صدر میں اس دکان پر پہنچا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ دکان کے مالک نے مجھے بتایا کہ ایک ماہ پہلے وہ کام چھوڑ کر جاچکا ہے۔ اس صورتِ حال نے ہم دونوں کو پریشان کر دیا اور مجبوراً ہمیں کینٹ اسٹیشن پر ایک ہوٹل میں قیام کرنا پڑا کیونکہ......“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”کیونکہ جس مقصد کی خاطر میں سائرہ کو سعید آباد سے لے کر کراچی پہنچا تھا، اس کو حاصل کیے بغیر واپسی ممکن نہیں تھی۔“

”مقصد کی خاطر......“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ تم دونوں کس مقصد کے حصول کے لیے سعید آباد سے کراچی پہنچے تھے؟“

”جناب! دراصل بات یہ ہے کہ......“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پچھلی دفعہ جب میں کراچی آیا تھا تو میں نے صدر میں ایک عجیب منظر دیکھا تھا اور وہ عجیب منظر تھا، مختار بی بی کا......“

”مختار بی بی؟“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ ”تمہارا مطلب ہے، سائرہ کی سگی ماں......“

”جی ہاں!“ وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

”لیکن مختار بی بی نے تو تین سال پہلے نہر میں کود کر خودکشی کر لی تھی؟“ میں نے بہ آوازِ بلند استفسار کیا۔

”میں بھی یہی سمجھتا تھا۔“ وہ بڑی رسان سے بولا۔ ”اسی لیے جب میں نے اسے کراچی میں ایک مخبوط الحواس بھکارن کے روپ میں دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ پہلے میں نے سمجھا کہ میری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ میں نے کئی بار پلکیں جھپکائیں لیکن آنکھوں کے سامنے کی حقیقت میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ وہ ہوبہو مختار بی بی ہی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ عمر رسیدہ نظر آتی تھی۔ اس کا حلیہ بھی خاصا خراب ہو چکا تھا جیسا کہ عام طور پر بھکاریوں کا ہوتا ہے اور وہ بھکارن ہونے کے ساتھ ہی نیم پاگل بھی تھی۔ بھیک کے لیے ہر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتی تھی۔ بھیک ملے یا نہ ملے، وہ خاموشی سے آگے بڑھ جاتی تھی۔ میں کافی دیر تک اسے دیکھتا اور سوچتا رہا۔ بالآخر میرے ذہن نے فیصلہ کیا کہ وہ مختار بی بی ہی ہے۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے کے مشاہدے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ صدر کے ایک مخصوص ایریا ہی میں چکراتی اور بھیک مانگتی پھر رہی ہے اور یہ ایریا تھا، ایمپریس مارکیٹ کے سامنے بسوں کا اڈا......“

”اوہ......!“ میں نے ایک متاسفانہ سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”یہ معلوم ہونے کے بعد کہ سائرہ کی ماں مختار بی بی ایک بھکارن کے روپ میں صدر کے علاقے میں بھیک مانگتی پھر رہی ہے، تم نے کیا اقدام کیا؟“

”میں نے پہلی فرصت میں واپس سعید آباد جانے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ سائرہ کو اس سنگین صورتِ حال سے آگاہ کرسکوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور میں الٹے قدموں واپس چلا گیا تھا۔“

”الٹے قدموں......“ میں نے اسی کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ”یعنی اس بار تم اپنے دوست سے بھی نہیں ملے تھے؟“

”جی ہاں، ایسا ہی ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ میں پہلی فرصت میں سائرہ کو یہ اطلاع دینا چاہتا تھا کہ اس کی ماں مختار بی بی زندہ ہے اور وہ کراچی میں بھیک مانگتی پھر رہی ہے۔“

”تم کراچی سے فوراً سعید آباد پہنچے اور سائرہ کو اس کی ماں کے بارے میں بتایا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اس موقع پر سائرہ کے تاثرات کیا تھے؟“

”اسے فوراً ہی میری بات کا یقین آگیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور وہ اپنی ماں کو دیکھنے کے لیے مچل گئی تھی۔ وہ تو اسی لمحے اڑ کر کراچی آنا چاہتی تھی لیکن ایسا چونکہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسے سمجھایا تو بات اس کی سمجھ میں آگئی چنانچہ، ہم دو تین روز کے بعد چپ چاپ کسی کو بتائے

بغیر سعید آباد سے کراچی آگئے۔''
''کیا کراچی آکر تم نے سائرہ کو اس کی ماں سے ملوا دیا تھا؟''
''نہیں جناب! ایسا ممکن نہیں ہوسکا۔'' وہ مایوسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کاش! ایسا ہوجاتا تو آج ہم اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے......'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور لحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
''کراچی پہنچتے ہی ہم پے در پے مشکلات کا شکار ہوتے چلے گئے۔ ہم سیدھے صدر کے علاقے میں آئے تھے لیکن مختار بی بی مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے ایمپریس مارکیٹ کے آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نے نگل لیا ہو۔ دو گھنٹے کی تلاش بسیار کے بعد بھی جب ہمیں مختار بی بی کہیں دکھائی نہ دی تو میں تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ اس وقت تک شام بھی ہونے لگی تھی۔ سائرہ کو مجھ پر شک بھی ہوا کہ شاید میں نے اس سے غلط بیانی کی ہے لیکن جلد ہی میں اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا کہ میں نے اس کے ساتھ کوئی فریب یا فراڈ نہیں کیا۔ میرا دوست امتیاز صدر میں ایک ہیئر ڈریسر کے پاس کام کرتا تھا اور اتفاق سے اس دن ہیئر ڈریسرز کی ہفتہ وار چھٹی تھی لہٰذا مذکورہ دکان کو بند پاکر میں نے سائرہ کے ساتھ ڈرگ روڈ کا رخ کیا تا کہ رات تو کسی محفوظ مقام پر گزار لی جائے، کل کی کل دیکھیں گے۔ جب ہم ڈرگ روڈ کینٹ بازار میں پہنچے تو ایک اور بجلی ہم پر گرنے کی منتظر تھی۔ میرا دوست امتیاز وہ گھر چھوڑ کر کہیں جاچکا تھا۔ کہاں؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ جب کوئی راستہ نظر نہ آیا تو ہمیں مجبوراً کینٹ اسٹیشن پر ایک ہوٹل میں قیام کرنا پڑا۔ اگلے روز ہم دوبارہ صدر پہنچے۔ سب سے پہلے میں ہیئر ڈریسر کی دکان پر پہنچا اور وہاں سے معلوم ہوا کہ امتیاز لگ بھگ ایک ماہ پہلے کام چھوڑ کر جاچکا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والوں سے امتیاز کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ وہ پورا دن ہم نے ایمپریس مارکیٹ کے سامنے اس بس اسٹاپ کے مخصوص ایریا اور اس کے اردگرد کے علاقے میں مختار بی بی کو تلاش کرتے ہوئے گزار دیا۔ تھک ہار کر رات کو واپس ہوٹل آگئے۔ ہم سعید آباد سے کراچی تیس جولائی کو آئے تھے۔ اسی رات ہوٹل میں کمرا لیا۔ چوبیس اور پچیس جولائی کا پورا دن ہم مختار بی بی کی تلاش میں صدر کی خاک چھانتے رہے اور پچیس جولائی کی شام جب ہم ایک فیملی پارک میں بیٹھے اپنے حالات پر غور کررہے تھے تو پولیس نے ہمیں شکار کرلیا۔''
شاہ نواز نے اپنی داستانِ غم مکمل کی تو میں اسے چھوڑ کر سائرہ کی جانب بڑھ گیا۔ اس دوران میں وہ چپ چاپ کٹہرے میں کھڑی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور کرب کو بہ آسانی دیکھا اور پڑھا جاسکتا تھا۔ میں نے ان دونوں کو اس عذاب سے نکالنے کے لیے جو ڈراما رچایا تھا، وہ اس ڈرامے کے مرکزی کردار تھے اور مجھے خوشی اسی بات کی تھی کہ انہیں میں نے جو کچھ سمجھایا تھا انہوں نے ہوبہو اسی اسکرپٹ پر عمل کر دکھایا تھا۔
''سائرہ!'' میں نے اکیوزڈ باکس کے قریب آکر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''جب شاہ نواز نے تمہیں آکر بتایا کہ اس نے تمہاری ماں کو کراچی کے صدر میں بھیک مانگتے دیکھا ہے تو تمہیں کیسا لگا تھا؟''
''مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہوئی تھی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میرا دل چاہا تھا کہ میں ابھی اور اسی وقت اڑ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں۔''
''لیکن تمہاری ماں مختار بی بی کا تو تین سال پہلے انتقال ہوگیا تھا۔'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پھر تم نے کیسے یقین کرلیا کہ صدر کے علاقے میں، ایمپریس مارکیٹ کے سامنے بھیک مانگنے والی وہ نیم پاگل عورت تمہاری ہی ماں ہوگی؟''
''مجھے فوراً اس بات کا یقین اس لیے بھی آگیا تھا کہ میں اپنی ماں کی موت سے مطمئن نہیں تھی۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میری ماں زندہ ہے اور کہیں نہ کہیں بڑی مشکلات بھری زندگی گزار رہی ہے۔''
''ماں کی موت کا یقین کیوں نہیں تھا تمہیں؟'' میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ''جبکہ پورا سعید آباد اس بات کا گواہ ہے کہ تمہاری ماں نے نہر میں کود کر خودکشی کی تھی۔ اس کی لاش گاؤں کی نہر سے برآمد ہوئی تھی......؟''
''یقین نہ ہونے کی چند وجوہات ہیں وکیل صاحب!'' سائرہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ بولنا شروع کیا۔ ''آج سے لگ بھگ تین سال پہلے ایک رات اچانک میری ماں گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ ہم نے اسے پورے سعید آباد میں تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہ ملی پھر نہر میں سے اس کی لاش برآمد ہوگئی تھی۔ اس لاش کے بدن پر میری ماں کا لباس تھا لیکن چہرہ اور ہاتھ پاؤں اس قدر مسخ ہوگئے تھے کہ ماں کی پہچان ممکن نہیں رہی تھی۔ یہی تاثر لیا گیا کہ ماں نے

گھریلو حالات سے تنگ آکر خودکشی کرلی ہے۔''

''گھریلو حالات سے تنگ آکر کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے گھر میں ایسے حالات تھے کہ مختار بی بی کو نہر میں کود کر اپنی جان دینا پڑتی......؟''

''بظاہر تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''اور درپردہ......؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہونے کے باوجود بھی ماں کو ایک بڑا دکھ تھا۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''کیا اس دکھ کا تعلق مختار بی بی کی ازدواجی زندگی سے تھا؟'' میں نے قدم قدم اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی...... جی ہاں۔'' اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔ ''معزز عدالت تمہاری ماں کے اس دکھ کے بارے میں جاننا چاہتی ہے۔''

''میری ماں کو یقین کی حد تک شک تھا کہ بابا کسی اور عورت میں دلچسپی رکھتے ہیں۔'' وہ کرب ناک انداز میں بتانے لگی۔ ''اور بابا اس عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن ماں، بابا کے راستے کی دیوار تھی۔ بابا اتنی آسانی سے اس دیوار کو گرا کر اپنی خواہش پوری نہیں کر سکتے تھے۔''

''کہیں...... اس عورت کا نام...... ممتاز...... تو نہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وکیل صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔

''ہوں......!'' میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تو کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ تمہارے بابا مراد شاہ نے اپنے راستے کی دیوار گرانے کے بعد ممتاز سے شادی کی تھی......؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی اس لیے کوئی تبصرہ نہیں کروں گی۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''جو صورتِ حال تھی، وہ میں نے آپ کو بتادی ہے۔ نمبر ایک، مجھے بڑا مضبوط شک ہے کہ نہر میں سے جو لاش نکالی گئی تھی، وہ میری ماں کی لاش نہیں تھی۔ لاش کے بدن پر میری ماں کا لباس البتہ ضرور تھا۔ اس کو میری ماں کی لاش کی حیثیت سے گاؤں کے قبرستان میں دفن کردیا گیا لیکن ہر وقت مجھے یہ احساس رہتا تھا کہ میری ماں زندہ ہے اسی لیے جب شاہ نواز نے میری ماں کے حوالے سے خوش خبری سنائی تو مجھے اس کی بات کا یقین آگیا تھا۔ نمبر دو......!'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''نمبر دو...... ماں کے علاوہ مجھے بھی اس بات کا شک تھا کہ بابا کسی عورت کو میری ماں پر سوکن لانا چاہتے ہیں۔ میں ماں کے دکھ کو اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتی تھی پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ بابا نے ممتاز نامی عورت سے شادی کرلی۔ فطری بات ہے کہ میں ممتاز کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ بھی مجھے گھر میں برداشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔ دو سال اسی کشمکش اور رسا کشی میں گزر گئے۔ ہمارے درمیان آئے دن لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ ابتدا میں بابا ہم دونوں کو سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کرادیا کرتے تھے لیکن پھر میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ بابا میری سوتیلی ماں ممتاز کی سائڈ لینے لگے ہیں۔ بابا کے اس رویے نے میرے اندر سرکشی اور بغاوت کے جذبات کو جنم دیا چنانچہ جب شاہ نواز کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اس نے کراچی کے کسی علاقے میں میری ماں کو بڑی خستہ اور قابلِ رحم حالت میں دیکھا ہے تو میں بے چین ہوگئی اور اپنی ماں سے ملنے کے لیے میں کسی کو بتائے بغیر شاہ نواز کے ساتھ سعید آباد سے کراچی آگئی مگر میری قسمت خراب کہ ماں سے پھر بھی ملاقات نہ ہوسکی۔''

اس کی آواز میں نمی اتر آئی۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ''نمبر تین...... میں عدالت سے التجا کروں گی کہ اس کیس کے اختتام پر مجھے بابا کے حوالے نہ کیا جائے۔ میں نے عدالت میں جتنا کچھ بول لیا ہے، اس کے بعد وہ گھر میرے لیے کسی جہنم سے کم ثابت نہیں ہوگا۔ میں بھی اپنی ماں کی طرح کسی قبر میں دفن نہیں ہونا چاہتی۔''

آخری جملہ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ حالات کے تناظر میں اس کا ایک ہی مطلب نکلتا تھا کہ پہلے تو اسے اپنی ماں کی موت کا یقین ہی نہیں تھا اور اگر واقعی وہ گزر چکی تھی تو پھر سائرہ کے خیال میں مختار بی بی کو باقاعدہ قتل کیا گیا تھا اور وہ اپنی ماں کی طرح قتل نہیں ہونا چاہتی تھی۔

اب اس امر میں واقعی کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ عدالت سے رہائی کے بعد اگر وہ واپس اپنے گھر جاتی تو اس کی سوتیلی ماں سائرہ کی زندگی عذاب کر کے رکھ دیتی اور اس کا بابا مراد شاہ بھی اسے پھولوں کے بستر پر نہ بٹھاتا۔ اس نے آج عدالت میں جو بیان دیا تھا، وہ سراسر مراد شاہ کے خلاف جاتا تھا۔ اس بیان کی روشنی میں مراد شاہ کا چہرہ ایک قاتل کی حیثیت سے ابھرتا تھا۔ عین ممکن تھا، مگر

پہنچتے ہی وہ سائرہ کو زندہ گاڑ دیتا۔ میں بھی اسی بات کے حق میں تھا کہ اس صورتِ حال میں سائرہ کو اس گھر میں قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ انہی حقائق کے تناظر میں، میں نے اس سے پوچھ لیا۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ سائرہ...... اس کیس سے بری ہونے کے بعد تم کہاں جانا چاہو گی؟"

"شاہدہ کے پاس۔" اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"شاہدہ!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کون خاتون ہیں اور کہاں رہتی ہیں؟"

"شاہدہ بی بی میری چھوٹی خالہ ہیں جی۔" اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ بتایا۔ "وہ نواب شاہ میں رہتی ہیں۔ میرے خالو ایوب سونگی ایک سرکاری محکمے میں ملازم ہیں۔ میں سمجھتی ہوں، میں سب سے زیادہ انہی کے گھر میں محفوظ رہ سکتی ہوں۔"

میں نے سائرہ کو فارغ کرتے ہوئے روئے سخن مجسٹریٹ کی جانب موڑا اور بہ آوازِ بلند کہا۔ "جنابِ عالی! ملزمہ سائرہ نے اپنی حفاظت کے پیشِ نظر فیصلہ سنا دیا ہے۔ اس کے بیان کی روشنی میں نہ صرف یہ خود بلکہ اس کا ساتھی ملزم شاہ نواز بھی بے قصور اور بے گناہ نظر آتا ہے۔ شاہ نواز نے جو بھی قدم اٹھایا، وہ انسانی ہمدردی کے زمرے میں آتا ہے۔ سائرہ کا اقدام بھی اس کے غیر یقینی گھریلو حالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش تلاش کرنا ممکن نہیں۔ اس گھر میں واقعتاً ملزمہ سائرہ کو کئی قسم کے خطرات لاحق ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ سائرہ کی ماں مختار بی بی کے ساتھ ادھر سعید آباد میں کیا واقعہ پیش آیا۔ اس کی موت طبعی ہے یا یہ خودکشی کا کیس تھا اور یا پھر واقعی اسے قتل کیا گیا تھا۔ یہ تمام تر معاملات سعید آباد پولیس کے کھاتے ہیں۔ اس عدالت میں میرے مؤکلین کے خلاف جو کیس زیرِ سماعت ہے، اس کا خلاصہ سامنے آچکا ہے۔ سائرہ اور شاہ نواز نے جس مقصد کی خاطر سعید آباد سے کراچی تک کا سفر کیا، وہ پورا ہوا یا نہیں، میں اس مباحثے کو بھی نہیں کھولوں گا۔ بس......!" میں نے ذرا دیر کو رک کر حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر دوبارہ مجسٹریٹ کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"بس...... معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ موجودہ حالات و واقعات کی روشنی میں میرے مؤکلین کو باعزت بری کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں۔ دیٹس آل یور آنر......"

میرے خاموش ہونے کے بعد مجسٹریٹ کچھ دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لیتا رہا پھر دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!"

☆☆☆

گزشتہ پیشی پر دونوں ملزمان کے بیانات اور پھر ان پر میری جرح کے نتیجے میں جو صورتِ حال سامنے آئی تھی، اس کی روشنی میں مجھے اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ ان شاء اللہ! آئندہ پیشی فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ مذکورہ پیشی پر میرے مؤکلین کو باعزت بری کر دیا جائے گا۔

سائرہ نے اپنے گھر کو اپنے لیے غیر محفوظ بیان کر کے عدالت کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ویسے حالات بھی ایسے ہی نظر آرہے تھے کہ عدالتی معاملات سے رہائی پانے کے بعد اگر سائرہ اپنے گھر واپس گئی تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔ مراد شاہ، سائرہ کی ماں مختار بی بی کے قتل میں ملوث تھا یا نہیں یہ تو ایک الگ بحث تھی اور اس معاملے کو دیکھنا سعید آباد پولیس کا فرض بنتا تھا۔ اگر انہوں نے پچھلے دو سالوں میں اس طرف دھیان نہیں دیا تھا تو یقیناً اس سلسلے میں متحرک ہو سکتے تھے کیونکہ یہ ایشو اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مراد شاہ، سائرہ کا سگا باپ تھا اور اصولی طور پر سائرہ کو اسی کی کسٹڈی میں دیا جانا چاہیے تھا لیکن اس وقت جو حالات تھے۔ وہ اس بات کا تقاضا کرتے تھے کہ سائرہ کو کسی محفوظ مقام پر ٹھکانا کرنا چاہیے پھر سائرہ نے خود بھی عدالت سے اسی قسم کی استدعا کی تھی لہٰذا مجھے قوی امید تھی کہ آئندہ پیشی پر عدالت سائرہ کی پوزیشن کا احساس کرتے ہوئے اسے شاہدہ اور ایوب سونگی کی تحویل میں دے دے گی۔

میں نے آفس آکر صدیقی صاحب کو فون کیا اور انہیں تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے جوش بھرے انداز میں کہا۔

"مبارک ہو بیگ صاحب! میں محسوس کر رہا ہوں، آئندہ پیشی پر ہمارے حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "لیکن اس سلسلے میں کچھ پیچیدگیاں بھی ہیں۔"

"کیسی پیچیدگیاں بیگ صاحب!" ان کی حیرت سے لبریز آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ سچویشن دیکھ رہے ہیں نا......" میں نے گہری

سنجیدگی سے کہا۔ ''سائرہ نے عدالت سے مطالبہ کیا ہے کہ اس کیس کے اختتام پر اسے اس کے خالہ خالو کے حوالے کیا جائے۔ وہ اپنے باپ اور سوتیلی ماں کے پاس ہرگز ہرگز نہیں جانا چاہتی۔ اس کا خالو ادھر نواب شاہ میں کسی سرکاری محکمے میں ہے۔ سائرہ ان کے گھر میں خود کو محفوظ سمجھتی ہے۔''

''تو اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے بیگ صاحب!'' وہ معتدل انداز میں بولے۔ ''اگلی پیشی میں ابھی دس دن پڑے ہیں۔ آپ سائرہ سے اس کے خالو کا ایڈریس اور اس کے دفتر کا فون نمبر وغیرہ لے لیں۔ میں شاہدہ اور ایوب سولنگی کو کراچی بلانے کا بندوبست کردوں گا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جب عدالت شاہ نواز اور سائرہ کو باعزت بری کرے گی تو سائرہ کو اس کے خالہ خالو کے حوالے کردیں گے اور شاہ نواز خیر سے اپنے گھر چلا جائے گا۔ اللہ اللہ، خیر سلا!''

''میں آپ کو نواب شاہ والی پارٹی کا فون نمبر اور ایڈریس ارینج کردوں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ شاہدہ اور ایوب سولنگی کو آئندہ پیشی پر عدالت بلالیں مگر میرے ذہن میں کچھ اور الجھن ہے......''

''کیسی الجھن؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''ذرا کھل کر بتائیں......''

''صدیقی صاحب! میں چاہتا ہوں کہ رہائی کے فوراً بعد سائرہ کو اس کے خالہ خالو کی تحویل میں نہ دیا جائے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''سائرہ کا باپ مراد شاہ ایک طاقتور شخص ہے۔ عین ممکن ہے، وہ اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اپنی سالی اور ساڑھو کے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کردے۔ فوری طور پر سائرہ کا اندرونِ سندھ جانا مناسب نہیں۔''

''بات تو آپ کی دل کو لگ رہی ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولے۔ ''اس سلسلے میں، میں نے کچھ سوچ لیا ہے لیکن آپ کو بتاؤں گا نہیں۔ پہلے آپ بتائیں کہ کیا چاہتے ہیں؟''

''میں چاہتا ہوں کہ باعزت بریت کے بعد کچھ عرصے کے لیے سائرہ ادھر کراچی میں ہی رہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس سلسلے میں، میرے ذہن میں آپ کا نام ہے۔ آپ ایک فلاحی تنظیم کے روح رواں ہیں اور ایسے بہت سے سماجی بہبود کے اداروں سے آپ کے دوستانہ مراسم ہیں جہاں بے سہارا عورتیں اور لڑکیاں بحفاظت رہتی ہیں۔ میں سائرہ کو کچھ عرصے کے لیے کسی ایسے ہی ادارے میں رکھنا چاہتا ہوں۔''

''آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے بیگ

چلنا

ایک غائب دماغ پروفیسر سے اس کی بیوی نے کہا۔ ''پتا ہے اب منّا چلنے لگا ہے۔''

پروفیسر۔ ''کب سے؟''

بیوی۔ ''آٹھ دن ہو گئے۔''

پروفیسر۔ ''ارے تم مجھے اب بتا رہی ہو۔ اب تو وہ کافی دور نکل گیا ہوگا۔''

ہری مرچیں

مریض ڈاکٹر سے۔ ''کوئی لمبی عمر کا طریقہ بتاؤ۔''

ڈاکٹر۔ ''شادی کرلو۔''

مریض۔ ''کیا اس سے عمر لمبی ہو جائے گی؟''

ڈاکٹر۔ ''نہیں یہ شوق ختم ہو جائے گا۔''

مشکوک

ایک پولیس انسپکٹر کی شادی تھی۔ برات جارہی تھی اور وہ اپنے دوست کے ہمراہ کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے آنے والے براتیوں کی بس کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے دوست سے کہنے لگا۔ ''پیچھے جو بس آرہی ہے وہ مجھے مشکوک لگتی ہے۔ گھر سے یہاں تک برابر ہمارا پیچھا کررہی ہے۔''

مرسلہ۔ سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ

لمحہ فکر

استاد نے کلاس میں بچوں سے سوال کیا۔ ''یہ بتاؤ کہ وہ کون لوگ ہیں جو نماز نہیں پڑھتے؟''

پہلے بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''جو لوگ مرچکے ہیں۔''

دوسرے بچے نے جواب دیا۔ ''جن کو نماز پڑھنی نہیں آتی۔''

تیسرے نے جواب دیا۔ ''جناب! وہ لوگ جو مسلمان نہیں ہیں۔'' بچے تو جواب دے کر فارغ ہو گئے۔

مگر مجھے سوچنے پر لگا دیا کہ میرا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے؟ کیا میں مرچکا ہوں؟ کیا مجھے نماز نہیں آتی؟ یا میں مسلمان نہیں ہوں؟

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

صاحب!'' وہ مسرت بھرے لہجے میں بولے۔ ''لیکن کیا اس بات کے لیے سائرہ کے خالہ اور خالو راضی ہو جائیں گے؟''

''انہیں راضی کرنا میرا کام ہے۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آپ اپنی جانب کی ذمے داری اٹھائیں۔''

''ڈن......!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولے۔ ''آپ میری طرف سے ہر نوعیت کی پریشانی اور فکر کو بھول جائیں مگر ایک اور مسئلہ بھی حل طلب ہے۔''

''کون سا مسئلہ؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''یہ بات صرف ہم دونوں اور وہ دونوں یعنی سائرہ اور شاہ نواز ہی جانتے ہیں کہ وہ عشق کے جہاز پر سوار ہو کر سعید آباد سے کراچی پہنچے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کے خواہاں ہیں۔ سائرہ اپنے گھریلو حالات سے تنگ ہو کر گھر سے نکلی ہو یا شاہ نواز کی محبت سے مجبور ہو کر، اس بحث میں پڑے بغیر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک دوسرے کی چاہت میں پاگل ہیں۔ ہمارا فوکس اس وقت صرف سائرہ پر ہے۔ کیا یہ شاہ نواز کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی؟ اگر وہ رہا ہونے کے بعد سعید آباد جائے گا تو مراد شاہ اس کا جینا عذاب کر دے گا۔ وہاں کے تھانے میں ویسے بھی شاہ نواز کے خلاف سائرہ کے اغوا کی رپورٹ درج ہے۔ سائرہ کی بازیابی اور شاہ نواز کی باعزت بریت کے بعد اگرچہ اس رپورٹ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں رہتی مگر آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ چھوٹے گاؤں دیہات اور گوٹھوں میں بارسوخ افراد کا تھانوں پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ مراد شاہ، شاہ نواز کے لیے کوئی بھی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔''

''پہلی بات تو یہ کہ میرا فوکس صرف سائرہ پر نہیں ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''میں دونوں کو ایک جیسی سنجیدگی کے ساتھ لے رہا ہوں لہٰذا ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ ناانصافی یا زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ میں ان دونوں کے دلوں میں بھڑکنے والے محبت کے شعلوں کی آنچ کو بھی محسوس کر رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ وہ بہت جلد شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔ وہ عاقل بالغ ہیں۔ عدالت اور پاکستانی قانون انہیں شادی کا حق دیتا ہے اور ان دونوں کے حالات بھی اسی کے متقاضی ہیں مگر......'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

''اس وقت جو سچویشن ہے، اس میں سائرہ کے لیے سب سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ شاہ نواز ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے باپ اور سوتیلی ماں کے پاس جانے سے صاف انکار کر چکی ہے۔ اس نے خالہ اور خالو کے پاس جانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ہم اسے نواب شاہ ضرور بھیجیں گے مگر شاہ نواز کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنے کے بعد۔ جب وہ ایک مرد کی قانونی، اخلاقی اور شرعی پناہ میں چلی جائے گی تو پھر وہ کراچی میں رہے، سعید آباد یا نواب شاہ میں، اس کے لیے کوئی خطرے والی بات نہیں ہوگی۔''

''ایگریڈ......!'' معظم صدیقی میرے منصوبے کی تائید میں بولے۔ ''مگر اس سلسلے میں ہمیں شاہ نواز کے گھر والوں کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس شادی کے لیے تیار نہ ہوئے تو پھر کوئی سنگین مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا......'' لحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولے۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ شاہ نواز کا بڑا بھائی اور باپ کراچی پہنچ چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے مشورہ کرنا بھی ضروری ہے۔''

''آپ کو بالکل ٹھیک پتا چلا ہے اور آپ بالکل درست سمجھ رہے ہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک آدھ دن میں ان دونوں سے ملاقات کرنے والا ہوں۔ میں حالات کی نزاکت انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ اگر میری بات اور مشورہ ان کی کھوپڑی میں اتر گیا تو ٹھیک ورنہ وہ جانیں اور ان کا کام۔ دیکھیں صدیقی صاحب......!'' میں نے لحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''میں انہیں صرف سمجھا ہی سکتا ہوں، اپنا فیصلہ ان پر تھوپ نہیں سکتا۔ میرا کام اس وقت ختم ہو جائے گا جب عدالت سائرہ اور شاہ نواز کو باعزت بری کر دے گی۔ اس کے بعد میں اور آپ ان دونوں کے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے جو کچھ سوچ رہے ہیں، وہ دونوں پارٹیوں پر مسلط کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔''

''میں آپ کی بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں بیگ صاحب!'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولے۔ ''ہم صرف کوشش ہی کر سکتے ہیں، کسی کے نصیب کو بدلنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔''

اختتامی کلمات کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔

آئندہ روز تین افراد مجھ سے ملنے کے لیے میرے دفتر آئے۔ تینوں کی وضع قطع اور حلیوں سے لگتا تھا کہ ان کا

تعلق اندرونِ سندھ سے ہے۔ ان میں سے ایک جو باقی دونوں کا وڈیرا سائیں نظر آتا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔
''وکیل صاحب! میرا نام مراد شاہ ہے، سائرہ کا باپ مراد شاہ!''
میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ''جی شاہ جی...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں......؟''
''خدمت تو میں آپ کی کرنے آیا ہوں وکیل صاحب!'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''آپ نے پیشہ ورانہ مہارت سے میری بیٹی کا کیس لڑا ہے اور اب وہ رہا ہونے ہی والی ہے۔ یہ الگ بات کہ اس دوران میں آپ کی کوشش اور سائرہ کی حماقت نے میری راہ میں بہت سے کانٹے بچھا دیے ہیں۔''
مراد شاہ پکے رنگ کا مالک اور قوی الجثہ شخص تھا۔ عمر پچاس سے متجاوز اور چہرے پر مناسب سی ڈاڑھی۔ اس کی بول چال میں ایک خاص نوعیت کا تحکم پایا جاتا تھا۔ وہ ایک رعب داب والا اور غصیلا شخص نظر آتا تھا تاہم ابھی تک وہ ٹھنڈے لہجے ہی میں بات کر رہا تھا لیکن میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اگر کوئی اختلافی موضوع نکل آیا تو ہمارے درمیان گرما گرمی بھی ہوسکتی تھی اور میں ایسی بدمزگی ہرگز نہیں چاہتا تھا۔
''میں نے ان دونوں کی وکالت کے دوران میں جو کچھ کیا، وہ میرے پیشے کا تقاضا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے کہا۔ ''میرا مقصد صرف اور صرف انہیں باعزت بری کرانا تھا اور میں اپنے اس مقصد میں تقریباً کامیاب ہوچکا ہوں۔ اس کیس کی سماعت میں اگر چند تلخ حقائق نکل کر سامنے آگئے ہیں تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔''
''میں یہاں آپ کو دوشی ٹھہرانے نہیں آیا ہوں اس لیے ان وضاحتوں کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''اس سارے معاملے پر مٹی ڈالیں اور آپ اس کیس سے دستبردار ہوجائیں۔''
''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی!'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیس اس وقت آخری مراحل میں ہے۔ میں اس سے الگ کیسے ہوسکتا ہوں؟''
''کیا قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا؟'' وہ تپتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔
''قانوناً نہیں، یہ بات میں اخلاقاً کہہ رہا ہوں۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''آپ کو ایسی غلطی نہیں کرنا چاہیے۔''
''میں بہتر سمجھتا ہوں کہ کون غلطی پر ہے۔'' وہ پھنکارا۔ ''دراصل، میں نے اپنی بیٹی کے لیے دوسرا وکیل کرلیا ہے۔ آئندہ پیشی پر وہی وکیل حاضر ہوگا، آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا جو حساب بنتا ہے، مجھے بتائیں۔ میں ابھی ادا کردوں گا......'' اس نے ذرا دیر کو رک کر برا سا منہ بنایا پھر زہریلے لہجے میں بولا۔
''میں ابھی زندہ ہوں۔ سائرہ کی رہائی کے لیے ایک چھوڑ، دس وکیل کرسکتا ہوں۔ میں نے اس کے لیے بڑے چوٹی کے وکیل کا انتخاب کیا ہے۔ وہ استغاثہ کا جنازہ نکال دے گا۔ میری بیٹی کوئی لاوارث نہیں ہے کہ فلاحی اداروں کے وکیل اس کا کیس لڑیں۔''
یہ اس نے سراسر مجھ پر چوٹ کی تھی۔ میں نے بڑے تحمل سے اس کے وار کو پیا اور معتدل انداز میں کہا۔ ''نمبر ایک، میں کسی فلاحی یا سماجی ادارے کا وکیل نہیں ہوں شاہ جی۔ نمبر دو، یہ کیس میں نے پیسوں کے لالچ میں نہیں پکڑا اس لیے آپ میرا حساب چکتا کرنے کا خیال ذہن سے نکال دیں۔ نمبر تین، ایک بات میری دھیان سے سن لیں کہ آپ کی بیٹی کی بہتری اسی میں ہے کہ دونوں ملزمان کا وکیل ایک ہی ہو۔ پولیس نے ان پر گھر سے بھاگنے، ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہر کر رنگ رلیاں منانے اور کھلے عام فحش حرکات کرنے کا کیس بنایا ہے اور اس فعل میں دونوں فریقین کی رضامندی شامل ہے۔ اگر دونوں کے وکیل الگ الگ ہوئے تو بہت سی قانونی پیچیدگیاں پیدا ہوجائیں گی۔ بہرحال...... آپ کی مرضی ہے۔''
''وکیل صاحب! میں آپ کے پاس قانون کی باریکیاں سمجھنے نہیں آیا ہوں۔'' وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اپنی بیٹی کا فائدہ نقصان بڑی اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ ایوب سولنگی ہمیشہ سے میرا دشمن رہا ہے۔ مجھے شک ہے کہ آپ نے اس سے کوئی تگڑی رقم پکڑ کر کیس کو میری مخالفت میں ہموار کیا ہے تاکہ سائرہ رہا ہوکر نواب شاہ پہنچ جائے اور میں بیٹی سے محرومی کے ساتھ ہی مختلف نوعیت کی قانونی پیچیدگیوں میں الجھ جاؤں۔''
''آپ ایک بدگمان اور عاقبت نااندیش انسان ہیں۔'' میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو اپنی بیٹی کا ذرا بھی خیال نہیں ہے شاہ جی؟''
وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہم خاندانی لوگ ہیں وکیل صاحب! شاہ نواز اور اس کا خاندان میرے برابر کھڑے ہونے کے بھی لائق نہیں ہے۔ میں اس کمینے کو ایسا فٹ کراؤں گا کہ

اس کی اگلی پچھلی سات نسلیں یاد کریں گی۔''

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ کسی وکیل کو موٹی رقم کھلا کر میرا بنا بنایا کھیل بگاڑنے کے موڈ میں تھا۔ بہر حال، اس بات کا فیصلہ تو وقت کو کرنا تھا کہ کون کس کو نیچا دکھائے گا۔

''اگلی پیشی میں ابھی چند روز باقی ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ اچھی طرح ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ سوچ لیں شاہ جی۔''

''سوچنے اور سمجھنے کا میرے پاس وقت نہیں ہے وکیل صاحب!'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''آپ کا جو حساب بنتا ہے، وہ مجھ سے لے لیں اور بس اپنی چھٹی سمجھیں۔''

''اتنی بھی کیا جلدی ہے شاہ جی! میں اگلی پیشی پر عدالت جا کر اپنا حساب آپ سے وصول کرلوں گا۔'' میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''یہ کیس نہ تو آپ نے میرے حوالے کیا تھا اور نہ ہی آپ اس کیس کو مجھ سے لے کر کسی اور وکیل کو دے سکتے ہیں۔''

''میں سائرہ کا باپ ہوں۔'' وہ غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس کے لیے میں جس کو چاہوں وکیل کروں۔ میرا یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔''

''چھین سکتا ہے...... بلکہ چھین چکا ہے۔'' میں نے اس پر چوٹ کی۔

''کک...... کون......؟'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

''آپ کی چہیتی بیٹی سائرہ!'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''پچھلی پیشی پر آپ کی بیٹی نے معزز عدالت پر یہ واضح کردیا ہے بلکہ عدالت سے درخواست کی ہے کہ وہ رہائی کے بعد آپ کے پاس نہیں جانا چاہتی۔ اسے اس کی خواہش کے مطابق شاہدہ اور ایوب سولنگی کے حوالے کیا جائے۔ آپ یہ بازی ہار چکے ہیں۔ آپ چاہے کتنا بھی اونچا وکیل کرلیں، جب سائرہ آپ کے ساتھ جانا ہی نہیں چاہتی تو عدالت اسی کی سنے گی۔ وہ آپ کے گھر میں اپنی جان کے لیے سخت خطرہ محسوس کرتی ہے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر دھمکی آمیز انداز میں بولا۔ ''میں دیکھ لوں گا آپ کو...... اور آپ کی وکالت کو بھی!''

''ضرور شاہ جی......'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنا یہ شوق ضرور پورا کیجیے گا۔''

وہ غصے میں پھنکارتے اور تنتناتے ہوئے اپنے حاشیہ برداروں کے ساتھ میرے آفس سے نکل گیا۔ میں نے اب تک جو کچھ کیا اور جو کچھ کہا، اس کا ایک ہی مقصد تھا۔ یعنی قانون کے تقاضے پورے کرنا اور...... اس سلسلے میں مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ مراد شاہ جیسے کردار میں نے بہت دیکھے تھے۔

☆☆☆

آئندہ پیشی سے پہلے میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے سائرہ کے خالو ایوب سولنگی سے نواب شاہ میں رابطہ کرلیا۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں اچھی پوسٹ پر فائز تھا۔ میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا۔

''سولنگی صاحب! آپ کو آئندہ پیشی پر کراچی میں ہونا چاہیے۔''

ہمارے بیچ یہ گفتگو بہ ذریعہ ٹیلی فون ہو رہی تھی، اس نے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! اگلی پیشی کب ہے؟''

میں نے اسے پیشی کی تاریخ بتادی۔

اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں پیشی سے ایک دن پہلے کراچی پہنچ جاؤں گا اور پیشی پر عدالت میں موجود رہوں گا لیکن یہ معاملہ خاصا حساس ہے۔''

''جی بالکل، حساس تو ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''مراد شاہ سے میری ون ٹو ون ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ میرے آفس میں مجھ پر دھونس جمانے آیا تھا۔ اس کے ارادے خاصے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔''

''مراد شاہ کی خطرناکی کو تو میں نمٹ لوں گا۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔''

''کون سا اصل مسئلہ؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''میرا اشارہ سائرہ کی طرف ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر وہ عدالت میں اپنے باپ کو دیکھ کر اس کے رعب میں آگئی اور اس کے ارادے کمزور پڑ گئے تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''مجھے یقین ہے، وہ کمزور نہیں پڑے گی۔'' میں نے پُرشوق لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں، وہ مراد شاہ کو اپنی ماں مختار کا قاتل سمجھتی ہے اور اسے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر وہ واپس مراد شاہ کے ساتھ سعید آباد چلی گئی تو پھر اس کا انجام مختار سے بھی زیادہ حسرت ناک ہوگا۔''

''چلیں دیکھتے ہیں......'' وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ''جو بھی ہوگا، بھگت لیں گے۔''

ہمارے بیچ مزید دس پندرہ منٹ تک ٹیلی فونک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا پھر میں نے اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد ''اللہ حافظ'' کہہ دیا۔

اگلی پیشی سے پہلے میں نے معظم صدیقی سے بھی ایک

تفصیلی ملاقات کی اور ہم نے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرلیا۔

علاوہ ازیں ایک روز میں نے اپنے ذرائع استعمال کرکے سائرہ اور شاہ نواز سے بھی مختصر سی ملاقات کرلی اور انہیں سختی سے تاکید کردی کہ میں نے انہیں جو کہانی رٹوائی تھی، پوری ثابت قدمی سے اس پر ڈٹے رہنا ہے اور کسی بھی شخص کو اس راز سے آگاہ نہیں کرنا ورنہ بازی پلٹ جائے گی اور پھر میں ان کے لیے کچھ نہیں کرسکوں گا۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایات پر من وعن عمل کریں گے اور کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ میں ان کی جانب سے مطمئن ہوگیا۔

آئندہ پیشی سے پہلے ایک روز شاہ نواز کا بڑا بھائی رب نواز اور باپ اللہ بخش مجھ سے ملنے دفتر آئے۔ ان کے چہروں سے سادگی اور مخصوص دیہاتی پن جھلکتا تھا تاہم اس جھلک میں پریشانی اور فکرمندی کی بھی بہتات تھی۔ اللہ بخش سعید آباد کا ایک چھوٹا زمین دار تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد رب نواز نے کہا۔

''وکیل صاحب! یہ بیٹھے بٹھائے شاہ نواز کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اگر ہمیں پتا ہوتا کہ وہ مراد شاہ کی بیٹی کے ساتھ کراچی جارہا ہے تو ہم اسے کبھی یہ قدم نہ اٹھانے دیتے۔ مراد شاہ بہت ہی طاقتور اور خطرناک شخص ہے۔ ہم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔''

''ادھر سعید آباد کے تھانے میں مراد شاہ نے شاہ نواز کے خلاف اپنی بیٹی کے اغوا کی رپورٹ بھی درج کروا رکھی ہے۔'' اللہ بخش روہانسے لہجے میں بولا۔ ''آپ ہی بتائیں، ہم اس مشکل سے کیسے نکلیں؟''

''ایک بات تو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔'' میں نے باری باری ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہ نواز نے سائرہ کو اغوا کیا ہے اور نہ ہی عاشقی معشوقی کا کوئی قصہ ہے۔''

''پھر...... پھر یہ کیا ہے؟'' رب نواز نے حیرت بھرے انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ ''سعید آباد میں بعض لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ سائرہ اور شاہ نواز آپس میں ملتے رہے ہیں اور ان کے بیچ کوئی تعلق بھی ہے۔ ہم لوگوں کی زبان تو نہیں پکڑ سکتے نا۔''

''کسی کی زبان پکڑنے کی ضرورت بھی نہیں۔'' میں نے مصلحت کوشی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک سائرہ اور شاہ نواز کے بیچ تعلقات کی بات ہے تو آپ اسے ہمدردی کا رشتہ سمجھ لیں۔''

''ہمدردی کا رشتہ؟'' رب نواز نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ہاں......'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اور یہی ہمدردی کا رشتہ ان دونوں کو سعید آباد سے کھینچ کر کراچی لایا ہے۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......'' اللہ بخش کی پریشانی میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔

رب نواز التجا آمیز انداز میں بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ ہماری آسانی کے لیے تھوڑی وضاحت کردیں۔''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے انہیں سائرہ کی والدہ مختار بی بی کی بھکارن کے روپ میں، کراچی میں موجودگی، شاہ نواز کا مختار بی بی کو صدر کے علاقے میں دیکھنا، سائرہ کو اس کی ماں کے بارے میں بتانا، پھر ان کا ایک ساتھ مختار بی بی کی تلاش میں کراچی آنا...... کے حوالے سے تمام تر کہانی مختصر مگر جامع الفاظ میں سنادی جس میں ان دونوں کا ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں قیام، شاہ نواز کے دوست کی تلاش اور پارک میں ان کی گرفتاری کے واقعات بھی شامل تھے۔

پوری بات سننے کے بعد رب نواز نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''وکیل صاحب! آپ تو بڑی خطرناک باتیں کررہے ہیں۔ ان حالات میں شاہ نواز کس طرح چھوٹے گا......''

''آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''سب ٹھیک ہوجائے گا۔ بس میں جیسا کہوں، آپ لوگ ویسا ہی کرتے جائیں۔''

''آپ حکم کریں وکیل صاحب......!'' اللہ بخش گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں صورتِ حال کی نزاکت اور سنگینی کی مناسبت سے انہیں ہدایات دینے لگا۔ وہ ہمہ تن گوش ہوگئے۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور ملزمان والے کٹہرے میں سائرہ اور شاہ نواز سر جھکائے کھڑے تھے۔ انہوں نے درحقیقت کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن وہ جس نوعیت کے حالات کا شکار ہوکر یہاں تک پہنچے تھے، اس سفر نے انہیں بہت تھکا دیا تھا۔ وہ مضمحل اور ٹوٹے ہوئے دکھائی دیتے تھے تاہم میری راہنمائی نے ان کے اندر زندگی کی کرن کو مرنے نہیں دیا تھا۔ اب تک انہوں نے میری ہدایات کے مطابق عمل کیا تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ آئندہ بھی مایوس نہیں کریں گے۔

معظم صدیقی کی فلاحی تنظیم کے پلیٹ فارم سے میں سائرہ اور شاہ نواز کا وکیل مقرر ہوا تھا۔ شاہ نواز کے بھائی رب نواز اور باپ اللہ بخش کی تائید بھی مجھے حاصل تھی لیکن سائرہ کا باپ مراد شاہ کسی اور ہی موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ جیسا کہ وہ میرے آفس میں مجھے دھمکی دے گیا تھا کہ اسے میری وکالت کی ضرورت نہیں اور یہ کہ وہ اگلی پیشی پر اپنی بیٹی کے لیے کسی اونچے وکیل کا بندوبست کرلے گا تو...... اس نے اپنے ارادے پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔ اس پیشی پر شہر کے ایک نامور اور مہنگے وکیل نے اپنا وکالت نامہ عدالت میں دائر کیا تو مجسٹریٹ نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

''بیگ صاحب! کیا آپ اس کیس سے دست کش ہوگئے ہیں؟''

''نو سر!'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ کیس اس وقت اپنے آخری مراحل میں ہے اور میرا پیشہ ورانہ تجربہ بتاتا ہے کہ آج اس کیس کا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔ اس صورتِ حال میں، میں اس کیس کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں!''

مجسٹریٹ نے ان وکیل صاحب کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کو کس نے مقرر کیا ہے؟''

''ملزمہ سائرہ کے باپ مراد شاہ نے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں صرف سائرہ کے ڈیفنس کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ دوسرے ملزم یعنی شاہ نواز سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں۔''

''بات لین دین کی نہیں ہے جناب عالی!'' میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''دو ملزمان ایک ساتھ، ایک کیس میں نامزد ہیں لہٰذا ان دونوں کی وکالت بھی کسی ایک وکیل ہی کو کرنا چاہیے۔ اگر اس کیس کی رسی کے دوسروں کو دو مختلف افراد مخالف سمت میں کھینچنے کی کوشش کریں گے تو سراسر نقصان رسی ہی کو پہنچے گا۔ یعنی سائرہ اور شاہ نواز کے لیے یہ گھاٹے کا سودا ثابت ہوگا۔''

''کسی بھی ملزم کے حوالے سے سود و زیاں کا حساب کرنا اس کے وکیل کا نہیں بلکہ اس کے ورثا کا کام ہوتا ہے۔'' وکیل صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''سائرہ کے باپ نے مجھے اس کا وکیل مقرر کیا ہے لہٰذا آپ خود کو فارغ ہی سمجھیں۔''

''بے حد معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میرے فاضل دوست نے انتہائی غیر پیشہ ورانہ بات کی ہے۔'' میں نے باری باری مجسٹریٹ اور ان وکیل صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی وکیل اپنے موکل کے فائدے نقصان کا حساب نہیں رکھے گا تو پھر وہ اسے انصاف کیسے دلا سکے گا اور جہاں تک میرے فارغ ہونے کا تعلق ہے تو......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے مراد شاہ نے سائرہ کا وکیل مقرر نہیں کیا تھا لہٰذا مجھے رکھنے یا فارغ کرنے کا اختیار اس کے پاس نہیں ہے۔''

''آپ کو کیس کی پیروی کے لیے ایک مقامی فلاحی تنظیم نے مقرر کیا تھا۔'' اس وکیل نے مجھ پر چوٹ کی۔ ''لیکن اب ملزمہ سائرہ کا باپ یہاں آچکا ہے۔ وہ ایک بااثر اور صاحب ثروت شخصیت ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے چوٹی کا وکیل کرسکتا ہے۔''

''میرے فاضل دوست! میری بات کو دھیان سے سنیں۔'' میں نے ان وکیل صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اول، مجھے ایک فلاحی تنظیم کے توسط سے یہ کیس ملا ہے لیکن میری وکالت کو ملزمہ سائرہ کی تائید حاصل ہے۔ میں دراصل کسی فلاحی تنظیم کا نہیں بلکہ سائرہ کا وکیل ہوں۔ دوم، اگر مجھے اس کیس سے کوئی الگ کرسکتا ہے تو وہ یا تو مذکورہ فلاحی تنظیم ہے یا پھر ملزمہ سائرہ۔ کسی مراد شاہ کا اس کیس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔''

''تعلق واسطہ کیسے نہیں ہے؟'' وکیل صاحب کو جوش آگیا۔ ''مراد شاہ، ملزمہ سائرہ کا سگا باپ ہے۔''

''مراد شاہ کے سائرہ کا سگا باپ ہونے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے میرے فاضل دوست ...... لیکن شاید آپ کو اس کیس کے پس منظر سے مکمل آگاہی حاصل نہیں ہے اسی لیے آپ بغیر سوچے سمجھے بہت بڑھ چڑھ کر بول رہے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ گھور کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ کو قطعاً کچھ پتا نہیں ہے کہ ملزمہ سائرہ نے پچھلی پیشی پر اپنے باپ مراد شاہ پر کس طرح اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا۔'' میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''ملزمہ، اپنے باپ کو اپنی ماں مختار بی بی کا قاتل سمجھتی ہے یا کم از کم وہ مراد شاہ کو اپنی ماں کی موت کا ذمے دار جانتی ہے۔ اسے مراد شاہ پر رتی بھر بھی اعتبار نہیں۔ وہ مراد شاہ کے ساتھ واپس سعید آباد جانے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں۔ اسے مراد شاہ کے گھر میں اپنی جان کو خطرہ ہے اور ان تمام باتوں کا کھلم کھلا اظہار وہ گزشتہ پیشی پر معزز عدالت کے روبرو کرچکی ہے۔ اب آپ بتائیں، اس سچویشن میں ملزمہ، مراد شاہ کے وکیل کو یعنی آپ کو کیسے قبول کرسکتی ہے لیکن پھر بھی......'' میں نے ڈرامائی

انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"اگر ملزمہ سائرہ مجھے رد کر کے آپ کو اپنا وکیل مان لیتی ہے تو میں ابھی اور اسی وقت اس کیس سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔" پھر میں نے روئے سخن مجسٹریٹ کی جانب موڑا اور کہا۔

"دیس آل یور آنر!"

اس سچویشن پر نیا وکیلِ صفائی بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ مجسٹریٹ نے سائرہ سے پوچھا۔ "بی بی! تم کیا کہتی ہو؟"

"سر! میں اپنے بابا پر بھروسا نہیں کر سکتی تو ان کے وکیل کی کیا حیثیت ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں کسی بھی قیمت پر واپس سعید آباد نہیں جانا چاہتی۔ وہاں میری جان کی دشمن میری سوتیلی ماں ممتاز موجود ہے۔ اس سازشی عورت نے میری ماں کو راہ سے ہٹا کر میرے بابا کے دل و دماغ پر قبضہ کیا ہے۔ مجھے نہیں جانا وہاں......" وہ جذباتی ہوگئی۔ "ورنہ میرا بھی وہی حشر ہوگا جو میری ماں کا ہوا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری مسخ شدہ لاش بھی کسی نہر سے برآمد ہو۔"

پچھلی پیشی پر میں اپنے دلائل کے زور پر عدالتی کارروائی کو اس منزل پر لے آیا تھا کہ جس کے بعد فیصلہ میرے حق میں یعنی میرے مؤکلین کے حق ہی میں ہونا تھا۔

"بیگ صاحب!" مجسٹریٹ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "گزشتہ پیشی پر ملزمہ سائرہ بی بی نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ اسے اس کی خالہ شاہدہ کے حوالے کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں آپ نے کیا انتظام کیا ہے؟"

"جناب عالی! ملزمہ سائرہ کا خالو ایوب سولنگی اس وقت عدالت کے کمرے ہیں موجود ہے۔" میں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ "ایوب سولنگی کا تعلق نواب شاہ سے ہے اور وہ ایک سرکاری محکمے سے وابستہ ہے۔"

"سائرہ بی بی!" مجسٹریٹ نے میری مؤکلہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کہ تمہیں تمہارے خالو اور خالہ کے حوالے کر دیا جائے؟"

"جی بالکل۔" سائرہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"میرے لیے اس سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن یہ مجھے ہرگز منظور نہیں ہے۔" یہ آواز مراد شاہ کی تھی۔

وہ بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھا اور عدالتی کارروائی کو سماعت کر رہا تھا۔ اس نے اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے سائرہ کے لیے چوٹی کے ایک وکیل کا انتظام کیا تھا لیکن میں نے اپنے دلائل کی مدد سے اس کی سازش کی دھار لگی چھری کو پتھر پر دے مارا تھا۔

"آپ کو جو کچھ کہنا ہے، یہاں آکر کہیں۔" مجسٹریٹ نے وٹنس باکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مراد شاہ سے کہا۔

ایک منٹ کے بعد مراد شاہ گواہوں والے کٹہرے میں کھڑا عدالت سے درخواست کر رہا تھا۔ "جناب عالی! وقت بہت ظالم اور میری بیٹی بہت نادان ہے۔ میرے دشمن ایوب سولنگی نے ایک گہری سازش کے ذریعے سائرہ کو مجھ سے دور کر دیا ہے۔ عدالت کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ میری اور سولنگی کی بہت پرانی دشمنی ہے۔ مجھے شک ہے کہ شاہ نواز، سولنگی ہی کا ایک مہرہ ہے۔ اس کمینے بدذات نے میری بچی کو ورغلایا ہے۔ یہ اسے مختار بی بی کے بارے میں ایک من گھڑت کہانی سنا کر کراچی لے آیا۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ یہ دونوں پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ورنہ پتا نہیں، سولنگی شاہ نواز کے ذریعے میری عزت کو کہاں کہاں اچھالتا۔ میں معزز عدالت سے منت کروں گا کہ میری بچی کو میرے ساتھ بھیجیں یا نہ بھیجیں لیکن اسے میرے دشمن کی تحویل میں بھی نہ دیں۔ میرا اشارہ ایوب سولنگی کی جانب ہے۔"

صورت حال میں خاصی تبدیلی آگئی تھی اور اس تبدیلی میں شاہ نواز کی درخواست نے مزید اضافہ کر دیا۔ شاہ نواز نے مجسٹریٹ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

سردار (اپنے دوست سے) "ایسا کون سا اسٹیشن ہے جہاں ٹرین نہیں رکتی......؟"

دوست۔ "ایسا کوئی نہیں۔"

سردار۔ "ریڈیو اسٹیشن"

☆☆☆

☆ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں لیکن ڈیل زمین پر ہوتے ہیں۔

☆ صدقہ ہر بلا کو ٹال دیتا ہے سوائے اس کے جس سے آپ کا نکاح ہوا ہے۔

☆ اگر آپ کی بیوی آپ کا کہا نہیں مانتی تو پریشان نہ ہوں کسی کی بیوی بھی نہیں مانتی۔ (اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں)

مرسلہ۔ اختر شاہ عارف، ڈھوک، جمعہ جہلم

''سر! میں عدالت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں بولو...... تمہیں کیا کہنا ہے؟'' مجسٹریٹ نے سوال کیا۔

''جناب! میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے منت کرتا ہوں کہ ہمیں ایوب سولنگی کے حوالے نہ کیا جائے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں مراد شاہ کی حمایت یا ایوب سولنگی کی مخالفت کر رہا ہوں بلکہ اس کے پیچھے ایک نکتہ چھپا ہوا ہے۔''

میں نے معظم صدیقی کے ساتھ مل کر جو منصوبہ بنایا تھا، اسی کی روشنی میں، میں نے شاہ نواز کو چند ہدایات دی تھیں اور اس وقت وہ میری ہی زبان بول رہا تھا۔

''کیسا نکتہ؟'' مجسٹریٹ نے شاہ نواز سے استفسار کیا۔

''جناب عالی! میں شاہ جی کی طاقت اور اختیار سے اچھی طرح واقف ہوں اور ان کی طاقت و اختیار کے درجنوں مظاہرے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھے ہیں۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''اگر مجھے میرے والدین کے حوالے کر دیا گیا اور سائرہ کو اس کے خالو خالہ کے سپرد کر دیا گیا تو ہم دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ شاہ جی اپنے غنڈوں کی مدد سے ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیں گے اور...... سولنگی صاحب بھی بہت بڑی مصیبت میں آجائیں گے۔''

''جناب عالی!'' میں نے مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ساری صورتِ حال عدالت کے سامنے ہے۔ حقائق پر سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ ملزمہ سائرہ جب تک مراد شاہ کی دسترس میں رہے گی، ہر لمحے اس کی جان کو خطرہ لاحق رہے گا اور جہاں تک بے چارے شاہ نواز کا تعلق ہے تو وہ ایک نیکی کی پاداش میں اس جھمیلے میں پھنس گیا ہے۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ اس کی ہمدردی کا اتنا خطرناک نتیجہ برآمد ہوگا تو شاید وہ بھول کر بھی سائرہ کو اپنے ساتھ کراچی نہ لے کر آتا۔ اس نے معزز عدالت کو بالکل درست بتایا ہے کہ وہ مراد شاہ کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ مراد شاہ اس کا اور اس کے گھر والوں کا جینا حرام کر دے گا۔ پھر ادھر سعید آباد کے تھانے میں اس کے خلاف سائرہ کے اغوا کی رپورٹ بھی درج ہے۔ پولیس والے وہاں پہنچتے ہی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ وہ اس کی کم اور مراد شاہ کی زیادہ سنیں گے، جیسا کہ ایسے معاملات میں ہوتا ہے لہٰذا میرے پاس ایک تجویز ہے......''

''کیسی تجویز؟'' میری بات مکمل ہوتے ہی مجسٹریٹ نے پوچھ لیا۔

''موجودہ حالات کی سنگینی اور واقعات کی نزاکت کے پیشِ نظر میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ نہ تو سائرہ کو ایوب سولنگی کے حوالے کیا جائے اور نہ ہی شاہ نواز کو سعید آباد روانہ کیا جائے۔'' میں نے اپنے منصوبے کو فائنل ٹچ لگاتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ کچھ عرصے کے لیے ان دونوں کو ایک تیسرے محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے۔''

''تیسرا محفوظ مقام!'' مجسٹریٹ نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟''

''کسی سماجی فلاحی ادارے کی طرف۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اور اس مقصد کے لیے میری نظر میں معظم صدیقی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ صدیقی صاحب کی تنظیم اس کیس کے اخراجات اٹھا رہی ہے۔ وہ اس سلسلے میں بہترین انتظامات کر سکتے ہیں۔''

''یہ لوگ کب تک کسی فلاحی ادارے میں پڑے رہیں گے؟'' مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔

''جب تک وقت کی گرد نہیں بیٹھ جاتی۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے، ایسا بہت جلد ہوجائے گا۔''

مجسٹریٹ نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میری تجویز اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر سائرہ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بی بی! کیا تم صدیقی صاحب کے ذریعے کسی سماجی ادارے میں عارضی قیام کرنے کے لیے راضی ہو؟''

''جی...... میں راضی ہوں۔'' سائرہ نے تائیدی انداز میں کہا۔

''اور تم کیا کہتے ہو؟'' جج نے شاہ نواز سے پوچھا۔

''مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' شاہ نواز نے جواب دیا۔

مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! کیا صدیقی صاحب اس وقت عدالت میں موجود ہیں؟''

''جی...... وہ عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو انہیں اندر بلا لیا جائے۔''

''اجازت ہے......!'' مجسٹریٹ نے اپنی مخصوص بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں سائرہ اور شاہ نواز کو معظم صدیقی کے سپرد کرنے کے سلسلے میں تمام تر ضروری کارروائی

مکمل کر لی گئی۔ اس کے بعد مجسٹریٹ نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو میں نے پہلی فرصت میں سائرہ اور شاہ نواز کو صدیقی صاحب کی گاڑی پر سوار کر کے وہاں سے رخصت کر دیا۔ جب صدیقی صاحب کی گاڑی عدالت کی عمارت کے احاطے سے باہر نکل گئی تو میں نے سکھ کی سانس لی۔

اللہ بخش، رب نواز اور ایوب سولنگی بھی میرے پیچھے پیچھے عدالت سے باہر نکلے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے، میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مراد شاہ کے غضب سے انہیں محفوظ کرنے کا اس سے بہتر طریقہ فی الحال اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ لوگ میرے دفتر میں پہنچیں۔ باقی باتیں وہاں پر ہوں گی۔''

وہ مجھ سے درجنوں سوالات کرنا چاہتے تھے لیکن میرے تشفی بھرے دوٹوک انداز نے انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ عدالت کے کمرے میں میری کارکردگی کا چشم دید مظاہرہ دیکھ چکے تھے لہٰذا انہیں مجھ پر بھروسا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، وہ سائرہ اور شاہ نواز کے تحفظ کے لیے ضروری ہے چنانچہ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

☆☆☆

منظر میرے آفس کے کمرے کا تھا اور میرے علاوہ وہاں تین افراد موجود تھے یعنی شاہ نواز کا بڑا بھائی رب نواز اور باپ اللہ بخش اور سائرہ کا خالو ایوب سولنگی۔ ان تینوں کا تعلق اندرونِ سندھ سے تھا اور مجھے انہیں جلدی فارغ کرنا تھا تاکہ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے اپنے گھروں کو پہنچ جائیں۔

''وکیل صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' ایوب سولنگی نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے نواب شاہ سے مجھے یہاں بلایا اور پھر سائرہ کو میرے حوالے کرنے کے بجائے اسے کسی سماجی ادارے کے سپرد کر دیا۔''

''سولنگی صاحب! پہلی بات تو یہ کہ میں نے اپنی خواہش پر آپ کو یہاں نہیں بلایا تھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ عدالت کا حکم تھا کہ سائرہ کے خالو کو عدالت میں حاضر کرنے کا بندوبست کیا جائے اور عدالت نے یہ حکم اس لیے دیا تھا کہ سائرہ نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ وہ سعید آباد ہرگز نہیں جانا چاہتی لہٰذا اسے اس کے خالو اور خالہ کے سپرد کر دیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ اس کیس میں صرف سائرہ ہی نہیں بلکہ شاہ نواز بھی نامزد تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ اگر سائرہ کو آپ کی کسٹڈی میں دے دیا جاتا تو آپ بہ طریقِ احسن اس کی حفاظت کر لیتے لیکن اس صورت میں شاہ نواز بے یارومددگار رہ جاتا۔ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ اس میں یا اس کے والدین میں اتنا دم خم نہیں کہ یہ لوگ مراد شاہ کا مقابلہ کر پاتے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر شاہ نواز سعید آباد چلا جاتا تو پھر کوئی اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' رب نواز نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''آپ بالکل حقیقت بیان کر رہے ہیں۔''

ایوب سولنگی نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''آپ کے ذہن میں کیا ہے؟ آئندہ کے بارے میں آپ نے کیا سوچ رکھا ہے؟''

''میرے ذہن میں سائرہ اور شاہ نواز کا دائمی تحفظ ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوگ جتنی جلدی ایک ہو جائیں، اتنا ہی اچھا ہے اور میں نے اسی مقصد کے لیے انہیں کچھ عرصے تک کراچی میں روکنے کا پروگرام بنایا ہے۔''

''مطلب یہ کہ...... آپ ان کی شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟'' سولنگی نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''یہ سوچ ان دونوں کی ہے۔ میں تو ان کی اس نیک سوچ کو عملی شکل دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ آپ نے سنا ہے نا...... ایک، ایک اور دو گیارہ!''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادھر گاؤں میں کچھ لوگوں کا خیال درست تھا کہ سائرہ اور شاہ نواز ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔'' رب نواز نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''جی...... دونوں کی پسندیدگی تک تو یہ خیال درست ہے لیکن اگر کوئی یہ سوچ رہا ہے کہ شاہ نواز نے سائرہ کو اغوا کیا ہے یا سائرہ، شاہ نواز کے ساتھ گھر سے بھاگ کر کراچی آئی ہے تو ایسی سوچ سراسر غلط ہوگی۔'' میں نے اپنے مؤکلین کا مورال بلند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''حقیقت یہی ہے کہ شاہ نواز نے کراچی کے صدر کے علاقے میں ایک ایسی بھکارن کو دیکھا تھا جو ہوبہو سائرہ کی

ماں یعنی مختار بی بی ایسی تھی۔ شاہ نواز نے جب سائرہ سے اس کا ذکر کیا تو وہ اپنی ماں کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوگئی چنانچہ یہ لوگ چپ چاپ کراچی چلے آئے لیکن بدقسمتی سے پے در پے مشکلات میں گھرتے چلے گئے اور بالآخر پولیس کے ہتھے چڑھ گئے......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ان کی محبت پاکیزہ ہے۔ ان کی نیت اور کردار میں کوئی کھوٹ نہیں لہٰذا ان کی محبت کو پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچنا چاہیے اور موجودہ حالات میں اس کا سب سے محفوظ قانونی اور شرعی راستہ نکاح ہی ہے۔ میں ان کی شادی کے حق میں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جب یہ دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ جائیں گے تو پھر مراد شاہ ان کے خلاف کچھ نہیں کرسکے گا۔''

''اور آپ ان کا نکاح عدالت میں کروانا چاہتے ہیں؟'' ایوب سولنگی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''فی الحال تو یہی منصوبہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں آپ کے اس نیک منصوبے سے اتفاق کرتا ہوں۔'' سولنگی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اگر اس کام کے لیے مقام تبدیل کرلیا جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''مقام تبدیل......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ نیک کام اگر کراچی کی کسی عدالت کے بجائے میرے گھر میں ہو تو اس شادی کی شان و شوکت میں ہزار گنا اضافہ ہوجائے گا۔'' سولنگی نے تجویز دی۔

اللہ بخش نے کہا۔ ''سولنگی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم لوگ ان کی تجویز سے اتفاق کرتے ہیں۔ اس میں امن، سلامتی اور سب کی عزت افزائی ہے۔''

جب دونوں جانب سے ایک ہی صدا بلند ہوئی تو میں نے مخالفت سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

''جب آپ لوگ اس پر اتفاق کرتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن اس کام میں تاخیر مناسب نہیں۔ یہ نیک کام جتنا جلدی ہوجائے اس میں آپ سب کا بھلا ہے۔''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب! ہم واپس جارہے ہیں۔'' ایوب سولنگی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ جلد از جلد سائرہ اور شاہ نواز کو نواب شاہ پہنچانے کا بندوبست کریں۔ باقی کے معاملات سے میں خود نمٹ لوں گا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا۔

''آپ کے پاس میرا ایڈریس تو ہے نا؟''

''جی...... ایڈریس بھی ہے اور فون نمبر بھی۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں پہلے صدیقی صاحب سے بات کرلوں اس کے بعد آپ کو مطلع کرتا ہوں۔''

''یہ لوگ جس دن نواب شاہ کے لیے نکلیں، آپ مجھے فون کردیجیے گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں خود انہیں ریسیو کرلوں گا۔''

''او کے!'' میں نے کہا۔ ''آپ بے فکر ہوجائیں۔''

انہوں نے باری باری مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

☆☆☆

میں کوئی نکاح خواں ہوں اور نہ ہی میں نے کوئی شادی دفتر کھول رکھا ہے کہ دونوں کو ملانے کے انتظامات میں لگا رہوں۔ درحقیقت اس کیس میں میرا کام اسی وقت ختم ہوگیا تھا جب عدالت نے میرے مؤکلین کو باعزت بری کردیا تھا لیکن بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن سے آپ اتنی جلدی لاتعلق نہیں ہوسکتے اور یہ بھی ایک ایسا ہی معاملہ تھا جس کے اختتام تک جانا اور آپ کو اس کہانی کے انجام سے آگاہ کرنا میرا فرض بنتا ہے۔

پروگرام کے مطابق، سائرہ اور شاہ نواز کو ایوب سولنگی کے پاس نواب شاہ شفٹ کردیا گیا۔ ایوب سولنگی نے ان کی شادی کے انتظامات کیے لیکن کسی طرح شادی والی خبر پر لگا کر اڑی اور سعید آباد پہنچ گئی چنانچہ عین نکاح کے روز مراد شاہ کے مسلح آدمیوں نے سولنگی کے گھر پر حملہ کردیا۔ سولنگی کسی بھی قسم کی ہنگامی صورت حال کے لیے ہر لمحہ تیار تھا اور اس نے اپنی حفاظت کا مکمل بندوبست کر رکھا تھا لہٰذا مراد شاہ کے بندوں کو منہ کی کھانا پڑی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ سولنگی نے متعلقہ تھانے میں مراد شاہ کے خلاف بلوے اور غنڈا گردی کی رپورٹ درج کروادی۔

اس شکست اور ہزیمت نے مراد شاہ کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا اور وہ یہ ذلت برداشت نہ کرسکا۔ اس کے دل نے بے وفائی کی اور وہ اس دارِ فانی سے کوچ کرگیا۔ سائرہ اور شاہ نواز اس کے شر سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے۔

اس نوعیت کی لو اسٹوریز کا اینڈ عموماً ٹریجک ہوتا ہے لیکن سائرہ اور شاہ نواز کی طرح چند جوڑے خوش نصیب بھی ہوتے ہیں جن کے من میں بھڑکنے والی محبت کی چنگاری شعلے کا روپ دھارنے کے بعد انہیں جلا کر خاکستر نہیں کرتی بلکہ ان کی زندگی گل و گلزار ہوجاتی ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

تجربہ

تنویر ریاض

بعض اوقات جیسے انتہائی ناکارہ چیز بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے اسی طرح اس کی ”انتہائی بے وقوفی“ نے بھی کتنی عقلمندی کا مظاہرہ کیا تھا اس کا اندازہ عقل کے ٹھیکیداروں کو اس وقت ہوا جب ان کی اپنی عقل پر جھوٹی فتح کے پردے پڑ گئے تھے... اسی لیے کہتے ہیں کہ تجربہ چھوٹا ہو یا بڑا کوئی نہ کوئی سبق ضرور سکھاتا ہے... اور اس سے انکار کرنا سوائے بے وقوفی کے کچھ بھی نہیں۔

بے وقعت کاموں میں وقت گزارنے والے کا مفید تجرباتی کارنامہ
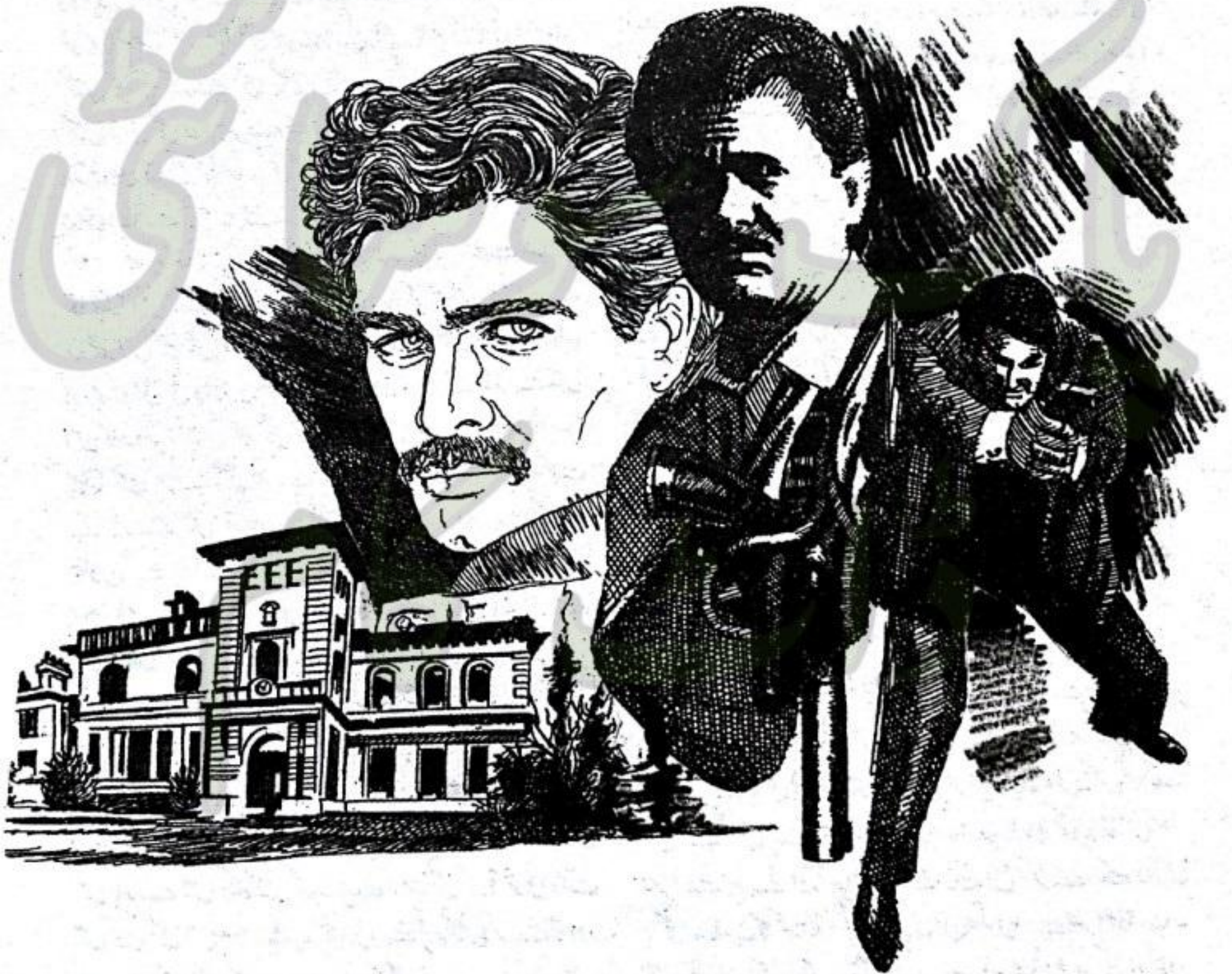
ہمارا منصوبہ بالکل سیدھا سادہ تھا اور بہ ظاہر اس میں کوئی پیچیدگی نظر نہیں آرہی تھی۔ تمام تفصیلات طے کرلی گئی تھیں اور لوئیس نے تمام معلومات اکٹھی کر کے منصوبہ بندی کی تھی جس کے مطابق ملٹن کو ڈرائیور کا فرض ادا کرنا تھا جبکہ نقب زنی کی اصل کارروائی کی ذمے داری ہوپر کی تھی جو مغربی لندن میں تالے توڑنے کا ماہر تھا جبکہ میں یعنی چیکو اس کارخیر میں اس کا ساتھ دیتا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لیکن عین وقت پر ہوپر نے اصرار کیا کہ اس کے بھتیجے ٹیرنس

کو بھی اس مہم میں شامل کیا جائے۔

اس کا مطالبہ سن کر ہم سب حیران رہ گئے کیونکہ ٹیرنس کو اس طرح کی کارروائی میں حصہ لینے کا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔ ان دنوں اسکولوں میں اس کا رواج چل پڑا ہے اور بچوں کو والدین کے ساتھ ان کے کام کی جگہ پر بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ بھی عملی زندگی سے آگاہی حاصل کرسکیں لیکن ٹیرنس کے باپ نے کبھی جم کر کوئی کام نہیں کیا تھا لہٰذا وہ اپنے بیٹے کو کیا سکھاتا، البتہ ٹیرنس کو اپنی ماں کے ساتھ کام کرنے کا تھوڑا بہت تجربہ تھا۔ وہ ٹیلی ویژن پروگراموں کی شوٹنگ کے دوران لوکیشن پر کھانا فراہم کرتی تھی۔ ٹیرنس نے ایک ہفتہ کے لیے اس کی مدد کی تھی، جب وہ ایک ریئلیٹی شو کے عملے کے لیے کھانا تیار کررہی تھی۔ اس شو کا نام بہت مشہور تھا لیکن میرے لیے اس نام کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ مجھے کبھی ٹیلی ویژن پروگراموں سے دلچسپی نہیں رہی تھی اور میرے خیال میں ٹیرنس نے بھی محض اپنا وقت ہی ضائع کیا تھا۔ کسی لڑکے کو یہ کام زیب نہیں دیتا اور نہ ہی وہ اسے اپنا کیریئر بنا سکتا ہے۔

ہوپر خاندانی رشتوں کے بارے میں بہت حساس تھا لہٰذا اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ ٹیرنس کو اس کے ساتھ اس مہم میں حصہ لینا چاہیے۔ ٹیرنس اس وقت لڑکپن اور نوجوانی کی دہلیز پر کھڑا ہوا تھا اور زندگی کے بارے میں اس کا رویہ انتہائی غیر سنجیدہ تھا۔ وہ اس طرح کی ٹی شرٹ پہنتا جن پر بے معنی نعرے لکھے ہوتے اور اس کی پتلون کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ واقعی وہ پتلون ہے یا اس نے نیکر پہن رکھی ہے۔ اس کے سر پر ہمیشہ بیس بال کیپ ہوتی جس کا زاویہ فطری انداز سے ہمیشہ مختلف ہوتا۔

ہوپر نے ٹیرنس کو اپنے ساتھ شامل کرنے کا خیال عین اس وقت ظاہر کیا جب ہماری منصوبہ بندی کی میٹنگ ختم ہونے والی تھی۔ وہ یقیناً جانتا ہوگا کہ ہم میں سے کوئی بھی اسے پسند نہیں کرے گا اور اسی لیے اس نے آخر وقت تک اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اسے امید تھی کہ آخری وقت میں کوئی بھی اس معاملے پر سنجیدگی سے غور نہیں کرے گا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گا۔

اس وقت تک تمام معاملات ہموار طریقے سے طے پاچکے تھے۔ اس منصوبے کی تفصیلات طے کرنے میں زیادہ حصہ میرا ہی تھا۔ میں نے ہی اس جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں اور لوئیس کو اس سلسلے میں کچھ مفید تجاویز بھی دی تھیں۔ شاید اسی لیے میٹنگ کے دوران بھی لوگوں نے اسے میرا منصوبہ قرار دیا تھا۔ حالانکہ میں اس گروہ میں سب سے آخر میں شامل ہوا تھا لیکن اس میٹنگ کے دوران مجھے احساس ہوا کہ ان لوگوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے قبول کرلیا بلکہ میری عزت بھی کرنے لگے تھے۔

میں نے اس جگہ کے بارے میں اپنے ایک ساتھی باب سے سنا تھا اور اسے سننے کے بعد میرا پہلا ردعمل یہی تھا کہ اس کام میں بہت خطرہ ہے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی اسی انداز میں سوچتا۔ اس طرح کے کاموں میں روزِ اول سے ہی یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہمیں اپنے آپ کو غلاظت سے دور رکھنا ہے۔ مجھے پولیس والوں سے ذاتی طور پر کوئی اختلاف نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بھی انسان ہیں اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں لگے رہتے ہیں لیکن میں نے اپنا اصول بنا رکھا تھا کہ ان سے دور رہنا ہی بہتر ہے لہٰذا جب مجھے باب نے یہ بتایا کہ وہ جس فلیٹ کی جانب اشارہ کررہا ہے وہ پولیس اسٹیشن کی پہلی منزل پر واقع ہے تو میں نے سوچا کہ یہ کام تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے پھر اس نے مجھے ایک کہاوت سنائی کہ چھپنے کے لیے بہترین جگہ روشنی کے نزدیک ہی ہوتی ہے۔ مجھے اس میں بھی کوئی چکمہ بازی نظر آئی لیکن میں اس کی بات سنتا رہا اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیونکہ جیسے جیسے وہ مجھے تفصیلات بتارہا تھا، اسے سن کر مجھے یہ کام زیادہ مشکل نہیں لگا۔ بس اس کے لیے تھوڑی سی ہمت اور جرأت کی ضرورت تھی۔

سرخ اینٹوں سے بنا ہوا وکٹورین انداز کا یہ پولیس اسٹیشن کسی سستے زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا، گراؤنڈ فلور پر پولیس افسران کے کمرے تھے جبکہ دوسری منزل پر پولیس کورٹ اور میٹنگ روم تھا اور پہلی منزل کافی عرصہ سے خالی پڑی تھی۔ 1970ء میں اخراجات میں کمی اور بچت کے خیال سے اسے رہائشی فلیٹ میں تبدیل کردیا گیا۔ اس شخص کو ایک دیوانے شخص نے خرید لیا جو نوادرات کا ماہر تھا۔ خاص طور پر اسے سونے اور چاندی کے سکے جمع کرنے سے دلچسپی تھی۔ باب کا کہنا تھا کہ یہ فلیٹ ان سکوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس فلیٹ کے مالک نے ملک سے باہر کافی عرصہ گزارا اور اس دوران وہ مختلف تاجروں سے یہ سکے خریدتا رہا۔ اس کے خیال میں یہ فلیٹ پولیس اسٹیشن کی عمارت میں ہونے کی وجہ سے انتہائی محفوظ تھا۔ اسی لیے نہ تو وہاں خطرے کا الارم لگایا گیا اور نہ ہی کھڑکیوں پر گرل لگانے کی ضرورت محسوس

کی گئی۔

فلیٹ کے مالک کو اپنے سرمائے کے محفوظ ہونے کا اتنا یقین تھا کہ اس نے ان سکوں کا بیمہ بھی نہیں کروایا۔ میں خود بھی اس کے حق میں نہیں ہوں کیونکہ بیمہ شدہ چیزوں کو چرانے کا مطلب پولیس کے ساتھ ساتھ انشورنس کمپنی کے سراغ رسانوں کو بھی اپنے پیچھے لگانا ہے اور اکثر یہ لوگ پولیس کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار اور کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ میں اسی لیے غیر بیمہ شدہ چیزیں چرانے کو ترجیح دیتا ہوں تاکہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد رات کو اطمینان سے سوسکوں۔

بہر حال کسی بھی منصوبے کی جزئیات طے کرنے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں لوئیس کا کردار سب سے اہم تھا، ہم ہمیشہ اسی انداز میں کام کرتے تھے۔ لوئیس عملاً کسی کارروائی میں شریک نہیں ہورہا تھا لیکن اس جگہ کو دیکھنا اور اس کے مطابق لائحہ عمل تیار کرنا اسی کی ذمے داری تھی۔ اس سے پہلی بار ملنے والا کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ لوئیس نے زندگی میں کبھی کوئی قانون شکنی بھی کی ہوگی اور حقیقت بھی یہی تھی البتہ ہماری ہر کارروائی کے پیچھے بس اس کا ذہن کام کرتا تھا۔

ہمارا کوئی لیڈر نہیں تھا لیکن ہم لوئیس سے ہی راہنمائی اور مشورے حاصل کرتے تھے۔ وہ دیکھنے میں ایک اسکول ٹیچر لگتا تھا۔ آنکھوں پر موٹا سا چشمہ اور جسم پر ڈھیلی ڈھالی پتلون پہنے جب وہ کسی ایسی جگہ چلا جاتا، جہاں اسے نہیں جانا چاہیے تھا تو کوئی بھی اس پر شک نہیں کرتا اور سب یہی سمجھتے تھے کہ وہ راستہ بھول کر غلطی سے اس جانب آگیا ہے۔

پولیس اسٹیشن کے بارے میں بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ میٹنگ کے دوران اس نے بتایا۔ ''میرا ارادہ باہر سے اس جگہ کا سرسری جائزہ لینا تھا۔ میں وہاں ایک ایسے شخص کی طرح ادھر ادھر گھومتا رہا جیسے باہر جانے کا راستہ نہ مل رہا ہو۔ اس طرح مجھے ان معلومات کی تصدیق کرنے کا موقع مل گیا، گو کہ پولیس اسٹیشن کے داخلی دروازے پر کیمرے اور دیگر سیکورٹی آلات نصب ہیں لیکن پہلی منزل پر واقع فلیٹ کی نگرانی کا کوئی انتظام نہیں۔''

''ظاہر ہے کہ ہم وہاں ہیلی کاپٹر کے ذریعے تو نہیں جاسکتے۔''

ملٹن نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''پہلی منزل پر جانے کے لیے ہمیں پولیس اسٹیشن کے حفاظتی نظام سے گزرنا ہوگا۔''

لوئیس نے ہاتھ اٹھا کر ملٹن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ درست ہے اور پہلی منزل کی سیڑھیوں تک پہنچنے کی کوشش انتہائی خطرناک ہوگی۔''

''گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ہم کھڑکی توڑ کر اندر چلے جائیں؟''

''تمہاری سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ بہت جلد باز ہو اور چاہتے ہو کہ جو بھی ہونا ہے وہ فوراً ہوجائے۔ ایک اچھے ڈرائیور کے لیے یہ خوبی ہوسکتی ہے لیکن کسی محفل میں اس کا اظہار مناسب نہیں ہوتا۔''

ملٹن منہ بنا کر خاموش ہوگیا اور اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

''میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ مجھے یہ رپورٹ میرے اپنے اسٹائل میں مکمل کرنے دو۔'' لوئیس نے کچھ اس انداز میں کہا کہ ملٹن کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ''باہر سے عمارت کا جائزہ لینے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اندر جا کر اپنی معلومات میں اضافہ کروں۔ میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے روپ میں ڈھال لیا جو کسی الجھن کا شکار ہو۔ پولیس کو سنانے کے لیے میں نے ایک کہانی گھڑ لی تھی کہ میرا پوتا کسی بات پر ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا ہے۔ لہٰذا اس کی تلاش میں میری مدد کی جائے۔

''جب میں عمارت میں داخل ہوا تو وہاں پہلے ہی بہت سے لوگ موجود تھے اور ڈیسک سارجنٹ ایک بوڑھی عورت سے مصروفِ گفتگو تھا جو مسلسل اس بات پر زور دے رہی تھی کہ اگر اس کے پڑوسی کے خلاف فوری کارروائی نہ کی گئی تو نقضِ امن کا خطرہ ہے۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا یہ تماشا دیکھتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور یوں ظاہر کیا جیسے مجھے رفع حاجت کی ضرورت پیش آرہی ہے پھر وہاں سے گزرتی ہوئی ایک لیڈی کانسٹیبل سے پوچھا کہ مردانہ بیت الخلا کہاں ہے۔ اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا جو راہداری میں کھلتا تھا اور اس کے دائیں بائیں جانب مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ بیت الخلا بنے ہوئے تھے جبکہ درمیان سے ایک زینہ اوپر کی جانب جارہا تھا۔ اس کے نیچے کچھ فائل کیبنٹ اور ٹوٹی ہوئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی دفتر نہیں تھا بلکہ حوالات اور پولیس اسٹیشن کے عقبی دروازے کی طرف جانے کے لیے راستے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

''سیڑھیوں کے اختتام پر مجھے ایک دیوار نظر آئی جسے دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ پولیس اسٹیشن کے اصلی نقشے

میں شامل نہیں تھی اور بعد میں تعمیر کی گئی ہے۔ اس میں ایک دروازہ بھی نصب تھا جو پہلی منزل کے فلیٹ کی جانب کھلتا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ کوئی وہاں آتا میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا جو کہ زیرِ استعمال نہ ہونے کی وجہ سے گرد آلود ہو رہی تھیں۔ اوپر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دروازے میں ایک عام سا تالا لگا ہوا ہے جسے ہوپر بہ آسانی کھول سکتا ہے۔"

ہوپر نے اس تعریف پر مسکراتے ہوئے سر کو تھوڑا سا جھکایا۔ جواب میں لوئیس نے بھی مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھ دیے۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کی رپورٹ مکمل ہو چکی ہے۔ ملٹن سب کچھ سننے کے بعد غیر مطمئن نظر آ رہا تھا لیکن اس ڈر سے کچھ نہیں بولا کہ کہیں لوئیس اسے دوبارہ نہ جھڑک دے۔ تاہم میں سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"گویا تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم پولیس اسٹیشن کے اندر سے ہوتے ہوئے فلیٹ تک جائیں گے؟"

"تم بہت سمجھ دار ہو۔ واقعی میرا یہی مطلب تھا۔"

چند لمحوں کے لیے خاموشی رہی پھر میں نے ایک اور سوال داغ دیا۔ "لیکن کیا ہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر وہاں سے گزر سکیں گے؟ فرض کرو کہ میں اور ہوپر فلیٹ میں جانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ کسی توقف کے بغیر ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دیں گے۔"

"تم بھی انہی کی وردی میں ملبوس ہوگے۔" لوئیس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ ہم پولیس کی وردی پہن کر وہاں جائیں گے؟"

"بالکل۔" لوئیس نے اتنے اطمینان سے کہا جیسے اس کے نزدیک یہ بہت ہی معمولی بات ہو۔

ہوپر اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم بیک وقت ایک سے زیادہ جرم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سونے اور چاندی کے سکے چرانے کے ساتھ ساتھ ہمیں فرضی پولیس والوں کا کردار بھی ادا کرنا تھا اور یہ بالکل شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے والی بات تھی۔

"میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟" ملٹن نے پوچھا۔ "جب لوگ دو پولیس والوں کو ایک پرائیویٹ کار سے اترتے ہوئے دیکھیں گے تو کیا انہیں شک نہیں ہوگا؟"

"بالکل نہیں۔ کیونکہ اس کار کا ڈرائیور یعنی تم نے بھی پولیس کی وردی پہن رکھی ہوگی۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں بھی اس فینسی ڈریس شو میں حصہ لوں گا؟"

"ہاں۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا پھر میں نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے لوئیس۔ اب تم تفصیل سے بتاؤ کہ ہمیں اس کے بعد کیا کرنا ہوگا؟"

لوئیس نے منصوبے کی جزئیات بیان کرنا شروع کیں۔ ہم نے اس سے کئی سوال پوچھے اور بڑی باریک بینی سے منصوبے کا جائزہ لیا۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں پر غور کیا اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچے کہ واقعی لوئیس ہم میں سب سے زیادہ ذہین ہے۔

عین اسی وقت ہوپر نے اپنے بھتیجے ٹیرنس کو اس مہم میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی تاکہ اسے بھی کام کا تجربہ ہو سکے۔

☆☆☆

میرا خیال تھا کہ نوعمر لڑکے بالعموم خاموش رہتے ہیں۔ چڑچڑے اور بدمزاج جو گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے بیڈروم میں بند ہو کر انٹرنیٹ یا موبائل فون کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں اور ان کے پاس اپنے والدین کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا لیکن اس شام میرا اندازہ غلط ثابت ہو گیا جب ٹیرنس اپنے چچا ہوپر کے ساتھ آیا اور ہم مہم پر جانے کے لیے کار میں سوار ہو گئے۔ چند منٹوں میں ہی سمجھ گیا کہ وہ دوسرے نوعمر لڑکوں سے مختلف ہے۔ اس نے سارے راستے بول بول کر ہمارے کان کھا لیے۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی بھی اس کے ساتھ آدھا گھنٹا گزار لے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قوتِ سماعت سے محروم ہو جائے گا۔ اس نے ایک عجیب وغریب قسم کا آفٹر شیو لوشن لگایا ہوا تھا جس کی مسالے جیسی بو پوری کار میں پھیل رہی تھی۔

ہم نے اسے پہلے سے اس کام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ لوئیس کا خیال تھا کہ اس لڑکے کو جتنا کم سے کم معلوم ہو اتنا ہی بہتر ہے اور میں بھی لوئیس کے اس خیال سے متفق تھا۔ اگر ہم اس کے سارے سوالوں کے جواب دے دیتے تو شاید وہ ہم سے بھی زیادہ اس مہم کے بارے میں جان جاتا۔ اسے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ وہ یہ بھی جاننا چاہ رہا تھا کہ ہم تینوں نے پولیس کی وردی کیوں پہن رکھی ہے اور یہ کہ کیا ہم مسلح بھی ہیں۔ تنگ آ کر ہوپر نے اسے جھڑک دیا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے اس کے لیے یہ سب جاننا ضروری نہیں۔ وقت آنے پر بتا دیا جائے گا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

ہنسنا منع ہے

دو حبشی اور ایک ہندوستانی جارہے تھے۔ ان کو ایک پری ملی اس نے کہا۔ ”میں تم سب کی ایک ایک خواہش پوری کرسکتی ہوں۔“ پہلا حبشی بولا۔ ”مجھے گورا کردو۔“ پری نے اسے گورا کردیا۔

دوسرا حبشی بولا۔ ”مجھے بھی گورا کردو۔“ پری نے اسے بھی گورا کردیا۔ ہندوستانی کھڑا ہنس رہا تھا۔ پری نے اسے کہا۔ ”منحوس اپنی خواہش بتاؤ جو میں پوری کردوں۔“ ہندوستانی ہنستے ہوئے بولا۔ ”ان دونوں حبشیوں کو دوبارہ کالا کردو......“ جیو ہندوستانیوں۔ نہ جیو نہ جینے دو۔

مرسلہ۔ اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ جہلم

رٹا

ایک بچے کو رٹا لگانے کی عادت تھی۔ امتحان نزدیک تھے چنانچہ بچے نے my best friend مضمون کو رٹا لگا کے یاد کرلیا لیکن امتحان میں my best friend کی بجائے my father مضمون آگیا۔ تو اس بچے نے پرچے میں مضمون اس طرح لکھا۔

i have many father but mr. amjad is my best father

مرسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

ہوپر کی ڈانٹ سن کر وہ وقتی طور پر خاموش ہوگیا لیکن چند منٹوں بعد دوبارہ اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی لیکن اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم اسے کام کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ لہٰذا اس نے ہمیں خوش کرنے کے لیے اپنے گزشتہ عملی تجربے کے بارے میں بتانا شروع کردیا جو اس نے اسی ہفتے اپنی ماں کے ساتھ لوکیشن پر کام کے دوران حاصل کیا تھا۔ میں نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ مجھے بھی ٹیلی ویژن سے دلچسپی نہیں رہی، البتہ بعض اوقات کھیلوں کے پروگرام دیکھ لیتا تھا۔

ملٹن بڑے غور اور دلچسپی سے ٹیرنس کی باتیں سن رہا تھا کیونکہ وہ خود بھی ٹیلی ویژن کا رسیا تھا اور فرصت کا سارا وقت ٹی وی دیکھنے میں گزار دیتا تھا۔ اسے ٹیلی ویژن شوز کے بارے میں کافی معلومات تھیں لہٰذا وہ یہ جان کر بہت متاثر ہوا کہ ٹیرنس اس ریئلیٹی شو کے تمام اداکاروں سے مل چکا ہے جنہیں اس کی ماں کھانا فراہم کرتی تھی۔

”اوہ۔“ ملٹن نے بڑے پرجوش انداز میں کہا۔ ”مجھے تمہاری کہانی کا وہ حصہ پسند آیا جب انہوں نے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں شوٹنگ کی اور ویٹرس کو پتا بھی نہ چلا کہ خفیہ کیمروں کی مدد سے اسے شوٹ کیا جارہا ہے۔ وہ کسی تیاری کے بغیر کتنی بے تکی لگ رہی ہوگی۔ کیا کبھی ایسا ہوا کہ کسی نے ان لوگوں کو شوٹنگ کرنے سے روک دیا ہو؟“

”نہیں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”انہیں یہ سب اچھا لگتا ہے۔ آج کل سب لوگ یہی چاہتے ہیں کہ ان کا چہرہ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر نظر آئے۔“

ملٹن بہت زیادہ متاثر دکھائی دے رہا تھا اور جب ٹیرنس نے اسے وہ اجازت نامہ دکھایا جس کی مدد سے وہ شو کے سیٹ یا لوکیشن پر بلا روک ٹوک جاسکتا تھا تو ملٹن اسے عقیدت سے دیکھنے لگا۔ اجازت نامے پر شو کا نام ”ڈینجر۔ مین ایٹ ورک“ جلی حروف میں چھپا ہوا تھا۔

وہ دونوں اپنی باتوں میں مصروف تھے اور ہم اپنی منزل سے قریب تر ہوتے جارہے تھے لہٰذا میں نے ملٹن سے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ اب وقت آگیا تھا کہ ٹیرنس کو اس مہم میں اس کے کردار کے بارے میں بتا دیا جائے۔ ہم نے اس کے لیے ایک کام تلاش کرہی لیا تھا اور یہ خیال لوئیس کے دماغ میں اس وقت آیا جب اس نے ہوپر سے اس کے بھتیجے کی عمر پوچھی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چلے گا۔“ شاید وہ یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ کھوٹا سکہ بھی کبھی کام آجاتا ہے۔

لوئیس کے منصوبے کے مطابق ہمیں اپنی کارروائی گیارہ بجے کرنا تھی کیونکہ اس وقت تک زیادہ تر پولیس والے گشت پر روانہ ہوچکے ہوتے ہیں۔ عموماً ان اوقات میں نوعمر لڑکے شراب خانوں سے نشے میں دھت ہوکر باہر نکلتے اور شوروغوغا کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں ان حرکتوں سے روکنے کے لیے سرشام ہی پولیس کو سڑکوں اور گلیوں میں تعینات کردیا جاتا ہے اور پولیس اسٹیشن میں ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بہت کم نفری موجود ہوتی ہے۔

لوئیس نے ہمیں کور کرنے کے لیے ایسی ہی ایک ہنگامی صورتِ حال کی منصوبہ بندی کی تھی اور ٹیرنس کو اس کے گزشتہ تجربے کے پیشِ نظر اس میں مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔ ٹیرنس نے ایک معصوم بچے کی طرح ہماری ہدایات غور سے سنیں۔ بے شک اسے بولنے کا مرض تھا لیکن وہ بڑی سعادت مندی سے ان ہدایات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا لڑکا ہوتا تو کبھی اپنے چہرے اور جسم پر ٹماٹو کیچپ اور سبزی کا سوپ ملنے پر تیار نہ ہوتا لیکن وہ کچھ کہے بغیر راضی ہوگیا۔

اب میں یہ بھی بتا دوں کہ ان دونوں چیزوں کے استعمال کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ ٹماٹو کیچپ سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ جسم اور چہرے پر خون لگا ہوا ہے لیکن لوئیس کے منصوبے کے مطابق ہمیں صرف یہی ظاہر نہیں کرنا تھا کہ ٹیرنس زخمی ہوا ہے بلکہ یہ بھی دکھانا تھا کہ اسے قے ہوئی ہے۔ اس مقصد کے لیے سبزیوں کا سوپ سب سے زیادہ بہترین تھا۔

پولیس اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر ہم نے کارروائی اور ٹیرنس کا میک اپ شروع کر دیا۔ ہمیں اسے ایک ایسے لڑکے کا روپ دینا تھا جو شراب کے نشے میں چور ہو کر کسی سے لڑ پڑا تھا۔ یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ لڑکے نے پہلے ہی بدوضع لباس پہن رکھا تھا اور اس پر زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم نے اس کے چہرے پر اس طرح ٹماٹو کیچپ لگایا جیسے اس کی ناک سے خون بہہ رہا ہو اور قمیص کے سامنے والے حصے پر سبزیوں کا سوپ گرا دیا۔

ہوپر اور میں نے تھوڑا سا کیچپ اور سوپ اپنے کپڑوں پر بھی چھڑک لیا تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ ہم نے اسے پکڑنے کے لیے کتنی جدوجہد کی تھی۔ اس کے بعد ہم گاڑی سے اتر گئے اور ملٹن کو جانے کا اشارہ دے دیا۔ اس کا کام صرف اتنا تھا کہ پولیس اسٹیشن کے عقب میں گاڑی کھڑی کر کے ہماری واپسی کا انتظار کرے۔

جونہی ہم اپنی گاڑی سے باہر آئے، ٹیرنس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کیم کارڈر نکال لیا جس سے تصویر اور آواز دونوں ریکارڈ کی جا سکتی تھیں۔ وہ دیکھنے میں بہت قیمتی اور جیبی سائز کا لگ رہا تھا۔

”یہ کس لیے لے کر آئے ہو؟“ ہوپر نے پوچھا۔

”اگر تم برا نہ مناؤ تو میں اس کارروائی کی فلم بنانا چاہتا ہوں، تاکہ میں اس کا ریکارڈ رکھ سکوں۔“

”کیا کہا؟“ ہوپر آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔ ”تم ہماری فلم بناؤ گے۔ کیا تمہاری موٹی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ ایک مجرمانہ کارروائی ہے اور تم اس کا ریکارڈ رکھنا چاہتے ہو تاکہ پولیس کو ایک ثبوت مل جائے اور وہ ہمارے خلاف آسانی سے کارروائی کر سکے۔“

ہوپر کی ڈانٹ سن کر وہ تھوڑا سا افسردہ نظر آنے لگا لیکن اس نے مزید کچھ کہے بغیر وہ کیمرا اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس جانب سے مطمئن ہو جانے کے بعد ہم دونوں نے اسے اس کے کام کے بارے میں ہدایات دیں اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر چلنے لگے۔ اب ہمیں پولیس اسٹیشن کے استقبالیہ کے سامنے سے گزرنا تھا اور یہی وہ مقام تھا جہاں ہم پکڑے جا سکتے تھے لیکن لوئیس کا کہنا تھا کہ رات کے وقت ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا کیونکہ وہاں صرف ایک ڈیسک سارجنٹ ڈیوٹی پر ہوگا اور اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ بھی اس وقت کسی ہنگامی صورتِ حال میں مصروف ہوگا۔ اس لیے ہم اس کی نظروں میں آئے بغیر وہاں سے گزر سکتے تھے۔ ہمیں صرف داخلی گیٹ سے گزر کر اس دروازے تک پہنچنا تھا۔ جو سیڑھیوں کی جانب کھلتا تھا۔ اس کے بعد ہمارے لیے کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ ہمیں وہاں پر نصب کئی کیمروں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ہوپر اور میں نے اپنی اپنی ٹوپیوں کو آگے کی طرف جھکا لیا تھا اور اسی طرح ٹیرنس کو بھی مجبور کیا کہ وہ کم از کم زندگی میں ایک بار اپنی بیس بال کیپ کو سیدھا کر کے پہنے تاکہ اس کا بدصورت چہرہ کسی حد تک چھپ جائے۔

پولیس اسٹیشن کے کونے پر پہنچتے ہی ہم نے ایکٹنگ شروع کر دی۔ ٹیرنس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اپنے آپ کو ہماری گرفت سے آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا جبکہ میں اور ہوپر اس پر لعن طعن کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایسے جملے ادا کر رہے تھے جن میں ڈرانے دھمکانے کا عنصر نمایاں تھا۔ مثلاً یہ کہ ”بیٹا بہت ہو چکا۔ ایک رات حوالات میں گزارو گے تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔“ وغیرہ وغیرہ۔ اس حرکت کا مقصد صرف وہاں سے گزرنے والے راہ گیروں کو مطمئن کرنا تھا، البتہ یہ طے تھا کہ پولیس اسٹیشن کے اندر داخل ہوتے ہی ہم خاموشی اختیار کرلیں گے کیونکہ ہم کسی کو بلاوجہ اپنی جانب متوجہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ہم جب اندر داخل ہوئے تو وہاں کا منظر ہماری توقع کے عین مطابق تھا۔ ڈیسک سارجنٹ اور تین نشے میں دھت افراد کے درمیان کسی مسئلے پر زوردار بحث ہو رہی تھی۔ اس لیے کسی کی نظر ہم پر نہ گئی اور ہم بہ آسانی وہاں سے گزرتے چلے گئے لیکن جیسے ہی ہم دروازے تک پہنچے۔ نہ جانے کہاں سے ایک لیڈی کانسٹیبل نمودار ہو گئی۔ اس نے ایک نظر ٹیرنس پر ڈالی اور نتھنے سکیڑتے ہوئے بولی۔

”لگتا ہے کہ ایک رات حوالات گزارنے کے بعد اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“

اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا منصوبہ کامیاب رہا اور پولیس کانسٹیبل کو بھی ہم پر ذرا سا شک نہیں ہوا۔ لیڈی کانسٹیبل کو شاید بولنے کی بیماری تھی۔ ٹیرنس کی شکل دیکھ کر بولی۔

''اوہ، میرے خدا، اس کے جسم سے یہ کیسی بو آرہی ہے؟''

ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ٹیرنس جیسے نوعمر لڑکے اس معاملے میں کتنے حساس ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ بول پڑا۔ ''یہ بو میرے جسم سے نہیں آرہی بلکہ......''

ہوپر نے اسے گھورا تو وہ خاموش ہوگیا لیکن لیڈی کانسٹیبل کچھ مشکوک ہوگئی لیکن اس سے پہلے ہی ہم وہ دروازہ پار کرچکے تھے۔ اس لیے اسے مزید کچھ بولنے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ میں اور ہوپر دونوں ہی محسوس کررہے تھے کہ کام کی ابتدا غلط ہوئی ہے اور ہم نے ایک ناتجربہ کار لڑکے کو اپنے ساتھ شامل کرکے خطرہ مول لے لیا ہے لیکن اب کچھ کہنے سننے کا موقع نہ تھا۔ ہم تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچے اور جیسا کہ لوئیس نے کہا تھا۔ ہوپر کو فلیٹ کا تالا کھولنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

ہم فلیٹ میں داخل ہوچکے تھے اور اس لیڈی کانسٹیبل کے سوا ہمیں کسی نے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی آواز سنائی دی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ وہ ہمیں تلاش کررہے ہیں۔ لہٰذا ہم نے سکون کا سانس لیا اور اپنی ٹارچ نکال کر مطلوبہ سامان کا جائزہ لینے لگے۔ واقعی باب کی اطلاع بالکل درست تھی۔ ٹارچ کی روشنی جہاں جہاں پڑتی، وہیں ہمیں سونے اور چاندی کے سکے نظر آتے۔ یہ سکے شیشے کی الماریوں میں رکھے ہوئے تھے جو کہ دیواروں پر نصب تھیں۔ ہم اپنے ساتھ نائیلون سے بنے ہوئے تھیلے لے کر آئے تھے چنانچہ جلدی جلدی ان سکوں کو تھیلوں میں ڈالنا شروع کردیا گو کہ ہمیں زیادہ کا لالچ نہیں تھا لیکن آسانی سے ملنے والے موقع کے پیش نظر ایک بھی سکہ وہاں چھوڑنا کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ جب ساری الماریاں خالی ہوگئیں تو ہم نے فلیٹ کے دوسرے حصوں کا بھی سرسری سا جائزہ لیا لیکن وہاں ہمارے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ہمیں اس کمرے سے ہی اتنا کچھ مل گیا تھا جو آئندہ چند برسوں تک ہمارے لیے کافی ہوتا۔ ان سکوں کو رائج الوقت کرنسی میں تبدیل کرنے کے لیے مجھے اپنے ایک دوست کی خدمات حاصل کرنا پڑتیں جو سکوں کو دھات میں پگھلانے کا ماہر تھا۔ اس کے بعد ہم اس سونے اور چاندی کو مارکیٹ میں فروخت کرکے نقد رقم حاصل کرسکتے تھے۔

میں نے کھڑکی سے جھانک کر پولیس اسٹیشن کے عقب میں واقع پارکنگ لاٹ پر نگاہ ڈالی اور اپنی ٹارچ جلا کر سگنل دیا۔ جواب میں ایک کار کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں اور بجھ گئیں۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ ملٹن روانگی کے لیے تیار ہے۔ ہمارا کام تقریباً ختم ہوچکا تھا کہ فلیٹ کے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

ہوپر اور میں اپنی جگہ پر مجسمے کی طرح ساکت ہوگئے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی اختیار کرلی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور پھر ٹیرنس سے ایک حماقت سرزد ہوگئی۔ وہ آگے بڑھا اور ریسیور اٹھا کر بولا۔

''ہیلو!''

ہوپر نے اس تک پہنچنے میں لمحہ بھر کی دیر نہیں لگائی اور اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر کال منقطع کردی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا اور وہ کھا جانے والی نظروں سے اپنے بھتیجے کو گھور رہا تھا۔ بالآخر اس سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ غصے سے بولا۔

''تمہیں فون اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میں نے سوچا کہ شاید کوئی اہم فون ہو۔'' ٹیرنس نے سادگی سے کہا۔ ''میرے اسکول کے جتنے بھی ساتھیوں نے عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے کہیں کام کیا، وہاں وہ زیادہ تر ٹیلی فون ہی ریسیو کیا کرتے تھے۔''

میں نے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک سیدھا سادہ کام پیچیدگی اختیار کرلے لہٰذا میں نے کہا۔ ''یہاں سے نکل چلو۔''

اس کے ساتھ ہی میں اور ہوپر دروازے سے نکل کر سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگے۔ ہم نے ٹیرنس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس نے خود ہی اپنے لیے مشکل کھڑی کی تھی اور اسے اپنے طور پر ہی اس سے نکلنا تھا لیکن یہ ہماری بھول تھی۔ صرف وہ ہی نہیں بلکہ ہم بھی مشکل میں پھنس گئے تھے۔ جونہی ہم سیڑھیوں پر پہنچے تو دیکھا کہ نیچے بہت سے پولیس والے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں ہماری جانب تھیں۔ ہم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ شاید یہ اس سے بھی زیادہ بری صورتِ حال تھی اور یہ سب ٹیرنس کو ساتھ ملانے کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ لیڈی کانسٹیبل بھی وہاں موجود تھی جس سے میں نے اندازہ لگالیا کہ اس نے دوسروں کو خبردار کیا ہوگا۔ ان میں سب سے نمایاں ایک سینئر پولیس افسر تھا جو کم از کم چیف سپرنٹنڈنٹ کے عہدے کا ہوگا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں موبائل فون پکڑا ہوا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ فون اسی نے کیا ہوگا۔ اس نے ہمیں

گھورتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تو تم لوگ رنگے ہاتھوں پکڑے ہی گئے۔''

میرے اور ہوپر کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس لیے خاموش رہنے میں ہی عافیت تھی۔ اب ہم اس سزا کے بارے میں سوچ رہے تھے جو پولیس آفیسر کا بھیس بدل کر چوری کرنے کے الزام میں مل سکتی تھی۔ گویا ہم سے دہرا جرم سرزد ہوا تھا۔

اس مشکل صورتِ حال میں ہم دونوں ٹیرنس کو بالکل ہی بھول گئے پھر ہم نے اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور وہ اس سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے کیمرا آنکھوں سے لگا رکھا تھا جیسے وہ اس پورے منظر کی عکس بندی کر رہا ہو اور گلے میں وہی شناختی کارڈ لٹکا ہوا تھا جو اس نے راستے میں ملٹن کو دکھایا تھا۔

اس نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ڈرامائی انداز میں پولیس والوں کو مخاطب کیا جو سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہوئے اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ''شام بخیر۔ خواتین و حضرات۔''

پولیس والوں نے اسے مشکوک انداز میں دیکھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اسے نوعمر ہونے کی وجہ سے کوئی رعایت دینے کے حق میں نہیں تھے، وہ جان گئے تھے کہ ٹیرنس بھی ہمارا ہی ساتھی ہے۔

ٹیرنس نے انہیں مزید سوچنے کا موقع نہیں دیا اور بولا۔ ''تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس پولیس اسٹیشن کو ڈینجر مین ایٹ ورک کی شوٹنگ کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں باقاعدہ سرکاری اجازت نامے کی نقل تمہیں صبح تک مل جائے گی۔''

پولیس والوں کا ردعمل انتہائی حیران کن تھا۔ ان کے چہروں پر ایک منٹ پہلے تناؤ کی جو کیفیت تھی، اچانک ہی مسکراہٹ اور خوشی میں بدل گئی۔ ان میں سے کچھ تو زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ وہ سب اپنے آپ کو اسمارٹ، خوش مزاج اور اسپورٹس مین ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ٹیرنس اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''شاید تم نہیں جانتے کہ اس وقت بھی خفیہ کیمروں کی مدد سے یہاں کی منظرکشی کی جا رہی ہے جسے پورے برطانیہ میں دکھایا جا رہا ہے۔ تم سب اس شو کا حصہ ہو جبکہ میں اور میرے ساتھی درحقیقت اداکار ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ تم انہیں گرفتار کرنے والے تھے۔''

پولیس والوں نے بے چینی سے اپنے قدموں کو دائیں بائیں جنبش دی اور چیف سپرنٹنڈنٹ نے سر ہلا کر اعتراف کیا کہ وہ ایسا ہی کرنے والا تھا پھر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جیسے یہ ظاہر کرنا چاہ رہا ہو کہ وہ خود کتنا بڑا اسپورٹس مین ہے۔

ٹیرنس بولا۔ ''اب میں اور میرے ساتھی تمہارے درمیان سے گزر کر پارکنگ لاٹ تک جائیں گے جہاں ہمارا ایک اور ایکٹر پولیس کار میں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ ہمارے خفیہ کیمرے اس منظر کے ساتھ ساتھ تمہارے ردعمل کو بھی ریکارڈ کریں گے۔''

پولیس والے جوش اور مسرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ شاید انہیں اس سارے کھیل میں مزہ آ رہا تھا۔ ٹیرنس نے سیڑھیاں اترنا شروع کیں اور ہم اس کے آگے آگے چل دیے۔ اب ہم تینوں نیچے آ چکے تھے۔ ٹیرنس نے بڑی احتیاط سے اپنا کیمرا سیڑھیوں پر ایسی جگہ رکھ دیا جہاں سے وہ چیف کو فوکس کر سکے۔ چیف نے براہِ راست کیمرے کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ایسی چمک ابھری جیسے اس کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہو۔

''براہِ کرم راستہ دے دیجیے۔'' ٹیرنس نے کہا تو وہ سب بڑی فرمانبرداری سے ایک جانب ہٹ گئے تاکہ ہمیں پارکنگ لاٹ تک جانے کا راستہ مل سکے۔

جانے وہ کب تک وہاں کھڑے ان کیمروں کے خیال سے اپنے تاثرات ظاہر کرتے رہے جن کا کوئی وجود نہیں تھا اور نہ ہمیں اس بارے میں جاننے کی ضرورت تھی۔ ہم تینوں بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے اپنی کار تک پہنچے اور ملٹن نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اس کے بعد سب کچھ بڑے اچھے طریقے سے ہوتا گیا۔ ہم نے ان سکوں کو سونے اور چاندی میں ڈھال کر اس کے عوض نقد رقم حاصل کی اور اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ میرے حصے میں جو رقم آئی وہ آئندہ چھ ماہ کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔ البتہ ایسا پہلی بار ہوا کہ ہمیں لوٹ کے مال کو چار کے بجائے پانچ حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ کیونکہ ٹیرنس کو بھی ہمیں برابر کا حصہ دینا پڑا۔ وہی تو ہمیں اس عذاب سے نکال کر لایا تھا۔ ورنہ مجھے اور ہوپر کو جانے کتنا عرصہ جیل میں رہنا پڑتا لیکن جس ہوشیاری سے اس نے ہم دونوں کو وہاں سے نکالا، اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب مجھے یقین آ گیا کہ تجربہ خواہ کیسا بھی ہو، وہ کبھی رائگاں نہیں جاتا۔

محفلِ شعر و سخن

❄ امجد ریاض...... یچیچہ وطنی

طبیب یوں کوششیں نہ کر تجھے کیا خبر میرے مرض کی
تو عشق کر، پھر چوٹ کھا، پھر دوا کر میرے مرض کی

❄ شازیہ...... کراچی

کیسے گوارا کرلوں میں ان پل دو پل کے سہاروں کو
آنچل میں کیوں باندھ کے رکھوں پت جھڑ جیسی بہاروں کو
وہ کیا جانیں کہ ایک خدا کی پوجا میں کیا ملتا ہے
در در سجدے کرتے ہیں جو دولت کی جھنکاروں کو

❄ ریاض بٹ...... حسن ابدال

مدتوں پہلے کہ جب تجھ سے تعارف بھی نہیں تھا
تیری تصویر بناتے تھے خیالات میرے

❄ اظہر حسین بچار...... ہزاری، جتوئی

سب اس پہ متفق تھے کہ مجھ سے عناد تھا
یارو! بات بات میں ورنہ تضاد تھا
سب کی الگ زبان تھی، لہجے الگ الگ
کتنا مخالفت میں مگر اتحاد تھا

❄ ایم کامران خالد، میاد...... چھب

تجھے بھول کے بھی نہ بھلاسکوں تجھے چاہ کے بھی نہ پاسکوں
میری حسرتوں کو شمار کر، میری چاہتوں کا صلہ نہ دے

❄ فلک شیر ملک...... رحیم یار خان

تیری آنکھوں میں میرے رنگ رہیں نہ رہیں
میری خوشبو اپنی سانسوں میں بسائے رکھنا

❄ انعم کمال...... کراچی

ساتھ بھنور میں چھوڑ دیا اور ڈوبنے والے ہار گئے
دشت جنوں میں تنہا کر کے سب اپنے گھر بار گئے

❄ محمد اسماعیل اجاگر...... پنڈ یکھیب، ضلع اٹک

آج تنہائی کسی ہمدم دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے میری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور جھلکنے لگے تیرا عکس ہر سائے تلے

❄ محمد بشارت...... کنگر دورہ

آج پھر بجھ گئے جل جل کے امیدوں کے چراغ
آج پھر تاروں بھری رات نے دم توڑ دیا

❄ عتیق الرحمان...... سمندری، فیصل آباد

میں عمر بھر تلاش ہی کرتا رہا سکون
جب زندگی تمام ہوئی میں سفر میں تھا

❄ عبدالجبار رومی انصاری...... چوہنگ سٹی، لاہور

معلوم نہیں اڑ کے کدھر جاتے ہیں
پیچھا نہیں ممکن یہ جدھر جاتے ہیں
ہاں اتنا تو اندازہ ہوا ہے مجھ کو
اوراق ہیں عمر کے بکھر جاتے ہیں

❄ آمنہ شاہد آرائیں، میاں شاہد آرائیں...... شیخوپورہ

ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز
کچا تیرا مکان ہے کچھ تو خیال کر

❁ غلام یٰسین نونآری......ضلع مظفر گڑھ
غربت نہ دے سکی مرے پندار کو شکست
جھک کر کسی امیر سے ملتا نہیں ہوں میں

❁ محمد عمر زاہد، محمد صفدر معاویہ......خانیوال
مجھے کیا خبر کہ وہ عشق تھا
نماز تھی کہ سلام تھا
میرا اشک اشک تھا مقتدی
تیرا حرف حرف امام تھا

❁ طالب حسین طلحہ......تحصیل حاصل پور منڈی
شبِ فراق میں ہوئی ہے نیند سے بات
تو اب کیوں نہیں آتی ہے مجھ غریب کے پاس
وہ ہنس کے بولی کہ تو ہی ہے وہ
میں تیرے پاس رہوں یا تیرے نصیب کے پاس

❁ ملائکہ حریم......اوکاڑہ
میں انتظار کا قائل نہ تھا مگر تو نے
لگا دیا مجھے دیوار سے، گھڑی کی طرح

❁ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
اٹھنے لگیں زخموں سے تو کچھ اور بھی ٹیسیں
اے چارہ گرو! درد کا مرہم ہے یہ کیسا
کیا پھر کوئی مظلوم یہاں مارا گیا ہے
زندان میں ہنگامۂ ماتم ہے یہ کیسا

❁ مدحت......کراچی
تم کہہ رہے ہو خواہشیں، میں کہہ رہی ہوں بندشیں
تم کہہ رہے ہو خواب ہیں، میں کہہ رہی ہوں سازشیں
مجھ کو عزیز اپنی انا، ہے زعم تم کو حسن پر
میں جانتی ہوں پیار میں کیوں بڑھ رہی ہیں رنجشیں

❁ داؤد اشفاق......اوکاڑہ
الجھا ہوا ایسا کہ کبھی کھل نہیں پایا
سلجھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح تھا

❁ ماہین فاطمہ......اوکاڑہ
مجھ کو پاگل ہی نہ کردیں کہیں سوچیں میری
دل کے اندر کوئی آتا ہے تو جاتا کیوں ہے

❁ اشفاق شاہین......کراچی
ہر کوئی سنگ بکف ہے تو تعجب کیسا
دوست بھی تو نے مرے یار، بنائے تھے بہت

❁ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
تخت و تاج کی بازی میں کب جیت ہوئی غم خواروں کی
یہ کھیل بھی ہے زرداروں کا، یہ بازی ہے سرداروں کی
ہم پیار محبت والے ہیں اور امن بھی ہم کو پیارا ہے
یہ نیزے کیوں لہراتے ہو یہ جنگ ہے کیوں تلواروں کی

❁ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
انسانوں کی بستی میں کچھ ایسے ہیں دیوانے لوگ
اللہ کے نائب بن بیٹھے پر انساں کو نہ جانے لوگ
ہر اک چہرہ پڑھتے جائیں، ہر اک دامن چاک کریں
ہر اک جوہر ڈھونڈ کے لائیں، خود کو نہ پہچانے لوگ

❁ اطہر حسین......کراچی
یہاں خوابوں کی شاخوں پر کھلے ہیں پھول کچھ ایسے
وہ جب مہکے تو آنکھوں پر کئی الزام بھی دیکھے
لیے بیٹھے ہو کیوں قصہ زمانے کے رواجوں کا
کمایا تھا جنھوں نے نام وہ بدنام بھی دیکھے

❁ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
سکون میسر نہیں انسان کو کسی بھی لمحے
جنازے والے بھی کاندھے بدلتے رہتے ہیں

❁ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
کچھ اور بڑھ گئے اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

❁ احمد حسن عرضی خان......قبولہ بائی پاس
میں کیوں نہ پھروں دوپہروں میں ہراساں
برساتی ہیں اطراف سے پتھر تیری یادیں

❁ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
بارود برستا ہو جہاں روز زمیں پر
اُس دیس میں پھولوں کے زمانے نہیں آتے
جس دیس میں ہوں نوحہ کناں گلشن وصحرا
پنچھی وہاں آزادی کے نغمے نہیں گاتے

❁ راشد حبیب تابش......چھب، ضلع اٹک
ستاروں کی تمنا کررہا تھا
وہ میری اوقات کو سمجھا نہیں تھا

❁ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن خانیوال
باہر آتی نہیں دراڑ کوئی
ہجر اندر سے توڑ دیتا ہے

❄ فرحانہ عاصم......کراچی

تمہاری وہ یاد ہوں میں
ہمیشہ جسے بھول جاتے ہو

❄ مدثر احمد.....ملتان

محبتوں کے درانہ راستے
نہ کبھی الجھے نہ کبھی سلجھے

❄ ادریس خواجہ......سیالکوٹ

فقط ہوا تو یہی ہوا
کہ کوئی کسی کا نہ ہوا

❄ راجہ ثاقب محمود جنجوعہ......پنڈدادن خان، جہلم

ہم کب تجھ سے مانگتے ہیں اپنی وفاؤں کا صلہ
ملتے رہا کرو درد بڑھانے کے لیے

❄ امتیاز علی......پھالیاں

موضوع ہی بدل دیتا ہے میرے ذکر پہ
دیتا تھا جو ہر بات پہ حوالے میرے

❄ مہتاب احسان......حیدرآباد

مجھے کیا پتا دکھوں کی قیمت کا
اپنوں نے مفت میں دیے ہیں مجھے

❄ بلقیس فاطمہ......میرپورخاص

جب سے اس نے پوچھا کون ہو تم
تب سے نہ جانے کون ہوں میں

❄ نورین شہزاد......اسلام آباد

کانٹوں کے ساتھ رہتے ہیں کردار تو دیکھو پھولوں کا
زخموں سے کلیجا پھٹ جائے پر ساتھ نبھانا ہوتا ہے

❄ زینب کوثر ......سرگودھا

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کرلے

❄ سحرش......کوئٹہ

کچھ کو ہم نے شعر کا پیکر عطا کیا
کچھ لفظ اشک بن کے ان آنکھوں سے ڈھل گئے

❄ محمد اشفاق سیال......بشور کوٹ سٹی

مانا کہ تیرے لطف و کرم میں کمی نہیں
آسان اس قدر تو تیری دوستی نہیں

❄ محمد جاوید......تحصیل علی پور

تسکینِ دل کے لیے اداسی کا سامان ہوجائے
ان کا کوئی ستم اے کاش مہربان ہوجائے

❄ مرزا طاہر الدین بیگ......میرپورخاص

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

❄ رضوان احمد......کورنگی، کراچی

محفل میں جسے دیکھو تمہیں دیکھ رہا ہے
تم سارے حسینوں میں طرح دار بہت ہو

❄ محمود علی......حیدرآباد

دل کی دنیا صحرا صحرا، صحرا میں تنہائی ہے
پیاسا پیاسا من کا ساگر، ساگر میں گہرائی ہے

❄ محمد زریان سلطان......اردو بازار، کراچی

وہ دور کوئی اور تھا جب دل کا بھرم تھا
اب ملتا ہے بازار میں دو چار درم کا

❄ احمد علی......میرپورخاص

راہِ وفا میں ہم کو اک احساس تھا خاطر داری کا
تجھ کو بھی ہم بھول گئے اور خود کو بھی نہ یاد کیا

❄ نازیہ......کراچی

جان کے بازی ہار کے بھی ہم ان کا دل نہ جیت سکے
مل نہ پائے دل کے بدلے صبح و شام محبت کے

❄ ناہید......فیصل آباد

وہ کیا جانیں پیار کے رسیا کتنے پاگل ہوتے ہیں
دیپ جلانے آجاتے ہیں پروانوں کی بستی میں

❄ فرحان علی......میانوالی

جھوٹ دغا فطرت ہے تمہاری، وعدہ خلافی عادت ہے
کس کس بات کو جھٹلاؤ گے تم پہ ہیں الزام بہت

جیسے کو تیسا

فاروق انجم

خواہشات کا گھوڑا جب بے لگام ہوجائے تو زندگی کا سفر اتنا ہی مشکل ہوجاتا ہے جیسا کہ ان کا ہوا... انہیں ایک دوسرے کی خوشنودی تو مقصود تھی مگر ایک دوسرے کی مشکلات اور تلخ حقائق کا ذرا بھی ادراک یا احساس نہ تھا... کہنے کو وہ یک جان دو قالب تھے... کوئی لاکھ منہ سے کہے اصل حقیقت تو حالات واضح کرتے ہیں کہ وہ واقعی یک جان ہیں یا دو الگ الگ دنیاؤں کی مخلوق۔

میاں بیوی کے رشتے کی باریکیوں کو سمجھاتی ایک پراثر کہانی

قسمت بڑی عجیب چیز ہے، کبھی بھی اور کسی بھی وقت پلٹا کھا سکتی ہے۔ کچھ ایسا ہی مجاہد کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اس نے وکالت کی تو ایک بڑے وکیل کے ساتھ منسلک ہونے کا موقع مل گیا۔ اپنی محنت سے اس نے وکیل صاحب کے دل میں گھر کرلیا اور اچھی خاصی آمدن کا سلسلہ چل نکلا۔ کمائی ہونے لگی تو گھر والوں نے اس کے لیے لڑکی تلاش کرنا شروع کردی۔ پھر جلد ہی انہیں ایک اچھا کھاتا پیتا گھرانا مل گیا۔ شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ مجاہد کے بڑے بھائی بھی شادی شدہ تھے اور گھر میں اس کے لیے کوئی کمرا نہیں بچا تھا، چنانچہ اسے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لینا پڑا۔

مجاہد کی شادی ہوگئی۔ گھر میں اس کی بیوی آگئی جس کا نام راحیلہ تھا۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور بہت ہنس مکھ بھی تھی۔ دونوں کی نئی زندگی کا آغاز ہوچکا تھا۔ دن رات پیار محبت کی باتیں ہوتی تھیں، ہنسی جلترنگ کی طرح بکھرتی تھی اور ایک دوسرے کے ناز اٹھائے جارہے تھے۔ مجاہد راحیلہ کو کھانا کھلانے کے لیے اکثر ہوٹل لے جاتا تھا۔ گھومنے پھرنے کے

لیے وہ جب دل چاہتا نکل جاتے۔ دونوں اپنی زندگی میں آنے والی ازدواجی تبدیلی پر بہت ہی زیادہ خوش وخرم تھے۔

شادی کے ابتدائی دنوں کے بعد مجاہد دوبارہ اپنے کام پر چلا گیا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ اسی ہنسی خوشی میں شادی کو پانچ ماہ گزر گئے۔ مجاہد کے ساتھ ایک اور نوجوان وکیل کام کرتا تھا۔ اس کا نام رفیق ضرور تھا لیکن وہ اچھا رفیق نہیں تھا۔ یہ بات اُس کی برداشت سے باہر تھی کہ بڑے وکیل صاحب اس کی نسبت مجاہد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اندر ہی اندر اس بات سے حسد کرتا تھا۔ پھر جیسے ہی مجاہد کو اپنی شادی کے لیے چھٹیاں لے کر جانا پڑا، رفیق نے وکیل صاحب سے مجاہد کے خلاف کان بھرنا شروع کردیے۔ جب تک مجاہد شادی کی چھٹیوں میں مصروف رہا تب تک رفیق اپنا کام کر چکا تھا اور وکیل صاحب کے دل میں مجاہد کے لیے میل آ گیا تھا۔ اور پھر وکیل صاحب نے اس کی باتوں میں آکر فیصلہ کرلیا کہ وہ مجاہد کو اپنے چیمبر سے فارغ کردیں گے۔

جب مجاہد چھٹیاں ختم کر کے واپس آیا تو وکیل صاحب کا دل نہ چاہا کہ وہ ابھی مجاہد کو فارغ کریں۔ انہیں ترس آنے لگا کہ ابھی ابھی اس کی نئی شادی ہوئی ہے، اور پھر وکیل صاحب بھی تذبذب کا شکار ہو گئے۔ کچھ وقت اور گزر گیا لیکن رفیق کب رکنے والا تھا۔ جب اس نے وکیل صاحب کا دل موم ہوتا دیکھا تو پھر مجاہد کے خلاف زہر اگلنے لگا۔ وکیل صاحب فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے او انہیں اپنے اکاؤنٹنٹ کو ہدایت کرنی ہی پڑی اور ان کے اکاؤنٹنٹ نے حساب کتاب بنا کر ایک بند لفافہ تیار کیا اور مجاہد کو دیتے ہوئے کہا۔

''اس میں آپ کا تمام حساب کتاب ہے۔ اب آپ کوئی اور چیمبر دیکھ لیں۔''

''کیا مطلب؟'' مجاہد حیران ہوا۔

''مطلب یہ کہ اب آپ کے ساتھ میاں صاحب مزید کام نہیں کرسکتے۔'' چونکہ وکیل صاحب کا نام میاں ادریس تھا۔ اس لیے اس نے 'میاں' صاحب کا لفظ استعمال کیا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔'' مجاہد سمجھ تو گیا تھا لیکن واضح الفاظ میں بات سننا چاہتا تھا۔

اکاؤنٹنٹ نے ایک ہی سانس میں کہا۔ ''میاں صاحب اسلام آباد پیشی پر چلے گئے ہیں۔ انہوں نے آپ کو نوکری سے برخاست کردیا ہے۔ اب آپ ان کے اسسٹنٹ وکیل نہیں رہے۔ آپ کا حساب کتاب کردیا گیا ہے آپ کوئی اور چیمبر دیکھ لیں جہاں آپ کام کرسکیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں ان کا قابل اسسٹنٹ وکیل ہوں۔'' مجاہد جلدی سے بولا۔

''آپ ان سے فون پر بات کرلیں۔'' اکاؤنٹنٹ نے اپنی جان چھڑانی چاہی۔ رفیق ایک طرف بیٹھا دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وکیل صاحب کی غیر موجودگی میں اب وہ چیمبر کا باس تھا، اس سے پہلے یہ اختیار مجاہد کے پاس ہوتا تھا۔

مجاہد نے وکیل صاحب کو فون کر کے بات کی تو وکیل صاحب نے مختصراً۔ ''خدا حافظ'' کہا اور فون بند کردیا۔ مجاہد موبائل فون کو.... دیکھتا رہ گیا۔

مجاہد نے فیصلہ کیا کہ وہ اب دوبارہ وکیل صاحب کو فون نہیں کرے گا۔ اس نے اسی وقت کسی اور چیمبر میں کسی بڑے وکیل کے ساتھ کام کرنے کے لیے کوششیں شروع کردیں۔ لیکن ہر بڑا وکیل پہلے ہی کئی چھوٹے وکیلوں کے ساتھ بھرا پڑا تھا۔ مجاہد کے لیے کہیں جگہ ملنا ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔

مجاہد کو ایسے وکیلوں کے پاس... جگہ مل رہی تھی جو خود وکیل تھے لیکن کام نہ ہونے کی وجہ سے روٹی روزی کے لیے کسی کی درخواست لکھنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان وکیلوں کے پاس کام کرنا مجاہد کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ خود اپنا چیمبر نہیں بنا سکتا تھا۔

اس بات کو ایک ہفتے سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ مجاہد نے یہ بات راحیلہ سے مخفی رکھی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات بتا کر وہ راحیلہ کو بھی پریشان کرے، اُسے جلد ہی کسی اچھے اور قابل وکیل کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل جائے گا وہ کسی کو پتا بھی نہیں لگنے دے گا کہ اس کے روزگار میں تعطل آیا تھا۔ وہ روز تیار ہو کر کورٹ چلا جاتا اور کسی اچھے وکیل کے ساتھ کام کرنے کی ناکام کوشش کے بعد واپس آجاتا تھا۔

دن گزرنے لگے تھے۔ جمع پونجی ختم ہونے لگی۔ مجاہد کا ذہن منتشر ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ یہ پیشہ چھوڑ کر کوئی دوسرا کام شروع کردے۔ اس کی پریشانی دو چند ہوتی جارہی تھی۔

اس شام وہ گھر گیا تو راحیلہ نے بڑے پیار سے کہا۔ ''آج میں نے کچھ نہیں پکایا۔''

''وہ کیوں؟'' مجاہد نے جوتے اتارتے ہوئے پوچھا۔

''بہت دن ہو گئے ہیں ہم باہر کھانا کھانے نہیں گئے۔ میں نے سوچا آج باہر کھانا کھاتے ہیں۔'' راحیلہ کے لہجے میں اور بھی پیار بھر گیا۔

مجاہد نے سوچا فوری انکار کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ابھی وہ ایک بار تو کھانا کھلا ہی سکتا ہے چنانچہ اس نے خوش دلی

سے جانے کی ہامی بھرلی۔

اس رات پہلی بار مجاہد کو باہر کھانا کھا کر بل دیتے ہوئے اتنی تکلیف ہوئی جیسے کسی نے اس کی پسلیوں میں مکا مار دیا ہو۔ واپسی پر مجاہد کا چہرہ ایسا اُترا ہوا تھا گویا کسی نے اس کی جیب کاٹ لی ہو۔

دوسرے دن وہ پھر کورٹ چلا گیا۔ ایک وکیل صاحب کے پاس اسے منشی کی نوکری مل رہی تھی۔ وہ وکیل تھا اور اس نے ایک قابل وکیل کے پاس کام کیا تھا۔ اس نے سوچا اگر آج اس نے منشی کی نوکری کے لیے ہامی بھرلی تو وہ ساری زندگی منشی ہی رہے گا۔ وکیل ہونے کے باوجود وہ کبھی وکیل نہیں بن سکے گا۔ چنانچہ اس نے انکار کردیا۔

اسی طرح اور دن گزر گئے۔ اس دن وہ دوپہر کے بعد ہی گھر چلا گیا۔ راحیلہ نے اُسے چائے بنا کر دی اور پاس ہی بیٹھ گئی۔

''آپ سے ایک بات کرنی تھی۔'' راحیلہ مسکرا رہی تھی۔

''ہاں کہو۔'' مجاہد بولا۔

''فضیلہ کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی ہے۔'' راحیلہ نے بتایا۔

''فضیلہ کون؟'' مجاہد نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''آپ بھول گئے۔؟'' راحیلہ نے مسکراتے ہوئے پیار بھرے انداز میں شکوہ کیا۔

''تم بتاؤ کون فضیلہ......؟'' مجاہد جاننے کے لیے.... بے تاب سا ہوگیا۔

''میری بہن فضیلہ اور کون فضیلہ...... کیا ہوگیا ہے آپ کو؟'' راحیلہ نے پیار سے بتاتے ہوئے پرشکوہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو مجاہد زبردستی مسکرایا۔

''میں بھول ہی گیا تھا۔''

''آپ کو تو پتا ہے، فضیلہ کی منگنی ہوچکی تھی اور اس کا ہونے والا شوہر دبئی میں رہتا ہے۔ وہاں وہ ایک بہت بڑی کمپنی میں جاب کرتا ہے۔ اس کی اچھی خاصی تنخواہ ہے۔ اب وہ اچانک واپس آیا تو انہوں نے بتایا کہ اس کے بعد فضیلہ کے منگیتر کو دو سال تک چھٹی نہیں ملے گی اس لیے اب آیا ہے تو ان کی شادی کردی جائے۔ شادی کے دن رکھ دیے اور پندرہ دنوں کے بعد ان کی شادی ہے۔'' راحیلہ نے تفصیل بتائی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' مجاہد بولا۔

''اچھی بات تو ہے۔ ہمیں بھی فوراً شادی کی تیاری شروع کردینی چاہیے۔ میں نے آج سارا حساب کیا ہے۔ میری خریداری اور فضیلہ کو دی جانے والی سلامی ملا کر مجھے آپ پچاس ہزار روپے دے دیں۔'' راحیلہ نے کہا تو مجاہد کو لگا جیسے راحیلہ نے اس سے پچاس ہزار روپے نہ مانگے ہوں بلکہ اچانک اس کے پیر کو بجلی کی ننگی تار لگادی ہو۔ وہ یکدم اپنی جگہ سے اُچھلا۔

''پپ...... پچاس ہزار روپے؟''

''ہاں۔'' راحیلہ نے ایسے 'ہاں' کہا جیسے اس نے ایک معمولی رقم مانگی ہو۔

''تمہیں کپڑے بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری شادی کو ابھی پانچ ماہ ہوئے ہیں۔ سارے سوٹ نئے ہیں۔ میرے پاس بھی سوٹ ہیں۔ کپڑوں کا خرچہ نکال کر جو سلامی دینی ہے، وہ پیسے مجھ سے لے لو۔'' مجاہد نے کہا۔

''ہمارے خاندان میں ایسا رواج نہیں ہے۔ ہماری بھی عزت ہے۔ برادری میں ناک اونچی رکھنے کے لیے ہم بہنیں ہر شادی میں نئے کپڑے ہی سلواتی ہیں۔ ہم کسی کی بات سننا گوارا نہیں کرتے... اپنی شادی کے جوڑے میں کئی بار پہن چکی ہوں۔ وہ پرانے ہوچکے ہیں۔ آپ مجھے ابھی پچاس ہزار روپے دے دیں، تاکہ میں اپنی بہنوں کے ساتھ کل شاپنگ کرسکوں۔ شادی میں کوئی زیادہ دن نہیں رہتے ہیں۔'' راحیلہ نے فوراً کہا۔

مجاہد کے پاس پچاس ہزار روپے نہیں تھے۔ اس کے پاس جو پیسے بچے تھے تو وہ پھونک پھونک کر خرچ کررہا تھا۔ ایک دم سے پچاس ہزار روپے دینا اس کے لیے قطعی ناممکن تھا۔

''دیکھو تم مجھ سے سلامی کے پیسے لے لینا۔ کپڑے ہمارے پاس ہیں۔ ان کی ضرورت نہیں ہے۔'' مجاہد نے سمجھانے کی کوشش کی۔

راحیلہ نے اس کی طرف متانت سے دیکھا۔ ''کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ میری ساری بہنیں نئے کپڑے سلوا کر پہنیں اور میں پرانے کپڑے پہنوں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ مجھے پیسے چاہئیں بس۔'' راحیلہ کا انداز فیصلہ کن تھا۔ ان پانچ ماہ میں پہلی بار راحیلہ نے کسی بات پر اس طرح خفگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اندر کی ضد کی جھلک دکھائی تھی۔

''اچھا، میں سوچتا ہوں۔'' مجاہد نے فی الحال بات ختم کرنی چاہی۔

''سوچنا نہیں ہے۔ آپ نے مجھے پیسے دینے ہیں۔'' راحیلہ کے لہجے میں تغیر آگیا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی تھی اور چہرہ ایسا ہوگیا تھا جیسے وہ مجاہد سے اپنا کوئی ادھار وصول کررہی ہو۔ راحیلہ کا یہ روپ مجاہد

کے لیے حیران کن تھا۔

"اگر نہ دیے تو؟" مجاہد جو پہلے ہی پریشان تھا، اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"پیسے تو آپ کو دینے ہی پڑیں گے۔" راحیلہ نے بھی آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا۔

"اگر نہ دیے تو......؟" مجاہد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے غصے سے کہا۔

وہ نرم و نازک اور ہر وقت مسکرا کر مجاہد سے بات کرنے والی راحیلہ جانے اچانک کہاں غائب ہوگئی اور ایک نئی راحیلہ کا درشت لہجہ مجاہد کی سماعت سے ٹکرایا۔ "تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"کیا کروگی تم؟" راحیلہ کا یہ تغیر دیکھ کر مجاہد ایک لمحے کے لیے ڈر گیا تھا لیکن پھر بھی ڈٹ کر بولا۔

"یہ آپ بھی دیکھ لیں گے اور پورا محلہ بھی دیکھے گا۔" اس کے لہجے کی درشتگی بتا رہی تھی کہ وہ کچھ بھی کر گزرنے کی ہمت رکھنے والی بیوی ہے۔ مجاہد نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ نرم مزاج راحیلہ کے پیچھے کوئی اور ہی راحیلہ چھپی بیٹھی ہے۔

راحیلہ کہہ کر غصے سے چلی گئی اور مجاہد دم بخود سوچتا رہ گیا۔

اس کے بعد گھر کا ماحول بہت کشیدہ ہوگیا تھا۔ راحیلہ کا منہ پھول گیا تھا اور آنکھیں ایسے بدل گئی تھیں جیسے وہ مجاہد کو جانتی ہی نہ ہو۔ مجاہد نے کوشش کی کہ وہ اس سے بات کرے لیکن راحیلہ نے بات کرنا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ مجاہد کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ اپنے خاندان کی سب سے ضدی اور ہٹ دھرم لڑکی تھی۔ وہ ایک بار جب ضد کے پتھر پر قدم جما لیتی تھی تو پھر کوئی اسے وہاں سے اس کی بات مانے بغیر ایک انچ بھی نہیں ہٹا سکتا تھا۔ کیونکہ پانچ ماہ میں ایسی کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی، گھر میں ساس اور نندیں نہیں تھیں کہ جس سے برتن ٹکراتے اور یہ حقیقت منکشف ہوتی۔ اب فضیلہ کی شادی آئی، پیسوں کا معاملہ اُٹھا تو راحیلہ کا اصل روپ سامنے آیا۔

وہ پہلی رات تھی جب دونوں الگ الگ کمروں میں سوئے تھے۔ صبح راحیلہ نے ناشتا بھی تیار کر کے نہیں دیا اور وہ منہ بنائے اپنے کمرے میں بند رہی۔ مجاہد سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے اس کے پاس آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس نے کبھی کسی سے پیسے نہیں مانگے تھے اور اگر وہ کسی سے مانگ بھی لیتا تو اسے واپس کیسے کرتا کیونکہ وہ اس وقت.... بے روزگار تھا۔ وہ کسی سے جھوٹا وعدہ کر کے پیسے لے کر کسی آفت میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اسی چیمبر میں کام کر رہا ہوتا تو وہ کسی سے پیسے ادھار لے کر راحیلہ کو دے بھی سکتا تھا اور پیسے واپس کرنا بھی اس کے لیے مسئلہ نہ ہوتا۔

مجاہد نے سوچا کہ فی الحال وہ ایک جھوٹ بول کر راحیلہ کا غصہ کم کرے اور اس سے ناشتا تو بنوا لے۔

مجاہد اس کے پاس گیا اور بولا۔ "دیکھو تم ناراضگی چھوڑ دو۔ میں تمہیں شام کو پیسے دے دوں گا۔ تم اب غصہ تھوک کر ناشتا تیار کرو، مجھے جانا ہے۔" مجاہد نے سوچا تھا کہ ایسا کرنے سے وہ اپنا غصہ ختم کر دے گی اور جب غصہ نہیں ہوگا تو وہ اسے سمجھانے میں کامیاب ہوسکے گا کہ وہ ان دنوں کن حالات سے گزر رہا ہے۔ غصے اور ناراضگی کی وجہ سے تو وہ اس کی بات سننے کو بھی تیار نہیں تھی۔

مجاہد کی بات نے یہ اثر کیا کہ راحیلہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور ناشتا تیار کرنے چلی گئی۔ مجاہد کو تسلی ہوئی کہ کچھ برف پگھلی ہے۔ جب راحیلہ ناشتا لے کر اس کے پاس آئے گی تو وہ ناشتے کے دوران آرام سے سمجھا دے گا کہ وہ فی الحال اس کی ضرورت پوری نہیں کرسکتا ہے، وہ برسرِ روزگار نہیں ہے۔

لیکن اس وقت مجاہد دم بخود رہ گیا جب راحیلہ اس کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھ کر دوٹوک لہجے میں بولی۔

"آپ نے شام کو پیسے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر آپ نے مجھے شام کو پیسے دے دیے تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اور اگر پیسے نہ دیے تو میرا سوٹ کیس تیار ہوگا اور میں میکے چلی جاؤں گی۔ اور میں ایسا کر دوں گی کیونکہ میرا پورا خاندان جانتا ہے کہ میں اپنی بات منوا کر رہتی ہوں۔" راحیلہ نے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر دیا۔

مجاہد نے جو سوچا تھا اس کے برعکس ہوگیا تھا۔ اب وہ ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ بیوی کو میکے جانے سے روکنے کے لیے شام کو پچاس ہزار روپے اس کی جیب میں ہونے بہت ہی ضروری تھے۔

☆......☆......☆

مجاہد اب تو وکیل کا منشی بننے کو بھی تیار تھا لیکن وہاں گیا تو پتا چلا کہ انہوں نے منشی رکھ لیا ہے۔ دوسری جگہ ایک وکیل صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے کشادہ دلی سے کہا کہ وہ اس کا سارا چیمبر سنبھال لے۔ وہ خود بھی کمائے اور اسے بھی کھلائے۔ اب مجاہد ایسا وکیل تو تھا نہیں کہ اس کا نام سن کر لوگ کیس لے کر اس کے پاس آجاتے۔

مجاہد کو وہ بات یاد آنے لگی جو ایک بوڑھے وکیل نے ان کے چیمبر میں بیٹھ کر کہی تھی۔

"وکیل دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے پاس

کھانے کو روٹی نہیں ہوتی اور دوسرے وہ جن کے پاس روٹی کھانے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔''

مجاہد کا فی الحال ایسے وکیلوں کے ساتھ واسطہ پڑ رہا تھا جن کے پاس وقت تو بہت تھا لیکن کام نہیں تھا۔

مجاہد سارا دن گھوم کر باہر نکلا اور سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ گھر جائے گا تو بیوی سامان باندھے بیٹھی ہوگی۔ پیسے دے گا تو صلح ہو جائے گی اور نہیں دے گا تو سامان لے کر چلی جائے گی۔ مجاہد چلتا ہوا کچھ دور نکل گیا۔ سڑک کنارے ایک ہوٹل تھا۔ اس ہوٹل کی دال بہت مشہور تھی۔ لوگ دور دور سے دال کھانے کے لیے آتے تھے۔ مجاہد نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ راحیلہ نے ناشتا بنا کر جو کڑوی شرط بتائی تھی اسے سننے کے بعد کس کے حلق سے لقمہ اُتر سکتا تھا۔

مجاہد ابھی بیٹھا ہی تھا کہ تقریباً اسی کا ہم عمر اس کے پاس آتے ہوئے بولا۔ ''تم مجاہد ہی ہو نا؟''

مجاہد اپنا نام اس اجنبی کے منہ سے سن کر یکدم چونکا اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہاں، میں مجاہد ہی ہوں۔''

''مجھے پہچانا...... میں خادم...... تمہارا کلاس فیلو......''

اس نے مسکراتے ہوئے اپنے بارے میں بتایا تو یکدم مجاہد کو یاد آیا کہ یہ وہی خادم ہے جو اس کے ساتھ اسکول اور کالج میں پڑھتا رہا تھا۔ وہ اسکول کے زمانے میں ہی بہت ہوشیار، چالاک اور باتونی تھا۔ اپنی تیز طراری کے سبب وہ دوسرے پر غالب آجانے کا فن خوب جانتا تھا۔ پھر اس نے کالج سے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اب اچانک چند سال کے بعد وہ اسے مل گیا تھا۔

''ارے...... تم خادم ہو۔'' مجاہد کے چہرے پر صبح سے اب تک پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ خادم اسی کی میز پر بیٹھ گیا اور کچھ فاصلے پر بیٹھے اپنے ساتھی کو بھی اسی میز پر بلا لیا۔ جیسے ہی وہ نوجوان اس میز پر آیا، خادم نے اس کا تعارف کرایا۔

''یہ لطیف ہے۔ میرا بزنس پارٹنر......''

''تم بزنس کرتے ہو؟'' مجاہد نے جلدی سے پوچھا۔

''پہلے کچھ کھانے کے لیے منگوا لیں پھر باتیں کرتے ہیں۔ کھانا تم میری طرف سے کھاؤ گے۔ دیکھو تکلف نہیں چلے گا۔'' خادم نے ویٹر کو بلا کر دال روٹی، سلاد اور ٹھنڈی بوتلوں کا آرڈر دیا اور پھر بولا۔

''تم کیا کر رہے ہو؟ کوٹ اور ٹائی سے تو لگ رہا ہے کہ تم وکیل ہو۔''

مجاہد کے چہرے پر افسردگی آگئی اور اس نے بتایا۔ ''وکیل ہوتا تھا، لیکن اب کچھ نہیں ہوں۔ اچھا خاصا روزگار لگا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب تو لگتا ہے کہ آج میرا گھر بھی ٹوٹ جائے گا۔''

مجاہد کے منہ سے اپنی پریشانی کی بات نکل ہی گئی...

خادم نے فوراً پوچھا۔ ''کیسے گھر ٹوٹ جائے گا؟ کیا ہوا؟ ہمیں بتاؤ، ہم تمہارا گھر ٹوٹنے نہیں دیں گے۔''

''تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟'' مجاہد نے دونوں کی طرف مایوسی سے دیکھا۔ ''چھوڑو میں نے ایسے ہی اپنا دکھ سنانا شروع کر دیا۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔''

''مجھے پتا ہے کہ تمہارے منہ سے تمہارا دکھ کیوں باہر نکلا۔ کیونکہ جب بندہ بہت دکھی ہو جائے اور اس کی سننے والا کوئی نہ ہو تو پھر وہ دیوار کے آگے بھی بول دیتا ہے کیونکہ اسے اپنا دکھ اپنے اندر سے نکالنا ہوتا ہے۔ دیکھو ہم سماجی کارکن ہیں۔ لوگوں کے مسائل حل کرنا ہمارا کام ہے۔ ہم نے دنیا کے مسائل حل کرادیے تم تو میرے پرانے دوست ہو۔ مجھے بتاؤ پھر دیکھنا کیسے میں ابھی اس کا حل نکال کر تمہارے سامنے رکھ دیتا ہوں۔'' خادم کسی وکیل سے بھی زیادہ بولتا تھا۔

خادم کے لہجے میں اعتماد تھا اور مجاہد کو اس وقت کسی کی مدد کی بہت ضرورت تھی جس سے اس کا گھر بچ سکے۔ چنانچہ کھانا آنے سے قبل اس نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

اسی اثنا میں کھانا آگیا۔ خادم بولا۔

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، ابھی حل کر دیں گے۔ تم اب اطمینان سے کھانا کھاؤ۔'' خادم نے تسلی دی اور وہ تینوں کھانا کھانے لگے۔ کھانے سے فارغ ہو کر خادم نے بل دیا اور پھر دائیں بائیں دیکھ کر مجاہد سے آہستہ سے بولا۔

''جب بیوی ضدی مل جائے تو پھر ایسے معاملات باتوں سے حل نہیں ہوتے۔ ڈراموں سے حل ہوتے ہیں۔''

''گھر میں اسے کام ہی کیا ہوتا ہے، وہ ڈرامے ہی تو دیکھتی رہتی ہے۔'' مجاہد نے کہا۔

''میں وہ بات نہیں کر رہا ہوں۔'' خادم بدستور سرگوشی کے انداز میں بول رہا تھا۔

''کیا مطلب......؟'' مجاہد نے خادم کے چہرے پر اپنی سوالیہ نگاہیں جما دیں۔

''پچاس ہزار روپے کہاں سے گھر لے کر جاؤ گے؟ بقول تمہارے کہ پچاس ہزار روپے اگر تم کسی سے ادھار پکڑ بھی لو تو واپسی کی اُمید اس لیے نہیں کر سکتے کیونکہ تم... بے روزگار ہو۔ ادھار پکڑ کر پہلے سے بھی زیادہ پھنس جاؤ گے۔ اس لیے یہاں ایک ڈراما کرو۔'' خادم نے کہا۔

"کیسا ڈراما......؟"

"تم نے اپنی بیوی کو پچاس ہزار روپے شام کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہاں ڈراما یہ ہوگا کہ تم پچاس ہزار روپے لے کر گھر جا رہے تھے۔ راستے میں ڈاکوؤں نے پہلے تم سے پچاس ہزار روپے چھینے اور پھر تمہاری ٹانگ میں گولی مار کر فرار ہوگئے۔ میں تمہیں مرہم پٹی کرانے کے بعد گھر چھوڑنے جاؤں گا اور بھابی جی سے یہ ساری کہانی بیان کروں گا۔ بھابی کو یقین آجائے گا کہ تم وعدے کے مطابق پیسے لے کر آ رہے تھے کہ یہ واقعہ ہوگیا۔ تمہارا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔" خادم نے کہانی بیان کی۔

"پلان تو اچھا ہے۔ ٹانگ پر پٹی بھی نقلی ہوگی نا؟" مجاہد اس کی کہانی سن کر مسکرایا۔

"یہ جو پنڈلی پر گوشت ہوتا ہے، اس میں ایک گولی... سچ مچ ماری جائے گی۔ ٹانگ کو نقصان نہیں ہوگا۔ بس گولی اس انداز میں ماری جائے گی کہ گوشت کو چیر کر نکل جائے گی اور تم زخمی ہو جاؤ گے۔ لطیف ایسا کام بڑی مہارت سے کر لیتا ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ زخم ہوگا تو تمہارے گھر میں مرہم پٹی بھی ہوگی اور تب بھابی جی کو شک کی گنجائش نہیں رہے گی کہ یہ ڈراما ہے۔ اگر تم نے وقتی گولی لگنے کا ڈراما کیا تو بھابی جی کو پتا چل ہی جائے گا کہ تمہاری پنڈلی پر تو زخم کا نشان ہی نہیں ہے پھر تمہارا گھر ٹوٹنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" خادم نے کہا۔

"بات تو ٹھیک ہے لیکن گولی اور وہ بھی پنڈلی کے گوشت میں......" مجاہد گھبرا گیا۔

"تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ جو ڈراما میں نے تمہیں بتایا ہے کیا تمہیں اس میں دم لگ رہا ہے؟"

"دم تو ہے لیکن گولی......"

"بس ٹھیک ہوگیا۔ ہم سماجی کارکن ہیں، ہمارا کام دوسروں کے دکھ درد کو دور کرنا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔" وہ دونوں کھڑے ہوگئے۔

"کہاں؟" مجاہد نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم تمہارا گھر بچا رہے ہیں، آجاؤ تم فکر نہیں کرو۔" مجاہد تذبذب کا شکار تھا۔ دونوں نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا اور وہ دونوں اسے وہاں سے لے گئے۔ خادم کے پاس ایک پرانی کار تھی۔ دونوں اسے بٹھا کر کچھ دور ویرانے میں لے گئے۔ رات کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ کار سے باہر نکل کر مجاہد نے متوحش نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور پوچھا۔

"یہاں کیوں لے آئے ہو؟"

"تم نے ہم پر اعتماد کیا اور اب ہم تمہیں اس پریشانی سے نجات دلا کر رہیں گے۔ تمہارا گھر ٹوٹنے سے بچانا ہے اس لیے اب تمہاری پنڈلی کے گوشت میں بس ایک گولی مارنی ہے۔" خادم نے کہا تو مجاہد کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پھیل گئی۔

"نہیں... نہیں مجھے گولی نہیں کھانی...... مجھے ایسا نہیں کرنا...... تم دونوں کی مہربانی تم لوگوں نے میرے بارے میں سوچا...... مجھے جانے دو...... میں کوئی اور حل سوچ لوں گا......" مجاہد کہنے لگا۔ اچانک گولی چلنے کی آواز آئی اور مجاہد نے چپ ہو کر دائیں بائیں کچھ سننے کی کوشش کی پھر اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس کی پنڈلی میں گرم سیسہ ڈال دیا گیا ہو۔ اس نے چونک کر اپنی پنڈلی کی طرف دیکھا، اس کی پینٹ خون آلود ہو چکی تھی۔ اس کے پیروں میں بیٹھا ہوا لطیف اس کی پنڈلی کے گوشت میں گولی اتار چکا تھا۔

مجاہد کو لگا جیسے وہ ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔ اس نے سوچا کہ خادم اور لطیف کیسے سماجی کارکن ہیں کہ اس کا مسئلہ حل کرنے کے لیے وہ مدعی سے بھی زیادہ چست ہیں۔ اتنی جلدی تو مجاہد کو بھی نہیں تھی جتنی جلدی کا مظاہرہ انہوں نے کر دیا تھا۔ خادم نے آگے بڑھ کر مجاہد کو پکڑ لیا اور دونوں اسے اُٹھا کر اپنی کار کی طرف بڑھے۔

☆......☆......☆

ضد کی پکی اور غصے کی تیز راحیلہ اپنا سوٹ کیس تیار کیے بیٹھی اس انتظار میں تھی کہ مجاہد کب آ کر اس کی ہتھیلی پر پچاس ہزار روپے رکھتا ہے اور وہ مسکرا کر اپنا سوٹ کیس اندر لے جاتی ہے اور پچاس ہزار روپے نہ ملنے کی صورت میں وہ ایک لمحہ بھی نہیں رکے گی۔ اس کی ضد سے تو اس کے گھر والے بھی اتنے اجیرن تھے کہ انہوں نے تو راحیلہ کی شادی ہی اس لیے جلدی کی تھی۔

اچانک بیل ہوئی تو راحیلہ نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے خادم زخمی حالت میں کھڑے مجاہد کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ راحیلہ نے مجاہد کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کی پنڈلی پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا......؟" راحیلہ پریشان ہوگئی۔

"بھابی جی! اندر آنے دیں میں بتاتا ہوں۔" خادم نے کہا تو راحیلہ نے دروازہ چھوڑ دیا۔ خادم اسے سہارا دے کر اندر لے گیا۔ مجاہد کو بیڈ پر لٹایا تو راحیلہ نے پھر وہی سوال کیا۔

"کیا ہوا ہے......؟"

''کچھ نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' مجاہد نے نقاہت سے جواب دیا۔

''انہیں کیا ہوا ہے، مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو۔'' راحیلہ بہت پریشان ہوگئی تھی۔ اس وقت اس کے دل میں جو مجاہد کے لیے محبت تھی، اس کی تڑپ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''میں بتاتا ہوں۔ مجاہد میرا پرانا دوست ہے۔ ہم ایک ساتھ اسکول اور کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ آج یہ میرے پاس اپنی ایک پریشانی لے کر آیا تھا کہ اسے پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہے کیونکہ جن وکیل صاحب کے پاس یہ کام کرتا تھا انہوں نے ایک ماہ پہلے انہیں اپنے چیمبر سے فارغ کردیا تھا اور یہ تب سے فارغ ہی چلے آرہے تھے۔ جب انہوں نے پچاس ہزار روپے مجھ سے مانگے تو میں انہیں اپنے دوست لطیف کے پاس لے گیا۔ اس نے میری ضمانت پر سات دن کے لیے پچاس ہزار روپے انہیں دے دیے۔ ابھی یہ کچھ دور ہی گئے تھے کہ ڈاکو آئے، ان کی پنڈلی پر گولی ماری اور پچاس ہزار روپے لے کر فرار ہوگئے اور میں انہیں اسپتال لے گیا۔'' خادم نے بڑے اعتماد سے کہانی سنائی۔

راحیلہ حیرت سے سب کچھ سن رہی تھی۔ جیسے ہی خادم چپ ہوا راحیلہ فوراً مجاہد سے مخاطب ہوئی۔

''آپ کو چیمبر سے فارغ کردیا گیا تھا اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں؟''

''تم نے بتانے کا موقع ہی کب دیا تھا۔'' مجاہد بولا۔

''آپ بتانے کی کوشش تو کرتے۔'' راحیلہ نے شکوہ کیا۔

''میری کوشش کیا کرتی جب تم کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھیں۔'' مجاہد نے ناچاری سے کہا۔

''معاف کیجیے گا...... مجھے ایک دو اور بھی کام ہیں، مجھے اجازت دیں۔'' خادم نے مداخلت کی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' راحیلہ نے اس کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھا۔

''کوئی بات نہیں۔ میں ان کا دوست بھی ہوں اور ایک سماجی کارکن بھی۔ میرا کام ہی دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔ میرا نام میرے ماں باپ نے ایسے ہی خادم نہیں رکھ دیا تھا۔ بہرحال میں چلتا ہوں۔'' خادم کہہ کر جانے لگا تو وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا۔ ''مجاہد بھائی مناسب تو نہیں لگتا یہ بات کہتے ہوئے لیکن بات تو کہنی ہی ہے۔ اب یہ حادثہ تو ہوگیا ہے۔ لیکن آپ نے ایک ہفتے کے لیے میری ضمانت پر پچاس ہزار روپے لیے تھے۔ اب جیسے بھی ہے، ایک ہفتے کے بعد پچاس ہزار روپے واپس کردینا۔ ہم دونوں کی عزت کا سوال ہے۔''

''ہاں...... ہاں، تم فکر نہیں کرو۔ تمہاری عزت پر کوئی داغ نہیں آئے گا۔'' مجاہد نے فوراً کہا۔ وہ دل سے خادم کی اداکاری کا قائل ہوگیا تھا کہ کس طرح وہ سارے معاملے کو سنبھالنے کے لیے بہترین ڈراما رچا رہا تھا۔ خادم چلا گیا۔

''مجھے رونا آرہا ہے۔ آپ مجھے بتادیتے تو میں بالکل بھی ضد نہ کرتی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ چیمبر سے فارغ ہوگئے ہیں۔ میں تو اس لیے ضد کررہی تھی کہ آپ جان بوجھ کر مجھے پیسے نہیں دے رہے ہیں۔'' راحیلہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

''تم کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھیں ورنہ میں بتانے ہی والا تھا۔''

''دیکھیں اب آپ نے پچاس ہزار روپے کا قرض بھی اپنے سر پر چڑھالیا ہے اور اوپر سے زخمی ہوکر بستر پر بھی لیٹ گئے ہیں۔ مجھے معاف کردیں، یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔''

''ارے نہیں کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''اب مجھے فکر ہونے لگی ہے کہ ان کا قرض کیسے اُترے گا۔''

''تم فکر نہیں کرو، میں سب سنبھال لوں گا۔'' مجاہد کو خوشی تھی کہ خادم کے اس ڈرامے سے وہ زخمی تو ہوگیا لیکن اس زخم نے اس کی بیوی کو موم کردیا تھا۔ وہ یکدم راہِ راست پر آگئی تھی۔ مجاہد نے سوچا کہ اگر خادم جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرتا تو وہ زخمی ہونے سے بچ سکتا تھا محض نقلی مرہم پٹی سے بھی راحیلہ موم ہوسکتی تھی۔ وہ دل کی نرم تھی۔

راحیلہ گرم دودھ لینے چلی گئی اور مجاہد نے جلدی سے موبائل فون پر خادم کو فون کرکے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا تو خادم نے چہک کر کہا۔

''دیکھا...... اسے کہتے ہیں خدمت...... یہاں نقلی ڈراما کام نہیں دے سکتا تھا کیونکہ جب تمہارے رشتے دار تمہاری خبر کے لیے آئیں گے تو وہ تھانے کچہری کا بھی مشورہ دیں گے۔ تم ان چکروں میں نہ پڑنا اور اپنے اس حادثے کو گھر کی چاردیواری سے باہر نہ نکلنے دینا۔'' خادم نے ساتھ ہی تاکید کی۔

''نہیں نہیں، میں کیوں ان چکروں میں پڑوں گا بلکہ میں اپنی بیوی کو منع کردوں گا کہ وہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دے۔'' مجاہد نے جلدی سے کہا۔

''ٹھیک ہے عزے کرو۔'' خادم نے کہہ کر فون بند کردیا۔

راحیلہ کے رویے میں حیرت انگیز تبدیلی آگئی تھی۔ وہ ایسی نرم مزاج ہوگئی تھی جیسے اس کے اندر ضد نام کی کوئی چیز

کبھی رہی ہی نہ ہو۔ وہ اس کے لیے بہت پریشان ہوگئی تھی اور ایک ایک پل اس کا خیال رکھ رہی تھی۔ مجاہد بہت خوش تھا کہ خادم کی وجہ سے اس کا گھر ٹوٹنے سے بچ گیا اور راحیلہ پھر سے پہلی جیسی بیوی بن گئی تھی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ناشتے کے بعد خادم اور لطیف آگئے۔ ان کے ساتھ مجاہد کے محلے کا ناظم مشتاق بھی تھا۔ مجاہد کو حیرت ہوئی کہ وہ مشتاق کو کیوں ساتھ لے کر آئے ہیں۔ ناظم صاحب نے پہلے تو مجاہد سے خیر خیریت پوچھی اور یہ جاننا چاہا کہ حادثہ کیسے ہوا۔ مجاہد نے وہی کہانی سنا دی جو کل خادم نے اس کی بیوی کو سنائی تھی کہ کیسے پیسے لیے اور کیسے وہ ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا۔ کہانی سننے کے بعد ناظم صاحب نے کہا۔

''تھانے میں رپورٹ کرائی؟''

''شریف آدمی ہے۔ کہاں تھانے کچہری کے چکر میں پڑے گا۔ ایسی وارداتیں روز ہوتی ہیں اور کوئی نہیں پکڑا جاتا۔'' خادم جلدی سے بولا۔

''ہاں، یہ تو ہے۔'' ناظم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''بات دراصل یہ ہے کہ بھائی لطیف نے کیونکہ آپ کو پچاس ہزار روپے ایک ہفتے کے لیے میری ضمانت پر ادھار دیے تھے اور اتفاق سے آپ کے ساتھ یہ واقعہ ہوگیا لیکن کیونکہ وہ پیسا آپ کے ہاتھ سے گیا تھا اس لیے آپ پچاس ہزار روپے دینے کے پابند ہیں۔ لطیف بھائی نے کیونکہ میری موجودگی میں پیسے دیے تھے اور میرے اعتماد کی وجہ سے کوئی لکھت پڑھت بھی نہیں کی تھی۔ لطیف بھائی اپنی تسلی کے لیے محلے کے ناظم کو ساتھ لے کر آئے ہیں تاکہ اس بات کا گواہ ہو جائے کہ آپ نے ان کے پچاس ہزار روپے دینے ہیں اور آپ نے ناظم صاحب کو اپنے حادثے کا واقعہ سناتے ہوئے یہ اقرار کیا ہے کہ آپ نے ان سے پچاس ہزار روپے اُدھار لیے تھے۔'' خادم نے کہا۔

''ہاں وہ تو مجاہد صاحب بتا ہی چکے ہیں کہ کیسے انہوں نے ان سے پچاس ہزار روپے لیے تھے اور کیسے وہ لٹ گئے۔ یہ بات تو واضح ہوگئی ہے۔ کوئی شک وشبہ نہیں رہا ہے۔'' ناظم صاحب جلدی سے بولے۔

''آپ کو لانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ بات آپ کے علم میں آجائے اور آپ افہام و تفہیم سے وعدے کے مطابق رقم واپس کرا سکیں۔'' خادم نے کہا۔

''مجاہد صاحب اچھے آدمی ہیں۔ یہ اپنے وعدے پر پورا اُتریں گے ورنہ ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی ایک پائی تم نہیں نہیں جائے گی۔'' ناظم صاحب نے تسلی دلائی۔

''گلی کے دو بندے اور نہ بلالیں؟'' خادم نے پوچھا۔

''میں ناظم ہوں میرے علم میں بات آچکی ہے۔ کسی اور کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجاہد صاحب وقت پر پیسے دے دیں گے مجھے یقین ہے۔'' ناظم صاحب نے کہا۔

''بہت شکریہ۔'' خادم اور لطیف کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

خادم اور مشتاق آپس میں باتیں کر رہے تھے اور مجاہد حیرت سے باری باری دونوں کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ جو اس نے پہلے کیا تھا وہ ڈراما تھا یا جو اَب ہو رہا ہے وہ ڈراما ہے؟

''پھر بھی آپ ایک بار اور تاکید کر کے ان سے ایک بار پھر وعدہ لے لیں۔'' لطیف نے معصومانہ سی گزارش کی۔

''مجاہد صاحب! آپ نے ان سے جو پچاس ہزار روپے لیے تھے وہ آپ نے مقررہ تاریخ تک ان کو واپس کرنے ہیں۔'' ناظم صاحب نے مجاہد سے مخاطب ہو کر کہا۔

مجاہد نے ایسی نگاہوں سے خادم کی طرف دیکھا جیسے بکرا قصائی کے ہاتھوں کٹنے کے لیے تیار ہو اور رحم بھری نگاہوں سے دیکھنے کی ایک خفیف سی کوشش کر رہا ہو۔ خادم نے ایسے اشارہ کیا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ ڈرامے کی کامیابی کے لیے ایسا کہنا بہت ضروری ہے۔ طوعاً و کرہاً مجاہد نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بہ مشکل کہا۔

''ہا......ں......''

''لوجی مجاہد صاحب نے کہہ دیا ہے۔ بات صاف ہوگئی ہے۔ مسئلہ ہی کوئی نہیں ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ مجھے ایک جگہ اور جانا ہے۔'' مشتاق اس کا اقرار سن کر کھڑا ہوگیا۔ پھر مشتاق اور لطیف نے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ جب خادم نے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ مجاہد کے ہاتھ میں دیا تو مجاہد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''یہ کیا ڈراما ہے؟''

''یہ ڈراما نہیں بلکہ ڈرامے کا کلائمیکس ہے۔'' خادم زیرلب مسکرایا۔

''کیا مطلب؟'' مجاہد چونکا۔

''یہ ہمارا کاروبار ہے۔ ہم روز معصوم اور مصیبت میں پھنسے لوگوں کی تلاش میں نکلتے ہیں اور ان کا مسئلہ حل کرنے کی آڑ میں اپنی دہاڑی لگاتے ہیں۔ کل تم مل گئے اور پچاس ہزار روپے تمہارے نام کھاتے میں چڑھ گئے جواب ہم نے

وصول کرنے ہیں۔'' خادم نے صاف بتادیا۔

''تم دھوکے باز......'' مجاہد نے دانت پیسے۔

''چلاؤ، شور مچاؤ......اب کچھ نہیں ہوگا۔ محلے کے ناظم کے سامنے تم نے اقرار کیا ہے کہ تم نے لطیف کے پچاس ہزار روپے دینے ہیں اور اب تم پچاس ہزار روپے دینے کی فکر کرو۔'' خادم اطمینان سے بولا۔

''ایک پیسا نہیں دوں گا۔''

''نہ دو......ہمیں ناظم صاحب لے کر دیں گے۔ انہوں نے ہامی بھری ہے اور ہم کچے کھیل نہیں کھیلتے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ نرمی سے چھڑا لیا۔

''تم فراڈ ہو اور اپنے دوست کو بھی نہیں بخش رہے۔''

مجاہد تو سنتے ہی بے جان سا ہوگیا تھا۔ ان دونوں فراڈیوں نے کس خوبصورتی سے جال بچھا کر مدد کرنے کی آڑ میں اسی کو ذبح کرنے کے لیے تیار کرلیا تھا۔

''تمہاری بات کا برا نہیں مناؤں گا۔ مجھ جیسے سماجی کارکنوں کو ایسی باتیں سننے کو ملتی رہتی ہیں۔'' وہ مسکرایا اور باہر چلا گیا۔

مجاہد گم صم ہوگیا۔ بیٹھے بیٹھے وہ پچاس ہزار کا مقروض ہوگیا تھا۔ مجاہد کو خادم پر شدید غصہ آنے لگا۔ وہ کتنا شاطر تھا کہ جو کچھ بھی کررہا تھا اپنے لیے کررہا تھا تبھی تو اس نے آناً فاناً اس کی پنڈلی کے گوشت میں گولی مار کر اسے سوچنے اور بات کرنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ مجاہد کے جسم پر بے چینی سے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ مشکل میں آگیا تھا۔

☆......☆......☆

جب سے وہ تینوں گئے تھے مجاہد کا منہ لٹک گیا تھا۔ راحیلہ نے بار بار پوچھا کہ وہ اچانک اداس اور چپ کیوں ہوگیا ہے مگر ہر بار مجاہد نے اس کا سوال ٹال دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے؟ ناظم صاحب کو حقیقت بتادے؟ اگر ایسا کرے گا تو کیا وہ اس کی بات کا یقین کرے گا؟ پھر اس کی اپنی شخصیت پر کیا اثر پڑے گا؟ ایسے کئی سوالات تھے جو اس کے دماغ میں گردش کررہے تھے لیکن مجاہد کو کوئی معقول جواب نہیں مل رہا تھا۔ وہ اسی سوچ بچار میں تھا کہ راحیلہ کا بھائی آگیا۔ مجاہد نے راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''راحیلہ تم نے خوامخواہ ان کو تکلیف دی۔ بس ایک دو دن میں زخم ٹھیک ہوجائے گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''اتنی بڑی بات ہوگئی اور آپ نے ہمیں بتایا ہی نہیں۔'' راحیلہ کے بھائی نے شکوہ کیا۔

''بس وہ اچانک ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ کسی کو بتا کر کیا تکلیف دینی ہے۔'' مجاہد زبردستی مسکرایا۔ راحیلہ کا بھائی ایک گھنٹے تک بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد راحیلہ، مجاہد کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ چپ کیوں ہیں۔ آپ پچاس ہزار روپے واپس کرنے کی فکر میں ہیں۔ یہ سب کچھ کیونکہ میری وجہ سے ہوا تھا اس لیے میں نے ہی آپ کی فکر دور کرنے کا سوچا اور اپنے بھائی کو فون کرکے سب کچھ اسے بتادیا۔''

''کیا ضرورت تھی بتانے کی؟''

''بتانا ہی تھا۔ مجھ سے آپ کی فکر دیکھی نہیں جارہی ہے۔'' راحیلہ نے کہہ کر اپنا ہاتھ اپنے دوپٹے سے باہر نکالا تو اس میں پچاس ہزار روپے کی گڈی تھی۔ وہ گڈی اس نے مجاہد کے سامنے رکھ دی۔

''بھائی مجھے پچاس ہزار روپے دے گئے تھے۔ آپ ان کا قرض واپس کردیں اور مجھے معاف کردیں۔ میں آئندہ ضد نہیں کروں گی۔'' راحیلہ واقعی نادم تھی۔ مجاہد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا کہ کاش تم پہلے ہی ضد نہ کرتیں۔ مجاہد کو یہ بھی خیال آیا کہ وہ راحیلہ کے سامنے ساری حقیقت بیان کردے لیکن پھر اس نے اس خیال کو رد کردیا کہ اس طرح اس کا اعتماد مجروح ہوگا۔ راحیلہ سوچے گی کہ وہ اسے دھوکا دینے کے لیے کیسا ڈراما رچا رہا تھا اور جب پھنس گیا تو بتادیا۔ اس لیے مجاہد نے فیصلہ کیا کہ وہ اس راز کو راز ہی رکھے گا۔

مجاہد بولا۔ ''تم نے یہ پیسے کیوں لیے؟''

''بس آپ کوئی بحث نہیں کریں گے۔ آپ ان کو بلا کر پیسے واپس کردیں۔''

''دیکھو میں......'' مجاہد نے کہنا چاہا۔

''پلیز......چپ ہوجائیں اور یہ پیسے ان کو لوٹا دیں اور بے فکر ہوکر مسکرا دیں۔'' راحیلہ نے پیار بھرے انداز میں کہا تو مجاہد چپ ہوگیا۔

راحیلہ کچن میں چلی گئی۔ اچانک مجاہد کا فون بجنے لگا۔ اسکرین پر میاں ادریس ایڈووکیٹ کا فون تھا۔ مجاہد نے چونک کر جیسے ہی فون اٹھایا، دوسری طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ ہوگئی۔ مجاہد پریشان سا ہوکر گالیاں سننے لگا اور سوچنے لگا کہ اب گھر بیٹھے اس سے کیا غلطی ہوگئی ہے کہ وکیل صاحب اتنے نالاں ہیں۔ جب وکیل صاحب نے خوب گالیاں نکال لیں تو کہا۔

''یہ سب گالیاں میں اس کمینے کو دے رہا ہوں جس نے

سازش کر کے تمہیں نکلوایا اور پھر مجھے چونا لگانا شروع کر دیا۔ میں نے اسے پکڑ کر پہلے اس کی ...... خوب دھنائی کی اور پھر چیمبر سے نکال دیا۔ آئی ایم سوری...... میں نے اس پر اعتبار کیا۔ تم کل سے میرے چیمبر آ رہے ہو۔ مجھے کوئی انکار نہیں سننا...... سمجھے؟'' وکیل صاحب نے کہہ کر حکم دیا اور فون بند کر دیا۔

خوشی سے مجاہد پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے راحیلہ کو بلا کر بتایا تو دونوں کے چہرے کھل اُٹھے۔

نوکری کا مسئلہ تو حل ہو چکا تھا، اب مجاہد یہ سوچنے لگا کہ اس نے لطیف سے کوئی پیسا ادھار لیا ہی نہیں ہے تو پھر وہ واپس کیوں کرے ؟ اگر وہ پیسا حاصل کرنے کے لیے ڈراما کر سکتے ہیں تو وہ پیسا بچانے کے لیے بھی تو ایک ڈراما کھیل سکتا ہے۔ مجاہد نے سوچا اور پھر اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

☆......☆......☆

مجاہد کو چلنے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ لطیف نے گولی اس طرح سے پنڈلی کے گوشت میں ماری تھی کہ وہ محض چھو کر گزر گئی تھی۔ خادم ٹھیک کہتا تھا کہ لطیف اس کام میں بہت ماہر ہے۔ مجاہد کا زخم وکیل صاحب کے فون نے بھی ٹھیک کر دیا تھا۔ اب خادم اور لطیف کی جھولی میں جاتا ہوا پیسا بچانا تھا۔ اس نے سب سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے وکیل صاحب کے منشی کو فون کیا اور اسے کہا کہ وہ ایک اسٹامپ پیپر تیار کرے۔ اس پر جو کچھ لکھنا تھا، اس کی تفصیل بتا کر اس نے فون بند کر دیا۔

شام سے پہلے منشی وہ تحریر لے کر اس کے گھر آ گیا۔ مجاہد نے اسے چائے پلائی، تحریر کو غور سے پڑھا۔ جو اس نے کہا تھا وہی منشی نے لکھا تھا۔ منشی جانے لگا تو مجاہد کو گلی میں کچھ شور سا سنائی دیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو ناظم صاحب محلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

ناظم صاحب پریس کلب جا رہے تھے جہاں بڑے سیاسی لوگوں کی ایک تقریب تھی۔ مجاہد کو یکدم خیال آیا اور اس نے منشی کو روک کر خادم کو فون کر دیا۔

''آپ کے پچاس ہزار روپے تیار ہیں۔ آپ ابھی آ جائیں اور پیسے لے جائیں۔ مجھے رات کی بس پکڑ کر اپنے سسرال جانا ہے پھر ہفتہ، دس دن لگ جائیں گے......''

''ہم ابھی آئے۔'' خادم نے فوراً کہا۔ مجاہد نے منشی کو دوسرے کمرے میں بٹھا دیا۔ بیس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ خادم اور لطیف ڈھٹائی سے مفت کا مال لینے آ گئے۔

مجاہد نے دونوں کو بٹھایا اور پھر معصوم سی صورت بنا کر خادم سے کہا۔

''آپ مجھ سے ناجائز کر رہے ہیں۔''

''ہم اپنا کام کر رہے ہیں جو ہم روز کرتے ہیں۔ ہمارے پاس بھی وقت نہیں ہے اس لیے جلدی سے پیسے دو تاکہ ہم جائیں۔ اگر ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تو پھر لطیف ناظم صاحب کو ہی نہیں بلکہ پورے محلے کو جمع کر لے گا۔'' خادم نے ساتھ ہی دھمکی بھی دی۔

''بس اپنی عزت سے ڈر کر یہ زہر پی رہا ہوں۔'' مجاہد بولا۔ ''آپ ایسا کریں کہ ناظم صاحب کو بھی لے آئیں تاکہ ان کی موجودگی میں، میں آپ کو پیسے دے دوں۔'' مجاہد نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر ان کے سامنے لہرائی۔ دونوں نے للچائی ہوئی نظروں سے نوٹوں کی طرف دیکھا۔

''جاؤ بھئی ناظم صاحب کو بلا لاؤ۔'' خادم نے کہا تو لطیف باہر چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد واپس آ کر اس نے بتایا کہ ناظم صاحب سیاسی تقریب میں گئے ہیں۔

''اب پھر آپ کل آ جانا۔ ان کی غیر موجودگی میں پیسے دوں گا تو پھر کیا ثبوت ہوگا کہ میں نے آپ کو پیسے دے دیے۔'' مجاہد نے جلدی سے کہا۔

''سامنے پیسے ہوں اور خادم ان کو چھوڑ دے یہ ناممکن ہے۔'' وہ فوراً بولا۔ ''میں ناظم صاحب کو بتا دوں گا۔ تم مجھے پیسے دے دو۔''

مجاہد نے سوچا اور پھر پچاس ہزار کے نوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھ پر ظلم کر رہے ہو۔''

''ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تو پھر محلہ اکٹھا کرنا پڑے گا مجھے۔'' لطیف غصے سے بولا۔

''ناظم صاحب کا ہونا ضروری ہے۔ میں ان کے بغیر پیسے نہیں دے سکتا۔''

''وہ پتا نہیں کب آئیں گے، تم ہم سے رسید لکھوا لو اور ناظم صاحب کو دکھا دینا۔'' خادم کو پیسے لینے کی جلدی تھی۔

مجاہد نے کچھ دیر سوچا اور پھر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں وہی اسٹامپ پیپر تھا جو اس نے منشی سے لکھوایا تھا۔ اس نے اسٹامپ پیپر خادم کے سامنے رکھتے ہوئے پین دیا اور کہا۔ ''یہاں آپ دستخط کر دیں۔ میں ان کو یہ تحریر دکھا دوں گا کہ میں نے لطیف صاحب کے پیسے واپس کر دیے ہیں......'' خادم نے سرسری انداز میں تحریر دیکھ کر اپنے دستخط کر دیے۔ پھر لطیف نے

دستخط کیے اور مجاہد نے پچاس ہزار روپے خادم کی طرف بڑھا دیے۔ ابھی خادم نے پیسے پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ اس کا فون بج اُٹھا۔ اس نے جھنجلا کر فون کان سے لگایا اور دوسرے ہاتھ سے نوٹ پکڑ لیے۔ مجاہد نے نوٹ چھوڑے نہیں۔ دوسری طرف سے کچھ کہا جانے لگا۔ سنتے ہی خادم کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور اس نے پریشان ہو کر نوٹ چھوڑ دیے۔ اس نے فون بند کرتے ہوئے لطیف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لطیف! تمہاری جیب میں پیسے تھے؟''

''نہیں، کیوں کیا ہوا؟'' لطیف نے جواب دے کر پوچھا۔

''تم گاڑی سے باہر نکلے اور گاڑی کی سیٹ پر تمہارے پیسے رہ گئے۔ ہزار ہزار کے کئی نوٹ ہیں۔ ہم نے جہاں اپنی کار کھڑی کی ہے، وہاں مجمع لگا ہوا ہے کئی لوگوں نے گاڑی میں نوٹ بکھرے دیکھے ہیں۔'' خادم کے چہرے پر حیرت تھی۔

خادم کی بات سن کر لطیف بھی بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ خود خادم بھی مضطرب تھا۔

''ذرا دیکھ کر تو آئیں۔'' لطیف نے کہا تو خادم کھڑا ہو گیا۔

بات ہی عجیب تھی۔ فون کرنے والے نے اطلاع دی تھی کہ ان کی کار میں نوٹ بکھرے پڑے ہیں اور وہاں مجمع لگا ہوا ہے اس سے پہلے کہ پولیس کو بلایا جائے، آپ جلدی آجائیں۔

دونوں باہر نکل کر کچھ دور جہاں انہوں نے کار کھڑی کی تھی، اس طرف چل دیے۔ ابھی وہ کار سے کچھ فاصلے پر تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ کار کے پاس کوئی بھی نہیں ہے۔ تیز طرار خادم ٹھٹک کر رک گیا۔

''لطیف...... کار کے اندر نوٹوں کا ہونا تو ایک الگ بات ہے لیکن جس نے مجھے فون کیا، اس نے میرا نمبر کہاں سے لیا؟''

لطیف بھی رک گیا۔ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ پھر وہ کار کے پاس گئے۔ اندر جھانک کر دیکھا، ایک پیسا بھی نہیں پڑا تھا۔ دونوں واپس آئے تو مجاہد کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ خادم نے بیل دی۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر سے آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''میں خادم ہوں۔'' خادم نے بتایا۔

دروازہ مجاہد نے کھولا۔ اس نے دونوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی فرمایئے......''

''کسی نے غلط کال کی تھی۔ آپ پیسے دیں۔'' خادم بولا۔

''کون سے پیسے......؟'' مجاہد نے ایسے پوچھا جیسے وہ کچھ جانتا ہی نہ ہو۔

''پچاس ہزار روپے......'' خادم بولا۔

مجاہد نے سوچا اور پھر اپنی جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا۔ وہ اصل کی فوٹو کاپی تھی۔ اس نے کاغذ کھول کر خادم کے سامنے کر دیا اور کہا۔

''ذرا اسے پڑھنا۔''

خادم کے ساتھ ساتھ لطیف بھی کاغذ پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتے جا رہے تھے، ان کے ماتھے پر سلوٹیں ابھرتی جا رہی تھیں۔ جب پوری تحریر پڑھ لی تو خادم نے جھنجلا کر کہا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟''

''میاں یہ قانونی کاغذ ہے۔ وکیل صاحب نے لکھا ہے۔ چار گواہوں کے دستخط ہیں۔ تم دونوں نے مجھ سے پانچ لاکھ روپے ادھار لیے ہیں۔ دس مہینوں میں ہر ماہ پچاس ہزار روپے دے کر مجھے واپس کرو گے۔ تم دونوں کے دستخط بھی موجود ہیں اور اب کہہ رہے ہو کہ یہ کیا بکواس ہے۔ چلو پہلی قسط نکال کر دو۔ ورنہ میں قانونی چارہ جوئی کرنے کا پورا حق رکھتا ہوں۔''

مجاہد کی بات سن کر خادم اور لطیف ایسے چپ ہو گئے جیسے ان کے پاس بولنے کے لیے الفاظ نہ ہوں۔ پچاس ہزار روپے لینے کی جلدی میں انہوں نے تحریر بھی غور سے نہیں پڑھی تھی۔ اور تو اور جب انہوں نے دستخط کیے تھے تو کسی گواہ کے دستخط موجود نہیں تھے۔ مگر ان کے باہر جاتے ہی چار گواہوں کے دستخط ثبت ہو گئے تھے۔ اب وہ کیا جانیں کہ منشی صاحب اپنا ہنر آزما رہے تھے۔

عجیب صورت حال ہو گئی تھی۔ وہ احتجاج بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ خادم نے اچانک لطیف سے کہا۔

''تم نے مجھے ٹھیک مشورہ دیا تھا کہ میں اس کے ساتھ ڈراما کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لوں کہ...... یہ ایک وکیل ہے۔ میں ہی نہیں مانتا تھا۔''

خادم نے کہا اور تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ اس کے پیچھے لطیف بھی تھا۔ مجاہد نے آواز دے کر انہیں روکنا چاہا لیکن ان کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔

ماروی

محی الدین نواب

بائیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جھمرو اور چاچی متی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کرکے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا، محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف بجلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفادے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا مگر۔۔۔ ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوگئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہوکر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور بجلی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوجاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کرلے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مرجاتا ہے۔ ماروی کا علاج ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آجاتی ہے مراد مرینہ کے زیر اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا۔ رابعہ خاتون نے مراد کے بچے کو ماروی کے ہاں پہنچا دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ممی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے گا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آگیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کرواکے اسے اپنا چہرہ دے دیا۔ اب بونا عبداللہ مراد بن گیا تھا۔ دشمن مراد کو بونا دیکھ کر چکرا گئے۔ ماروی کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ اب اس کے پاس نہ اپنا چہرہ تھا اور نہ پرانی یادداشت۔ اس کی یادداشت تھوڑی دیر کے لیے آتی تھی تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ممی سن کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتادیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ

گئی۔لندن ایئرپورٹ پر میکی پر حملہ ہوا اور اس کا ایک بیٹا مارا گیا۔مارنے والے نے اپنا نام مراد بتایا۔ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہوکر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا۔مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آ گئی۔ادھر مراد نے دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کرلیا مراد انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کرلیا۔تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ان دونوں میں مقابلہ ہوا مراد شدید زخمی ہوا جبکہ مرینہ کے بارے میں خیال تھا کہ وہ ماری گئی۔ماروی کراچی میں ہی رہ رہی تھی۔محبوب کا ماروی کے لیے دیوانہ پن دیکھ کر معروف اور حماد ماروی کو ختم کرنے کا منصوبہ بنانے لگے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میڈونا نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔دشمنی سے باز آکر مراد کی دوست بن رہی تھی اور دوستی کے بہانے اس کی قربت تڑپا رہی تھی لیکن حالات نے مجبور کیا تھا۔اس کی سلامتی کے لیے اس سے بچھڑنا ضروری ہوگیا تھا۔

وہ جب تک بے ہوش پڑا رہا، یہ انتظار کرتی رہی کہ ہوش میں آجائے۔ایک بار آنکھیں کھول کر یہ دیکھ لے کہ دشمن کی بیٹی اسے سلامتی دے رہی ہے۔اسے ایک اسپتال میں پہنچا کر اس کا علاج کرا رہی ہے اور انتظار کے دوران میں وہ اس سے لگی خود کو تسلی دیتی رہی کہ اسے حاصل کررہی ہے اور آئندہ بھی حاصل کرنے کی ضد قائم تھی۔دماغ میں یہ بات پک رہی تھی کہ اس سے فی الحال دور رہ کر بھی.... قریب رہے گی اور اسے نظروں میں رکھے گی اور جب وہ ہوش میں آئے گا تو اپنی نیکیوں اور مہربانیوں کے حوالے سے کسی طرح دوستی کرے گی۔

پھر ایمان علی مراد کو لے جانے کے لیے ایمبولینس لے کر آ گیا۔یہ وہی تھا جسے اس نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا۔مراد بیڈ پر غافل پڑا ہوا تھا۔اس کا نیا مطلوب ومحبوب تھا اور وہ نئے اور پرانے کے درمیان تھی۔

ایمان علی نے بڑے دکھ سے پوچھا۔''کیا واقعی مجھ سے دل بھر گیا ہے؟''

وہ اس سے کترانے کے لیے بولی۔''اسے فوراً یہاں سے لے جاؤ۔دشمن ادھر آسکتے ہیں۔''

اسپتال کے وارڈ بوائز مراد کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس کی طرف لے جارہے تھے۔تب ایمان علی نے ہنستے ہوئے کہا۔''جیسے کو تیسا۔میں بھی پلے بوائے ہوں۔ایک پھول سے دوسرے پھولوں پر منڈلاتا رہتا ہوں۔تمہاری جیسی پلے گرل کے لیے آہیں نہیں بھروں گا۔''

وہ بولی۔''میری اور اپنی باتیں نہ کرو۔اپنے دوست کی سلامتی چاہو۔میں نے اپنے پاپا کے شوٹرز کو دوسری طرف بھٹکا دیا ہے۔اس کے باوجود دہلی پہنچنے تک وہ پھر رکاوٹ بن سکتے ہیں اور پتا نہیں مراد کے اور کتنے دشمن ہوں گے۔''

وہ بولا۔''اگر دشمنوں نے حملہ کیا تو میں نہیں جانتا کہ مراد کو کس طرح بچاسکوں گا۔میں اللہ کا نام لے کر اسے لے جارہا ہوں۔''

''میں جرائم کی دنیا میں رہتی ہوں۔گن چلانا اور دشمنوں سے نمٹنا جانتی ہوں۔تم اسے لے چلو۔میں تمہارے پیچھے فاصلہ رکھ کر آتی رہوں گی۔''

وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولا۔''یعنی مراد کا پیچھا نہیں چھوڑو گی۔اوکے...چلی آؤ۔''

وہ باہر ایمبولینس کے پچھلے حصے میں مراد کے پاس آگئی۔دل اس کی طرف کھنچا جارہا تھا۔اس نے ایمان علی سے کہا۔''یہ پہلے بے ہوش تھا۔اب گہری نیند میں ہے۔میں اس سے دو باتیں بھی نہ کرسکی۔مجھ سے وعدہ کرو۔جب یہ نیند سے بیدار ہوگا تو مجھ سے فون پر بات کراؤ گے۔میں ایک بار اس سے کچھ بولنا چاہتی ہوں۔''

ایمان علی نے وعدہ کیا کہ اس سے فون پر ضرور باتیں کرائے گا۔وہ مراد کو ایمبولینس میں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔دل نہیں مان رہا تھا۔جب وہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو اس نے سوچا' مجھے اس کے پیچھے جانا چاہیے۔دہلی تک بہت لمبا سفر ہے۔اس کے پاپا کے تابعدار اور شوٹرز کہیں بھی رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ایسے وقت ایمان علی تنہا کچھ نہیں کرسکے گا۔

وہ بے چین ہوگئی۔جس کی سلامتی کے لیے اتنی جدوجہد کرتی آئی تھی۔اسے بے یار ومددگار چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔اس نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔''میں تمہیں پانچ ہزار دوں گی۔مجھے دہلی پہنچا دو۔آگے ایک ایمبولینس جارہی ہے۔تمہیں اس کے پیچھے بہت فاصلہ رکھ کر چلنا ہوگا۔''

ڈرائیور کے منہ میں پانی آگیا۔ایک انتہائی گوری چٹی حسینہ تنہا رات کو اس کے ساتھ جارہی تھی۔گویا اسے جنگل میں منگل منانے کی دعوت دے رہی تھی۔اس نے کہا۔''فکر

نہ کرو۔ تمہیں شرافت سے دہلی پہنچادوں گا۔''

وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر وہاں سے چل پڑی۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔ آگے جانے والی ایک ایمبولینس بہت دور تھی۔ کبھی دکھائی دیتی، کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔

ڈرائیور عقب نما آئینے میں اسے دیکھتا جارہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی ویرانے سے گزرتے وقت اسے کیا کرنا ہے؟

اس کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ننھی سی اسکرین پر اس کے باپ کا نام تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کے آدمی مراد کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اب وہ باپ اس سے صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے کال کر رہا ہے۔

اس نے فون پر کہا۔ ''یس پاپا...؟''

وہ غصے سے بولا۔ ''پاپا کی بچی! تو نے کہا تھا' کالکا سے ٹرین کے ذریعے دہلی جارہی ہے۔ میرے تابعداروں نے پوری ٹرین چھان ماری ہے تو وہاں نہیں ہے۔''

''پاپا! آپ کے آدمی ٹرین میں مجھے نہیں مراد کو پکڑنے گئے ہوں گے۔ آپ کے خیال میں مراد مجھے اپنی نگرانی میں دہلی پہنچانے کے لیے ٹرین میں ضرور موجود ہوگا مگر افسوس......''

''تو نے مجھ سے جھوٹ کہا ہے۔ مجھے دھوکا دیا ہے۔''

''میں آپ کو دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ دراصل میں نے ٹرین میں گھنٹوں بیٹھ کر سفر کرنے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ ابھی کالکا سے 'کولو' آئی ہوں۔ یہاں سے بائی ائر دہلی جاؤں گی۔''

''لعنت ہے تم پر۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ اس کی دیوانی ہوگئی ہو۔ میری یہ بات لکھ لو کہ وہ خطرناک مراد علی منگی تمہارے دوسرے بوائے فرینڈز کی طرح تمہارا اسیر نہیں ہوگا۔ تمہیں دہلی ائرپورٹ پہنچا کر پھر کہیں روپوش ہوجائے گا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ یہ میرا ہو کر رہے گا۔''

''تمہیں اتنا یقین کیوں ہے؟ کیا تم کالکا اور کولو میں نہیں ہو؟ اسے حاصل کر رہی ہو؟ کہیں اس کے ساتھ رات گزار رہی ہو۔''

وہ مسکرائی۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے جھوٹ کہا۔ ''آپ باپ ہیں۔ اپنی بیٹی کو خوب سمجھتے ہیں۔ بائی دا وے بیٹی سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

میڈونا کی اس بات سے سمجھ میں آگیا کہ واقعی وہ مراد کے ساتھ کہیں رات کالی کر رہی ہے۔

اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''دشمن کے پاس ہو۔ باپ کی عزت کا خیال نہیں ہے۔ میں بھی دیکھتا ہوں' اسے کہاں تک بچاؤ گی۔ ویسے ہر حال میں دہلی تو تمہیں آنا ہی ہے۔ ذرا وہاں پہنچو تو سہی۔''

باپ نے فون بند کردیا۔ یہ بہت بڑا چیلنج تھا کہ ''دہلی تو پہنچو۔'' وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ ''کیا کرے؟''

ویسے مراد موجودہ بہروپ میں پہچانا نہیں جاسکتا تھا لیکن ایک زخمی کو ایمبولینس میں کسی اسپتال تک پہنچتے دیکھ کر اس پر شبہ کیا جاسکتا تھا۔ پتا نہیں پاپا کے شوٹرز اور جاسوس دہلی میں کہاں کہاں پھیلے ہوں گے۔ ائرپورٹ' ریلوے اسٹیشن' بس اڈے' ہوٹل اور اسپتال ہر جگہ موت کے ہرکارے ہوں گے۔

ایسے وقت ٹیکسی رک گئی۔ میڈونا نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دیکھا۔ دور تک درخت اور جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ ٹیکسی جنگل کے ایک درمیانی راستے پر رک گئی تھی پھر ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس بجھادیں۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ صرف ایک ننھا سا بلب ٹیکسی کے اندر روشن تھا۔

وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر میڈونا کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میری جان! تو بھی جوان میں بھی جوان ایسے میں دل ہوگیا بے ایمان......''

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''تم بڑے مزے کی باتیں کرتے ہو۔ میں سمجھ گئی۔ میری جوانی سے کھیلنا چاہتے ہو۔ مگر پہلے یہ بتاؤ میری مرضی کے خلاف زبردستی کرو گے یا پہلے مجھے خوش کرو گے اور مجھے راضی کرو گے؟''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''میں سمجھا تھا تم چیخنا چلانا شروع کردو گی مگر تم تو راضی ہو۔ بولو تمہیں کیسے خوش کروں؟''

''ڈانس کرو۔ مجھے ناچ کے دکھاؤ۔''

وہ ٹیکسی سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ''یہ کون سی بڑی بات ہے۔''

وہ باہر جاکر بریک ڈانس کرنے لگا۔ میڈونا ٹیکسی کے کھلے ہوئے دروازے سے لگی بیٹھی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم تو بہت اچھے ڈانسر ہو۔ ابھی تم میرے پاس آکر یہ لباس اتارنے والے ہو۔ چلو وہیں اتارو۔ پہلے دور سے جلوہ دکھاؤ۔''

اسے اپنی مردانگی دکھانی تھی۔ اس نے پتلون اتار دی۔ میڈونا نے کہا۔ ''لیکن ایک مشکل ہے۔ میری حفاظت کرنے والا مراد علی منگی میرے ساتھ ہے۔ وہ تمہیں میرے

قریب نہیں آنے دے گا۔ تم کیا کرو گے؟"

وہ حیرانی سے بولا۔ "ایں۔ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔"

میڈونا نے ہینڈ بیگ سے ریوالور نکال کر کہا۔ "میرا محافظ اپنا یہ سامان میرے پاس چھوڑ گیا ہے۔ وہ نہ ہوتے ہوئے بھی میری حفاظت کر رہا ہے۔ یہ دیکھو۔"

اس نے ایک فائر کیا۔ جنگل کے سناٹے میں دور تک آواز گونجنے لگی۔ گولی اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ وہ بولی۔ "دوسری گولی سیدھی تمہارے دل میں لگے گی۔"

وہ بُری طرح سہما ہوا تھا۔ میڈونا نے کہا۔ "پہلوان! مشکل میں ہے تیری جان۔ وہ پتلون وہیں چھوڑ دے۔ اپنی سیٹ پر جا اور گاڑی چلا۔ دیر نہ کر۔ وہ ایمبولینس دور نکل جائے گی۔"

اس نے دوسری گولی چلائی۔ اس کے پیروں کے پاس تھوڑی سی مٹی اڑی۔ وہ دوڑتا ہوا آکر برہنہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ بولی۔ "کتے ننگے ہی رہتے ہیں۔ دہلی پہنچ کر باہر نہ نکلنا۔ عورتیں پتھر ماریں گی۔"

وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ آگے جا کر وہ ایمبولینس نظر آنے لگی۔ میڈونا کو اطمینان ہوا لیکن یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ دہلی میں دشمن جگہ جگہ ہوں گے۔ وہ گاڑیوں کو اور خاص طور پر ایمبولینس کو ضرور چیک کریں گے۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔

اچانک اس کے ذہن میں بات آئی۔ "ماسٹر کو بوبو کو مراد کے حالات سے باخبر کرنا چاہیے۔ ماسٹر میرا جانی دشمن ہے لیکن مراد پر جان چھڑکتا تھا۔ وہ اس کی سلامتی کے لیے پورے دہلی شہر کو ہلا کر رکھ دے گا۔"

اس نے فوراً ہی اس سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "میں تمہارے دشمن میکی براؤن کی بیٹی میڈونا بول رہی ہوں۔"

"تعجب ہے۔ تم میڈونا ہو اور اپنے خاندان کے جانی دشمن سے بول رہی ہو۔"

"آپ بعد میں حیران ہوتے رہیں۔ پہلے اہم خبر سن لیں۔ آپ کا چہیتا شیر دلیر مراد علی منگی زخموں سے چور ہے۔ اس کا ایک جگری دوست ایمان علی اسے علاج کے لیے دہلی لے جا رہا ہے۔ میرے پاپا کے شوٹرز دہلی کے ہر اہم مقام پر موجود ہوں گے۔ آپ فوراً اس کی سلامتی کے لیے کچھ کریں۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "وہ کیسے زخمی ہو گیا ہے؟ میں تمہاری بات کا کیسے یقین کروں؟"

"میرا خیال ہے، آپ ایمان علی اور اس کے باپ ڈاکٹر ٹیمی سن کو جانتے ہیں؟"

"میں ڈاکٹر کو جانتا ہوں۔ اس نے مراد کو اپنا بیٹا بنایا ہے۔ مراد بھی اسے ڈیڈی کہتا ہے۔"

"ایمان علی نے اپنے باپ کو مراد کے موجودہ حالات بتائے ہوں گے آپ ڈاکٹر ٹیمی سن سے بات کریں۔"

ڈاکٹر ٹیمی سن، مراد کے لیے بہت اہم تھا۔ اس لیے ماسٹر کے پاس اس کا فون نمبر محفوظ تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے رابطہ ہوتے ہی کہا۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ کیا دشمنوں نے مراد پر گولیاں چلائی ہیں؟ کیا وہ بہت زیادہ زخمی ہو گیا ہے؟"

"ہاں، میرا بیٹا اسے کالکا سے یہاں ایک ایمبولینس میں لا رہا ہے۔ ہم جاگ رہے ہیں۔ میرے ساتھ جگنی بائی یہاں بیٹھی ہیں۔ ہم نے اس کے لیے حفاظتی انتظامات کیے ہیں۔ جب تک اسے محفوظ پناہ گاہ میں نہیں پہنچائیں گے، ہم جاگتے رہیں گے۔"

"کیا وہ بہت زیادہ زخمی ہے؟"

"مرینہ نے اس کے دو پیروں میں گولیاں ماری ہیں۔ تیسری گولی نے اس کے شانے کی ہڈی توڑ دی ہے۔ وہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں رہا ہے۔"

"او گاڈ! کیا مرینہ نے ایسی دشمنی کی ہے؟ وہ کہاں ہو گی؟"

"جہنم میں۔ مراد نے اسے مار ڈالا ہے۔"

"تھینکس گاڈ! ایک بلا ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے۔ مراد کے زخم تشویش ناک ہیں۔ اسے جلد سے جلد اٹھنا بیٹھنا اور چلنا پھرنا چاہیے۔ ورنہ دشمن اس کی جان کو آتے رہیں گے۔ میں عالمی شہرت یافتہ تجربہ کار ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کو اس کے علاج کے لیے بھیج رہا ہوں۔ وہ دن رات اسے توجہ سے..."

فون کا وائڈ اسپیکر آن تھا۔ جگنی بائی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ماسٹر! اتنی تیزی نہ دکھاؤ۔ عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹرز یہاں آئیں گے تو دشمن ضرور سوچیں گے کہ وہ زخمی کون ہے، جسے اس قدر وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جا رہا ہے۔ ہم ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جو دشمنوں کو مراد کی طرف کھینچ کر لائے۔"

ڈاکٹر ٹیمی سن نے کہا۔ "ماسٹر! تم مراد کے لیے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہاتے ہو۔ اس بار ہم پر بھروسا کرو۔ ہم دشمنوں کو اس کی ہوا بھی لگنے نہیں دیں گے اور ایسا علاج کرائیں گے کہ وہ جلد سے جلد چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔"

ماسٹر نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں مداخلت نہیں کروں گا۔ مجھے ہر روز اس کے حالات سے آگاہ کرتے رہو میرے اندر یہ معلوم کرنے کی بے چینی ہے کہ مرینہ نے اس

کا ٹکراؤ کہاں ہوا تھا؟ کیا تمہارا بیٹا ایمان علی وہاں موجود تھا؟''

''ایمان علی نہیں، میڈونا وہاں موجود تھی۔ اس سے پوچھو۔ وہی تفصیل بتا سکے گی۔''

ماسٹر نے میڈونا کو فون پر مخاطب کیا۔ ''تمہاری اطلاع درست ہے۔ مراد کو مرینہ نے زخمی کیا ہے۔ ڈاکٹر ٹمی سن کہتا ہے، تم وہاں موجود تھیں۔ مجھے بتاؤ وہاں کیا ہوا تھا؟''

اس نے پوری روداد سنائی کہ مراد نے اسے اغوا کرنے کے بعد کس طرح عزت اور سلامتی دی تھی۔ وہ اس کے پاپا کو ماسٹر کے سامنے جھکانا چاہتا تھا لیکن اس کے پاپا نے بیٹی کی رہائی کے عوض جھکنا منظور نہیں کیا۔ جسے باپ کی جان کہتا تھا اسے مرنے کے لیے مراد کے پاس چھوڑ دیا تھا۔

میڈونا اسے بتا رہی تھی کہ اسی دن سے وہ مراد پر صدقے واری ہو رہی ہے۔ جس وقت وہ مرینہ کی فائرنگ سے بے دم ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسی وقت وہ اپنے باپ کے شوٹرز کو بلا کر اسے ہلاک کرا سکتی تھی لیکن اس نے مراد کی سلامتی چاہی تھی۔ اسے کار لاکر ابتدائی طبی امداد پہنچائی تھی۔

اس نے ماسٹر کو فون پر کہا۔ ''یہ مراد علی منگی کیا ہے، میں نہیں جانتی۔ اس نے مجھے خرید لیا ہے۔ یہ میرے دل کی دھڑکن بن گیا ہے۔ میری رگوں میں لہو کی طرح دوڑ رہا ہے۔ میں ہر قیمت پر اس کے ساتھ پوری زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔''

اس نے ایک آہ کے ساتھ کہا۔ ''مگر وہ ماروی کا دیوانہ ہے۔ میں زبردستی اسے اپنا نہیں بنا سکوں گی۔ اس نے جبراً ماروی کی جگہ لینے والی مرینہ کو ختم کر دیا۔ پھر بھی میں اسے محبت سے جیتنے کی کوشش کروں گی۔ اس کے لیے قربانیاں دوں گی۔

''اس کے لیے پہلی قربانی یہ ہے کہ میں ماں باپ کو، پورے خاندان کو اور بے شمار دولت کو چھوڑ رہی ہوں۔ اب وہاں واپس نہیں جاؤں گی۔ یہ خیال آیا کہ کہاں جاؤں گی؟ کہاں چھپ کر رہوں گی؟ تب ماسٹر کو بوبو! مجھے تمہارا خیال آیا۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''میڈونا! آج سے تم میرے دشمن کی نہیں، میری بیٹی ہو۔ تم نے میرے مراد کی سلامتی چاہی ہے۔ اسے باپ سے چھپا کر ہمارے درمیان پہنچا رہی ہو۔ میں تمہارے باپ سے تمہیں چھپا کر رکھوں گا۔ ابھی تمہاری حفاظت کے لیے کچھ انتظامات کرتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں کال کروں گا۔ تم ابھی کہاں ہو؟''

''ایمان علی جس ایمبولینس میں مراد کو لے جا رہا ہے، میں اس کے پیچھے کچھ فاصلہ رکھ کر آ رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تم دہلی پہنچتے ہی مجھے کال کرو۔''

ماسٹر نے پھر ایک بار ڈاکٹر ٹمی سن سے رابطہ کیا۔ اس سے کہا۔ ''مراد کی سلامتی میڈونا کی مرہونِ منت ہے۔ اسی نے مراد کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا تھا اور اب ایک سیکیورٹی گارڈ کی طرح ایمبولینس کے پیچھے چلی آ رہی ہے۔ وہ مراد کی خاطر باپ سے باغی ہو گئی ہے اس سے چھپ کر رہنا چاہتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے سیکیورٹی دیں۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''بے شک ہم پر میڈونا کے احسانات ہیں۔ ہم ضرور اسے سیکیورٹی دیں گے۔''

''میڈونا صورت شکل سے اور بول چال سے انگریز حسینہ لگتی ہے اسے کس طرح چھپایا جائے گا۔''

جگنی بائی نے کہا۔ ''میں اسے اپنی بیٹی بنا کر اپنی گھاگھرا پلٹن کی عورتوں کے درمیان کسی بھی طرح چھپا لوں گی۔ تم اسے کہو کہ جس ایمبولینس میں مراد آ رہا ہے، اسی میں چھپ کر آئے۔ کسی طرح کی فکر نہ کرے۔''

ماسٹر نے ان سے رابطہ ختم کر کے میڈونا سے کہا۔ ''تم جس گاڑی میں آ رہی ہو، اسے چھوڑ دو۔ ایمبولینس میں مراد کے پاس جاؤ۔ تم دہلی پہنچ کر دشمنوں کی نظروں میں نہیں آؤ گی۔ تمہاری سیکیورٹی کے انتظامات ہو چکے ہیں۔''

اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں... وہ تو مراد کے قریب رہنے کے لیے بے چین تھی۔ اس نے ایمان علی سے کہا۔ ''تم ایمبولینس کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس جاؤ۔ میں آ رہی ہوں۔ پیچھے مراد کے پاس رہوں گی۔''

اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''ٹیکسی چھوڑ کر یہاں کیوں آ رہی ہو؟ مراد تو نیم بے ہوشی کی حالت میں ہے۔ تمہاری گرمی دور نہیں کر سکے گا۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ میرے پاس گن ہے۔ میں اس کی حفاظت کے لیے قریب رہوں گی۔''

''تعجب ہے۔ دو سو کلومیٹر تک اس سے دور رہنے کے بعد یاد آیا کہ اس کی سیکیورٹی کے لیے قریب رہنا ہے۔'' پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''مائی ڈیئر ڈریم گرل! تمہارے ڈریم کو خوب سمجھتا ہوں۔ آ جاؤ، ایمبولینس رکوا رہا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد ہی ایمبولینس رک گئی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ''ٹیکسی روکو۔''

اس نے روک دی۔ اس نے باہر نکل کر اسے ریوالور کے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''باہر آؤ اور اپنا موبائل فون مجھے دو۔''

اس نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔ وہ اوپر سے ملبوس

اور نیچے سے برہنہ تھا۔ اس نے پھر حکم دیا۔ "فوراً یہاں سے واپسی کے راستے پر دوڑتے ہوئے جاؤ۔ پیچھے پلٹ کر نہ دیکھنا۔ گولی ماردوں گی۔"

وہ فوراً ہی دوڑتا ہوا وہاں سے دور جانے لگا۔ میڈونا نے دو فائر کر کے ٹیکسی کے دو پہیوں کو ناکارہ بنایا پھر اپنا سفری بیگ اٹھا کر دوڑتی ہوئی ایمبولینس کے پاس آگئی۔

ایمان علی نے اسے طنزیہ انداز میں دیکھ کر کہا۔ "میں تمام راستے یہ سوچتا آرہا تھا کہ حسین عورتیں بے وفا کیوں ہوتی ہیں؟ کیا تم بتا سکتی ہو؟"

وہ بولی۔ "آگے ڈرائیور کے پاس جا کر بیٹھو اور دہلی تک یہ تسلیم کرتے ہوئے جاؤ کہ عورتوں سے زیادہ مرد..... بے وفا ہوتے ہیں اور اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھتے رہو کہ کہاں کہاں منہ کالا کرتے رہے ہو۔"

وہ چپ چاپ ڈرائیور کے پاس اگلی سیٹ پر چلا گیا۔ اس نے پچھلے حصے میں مراد کے پاس آ کر دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ وہ ایمبولینس وہاں سے آگے چل پڑی۔

وہ بیڈ پر گہری نیند میں تھا۔ میڈونا اس کے پاس آ کر اس پر جھک گئی۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر ہتھیلی سے اس کے چہرے کو چھونے اور سہلانے لگی۔ لیکن تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اسے پوری طرح پالینا چاہتی تھی۔ آخر کیا کرتی کسی حد تک پالینے کے لیے وہ آہستہ آہستہ اس کے سر سے پاؤں تک سفر کرنے لگی۔

ایمبولینس تیز رفتاری سے اپنی منزل کی سمت جارہی تھی۔

☆☆☆

بلاّ اور بشریٰ ایک طرح سے ماروی کے باڈی گارڈ تھے وہ دونوں اپنے لباس میں ہتھیار چھپا کر رکھتے تھے۔ ماروی، چاچی اور چاچا سے اچھی خاصی محلے داری ہوگئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ محلے کے اور خاندانوں سے بھی انہوں نے دوستی بڑھائی تھی۔ اس طرح کوئی ان دونوں پر کسی طرح کا شبہ نہیں کرسکتا تھا۔

ماروی کا بہ ظاہر کوئی دشمن نہیں تھا۔ لیکن انجانے دشمن نہ جانے کتنے تھے؟ وہ مراد تک پہنچنے کے لیے اسے اغوا کر سکتے تھے اس کی شریک حیات کو اس کی کمزوری بنا کر اسے روپوشی ترک کرنے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرسکتے تھے۔

انہیں اب تک یہ معلوم تھا کہ وہ شملہ میں ہے۔ اس لیے سب کی توجہ ادھر تھی۔ وہ ماروی کو نظرانداز کررہے تھے۔ لیکن مراد موجودہ حالت میں اپنے علاج کے لیے کچھ زیادہ ہی رازداری سے روپوش ہونے والا تھا۔ لہٰذا اب وہ اسے کسی بل سے نکالنے کے لیے ماروی کی جان کو آسکتے تھے۔

بلے اور بشریٰ کو محبوب کی طرف سے تشویش نہیں تھی۔ وہ بہت ہی نیک دل اور امن پسند تھا۔ کسی کو نقصان پہنچانے اور لڑنے جھگڑنے سے گریز کرتا تھا۔ اس کی طرف سے یہ خیال رکھتا تھا کہ وہ عاشق اپنی دیوانگی سے ماروی کے لیے مسائل پیدا نہ کرے۔

اور وہ نیک دل عاشق ماروی سے وعدہ کرچکا تھا کہ اس کے لیے مسئلہ نہیں بنے گا۔ آئندہ اسے کال بھی نہیں کرے گا۔ اس کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے گم ہوجائے گا لیکن اپنی ماروی سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق زندہ رہے گا۔

رانجھا نے ہیر کے عشق میں جوگ لیا تھا۔ محبوب جوگی بن کر نگر نگر بھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ اسے گوشہ نشین ہونا تھا تاکہ کوئی اسے تلاش نہ کرسکے۔

سمیرا، معروف تجلی اور حماد صدیقی نے طے کرلیا تھا کہ ماروی کو ہی ہلاک کردیا جائے۔ اس کی موت سے ہوسکتا تھا کہ محبوب پاگل ہوجائے۔ پاگل تو وہ اب بھی تھا۔ سمیرا جیسی بہترین شریک حیات کو کسی دن طلاق دینے والا تھا۔ اس سے پہلے ہی ماروی دنیا سے اٹھ جاتی تو وہ ماتم کرتا رہ جاتا۔ سمیرا کو طلاق دینا بھول جاتا کچھ عرصے تک ابنارمل رہنے کے بعد رفتہ رفتہ نارمل ہوجاتا۔

انہوں نے اپنے طور پر سوچا تھا کہ ماروی کو ختم کر دینے سے مسائل ختم ہوجائیں گے۔ حماد صدیقی نے اپنے دو ماتحتوں کو ماروی کی گلی میں چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ اس کی دن رات کی مصروفیات کے بارے میں رپورٹ دیتے رہیں۔

معلوم ہوا کہ وہ کبھی کبھی شاپنگ یا تفریح کے لیے باہر جاتی ہے لیکن شہر کی بھری پری آبادی میں اسے گولی نہیں ماری جاسکتی تھی۔ نہ ہی اسے اغوا کر کے کسی ویرانے میں لے جا کر ہلاک کیا جاسکتا تھا۔ حماد پکڑے جانے کا اور نظروں میں آنے کا کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔

اس کے دونوں ماتحت باری باری اس گلی کے چکر لگاتے تھے۔ وہ دوسرے ہی دن بلے کی نظروں میں آگئے۔ تیسرے دن بلے نے چائے خانے میں آ کر ایک ماتحت کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔ "کیا اس گلی میں تمہاری کوئی معشوق ہے؟ کبھی تم یہاں کے چکر لگاتے ہو۔ کبھی تمہارا ایک ساتھی آ کر گھنٹوں یہاں بیٹھا رہتا ہے۔"

وہ بولا۔ "یہی سمجھو۔ کچھ تو یہاں ہے، جس کے لیے ہم آتے ہیں۔ ویسے ہم نے تمہیں اور تمہاری گھر والی کو اس مکان نمبر ایک سو چالیس میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ کیا تم

اس میں رہائش پذیر لوگوں کے بارے میں کچھ بتا سکو گے؟''

بلّے نے حیرانی سے پوچھا۔ ''اے بھائی! تمہیں اس مکان والوں سے کیا دلچسپی ہے؟''

اس نے اپنا آئی ڈی کارڈ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر پڑھنا جانتے ہو تو اسے پڑھو۔ میں اسپیشل برانچ کا جاسوس ہوں۔''

بلّا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس سے مرعوب ہونے کے انداز میں بولا۔ ''جناب! آپ تو قانون کے مائی باپ ہیں۔ میرے لیے حکم کریں۔''

وہ بولا۔ ''اس گھر میں ایک جوان عورت ہے۔ اس کا نام ماروی ہے۔ تم اپنی گھر والی کے ساتھ وہاں جاتے ہو۔ یہ تو معلوم ہوا ہوگا کہ وہ شادی شدہ ہے لیکن اس کا شوہر کہاں ہے؟''

بلّے نے کہا۔ ''میری گھر والی نے پوچھا تھا۔ وہ کہتی ہے اس کا شوہر سعودیہ میں نوکری کرتا ہے۔ جلد ہی چھٹی لے کر آئے گا۔''

''وہ جھوٹ بولتی ہے۔ اس کا شوہر ایک مفرور مجرم ہے۔ وہ یہاں جب بھی آئے گا تو بھیس بدل کر آئے گا لیکن ہم سے چھپ نہیں پائے گا۔''

اس نے اپنے لباس کے اندر سے ایک ریوالور کی جھلک دکھاتے ہوئے دھمکی دی۔ ''خبردار! ہمارے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا ورنہ ہم تمہیں ایک ہی گولی سے اوپر پہنچا دیں گے۔''

بلّے نے سہم کر کان پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میری توبہ۔ میرے باپ کی توبہ۔ اب تو میں اس کے دروازے پر بھی نہیں جاؤں گا۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''تم ایسی حماقت نہیں کرو گے۔ اس کے گھر ضرور جاؤ گے۔ میں نے دیکھا ہے۔ وہ پرسوں تمہارے ساتھ حیدری مارکیٹ گئی تھی۔ وہ تم میاں بیوی پر بھروسا کرتی ہے۔''

''ہاں، وہ ہمیں بالکل اپنا سمجھتی ہے۔''

''کیا تم اسے کسی بہانے سمندر کے ساحل پر لا سکتے ہو؟''

بلّا میز پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''اسے کیا لانا ہے۔ وہ خود مجھ سے کہہ رہی تھی کہ کل اسے ایک ساحلی کاٹیج میں لے چلوں۔ وہاں وہ کسی سے ملنا چاہتی ہے۔''

جاسوس نے فوراً ہی اس کے بازو کو تھام کر پوچھا۔ ''وہ کس سے ملنا چاہتی ہے؟''

''اس نے مجھے نہیں بتایا لیکن آپ کہتے ہیں کہ اس کا شوہر جب بھی یہاں آئے گا تو بھیس بدل کر آئے گا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ وہ اتنی دور ساحلی کاٹیج میں اسی سے ملنے جا رہی ہوگی۔''

وہ بلّے کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''بالکل یہی بات ہے۔ تم تو بہت کام کے آدمی ہو۔ قانون کا ساتھ دو گے۔ ہماری مدد کرو گے تو سرکار کی طرف سے تمہیں انعام ملے گا۔''

اس نے للچانے کے انداز میں پوچھا۔ ''سنا ہے انعام میں بہت بڑی رقم ملتی ہے؟''

وہ فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے افسر سے بات کر رہا ہوں۔ وہ خوش ہو جائیں گے۔ تمہیں گائڈ کریں گے کہ کل کیا کرنا ہے؟''

اس نے رابطہ ہونے پر کہا۔ ''ہیلو! کون؟ فوراً حماد صاحب سے بات کراؤ۔''

پھر اس نے جواب سن کر کہا۔ ''وہ جیسے ہی واش روم سے آئیں ان سے کہو فوراً مجھے کال کریں۔ وہ کمبخت مراد ہمارے شکنجے میں آنے والا ہے۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ بلّے نے حماد کا نام سن کر سمجھ لیا کہ وہ محبوب کے لیے کام کر رہا ہے۔ مراد کو راستے سے ہٹا کر ماروی کو حاصل کرنے کے لیے محبوب کا راستہ ہموار کر رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی حماد نے فون پر اپنے ماتحت سے پوچھا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا مراد ہمارے شکنجے میں آنے والا ہے؟''

''جی ہاں۔ میں نے پہلے رپورٹ دی تھی کہ ماروی کے محلے میں ایک میاں بیوی رہتے ہیں۔ ماروی سے ان کی ایسی دوستی ہے جیسے وہ سگے رشتے دار ہوں۔ وہ اس شخص کے ساتھ......''

اس نے بلّے سے پوچھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

وہ بولا۔ ''قاضی احمد۔''

''وہ قاضی احمد کے ساتھ کبھی کبھی بازار یا شاپنگ پلازا جاتی ہے۔ آج اس نے قاضی سے کہا ہے کہ اس کے ساتھ ساحلی کاٹیج کی طرف جائے گی۔ وہ کسی شخص سے ملے گی۔

''سر! میں یقین سے کہتا ہوں کہ مراد اسی شہر میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ ماروی اس سے چھپ کر ملا کرتی ہے۔ کل بھی ملنے والی ہے۔''

حماد نے کہا۔ ''میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ اگر مراد اس سے ملنے نہ آئے۔ تب بھی وہ شہر سے دور ویران علاقہ ہے۔ ہم وہاں ماروی کا کام تمام کر سکیں گے۔ قاضی احمد کو اپنے اعتماد میں لو۔''

''سر! یہ قاضی احمد قانون کی مدد کرے گا لیکن انعام

میں نقد رقم چاہتا ہے۔"

"اس سے کہو کل اسے پچاس ہزار روپے نقد دیے جائیں گے۔ ہم اناڑی نہیں ہیں۔ ماروی کو ختم کرنے کے بعد اس چشم دید گواہ کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"آل رائٹ سر! سمجھ گیا... میں ابھی اس سے تمام معاملات طے کرتا ہوں۔"

اس نے فون کا رابطہ ختم کر کے بلے سے کہا۔ "تمہاری تو چاندی ہو گئی۔ سر نے کہا ہے، کل مراد پکڑا جائے گا تو تمہیں کل ہی پچاس ہزار روپے دیے جائیں گے۔"

بلا ایک لالچی شخص کی طرح خوشی ظاہر کرنے لگا۔ وہ دونوں یہ طے کرنے لگے کہ کل وہ کس طرح ماروی کو کس وقت وہاں سے ساحل سمندر کی طرف لے جائے گا۔

کل ابھی دور تھا۔ آج محبوب کی روپوشی نے ان سب کو پریشان کر دیا۔ معروف تجلی نے ایک دفتری... معاملہ میں بات کرنے کے لیے فون کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنے فون کا سوئچ آف کر دیا ہے۔ اس نے پی ٹی سی ایل پر اسے کال کی۔ گھر کے ملازم نے کہا۔ "صاحب نہیں ہیں۔ وہ اپنا کچھ سامان لے کر ٹیکسی میں کہیں گئے ہیں۔"

معروف نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ اپنی کار چھوڑ کر ٹیکسی میں گئے ہیں؟ کہاں گئے ہیں؟"

"پتا نہیں جناب! آپ کے لیے ایک خط چھوڑ کر گئے ہیں۔"

"او گاڈ... ! میں ابھی آ رہا ہوں۔"

وہ فوراً ہی کار ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے احاطے میں آیا۔ اس نے سیکیورٹی افسر سے پوچھا۔ "صاحب یہاں سے کب گئے ہیں؟"

"صبح چھ بجے ملازم سے ایک ٹیکسی منگوائی پھر اس میں اپنا سامان رکھ کر چلے گئے۔ مجھے یہ کوٹھی کی چابیاں دی ہیں کہ آپ آئیں تو آپ کو دے دوں۔"

اس نے چابیاں لے کر پوچھا۔ "سامان کیا تھا؟"

"ایک سفری بیگ اور ایک اٹیچی تھی۔"

معروف کوٹھی کے اندر آیا تو ملازم نے اسے ایک لفافہ پیش کیا۔ اس نے لفافے کو چاک کر کے اندر سے تہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ وہ اس کے نام ایک خط لکھ کر گیا تھا۔

"معروف صاحب! میں جا رہا ہوں۔ پتا نہیں کہاں جاؤں گا۔ میں نے ماروی سے وعدہ کیا ہے کہ اپنی صورت اسے کبھی نہیں دکھاؤں گا اور نہ ہی کبھی فون پر اپنی آواز اسے سناؤں گا۔

"آپ بھی یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ آج سے میری آواز میرا وجود گم ہو چکا ہے۔ ماروی کے بغیر زندگی حرام ہے اور خود کشی بھی حرام ہے۔ اس لیے جب تک اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے، ماروی کے نام سے سانسیں لیتا رہوں گا۔

"آپ سے گزارش ہے کہ مجھے تلاش کرنے کا ذریعہ اخبارات اور ٹی وی چینلز کو نہ بنائیں۔ اگر آپ بھی مجھے تلاش کرتے ہوئے مجھ تک پہنچیں گے تو پھر میری لاش دیکھیں گے۔ بہتر ہے مجھے تلاش کرنے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ میں سمیرا کو طلاق نہیں دوں گا۔ ماروی کے صدقے اسے معاف کر رہا ہوں۔ وہ میری عدم موجودگی میں میری جائداد اور کاروبار کی مالکہ ہے۔ اس کوٹھی میں بھی آ کر رہ سکتی ہے۔ باقی والسلام۔ آپ کا نالائق بچہ محبوب علی چانڈیو۔"

معروف نے خط پڑھتے ہی سمیرا کو کال کی۔ اس سے کہا۔ "فوراً محبوب کی کوٹھی میں آؤ۔"

"وہ مجھے آنے نہیں دیں گے۔"

"وہ جا چکا ہے۔ پھر ایک بار روپوش ہونے کی حماقت کر رہا ہے۔ وہ میرے نام ایک خط لکھ کر گیا ہے۔ خدا تم پر مہربان ہے۔ وہ تمہیں طلاق نہیں دے گا۔ اس کی عدم موجودگی میں تم اس کے تمام بزنس اور جائداد کی مالکہ رہو گی۔ فوراً یہاں آؤ۔"

وہ کیسے نہ آتی؟ تقدیر کا ستارہ ڈوبنے سے پہلے ابھر گیا تھا۔ اس کا سہاگ سلامت رہنے والا تھا اور سہاگ کو سلامت رکھنے والا کہیں چلا گیا تھا۔ کوئی بات نہیں، پہلے کی طرح پھر بھی نہ کبھی واپس آئے گا۔ وہ ایسی آنکھ مچولی کو سمجھ رہی تھی۔

سمیرا نے آ کر اس خط کو پڑھا۔ پھر اسے سینے سے لگا کر کہا۔ "وہ مجھے اپنی زندگی سے الگ نہیں کریں گے۔ بس مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ وہ کبھی نہ کبھی واپس ضرور آئیں گے۔" پھر وہ ذرا چپ رہ کر بولی۔ "انہوں نے لکھا ہے کہ ماروی کے صدقے مجھے معاف کر رہے ہیں۔ کیا ہے یہ ماروی؟"

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے معروف کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "تمہاری بربادی ہے۔ آبادی بھی ہے۔ وہ کہتی ہے تمہیں چھوڑ دو تو چھوڑ دیتا ہے۔ وہ کہتی ہے معاف کر دو تو وہ طلاق دینے سے باز آ جاتا ہے۔"

سمیرا نے کہا۔ "وہ محبوب کی منکوحہ نہیں ہے لیکن میری سوکن ہے۔ کبھی احسان کرتی ہے کبھی کلیجا چھلنی کر دیتی ہے۔

"دیکھا جائے تو وہ کچھ نہیں کرتی۔ محبوب اس کی طلب میں مجھ سے عداوت کرتے ہیں۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے اسے بہت ہی شرمناک بات کہی تھی۔ جبکہ وہ

دو مردوں سے نہیں کھیل رہی ہے۔ دو مرد اس سے کھیل رہے ہیں۔ ایک نے اسے اپنا بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ دوسرا اسے اپنا بنانے کے لیے مجھے چھوڑنا چاہتا تھا۔

''یہ کھلی سچائی سامنے ہے کہ ماروی کبھی محبوب کی دولت کے آگے نہیں جھکی۔ دردر بھٹکنے والے مراد کے لیے مرتی رہتی ہے۔''

معروف اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ حق بات اس لیے سمجھ رہی تھی کہ اسے طلاق کے عذاب سے نجات مل گئی تھی۔ صرف ماروی کے کہنے سے وہ اربوں روپے کے تاجدار شوہر کو پھر سے جیت چکی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ''وہ میری ایسی سوکن ہے جو میرے لیے باعث رحمت بنتی رہتی ہے۔ پہلی بار میں نے اس کی جان لینے کی کوشش کی۔ اس نے محبوب سے شکایت نہیں کی۔ ایک ناقابل معافی دشمنی کے الزام سے بچالیا۔

''اس کے احسانات کو میں بھول جاتی ہوں۔ اس نے دوسری بار اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ آج میں بیگم محبوب علی چانڈیو بن گئی ہوں۔ اسی نے محبوب کو قسم دی تھی۔ اس قسم نے مجھے ان کی منکوحہ بنا دیا ہے۔

''تیسری بار پھر ایک احسان کیا ہے۔ مجھے مطلقہ ہونے سے بچالیا ہے۔ میں اس کے احسانات کو بھول جاتی ہوں۔ میرے اندر سوکن کا جلاپا ہے۔ اب میں اس سے دشمنی نہیں کروں گی۔ میں اس کے احسانات کا بدلہ چکاؤں گی۔ معروف صاحب! آپ ماروی کو ہلاک نہیں کرائیں گے۔''

معروف نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟''

''اس نے مجھے بار بار نئی زندگی دی ہے۔ میں بھی اسے ہلاکت سے بچا کر نئی زندگی دوں گی۔''

''جذباتی ہو کر یہ نہ بھولو کہ وہ زندہ رہے گی تو محبوب صرف تمہارا بن کر کبھی نہیں رہے گا۔ تم اربوں روپے کی دولت اور جائداد تو حاصل کر رہی ہو لیکن ماروی، محبوب کو حاصل نہیں ہونے دے گی۔۔۔ کیا یہی ہوتا رہے گا کہ وہ اس کے پیچھے بھاگتا رہے گا اور تم محبوب کے پیچھے بھاگتی رہو۔''

''مجھے یہ بھاگ دوڑ منظور ہے۔ پلیز ابھی حماد کو فون کریں۔ اسے ماروی کی ہلاکت سے باز رکھیں۔''

''میں ابھی اس سے بات کروں گا۔ تم بیڈروم میں جا کر دیکھو، وہ کیا سامان لے گیا ہے۔ اس سے شاید اندازہ ہو سکے گا کہ وہ کتنے دنوں تک کہیں روپوش رہ سکے گا۔ اس کی چیک بک سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کتنی رقم لے گیا ہے اور اس رقم سے وہ کب تک گزارہ کر سکے گا۔''

''واقعی چیک بک سے کچھ اندازہ ہو سکے گا۔''

وہ فوراً ہی اٹھ کر بیڈروم کی طرف جانے لگی۔ جب وہ دروازے سے گزر کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تو معروف نے حماد سے رابطہ کرنے کے بعد کہا۔ ''یہ عورتیں بڑی ہی جذباتی ہوتی ہیں۔ سمیرا کا سر پھر رہا ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا جناب؟''

''میں کسی بھی طرح محبوب کو واپس لانے کی پلاننگ کر رہا ہوں اور وہ ہے کہ ماروی سے نیکی کرنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے اسے ہلاک نہ کیا جائے۔''

''معروف صاحب! بڑا ہی سنہری موقع ہاتھ آیا ہے۔ ہم کل ہی ماروی کا پیچھا کرتے ہوئے مراد کو اور ماروی کو آسانی سے اوپر پہنچا سکیں گے۔''

''اور تم اس موقع کو ضائع نہیں کرو گے۔ میں ابھی سمیرا سے کہوں گا کہ حماد لاہور گیا ہے اور اپنا فون گھر میں بھول کر گیا ہے۔ تم ابھی کہاں ہو؟''

''میں اپنے گھر میں ہوں۔''

''اپنی وائف کو سمجھاؤ کہ ابھی میں نے فون کیا تھا تو تمہاری وائف نے یہی کہا ہے کہ تم فون کو وہاں بھول گئے ہو۔ سمیرا کال کرے تو تمہاری وائف اسے بھی یہی جواب دے گی۔''

''آل رائٹ۔ میں یہی کروں گا۔''

معروف فون بند کر کے سوچنے لگا۔ ''ماروی کی ہلاکت لازمی ہے۔ مجھے محبوب کے بزنس کو سلامت رکھنا ہے۔ ماروی کی موت سے وہ ذہنی مریض بن سکتا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں اس کا علاج کراؤں گا۔ وہ جلد ہی نارمل ہو جائے گا۔ اسے صبر آجائے گا۔ وہ پھر بزنس اور سمیرا کی طرف رجوع کرے گا۔''

سمیرا آگئی۔ معروف نے کہا۔ ''حماد سے بات نہیں ہو سکے گی وہ لاہور گیا ہے اور اپنا فون غلطی سے گھر میں چھوڑ گیا ہے۔''

''آپ کسی طرح اس سے رابطہ کریں۔''

''وہ لاہور میں کہاں ہے؟ کس مجرم کے پیچھے لگا ہے؟ کیسی ڈیوٹی دے رہا ہے؟ میں نہیں جانتا۔ تمہیں مطمئن رہنا چاہیے۔ وہ لاہور میں جب تک رہے گا۔ یہاں ماروی سلامت رہے گی۔ جیسے ہی وہ آئے گا۔ میں اسے سمجھا دوں گا کہ ہمارا منصوبہ بدل گیا ہے۔''

وہ مطمئن ہو گئی۔ معروف کچھ وقت وہاں گزار کر چلا گیا۔ وہ اندر سے مطمئن نہیں تھی۔ اس نے حماد کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس کی وائف کی آواز سنائی دی۔ اس

نے سمیرا سے وہی کہا جو اسے سکھایا گیا تھا۔ تب سمیرا نے مایوس ہوکر فون بند کردیا۔ اس نے مان لیا کہ حماد کی واپسی تک ماروی محفوظ رہے گی۔

دوسرے دن ملک الموت کی مصروفیت بڑھ گئی۔ موت کا فرشتہ دوست اور دشمن کی تمیز نہیں کرتا۔ اس کا کوئی رشتے دار نہیں ہوتا۔ جس کا وقت پورا ہوجاتا ہے' اسے لے جاتا ہے۔

بلا ایک ٹیکسی ماروی کے دروازے پر لے آیا تھا۔ حماد کا ماتحت دور ایک موٹر سائیکل پر تھا۔ اس نے دیکھا' ایک عورت عبا اور نقاب میں گھر سے نکل کر بلے کے ساتھ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس ماتحت جاسوس نے ماروی کو پہلے بھی عبا اور نقاب میں دیکھا تھا۔

اس نے فون کے ذریعے حماد سے کہا۔ ''سر! ماروی اس کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی ہے۔ وہ وہاں سے جارہے ہیں۔ میں دور سے ان کا تعاقب کرتا رہوں گا۔''

حماد اپنے ماتحت سے فون کے ذریعے معلوم کرتا جارہا تھا اور مطمئن ہورہا تھا کہ شکار وہاں کے کاٹیجز میں سے کسی ایک کاٹیج تک پہنچنے والا ہے۔ وہ ایک بڑی سی ویگن کار میں اپنے چار مسلح ماتحتوں کے ساتھ وہاں پہنچا ہوا تھا۔ ان کا انتظار کررہا تھا۔

وہ ماتحت اپنی موٹر سائیکل پر اب ٹیکسی کے قریب آرہا تھا۔ وہاں سے ساحل قریب تھا۔ سڑک ویران تھی۔ دو چار گاڑیاں آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ جیسے ہی ٹیکسی کے قریب آیا۔ بلے نے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے اسے اُڑا دیا۔ وہ اپنی بائیک سے اُڑتا ہوا دور جاگرا۔ یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مرچکا ہے۔

ڈرائیور نے سہم کر بلے کو دیکھا۔ وہ اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ''پیچھے نہیں آگے دیکھ کر چلاؤ۔ تمہیں گولی نہیں لگے گی۔ ہمارا ساتھ دوگے تو انعام ملے گا۔''

اس نے جیب سے ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر اسے دیے۔ وہ خوش ہوکر بولا' ''آپ مہربان ہیں تو پھر یہ دیکھیں گے کہ اس تابعدار کو جو بولیں گے۔ یہ وہی کرے گا۔''

''بشریٰ نقاب سے باہر آگئی۔ عبا اتار کر اپنے ہینڈ بیگ کو کھول کر دیکھا۔ اس میں پستول اور بلٹس کے پیکٹ رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ٹیکسی ایسے کاٹیج کے پاس رکوائی جہاں ایک فیملی موجود تھی۔ وہاں سے دور حماد اپنے ماتحتوں کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔

وہ اپنے ماتحت کے ساتھ آنے والی ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اب تک کسی ٹیکسی سے کوئی عبا اور نقاب والی کسی قاضی احمد کے ساتھ نظر نہیں آئی تھی۔

اس نے اپنے ماتحت کو فون کیا تو کسی اور کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ جسے کال کررہے ہو' وہ مر چکا ہے۔ اسے کسی نے گولی ماری ہے۔ اگر اس کے دوست یا رشتے دار ہو تو فوراً ساحلی پولیس چوکی میں آجاؤ۔''

حماد کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ یکلخت خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ مراد کس بلا کا گن فائٹر ہے۔ اسے یقین ہوگیا کہ مراد نے ہی اس کے ماتحت کو ہلاک کیا ہوگا۔

اس نے جھنجلا کر سوچا۔ ''پتا نہیں اس کم بخت کو کیسے ہماری پلاننگ کا علم ہوچکا ہے۔''

اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ ''ہوشیار رہو۔ دشمن چھپ کر حملہ کرنے والا ہے۔''

وہ ایک خالی کاٹیج کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ اپنی گاڑی سے دور تھے۔ اب کھلی جگہ نہیں رہ سکتے تھے۔ حماد نے کہا۔ ''میں جبار کے ساتھ کاٹیج کے اندر جارہا ہوں۔ تم تینوں کاٹیج کے آگے پیچھے چھپ کر رہو۔''

وہ اپنے ماتحت کے ساتھ کاٹیج کے اندر آیا لیکن ایک غلطی اسے مہنگی پڑی۔ اس نے اب تک باہر رہ کر غلطی کی تھی۔ ان سے پہلے ہی بشریٰ اور بلے پچھلے دروازے سے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں پہنچتے ہی ماتحت کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ اس کی آخری چیخ تھی۔ دوسرے کمرے کے دروازے سے ایک گولی آکر اسے لگی تھی۔

حماد نے تیزی سے اپنی گن نکالی۔ اس سے زیادہ پھرتی بلے نے دکھائی۔ اس کے ہاتھ پر گولی ماری تو گن ہاتھ سے نکل گئی۔ بلے نے بڑی سفاکی سے کہا۔ ''اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ دوسری گولی سینے کے پار ہوگی۔''

باہر سے ایک ماتحت کی آواز آئی۔ ''سر! میں نے جبار کی چیخ سنی ہے۔''

بلے نے کہا۔ ''زندہ رہنا چاہتے ہو تو ان سے بولو۔ ہتھیار پھینک کر کاٹیج کے سامنے سمندر کی طرف جائیں۔''

حماد بڑی تیزی سے اپنی سلامتی کے لیے سوچ رہا تھا۔ اسے باتوں میں لگا کر اپنی گن تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ''میں دشمن کے نشانے پر ہوں۔ اندر نہ آنا۔ ورنہ یہ مجھے مار ڈالے گا۔ مجھے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک کر سامنے سمندر کی طرف جاؤ۔''

وہ اپنے افسر کی زندگی چاہتے تھے۔ ہتھیار پھینک کر

کاٹیج سے دور جیسے ہی سمندر کی طرف جانے لگے۔ تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔

بشریٰ چھت پر تھی۔ اس کی فائرنگ سے دو گر پڑے۔ تیسرا بھاگ رہا تھا لیکن کوئی موت سے کیسے بھاگ سکتا ہے۔ وہ بھی گولی کھا کر گر پڑا۔

بشریٰ نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے کہا۔ ''بلے وہ تینوں جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔ میں نیچے آجاؤں؟''

اس نے کہا۔ ''آجا۔''

پھر حماد سے بولا۔ ''اگر یہاں ماروی اور مراد ہوتے تو تم انہیں زندہ نہ چھوڑتے۔''

اس نے گھور کر پوچھا۔ ''کون ہو تم؟ سمجھوتا کرو۔ فائدے میں رہو گے۔''

بلے نے کہا۔ ''ہم ماروی اور مراد کو فائدہ پہنچانے آئے ہیں۔ تمہاری نظروں میں ان کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو پھر تمہاری اہمیت کیا ہے؟''

اس نے ٹریگر کو دبایا۔ ایک گولی نے اس کی پیشانی میں سوراخ کردیا۔ دوسری گولی سینے میں اتر گئی۔ وہ فرش پر گرتے ہی بے جان ہوگیا۔ بلے نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ پھر جبار کی تلاشی لی تو گاڑی کی چابی مل گئی۔

اس نے فون پر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ''تم آگے چلتے رہو ہم پیچھے ویگن کار میں آرہے ہیں۔''

وہ بشریٰ کے ساتھ کاٹیج کے باہر آیا۔ پھر تیزی سے دوڑتا ہوا ویگن کار میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں زبردست فائرنگ ہوئی تھی۔ لوگ جمع ہوگئے تھے لیکن اس کاٹیج سے دور تھے۔ انہوں نے ایک مرد اور ایک عورت کو ویگن کار میں جاتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ کوئی قریب نہیں آیا۔ وہ دور جارہے تھے۔

اس بھیڑ میں ایک شخص نے فون کے ذریعے قریبی تھانے میں اطلاع دی اور بتایا کہ وہاں کیا ہو چکا ہے۔ ایک عورت اور مرد یہاں سے ایک ویگن کار میں فرار ہورہے ہیں۔ عورت نے سرخ شلوار اور قمیص پہنی ہے۔ مرد بھی سرخ ٹی شرٹ میں ہے۔

انہوں نے دور جا کر ہتھیار اور بلٹس پھینک دیے۔ بشریٰ نے شلوار اتاری۔ اس نے اندر پنڈلیوں تک جینز پہنی تھی پھر قمیص اتاری۔ اس کے اندر نیوی بلیو کلر کی شرٹ تھی۔

آگے ٹیکسی ڈرائیور ان کا منتظر تھا۔ بلے نے گاڑی روک کر اپنی ٹی شرٹ اتار کر پھینکی۔ بشریٰ کے ہینڈ بیگ سے ایک بلیک اینڈ وہائٹ کلر کی شرٹ نکال کر پہن لی۔ وہ دونوں بڑی تیزی سے یہ تبدیلیاں کررہے تھے اور ٹیکسی میں آکر بیٹھ گئے۔ پھر وہ ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

آگے پولیس چوکی میں وہی ہورہا تھا جس کا اندازہ انہوں نے پہلے کرلیا تھا۔ کئی سپاہی سڑک کے دونوں کنارے کھڑے ہوئے تھے اور گاڑیوں کو سست رفتاری پر مجبور کررہے تھے۔ ہر گاڑی کے اندر جھانک کر سرخ لباس والے مرد اور عورت کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ویسے بھی انہیں ایک ویگن کار کا انتظار تھا۔ وہ ٹیکسی میں جانے والوں پر شبہ نہیں کررہے تھے۔ اور نہ ہی کسی کو روک کر سوالات کررہے تھے۔

وہ دونوں بخیریت وہاں سے نکل گئے۔ ایک کہاوت کے مطابق سانپ نکل گئے تھے۔ اب لکیر پیٹی جانے والی تھی۔ یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ہزاروں لوگوں کے درمیان پانچ لاشیں گرا کر جانے والے کون تھے؟

☆☆☆

مراد ایک طویل گہری نیند سے بیدار ہوگیا۔ وہ خود کو ایک بستر پر زخم خوردہ دیکھ رہا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ اب تک کیا ہوتا رہا ہے؟

وہ آرام دہ بستر پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ کمرے میں اے سی آن تھا۔ بیڈ کے قریب ہی ایک ایزی چیئر پر جگنی بائی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اور ڈاکٹر ٹمی سن پچھلی تمام رات مراد کے انتظار میں جاگتے رہے تھے۔ جب ایمان علی دوسرے دن دس بجے اسے لے کر آیا تو انہوں نے گھما گھرا پلٹن کی سخت سیکیورٹی میں بڑی رازداری سے اس پناہ گاہ میں اسے پہنچادیا تھا۔

ایمان علی دوسرے کمرے میں سورہا تھا۔ تیسرے کمرے میں میڈونا نیند پوری کررہی تھی۔ وہ سب میڈونا کے شکرگزار تھے۔ اسی نے مراد کو نیم مردہ حالت میں پہلے کالکا کے ایک اسپتال میں پہنچایا تھا۔ اسے زندگی کی طرف لوٹایا تھا۔ اس کی دوستی اور محبت سے وہ جگنی بائی کی پناہ میں پہنچ گیا تھا۔

اس نے سر گھما کر جگنی بائی کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ اپنی منہ بولی ماں کی محفوظ آغوش میں پہنچ گیا ہے۔ ایسے وقت اس نے اٹھنا چاہا تو نہ اٹھ سکا۔ اس کے سینے پر سے ایک چوڑا بیلٹ گزرتا ہوا بیڈ کے دونوں سروں تک گیا تھا۔

اسے باندھ کر رکھا گیا تھا تاکہ وہ بیدار ہونے کے بعد اچانک اٹھ کر نہ بیٹھے۔ کیونکہ شانے کی ہڈی کو جوڑنے کے لیے شاید پلاستر چڑھایا گیا تھا۔

میڈیکل رپورٹ کے مطابق شانے کی ہڈی ٹوٹی نہیں

تھی صرف تڑخ گئی تھی۔ جب تک وہ نہ بجڑتی اسے لیٹے ہی رہنا تھا۔ وہ یاد کر رہا تھا کہ مرینہ نے اس کے دونوں پیروں پر بھی گولیاں ماری تھیں۔ اب وہ پیروں کے زخم کو محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے پین کلر انجکشن لگائے ہوا گے۔ تب ہی وہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔

اس نے سوچا۔ ''میں یہاں تک کیسے آیا ہوں؟''

تب اسے میڈونا یاد آئی۔ جہاں مرینہ کے ساتھ موت کا کھیل کھیلا گیا تھا' وہاں سے اسے لانے کے لیے صرف میڈونا ہی تھی۔ وہ اس کے پاس ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آ کر گر گیا تھا۔ اس کے بعد اسے اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔ عقل کہہ رہی تھی کہ میڈونا ہی اسے نئی زندگی کی طرف لائی ہے۔

تقدیر عجب تماشے کرتی ہے۔ مرینہ جو دوست تھی' دشمن بن گئی تھی اور دشمن کی بیٹی دوست بن کر اسے سلامتی دے رہی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے میڈونا کا چہرہ آیا۔ وہ بڑے پیار سے مسکرا رہی تھی۔ تب اسے کچھ یاد آیا۔ وہ اس کی آغوش میں آ کر گرتے ہی فوراً بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ نیم بے ہوشی کے مرحلے سے گزر رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے چہرے سے اس کے چہرے کو سہلا رہی تھی اور اسے چوم رہی تھی۔

اور کچھ یاد نہیں آیا۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔ وہ میڈونا کی محبت' طلب اور دیوانگی کو سمجھ رہا تھا۔ اس پر بہت بڑا احسان کرنے والی بڑی خاموشی سے صلہ مانگ رہی تھی۔

محبت کی بات آئی تو آنکھوں کے سامنے سے میڈونا مٹ گئی۔ ماروی دکھائی دینے لگی۔ وہ پریشان تھی۔ مراد نے آخری بار فون پر کہا تھا کہ اسے پھر کسی وقت کال کرے گا۔ اب پتا نہیں کتنا وقت گزر چکا تھا۔ اسے اپنی جانِ حیات کو کال کرنا تھا۔

وہ چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ بیڈ پر ادھر ادھر پھیلا کر اپنا فون ڈھونڈنے لگا۔ تکیے کے نیچے بھی ہاتھ لے گیا۔ ایسے وقت اس کا ایک ہاتھ سرہانے والی میز کی طرف جا کر ایک گلاس سے ٹکرایا تو وہ وہاں سے فرش پر گر کر ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ جگنی بائی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

وہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر قریب آئی۔ اس پر جھک کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میرے بچے! تم تو بے ہوشی کی نیند سو رہے تھے۔ درگا ماں کی کرپا سے دیکھ رہی ہوں۔ تم کسی طرح کی تکلیف محسوس نہیں کر رہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''ماتا جی! مجھے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں لیکن میں پہلے ماروی سے بات کروں گا۔ کیا میرا فون آپ کے پاس ہے؟''

''فون ایمان علی کے پاس ہے۔ ابھی ماروی سے بات کراتی ہوں لیکن ڈاکٹر نے کہا ہے' تمہیں پہلے پھلوں کا جوس پلایا جائے۔ ہلکا ناشا کرایا جائے۔''

''میرے حلق سے کچھ نہیں اُترے گا۔ میں پہلے ماروی سے بات کروں گا۔''

وہ اس کے ایک گال کو چوم کر بولی۔ ''ابھی لاتی ہوں۔''

وہ دوسرے کمرے میں جا کر فون لے آئی۔ کالنگ لسٹ میں ماروی کا نام اور نمبر تھا۔ اس نے وہ نمبر پنچ کیے پھر مراد کو فون دیتے ہوئے بولی۔ ''اپنی ماروی سے بات کرو۔ میں جوس لے کر آتی ہوں۔ اب تو پینے سے انکار نہیں کرو گے۔''

وہ چلی گئی۔ اس نے فون کو کان سے لگایا۔ اسی وقت ماروی کی آواز سنائی دی۔ وہ جذباتی ہو کر چیخنے کے انداز میں بولی۔ ''مراد یہ تم ہونا؟ تم ہوش میں آ گئے ہو؟ نیند سے بیدار ہو گئے؟''

''ہاں۔ ابھی جاگتے ہی تمہیں کال کر رہا ہوں۔''

''تم نے کل کہا تھا کہ کسی وقت کال کرو گے۔ اب ایک رات اور ایک دن گزر چکا ہے۔ تم خیریت سے ہونا؟ تمہیں گولیاں لگی تھیں۔ اپنی حالت بتاؤ۔ کہاں ہو؟ دشمنوں سے محفوظ ہونا؟''

وہ جلدی جلدی اپنے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب سن لینا چاہتی تھی۔ وہ بولا۔ ''تم بہت پریشان ہو کر بول رہی ہو۔ فکر نہ کرو' میں محفوظ ہوں۔ مجھ سے پیار کرنے والی ماں جگنی بائی میری تیمارداری کر رہی ہیں۔ کل بے ہوش ہونے کے بعد میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں یہاں محفوظ پناہ گاہ میں کیسے پہنچا ہوں۔ یہ ابھی معلوم ہوگا۔ پہلے میں تمہیں مطمئن کرنا چاہتا تھا کہ زندہ ہوں اور محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔ اب ایک آدھ گھنٹے بعد تمہیں کال کروں گا۔ تم خیریت سے ہونا؟''

''فی الحال خیریت ہے۔ بلا اور بشریٰ میرے لیے ڈھال بنے ہوئے ہیں۔ تم کال کرو گے تو بہت سی باتیں کروں گی۔ تمہیں بتاؤں گی کہ یہاں کیا کیا ہو رہا ہے۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ جگنی بائی نے اس کی گردن اور سینے پر ایک ایپرن رکھا تھا۔ اسے چمچ سے جوس پلانے لگی۔ ایمان علی نے آ کر اس سے مصافحہ کیا اور پوچھا۔ ''کیسے ہو؟ تکلیف یا بے چینی محسوس کر رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ”تکلیف نہیں ہے۔ بے چینی ہے کہ کل سے اب تک کیا ہو چکا ہے؟ کیا تم مجھے یہاں لائے ہو؟“

”تمہیں لانے والی تمہیں سیکیورٹی دینے والی میڈونا ہے۔ وہی بتائے گی کہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے؟“

”وہ کہاں ہے؟“

”شاور لے رہی ہے۔ ابھی آئے گی۔“

”میرے زخموں کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“

جگنی بائی نے کہا۔ ”ڈاکٹر انور ادھا ماہر سرجن ہے۔ ہماری گھا گھرا پلٹن کی اہم ممبر ہے۔ اس وقت تم اسی کی کوٹھی میں ہو۔ کوئی دشمن سوچ بھی نہیں سکے گا کہ میڈیکل بورڈ کی چیئرمین اور ماہر سرجن انور ادھا کی کوٹھی میں ہو۔“

”وہ کیا کہتی ہے؟“

”اس نے کہا ہے کہ شانے کی ہڈی کو جڑنے میں تقریباً بیس دن لگیں گے۔ تم کم از کم ایک ہفتے تک اسی طرح پڑے رہو گے۔ اس کے بعد اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہو سکو گے۔“

مراد نے مرینہ کا تصور کیا پھر کہا۔ ”لعنت ہے۔ اس نے مجھے سچ مچ اپاہج بنا دیا ہے۔ کیا وہ مر چکی ہے؟“

جگنی بائی نے کہا۔ ”چڑیلیں آسانی سے نہیں مرتیں۔ پتا نہیں زندہ ہے یا مر چکی ہے؟ یہ میڈونا ہی بتا سکتی ہے۔“

میڈونا دوسرے کمرے میں تھی۔ شاور لینے کے بعد آئینے کے سامنے اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی اور ڈرائر سے بالوں کو خشک کر رہی تھی۔ مراد کے سامنے بالکل فریش ہو کر جانا چاہتی تھی۔ ایسے وقت کالنگ ٹون نے اسے مخاطب کیا۔

اس کا باپ کال کر رہا تھا۔ اس نے فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ”یس پاپا؟“

”تم کہاں ہو؟ تمہیں تو صبح تک دہلی پہنچنا تھا۔ اب وہاں رات ہو چکی ہے۔ تم نے فون کا سوئچ آف رکھا تھا۔“

”ہاں میں سکون سے سو رہی تھی۔“

”اور میرا سکون برباد کر رہی تھیں۔ تم دہلی کے کسی ہوٹل میں نہیں ہو۔ پھر کہاں سکون سے سو رہی تھیں؟“

”آپ کے کتے میری اور مراد کی بو سونگھنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ انہیں واپس بلالیں۔ خواہ مخواہ لاکھوں ڈالرز خرچ کر رہے ہیں۔ آپ میرے ذریعے کبھی مراد تک پہنچ نہیں پائیں گے۔“

”تم بھی مرینہ کی طرح اس کے لیے پاگل ہو رہی ہو... یہ لکھ لو کہ وہ کبھی تمہیں گھاس نہیں ڈالے گا۔“

اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”اور ہاں تم نے کہا تھا کہ شملہ کے راستے میں مرینہ اور مراد کا ٹکراؤ ہوا تھا۔ مراد نے اسے ہلاک کر دیا تھا لیکن اس کی لاش کہاں ہے؟ میرے آدمی شملہ سے کالکا تک دوڑ لگا چکے ہیں۔ اگر وہ مردہ ہوتی تو اس کی لاش کہیں تو ملتی۔“

”اسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہوگا۔“

”جو بھی لے جاتا۔ اسے کہیں اسپتال میں ہی پہنچاتا لیکن شملہ اور کالکا کے کسی اسپتال میں وہ زندہ یا مردہ نہیں پہنچائی گئی ہے۔ وہ لاش خود بخود تو کہیں گئی نہیں ہوگی؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟ مجھے مرینہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”جس سے دلچسپی ہے اسے بھی پا نہیں سکو گی۔ میں تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔ باپ کے پاس آجاؤ۔“

”آپ کس طرح میری بہتری چاہتے ہیں۔ یہ میں دیکھ چکی ہوں۔ پلیز آئندہ فون نہ کریں۔ ورنہ میں سم بدل دوں گی۔“

اس نے کال کاٹ دی۔ پھر آئینے میں خود کو مختلف زاویوں سے دیکھا۔ سینے سے ایک آہ نکلی۔ ”مجھ میں کوئی کمی نہیں ہے پھر بھی... کیا کہوں؟ تقدیر کو ماننا پڑتا ہے۔“

وہ مراد کے کمرے میں آئی۔ وہاں جگنی بائی اور ایمان علی تھے۔ مراد نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”آؤ میڈونا! مجھے یہ نئی زندگی تم دے رہی ہو۔ ویری نائس آف یو۔ تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔“

وہ قریب آتے ہوئے بولی۔ ”شکریہ ادا نہ کرو۔ میں نے جو بھی اچھا کیا ہے اس کا صلہ دو۔“

”تم میرے دین اور ایمان کے مطابق جو مانگو گی دوں گا۔“

”میں مانگنے سے پہلے یہ بتا دوں کہ میں پاپا کو اور اپنے پورے خاندان کو چھوڑ چکی ہوں۔ اسی لیے یہاں روپوش ہوں۔ پاپا کے آدمی اس شہر کے تمام ہوٹلوں میں مجھے تلاش کر چکے ہیں۔ انہیں پورا یقین ہے کہ وہ میرے ذریعے تمہیں ٹریپ کر سکیں گے۔ میں گھر کی نہ رہی۔ اب کس گھاٹ اتروں گی۔ اس کا فیصلہ تم کرو گے۔“

وہ بیڈ کے اور قریب آکر بولی۔ ”میرا فیصلہ یہ ہے اور میں چاہتی ہوں مجھے اپنا دوست بنا لو۔ ایسی دوستی چاہتی ہوں جس میں کوئی غرض یا مطالبہ نہ ہو۔ نہ ہم میاں بیوی ہوں گے۔ نہ عاشق اور معشوق اور نہ ہی میں داشتہ بننا چاہتی ہوں۔“

جگنی بائی نے کہا۔ ”ایک جوان عورت اور جوان مرد کے درمیان نہ کبھی ایسی دوستی ہوئی ہے اور نہ ہو سکے گی۔“

میری بیٹی عقل کی بات کرو۔''

وہ بولی۔ ''آنٹی! عقل کی بات یہ ہے کہ ہم کبھی ایک چھت کے نیچے رات نہیں گزاریں گے۔ضرور تادن گزار سکتے ہیں۔میں دوست ہوں تو مجھے یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ جب تک یہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوں' میں ان کی تیمارداری کرتی رہوں۔اس کے بعد ان سے دور ہو جاؤں گی۔''

اس نے جگنی بائی سے کہا۔ ''مراد کے صحت یاب ہونے کے بعد آپ سے چاہوں گی کہ مجھے کسی ایسی پناہ گاہ میں پہنچا دیں' جہاں میرے پاپا اور ان کے آدمی نہ پہنچ سکیں۔''

''فکر نہ کرو۔تم میری بیٹی بن کر رہو گی۔کوئی تمہارے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''اور میں تم سے دوستی نباہتا رہوں گا۔تم سے دور رہ کر بھی تمہاری خبر رکھوں گا۔''

وہ بولی۔ ''ایک اور گزارش ہے۔جدائی کے بعد جب بھی میں یاد آیا کروں' مجھ سے فون پر دو باتیں کرلیا کرو گے۔''

ایمان علی حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ ''یہ مراد سے بے غرض اور بے لوث دوستی پکی کررہی ہے۔کیا اس کے قریب آکر اس کی تیمارداری کرتے وقت پارسا رہے گی؟''

مراد اس سے کہہ رہا تھا۔ ''فون پر رابطہ ضرور رکھوں گا۔اس طرح دوستی نباہتا رہوں گا کہ تم مجھے اپنے قریب محسوس کرتی رہوگی۔''

جگنی بائی نے کہا۔ ''میرا بیٹا زبان کا سچا ہے یہ تمہیں کبھی بے یارومددگار رہنے نہیں دے گا۔اب تم یہ بتاؤ کہ میرے بیٹے کی فائرنگ سے مرینہ بھی وہاں بے دست و پا ہو گئی تھی۔تم نے آخری وقت اسے کس حال میں دیکھا تھا؟''

''میں نے دیکھا' وہ زمین پر ایک لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی۔مجھے مراد کو جلد سے جلد ہاسپٹل پہنچانا تھا۔میں اس عورت کی نبض ٹٹولنے کے لیے نہیں رک سکتی تھی۔''

مراد نے جگنی بائی کو دیکھا۔وہ بولی۔ ''اس کے اندر کوئی بدروح گھسی ہوئی ہے۔وہ چڑیل زندہ ہوگی۔''

میڈونا نے کہا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔ابھی تھوڑی دیر پہلے پاپا نے مجھ سے کہا ہے کہ ڈھونڈنے سے نہ میں ان کے ہاتھ آرہی ہوں اور نہ ہی مرینہ کی لاش کہیں پائی گئی ہے۔ان کے آدمی شملہ سے کالکا تک تمام راستوں کو دیکھ چکے ہیں۔اس کی لاش کسی کو نہیں ملی اور وہ ٹیکسی اور بسوں کا ایک ہی راستہ ہے۔کہیں تو لاش کو ہونا چاہیے تھا لیکن وہ غائب ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''بہت سخت جان ہے۔ڈھیٹ ہے' مرنے والی نہیں ہے۔اسے بھی کسی نے اسپتال پہنچا دیا ہوگا۔''

''پاپا کے آدمی اسے اسپتالوں میں بھی تلاش کرچکے ہیں۔''

''پھر تو کوئی ایسی بات ہوئی ہے' جو ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔مجھے تو سو فیصد یقین ہے' وہ بچ گئی ہے۔میری طرح کہیں اپاہج ہو کر پڑی ہے۔کہیں اس کا بھی علاج ہو رہا ہوگا۔''

ایسے وقت ڈاکٹر انورادھا اس کا معائنہ کرنے آگئی۔وہ تقریباً چالیس برس کی ایک صحت مند پرکشش پرسنالٹی کی حامل تھی۔اس نے آتے ہی کہا۔ ''مریض کے پاس بھیڑ نہ لگائیں۔ابھی یہاں سے جائیں۔''

جگنی بائی' میڈونا اور ایمان علی کمرے سے چلے گئے۔انورادھا نے بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیسا فیل کررہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''آرام سے ہوں۔آپ نے ایسی دوائیں دی ہیں کہ تمام زخم خاموش ہیں۔تکلیف محسوس نہیں ہورہی ہے۔''

''ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرتے رہو گے تو جلد ہی چلنے پھرنے لگو گے۔میری پہلی ہدایت یہ ہے کہ مجھے آپ نہیں تم کہو گے۔''

''ماتا جی نے بتایا ہے کہ آپ بہت ہی معروف ڈاکٹر ہیں۔دہلی میڈیکل بورڈ کی چیئرمین ہیں۔آپ جیسی ہستی کا احترام لازم ہے۔میں آپ کو آپ ہی کہوں گا۔''

''ڈاکٹر سے بحث نہ کرو۔جو کہا ہے وہ کرو۔''

وہ اس کے بازوؤں کے مسلز کو چھو کر اور اس کے چٹان جیسے سینے پر ہتھیلی رکھ کر بولی۔ ''کیا تم فولاد کے بنے ہوئے ہو؟ زخموں سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ تم ہلنے جلنے اور بولنے کے قابل نہ رہتے۔تمہیں کالکا میں ایک بوتل خون پہنچایا گیا اور میں نے یہاں ایک بوتل خون دیا ہے۔''

وہ اس کے بدن کو سہلا رہی تھی اور بول رہی تھی۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے ساتھ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔شانے کی ہڈی میں ہلکا سا فریکچر ہے۔میں کوشش کررہی ہوں پندرہ بیس دنوں میں ہڈی پہلے کی طرح جڑ جائے گی۔''

وہ پریشان ہو رہا تھا۔انورادھا اسے اس طرح چھو رہی تھی اور سہلا رہی تھی جیسے پھسلتی جارہی ہو۔اس نے دل میں کہا۔ ''یا اللہ! یہ میرے ساتھ کیا ہوتا رہتا ہے۔جو عورتیں شرم وحیا سے عاری ہیں' وہی مجھ سے کیوں ٹکراتی ہیں؟''

وہ بولا۔ ''پلیز ڈاکٹر! میں تنہائی چاہتا ہوں۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ میں علاج کرنے آئی ہوں۔''

''بے شک علاج کریں۔ آدھے گھنٹے بعد آئیں۔ میری نماز کا وقت ہو گیا ہے۔''

''تم اٹھنے کے قابل نہیں ہو۔ عبادت کیسے کرو گے؟''

''ہمارے دین میں نمازیوں کے لیے بڑی سہولتیں ہیں۔ مریض اٹھنے بیٹھنے اور ہلنے کے بھی قابل نہ ہو تو لیٹے ہی لیٹے اپنے رب کے آگے پوری نماز پڑھ سکتا ہے۔ یہ میرا اور میرے رب کا معاملہ ہے آپ جائیں۔''

وہ بیڈ کے سرے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم پھر مجھے آپ کہہ رہے ہو۔''

''میں یہی کہوں گا۔ میں اپنے اصولوں پر چلنے کا عادی ہوں۔ پلیز ماتا جی کو یہاں بھیج دیں۔''

وہ وہاں سے چلی گئی۔ جگنی بائی کمرے میں آگئی۔ مراد نے کہا۔ ''ماتا جی! میں پریشان ہو گیا ہوں۔ کیا جتنی ہوس کی ماری عورتیں اور لڑکیاں ہیں، وہ میرے ہی نصیب میں ہیں؟''

جگنی بائی نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا انورادھا بھی...؟''

''جی ہاں۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔''

وہ اس کے ہاتھ کو تھپک کر بولی۔ ''آہستہ بولو۔ یہ تمہارے لیے سب سے محفوظ جگہ ہے۔ دوسری جگہ تلاش کرنے میں وقت لگے گا۔ یہ میری گھاگھرا پلٹن کی ایک اہم رکن ہے اور اب ہماری رازدار بھی ہے۔''

وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ یہ بہت ہی ہوس پرست ہے۔ چونکہ عزت دار ہے اس لیے بڑی رازداری سے ہوس کا کھیل کھیلتی ہے۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تمہیں بھی اپنے لیے استعمال کرنا چاہے گی۔ جبکہ یہ تم سے عمر میں بڑی ہے اور بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑی ہے۔''

''کچھ بھی ہو ماتا جی! مجھے یہاں سے لے چلیں۔''

''بیٹے! یہ بہت ہی مانی ہوئی تجربہ کار ڈاکٹر ہے۔ تم پر خاص توجہ دیتے ہوئے علاج کرے گی۔ تم جلد ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ علاج کے لیے اور یہاں کامیابی سے چھپ کر رہنے کے لیے گناہ گار بن جاؤ۔ مجھے ابھی سوچنے دو کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''سوچنے سے ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ میں انکار کروں گا تو اس کی انا کو ٹھیس پہنچے گی۔ وہ اپنی انسلٹ برداشت نہیں کرے گی۔ مجھے غلط دوائیں دے کر ایک لاعلاج اپاہج بنا کر چھوڑ دے گی۔''

مشکوک آدمی

پولیس۔ ''آپ کے اردگرد اگر کوئی مشکوک آدمی رہتا ہو تو بتائیں۔''

آدمی۔ ''سر میرا پڑوسی وقت پر آفس جاتا ہے۔ کام ایمانداری سے کرتا ہے۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ غیر مسلموں سے تمیز سے بات کرتا ہے اور ٹریفک رولز کی سو فیصد پابندی کرتا ہے، اس کو چیک کریں جی۔''

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

بھوت

شوہر۔ ''کل رات جب میں گھر لوٹ رہا تھا تو قبرستان کے پاس مجھے چار بھوت ملے۔ انہوں نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا۔''

بیوی۔ ''پھر کیا ہوا......؟''

شوہر۔ ''میں نے ان سے کہا کہ ٹھہر میں اپنی بیوی کو بلاتا ہوں۔ اور یہ کہہ کر میں نے زور سے تمہارا نام لے کر پکارا۔ اس پر چاروں بھوت بھاگ کھڑے ہوئے۔''

☆☆☆

مسکراؤ

شوہر اور بیوی میں لڑائی ہوئی۔ بیوی غصے میں بھری ہوئی اوپر گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک سوٹ کیس لیے اتری۔ یہ دیکھ کر شوہر نے اطمینان کی سانس لی اور بڑی ادا سے مسکرایا۔

بیوی دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔

''مسکراؤ۔ آج جی بھر کے مسکراؤ۔ کل سے تمہاری یہ مسکان اپنے آپ غائب ہو جائے گی۔ میں میکے نہیں جا رہی ہوں بلکہ یہ خالی سوٹ کیس امی کو بھجوا رہی ہوں تاکہ وہ اس میں اپنا سامان پیک کر کے یہاں آ جائیں۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

وہ بولی۔ ''کیا مشکل ہے۔ دشمنوں سے ابھی نجات ملی ہے تو اپنوں کے شکنجے میں پھنس رہے ہو۔'' وہ اسے تھپک کر بولی۔ ''تم نماز پڑھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ اس کمرے سے نکل کر ایک بیڈ روم میں آئی۔ وہاں انورادھا ایک صوفے پر ٹیک لگائے سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہوس کی دلدل میں خود کو مراد کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ جگنی بائی نے اس کے قریب بیٹھ کر پوچھا۔ ''کیا مراد پر دل آگیا ہے؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''بڑا جی دار مرد ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اتنی گولیاں کھانے کے بعد مر جاتا۔ ہائے...! یہ تو ایک ہی رات میں مجھے پاگل کر دے گا۔''

جگنی بائی نے کہا۔ ''یہ اپنی ماروی کا دیوانہ ہے۔ کسی بھی حسینہ کو اپنے قریب آنے نہیں دیتا۔ میری بیٹی ورشا بھی اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گئی ہے۔ مرینہ کا ذکر تم سن چکی ہو۔ وہ مرد مار بھی اپنی ضد سے باز نہیں آتی۔ اس نے جبراً اسے حاصل کرنے کے لیے اس پر گولیاں برسائیں اور خود اس کے ہاتھوں ماری گئی۔''

انورادھا نے کہا۔ ''مرینہ اسے اپاہج بنا کر حاصل کرنا چاہتی تھی اور یہ تو اپاہج بن کر میرے پاس پہنچا ہے۔''

''پھر بھی انورادھا...! ذرا سوچو اس کی رضامندی کے بغیر اسے کیسے حاصل کرو گی؟''

''میں اسے ایسا انجکشن لگاؤں گی کہ اس کے ہاتھ پاؤں عارضی طور پر بے جان ہو جائیں گے۔ باقی بدن... کام کرے گا.......... اسے سن نہیں کروں گی۔''

پھر وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''پہلی بار ایک مرد دیکھتا رہے گا اپنی آبرو لٹاتا رہے گا اور مجھے من مانی کرنے سے روک نہیں سکے گا۔''

جگنی بائی سوچ میں پڑ گئی۔ ''یہ انورادھا سمجھانے سے نہیں سمجھے گی۔ اپنی طبی حکمت عملی سے مراد کے ساتھ ضرور پاپ کرے گی۔ میں اسے جبراً روکوں گی تو یہ میرے بیٹے کو نقصان پہنچانے والی دوائیں دے گی۔ اسے ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا دے گی۔''

انورادھا نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟''

جگنی بائی نے اس کی طرف جھک کر رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''تم جیسے چاہو اپنی ہوس پوری کرو۔ لیکن مراد بہت ہی خطرناک ہے۔ جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگا تو مرینہ کی طرح تمہیں بھی مار ڈالے گا۔''

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''میں اسے چلنے پھرنے کے قابل ہی نہیں ہونے دوں گی۔''

جگنی بائی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کب اس کے ساتھ عیش کرو گی؟''

''دو چار دن ابھی علاج کروں گی۔ اسے کھلا پلا کر تگڑا کروں گی پھر اسے کھانے اور چبانے کا مزہ آئے گا۔''

جگنی بائی نے اس کے ساتھ قہقہہ لگایا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اچھا جاتی ہوں۔ اسے جا کر سمجھاؤں گی کہ سیدھی طرح تم سے راضی ہو جائے۔ وہ ڈاکٹر کو خوش رکھے گا تو جلد ہی دشمن کے مقابلے میں تگڑا ہو سکے گا۔''

وہ دروازے تک جاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں جگنی بائی! وہ سمجھ لے تو اچھا ہے۔''

جگنی بائی نے مراد کے کمرے میں آ کر دیکھا۔ وہ چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ خلا میں تکتا ہوا زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ بیٹا عبادت میں مصروف ہے۔

وہ کمرے سے باہر آئی تو انورادھا ادھر آ رہی تھی اس نے کہا۔ ''ابھی نہ جاؤ۔ وہ نماز پڑھ رہا ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں دور رہوں گی۔ اسے ڈسٹرب نہیں کروں گی۔''

وہ مراد کے کمرے میں چلی گئی۔ جگنی بائی نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ پھر بنگلے کے باہر آ کر فون پر بونے عبداللہ کبڈی سے رابطہ کیا۔ پھر غصے سے بولی۔ ''تم کہاں مر گئے ہو؟ کل سے اب تک تین بار کال کر چکی ہوں۔ تم نے فون بند رکھا۔ کیا بات ہے؟''

وہ بولا۔ ''ماتا جی! شما چاہتا ہوں۔ اپنی فرمونا کے ساتھ ہنی مون منا رہا ہوں اس لیے فون کو کبھی بند رکھتا ہوں، کبھی آن کر دیتا ہوں۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ کال کریں گی۔''

''کیا آگرہ میں ہو؟''

''جی ہاں۔ آپ حکم کریں؟''

''تمہارا جانی یار مراد علی منگی مشکل میں ہے۔ زخموں سے چور، بے دست و پا پڑا ہوا ہے۔''

اس کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ جیسے تڑپتے ہوئے بول رہا تھا۔ ''او میں مر جاؤں۔ میرے یار کی یہ حالت جس نے بنائی ہے۔ وہ تو سمجھو آج ہی اوپر جائے گا۔''

''پہلے یہ بتاؤ۔ اسے چھپا کر رکھنے کی کوئی جگہ ہے؟''

وہ بولا۔ ''فی الحال کوئی جگہ نہیں مل رہی ہے تو اس فارم ہاؤس میں لے چلتے ہیں' جہاں ایک بار مرینہ سے ہمارا

مقابلہ ہوا تھا۔ کیا مرینہ کے وہاں پہنچنے کا اندیشہ ہے؟''

''نہیں۔ مراد نے اسے گولیاں ماری ہیں۔ پتا نہیں وہ مرچکی ہے یا زندہ ہے۔ زندہ ہوگی تب بھی اتنی جلدی ادھر نہیں آسکے گی۔ تب تک ہم مراد کو کسی اور پناہ گاہ میں لے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دس بجے تک پہنچ رہا ہوں۔''

اس نے فون بند کرکے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں میڈونا اور ایمان علی کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے قریب آکر انہیں انورادھا کے متعلق بتایا اور کہا۔ ''یہ ایک آدھ گھنٹے میں ڈیوٹی کے لیے اسپتال جائے گی۔ ہم اس کے جاتے ہی یہاں سے مراد کو نکال کرلے جائیں گے۔''

ایمان علی نے کہا۔ ''آنٹی! یہ ہماری رازدار ہے۔ ہم اسے دھوکا دے کر جائیں گے تو یہ پولیس کو ہمارے پیچھے لگا سکتی ہے۔ مراد کے کسی دشمن کی آلہ کار بن سکتی ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ میں ہر پہلو سے سمجھ رہی ہوں کہ آئندہ کیا ہوسکتا ہے۔ میں اس سے نمٹ لوں گی۔''

مراد نے نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ انورادھا نے بیزار ہوکر پوچھا۔ ''تم کتنی لمبی عبادت کرتے ہو؟''

وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ ''یا میرے اللہ! مجھے اس بلا سے بچالے۔ میرے مالک! میں اتنا مجبور اور بے بس ہوگیا ہوں کہ اس سے پیچھا چھڑا کر یہاں سے جا نہیں سکتا۔

''میں نہیں جانتا یہ میری مرضی کے خلاف کس طرح مجھے گناہ گار بنائے گی لیکن کچھ تو ایسا کرے گی' جس سے میری پاکیزگی مجروح ہوگی۔ میں ایک بات پورے ایمان سے جانتا ہوں کہ تو مجھے مجروح نہیں ہونے دے گا۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔ اس کامل ایمان رکھنے والے کی دعا قبول ہوگئی۔ وہ اسے ہاتھ نہ لگا سکی۔ میڈونا ایک سوکن کی طرح سلگتی ہوئی وہاں آگئی تھی۔

انورادھا نے کہا۔ ''پلیز! باہر جاؤ۔''

وہ مراد کے پاس آکر بولی۔ ''یہ میرا یار دلدار ہے۔ میں خطرات سے کھیلتی ہوئی اپنے باپ اور خاندان سے دشمنی کرتی ہوئی اسے یہاں لائی ہوں۔ اس پر میرا حق ہے۔ میں اسے تنہا نہیں چھوڑوں گی۔''

''میں ڈاکٹر ہوں۔ اس سے عشق نہیں کررہی ہوں۔ علاج کررہی ہوں۔ تم یہاں سے جاؤ۔''

اس نے پوچھا۔ ''تم ڈاکٹر ہونا...؟''

''کیا میرے ڈاکٹر ہونے پر شبہ ہے؟''

''ہاں شبہ ہے۔ ایسا کیا علاج کررہی ہو کہ مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ نہ تمہارے پاس دواؤں کا بیگ ہے۔ نہ مرہم پٹی کا سامان ہے۔ کیا تم علاج کرنے کے لیے منتر پڑھ کر پھونکنے آئی ہو؟''

وہ غصے سے بولی۔ ''بکواس مت کرو۔ یہ میرا گھر ہے۔ ابھی تمہیں نکال دوں تو کیا اپنے زخمی یار کو یہاں سے لے جاسکو گی؟ کہاں لے جاکر چھپاؤ گی؟''

جگنی بائی نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے انورادھا؟ کیا تم دونوں جھگڑ رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''میں اس عورت کو اپنے گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔ اسے یہاں سے لے جاؤ۔''

میڈونا نے جگنی بائی کی طرف گھوم کر آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''مجھے مراد سے دور کرنا اور یہاں سے نکالنا آسان نہیں ہے۔''

پھر وہ انورادھا سے بولی۔ ''یہاں سے نکالو گی تو سیدھی پولیس اسٹیشن میں جاکر کہوں گی کہ اس شہر کی معزز اور معروف ڈاکٹر انورادھا نے ایک مفرور زخمی مجرم کو اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔''

انورادھا نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ کیا بکواس کررہی ہے۔ ایک کرمنل کو چھپانے کا الزام مجھ پر آئے گا تو میری برسوں کی شہرت اور نیک نامی خاک میں مل جائے گی۔''

پھر وہ میڈونا سے بولی۔ ''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ یہ تمہارا یار دلدار ہے۔ کیا میرے ساتھ اسے بھی پولیس کے حوالے کردو گی؟''

وہ بولی۔ ''میں تو ایک ہی بات جانتی ہوں۔ جب یہ مجھے حاصل نہیں ہوگا تو تمہیں بھی نہیں ملے گا۔''

جگنی بائی نے کہا۔ ''پلیز جھگڑا نہ کرو۔ ہم سب نقصان میں رہیں گے۔ انورادھا میرے ساتھ آؤ۔ میری ایک بات سنو۔''

وہ انورادھا کے ساتھ کمرے سے باہر آکر دھیمی آواز میں بولی۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہ مراد کے دشمن کی بیٹی ہے۔ اس کے عشق میں گرفتار ہوکر باپ سے بغاوت کرکے آئی ہے۔''

انورادھا نے اس کمرے کے دروازے کی طرف ناگواری سے دیکھا۔ جگنی بائی نے کہا۔ ''اگر تم اس کے منہ لگو گی تو یہ دشمن کی بیٹی پھر دشمن ہوجائے گی پھر تمہاری شہرت اور نیک نامی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

اسی بات نے اس ڈاکٹر کو کمزور بنا دیا تھا۔ جگنی بائی

نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ ''تم ذرا صبر کرو۔ میں کل تک میڈونا کو بہلا پھسلا کر لے جاؤں گی۔ پھر اسے یہاں نہیں آنے دوں گی۔ تمہارے راستے کا یہ کانٹا صاف کردوں گی۔''

وہ مطمئن ہو کر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ صبر کرنا ہی ہوگا۔ میری کمزوری اس کے ہاتھ آگئی ہے۔''

وہ مایوس ہو کر اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ جگنی بائی کمرے میں آکر بولی۔ ''میڈونا! تم نے کمال کر دیا۔ اس نیک نام عزت والی کے دماغ میں بدنامی کی گھنٹی بجادی ہے۔ وہ کل تک مراد کی تنہائی میں نہیں آئے گی۔''

پھر وہ جھک کر مراد کے کان میں بولی۔ ''کل بہت دور ہے، ہم ابھی دو گھنٹے کے اندر یہاں سے نکل جائیں گے۔''

مراد نے جگنی بائی کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے اپنی طرف جھکایا پھر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ اس کے بعد اس نے میڈونا کو دیکھا۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ کھنچی چلی آئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مراد کے ہاتھ کو تھام لیا۔ وہ بولا۔ ''واقعی تم نے بازی پلٹ دی ہے آج سے ہماری دوستی پکی۔''

وہ خوشی سے کھل رہی تھی۔ دل میں کہہ رہی تھی۔ ''آج تمہارا ہاتھ ملا ہے۔ کل پورے کے پورے میرے ہاتھ میں آجاؤ گے۔''

مراد کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ماروی کی کال نے ہاتھ میں آئے ہوئے مراد کا ہاتھ چھڑادیا۔ وہ فون اٹھا کر اسے کان سے لگا کر بولا۔ ''ہاں ماروی! میں وعدے کے مطابق کال نہ کرسکا۔ یہاں حالات تیزی سے بدل رہے ہیں لیکن تشویش کی بات نہیں ہے۔ تم اپنے حالات سناؤ۔''

اس کی آواز سنائی دی۔ ''حالات یہ ہیں کہ بلّے نے حماد صدیقی کو گولی ماردی ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''ایسا کیا ہوگیا تھا؟ اس نے حماد صدیقی کو کیوں ہلاک کیا ہے؟''

وہ وہاں کے حالات تفصیل سے بتانے لگی۔ مراد نے سننے کے بعد کہا۔ ''اچھا تو انہیں شبہ ہے کہ میں وہاں موجود ہوں اور تم چھپ کر مجھ سے ملنے آتی ہو۔''

''ہاں حماد اور اس کے مسلح ماتحت میرے ذریعے تمہیں ٹریپ کرنا چاہتے تھے۔ اگر میری جگہ بشریٰ نہ جاتی' میں ہی وہاں ہوتی اور بلّا محافظ نہ ہوتا تو حماد مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔''

مراد نے کہا۔ ''بلّے نے اسے اوپر پہنچا کر غلطی نہیں کی ہے۔ محبوب تو ماتم کر رہا ہوگا۔ حماد اس کا ایک مضبوط بازو تھا۔''

''محبوب اس کی ہلاکت سے ابھی بے خبر ہوگا۔ کیونکہ وہ یہ شہر چھوڑ کر پھر کہیں روپوش ہوگیا ہے۔ مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ مجھ سے بہت دور رہے گا اور فون پر بھی اپنی آواز نہیں سنائے گا۔''

''کمال ہے۔ اس کا مطلب ہے' مجھے پھر سے اس فرشتے کی عزت کرنی چاہیے۔''

''مراد! وہ ہمیشہ سے معزز رہے ہیں۔ تم رقیب بن کر دیکھتے ہو۔ اس لیے وہ دشمن دکھائی دیتے ہیں۔ سوچو یہ کتنی بڑی بات ہے وہ مجھے بدنامی سے بچانے کے لیے مجھ سے دور رہنے کے لیے اربوں روپے کا کاروبار چھوڑ گئے ہیں۔ ایئرکنڈیشنڈ کوٹھی کا آرام چھوڑ کر نہ جانے کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔''

''میں مانتا ہوں۔ محبوب نے تم سے دور ہو کر میرے دل و دماغ سے فکر و اندیشے دور کردیے ہیں۔ میں اتنے شریف اور عظیم رقیب کو سلام کرتا ہوں۔ اس کے باوجود جب تک اس کے دل میں تمہاری تمنا رہے گی۔ وہ میرے لیے رقیب رہے گا اور تم میری بیوی ہو کر محبوب کے نام سے بدنام ہوتی رہوگی۔''

''میں کیا کروں' یہی میری تقدیر میں لکھا ہے۔''

''محبوب تمہاری تقدیر لکھ رہا ہے۔ اگر وہ واقعی قربانیاں دینا چاہتا ہے تو وہ شہر نہ چھوڑے۔ اپنی شریک حیات کو نہ چھوڑے۔ سمیرا کو اتنی محبتیں دے کہ بزنس کمیونٹی میں میاں بیوی کی محبت مثالی بن جائے اور لوگ محبوب کے ساتھ تمہارا نام لینا بھول جائیں۔''

''درست کہتے ہو۔ محبوب کو تہذیب' اخلاق اور انسانی محبتوں کے پیش نظر سمیرا کو سب سے زیادہ اہمیت دینا چاہیے۔ میں پھر ایک بار محبوب کو سمجھاؤں گی۔''

''بلّے اور بشریٰ سے کہو' بہت محتاط رہیں۔ حماد صدیقی کی ہلاکت کے بعد اسپیشل برانچ والے انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ اب میں فون بند کررہا ہوں۔ یہاں کے حالات سے نمٹنا ہے۔ پھر کسی وقت کال کروں گا۔''

ماروی نے اپنے فون کو دیکھا۔ وہ ابھی مراد کی آواز میں بولتے بولتے چپ ہوگیا تھا۔ وہ اسے دھڑکتے ہوئے دل سے لگا کر سوچنے لگی۔ ''ہم کب ملیں گے؟ مراد کب آئیں گے؟ آتے آتے دونوں پاؤں سے معذور ہوگئے ہیں۔''

وہ اسے خیالی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ''پتا نہیں کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہوسکیں گے۔

ان کے آنے تک مجھے یہاں کے حالات سے نمٹنا ہوگا۔"

پھر اس نے چاچی سے پوچھا۔ "میں کب تک چھپ چھپ کر زندگی گزارتی رہوں گی۔ میرا اندازہ ہے مراد ایک ماہ تک بستر سے نہیں اٹھ سکیں گے پھر ایک ماہ بعد بھی حالات کیا کروٹ لیں گے، ہم نہیں جانتے۔"

"میں کیا بولوں بیٹی! تمہارے نصیب میں تو اس سے ملنا اور مل کے بچھڑنا ہی ہے۔"

"بچھڑنا زیادہ ہے۔ ملنا کم ہے۔ ابھی تو ان کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ پتا نہیں دشمنوں سے چھپ کر کس طرح اپنا علاج کرا رہے ہیں۔ ایسے وقت مجھے ان کے پاس رہنا چاہیے۔ کیسی مجبوری ہے۔ صرف میری دعائیں ہی ان کے پاس جا سکتی ہیں۔"

ایسے وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ چاچی نے جا کر دروازہ کھولا۔ وہاں تین شخص کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے کہا۔ "ہم اسپیشل برانچ سے آئے ہیں۔ یہاں ماروی نامی ایک خاتون رہتی ہیں۔ ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔"

ماروی نے دروازے پر آ کر کہا۔ "آپ اندر آجائیں۔ لیکن میں کسی ایک شخص سے بات کروں گی۔ تمام اجنبیوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

ایک شخص اندر آ کر چھوٹے سے ڈرائنگ روم کو توجہ سے دیکھنے لگا۔ ماروی نے پوچھا۔ "فرمایئے؟"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم ایک مفرور قاتل مراد علی منگی کی شریک حیات ہو؟"

"جی ہاں، لیکن اس نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔ اس پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔"

وہ بولا۔ "جھوٹ اور سچ کا فیصلہ عدالت میں ہوتا ہے۔ بہرحال، ہم جانتے ہیں کہ وہ اسی شہر میں کہیں چھپا ہوا ہے اور کل تم اس سے ملنے ساحلی کاٹیج کی طرف گئی تھیں۔"

"کل میں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا ہے۔"

"بے شک ہم نے ابھی محلے والوں سے معلوم کیا ہے تم گھر کی چار دیواری میں تھیں لیکن کوئی عورت عبا اور نقاب میں اسی گھر سے نکل کر ٹیکسی میں گئی تھی۔"

ماروی نے کہا۔ "وہ میرے لیے اجنبی تھی۔ ریڈی میڈ ملبوسات فروخت کرنے آئی تھی۔ میں نے کچھ نہیں خریدا تو وہ منہ بنا کر چلی گئی۔"

"قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنا آسان نہیں ہے۔ وہ اسی شہر میں رہتا ہے اور تم سے چھپ کر ملتا ہے۔"

"آپ کا کام شبہ کرنا ہے۔ شبہ کرتے رہیں۔ میری نگرانی کراتے رہیں۔ اگر وہ کہیں چھپا ہوا ہے تو مجھ سے ضرور ملائیں۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔"

"ہم آپ پر شبہ نہیں کریں گے۔ مسز سمیرا محبوب نے آپ کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ وہ بھی کہتی ہیں کہ مراد علی منگی پاکستان میں نہیں ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مقتول حماد صدیقی کس پر مراد ہونے کا شبہ کر رہے تھے اور ساحلی کاٹیج کی طرف کیوں گئے تھے۔"

"آپ حضرات کے ایک نہیں کئی دشمن ہوتے ہیں۔ مقتول کسی اور کو گرفتار کرنے وہاں گئے ہوں گے۔"

چاچی نے ٹھنڈا مشروب لا کر پیش کیا۔ وہ پیتا رہا اور مختلف پہلوؤں سے ماروی کو کریدتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ چاچی نے کہا۔ "جب تک مراد نہیں آئے گا۔ تمہیں یہاں سے نہیں لے جائے گا۔ تب تک پولیس والوں سے اور انجانے دشمنوں سے جان نہیں چھوٹے گی۔"

ماروی سوچ رہی تھی۔ "سمیرا کبھی دشمن بن جاتی ہے کبھی دوست۔ اب وہ پھر میری تعریفیں کر رہی ہے۔ یہ تبدیلی اس لیے آئی ہے کہ میں نے اسے مطلقہ ہونے سے بچایا ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ "لیکن محبوب کہاں گم ہو گئے ہیں؟ مراد نے ابھی ٹھیک ہی کہا ہے۔ محبوب یہیں سمیرا کے ساتھ مثالی میاں بیوی بن کر رہیں گے تو لوگ مجھے بدنام کرنا بھول جائیں گے۔ سمیرا بھی میری حمایت میں بولتی رہے گی۔"

فون اس کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اسے سہلا رہی تھی اور سوچتی رہی۔ "میں نے ہی محبوب سے کہا تھا کہ وہ فون پر بھی اپنی آواز نہیں سنائیں گے۔ لیکن اب مجھے اپنی آواز سنانی ہوگی۔"

اس نے نمبر پنچ کر کے اسے کان سے لگایا۔ رابطہ ہوتے ہی محبوب نے حیرانی اور خوشی سے پوچھا۔ "ماروی! تم ہو؟ تم قسم توڑ رہی ہو؟ تم ہی ہونا؟"

"ہاں۔ میں ہوں۔ مجبور ہو کر بول رہی ہوں۔ آپ کے روپوش ہونے سے میں اور زیادہ بدنام ہو رہی ہوں۔"

"میں کیا کروں ماروی؟ جب بھی نیکیاں کرتا ہوں، برائیاں سامنے آتی ہیں۔"

"نیکیاں ایسے نہیں کی جاتیں۔"

"پھر کیسے کی جاتی ہیں؟"

"آپ اپنی شریک حیات کے ساتھ دن رات ازدواجی، گھریلو اور سماجی زندگی گزارتے رہیں گے۔ آپ

کی محبت، آپ کی توجہ آپ کے دن رات سمیرا کے لیے ہوں گے تو سب کو یقین ہو جائے گا کہ آپ نے مجھے بھلا دیا ہے۔ دیوانگی اور پاگل پن سے باز آگئے ہیں۔''

''سمیرا نے تمہارے بارے میں شرمناک باتیں کی ہیں۔ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔''

''سمیرا نے وہی کہا، جو ساری دنیا کہتی ہے اور آپ کے عشق کے باعث کہتی ہے۔ آپ اپنی غلطیوں کو نہ سمجھ کر اس پر غصہ اتار رہے ہیں۔ وہ بہت اچھی ہے۔ آج بھی میری عزت کرتی ہے۔ کیا میری عزت کرنے والی کی آپ قدر نہیں کریں گے؟''

''تم ہمیشہ مجھے مجبور کر کے اپنی باتیں منوا لیتی ہو۔''

''میری باتیں سچی اور اچھی ہوتی ہیں اور آپ بھی اچھے ہیں۔ اس لیے میری باتیں مان لیتے ہیں۔ آپ واپس آئیں۔ یہاں سمیرا کے ساتھ رہ کر مجھے بدنامی سے بچائیں۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ لوگ مجھے بدنام کرنا تو کیا میرا نام لینا بھی بھول جائیں گے۔''

وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ''میں آ رہا ہوں۔''

''آپ مجھے بھول کر آئیں گے۔ مجھے حرفِ غلط کی طرح مٹا کر آئیں گے۔''

''جو چاہو گی، وہی کروں گا۔ تمہاری نیک نامی کے لیے دل پر پتھر رکھ لوں گا۔''

''پھر وہی عاشقانہ باتیں؟ یہ اندازِ گفتگو تبدیل کریں۔''

''رفتہ رفتہ تبدیل ہو جائے گا۔''

''میں رابطہ ختم کر رہی ہوں، ہمیشہ کے لیے۔ مجھے سمیرا سے معلوم ہوتا رہے گا کہ آپ اسے کتنی توجہ اور محبتیں دے رہے ہیں۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ فی الحال تو یہی کہا جا سکتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔ تقدیر کا پتا نہیں، وہ پھر کیا تماشے کرنے والی تھی۔

محبوب کہیں دور نہیں گیا تھا۔ حیدرآباد کے ایک مڈل کلاس ہوٹل میں بیٹھ کر پلان کر رہا تھا کہ کسی ایسی جگہ جا کر مستقل رہائش اختیار کرے، جہاں کوئی جاننے پہچاننے والا نہ آسکے۔ ایک دن اور دو راتیں گزارنے کے بعد ماروی نے اسے کال کی تھی اور اسے واپس آنے پر مجبور کیا تھا۔

وہ واپسی کے لیے سامان سمیٹنے لگا۔ ایسے وقت اس کی نظر ایک ٹی وی چینل کی بریکنگ نیوز پر گئی۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ ''انٹیلی جنس کے ایک افسر حماد صدیقی کو کسی نامعلوم شخص نے گولی ماردی۔''

محبوب کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ اس کا وفادار اور تابعدار تھا۔ سنگین معاملات میں اس کے کام آتا رہتا تھا۔ بڑا ہی جی دار شخص تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ کسی نے آسانی سے گولی ماری اور وہ مر گیا۔ اس نے فوراً ہی حماد صدیقی کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر ایک اجنبی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو، آپ کون ہیں؟''

محبوب نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟ حماد صدیقی کے فون پر بول رہے ہیں۔''

''میں مقتول حماد کا ایک اعلیٰ افسر بول رہا ہوں۔''

''میں محبوب علی چانڈیو بول رہا ہوں۔''

''چانڈیو صاحب آپ کہاں ہیں؟ آپ اسے بہت چاہتے تھے لیکن اس کی تدفین کے وقت بھی نہیں آئے۔''

''مجھے افسوس ہے۔ میں اس کے حالات سے بے خبر تھا۔ کیا پتا چلا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟''

''دشمن کوئی زبردست ہو گا۔ اس کے ساتھ ایک عورت گن فائٹر بھی تھی۔ یہ لوگوں کا چشم دید بیان ہے۔ ان دونوں نے حماد کو اور اس کے چار مسلح ماتحتوں کو ہلاک کیا ہے۔ وہ ایسی چالاکی سے فرار ہوئے ہیں کہ ان کے قدموں کے نشان بھی نہیں مل رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے، وہ مراد علی منگی ہو گا۔''

''مراد پاکستان میں نہیں ہے۔''

''آپ کی وائف سمیرا بھی یہی کہتی ہیں۔ آخر وہ کون ہو گا جس کے ساتھ ایک گن فائٹر عورت بھی ہے۔ وہ دونوں زبردست پلان میکر ہیں۔ اپنی پلاننگ کے مطابق کامیاب ہو کر گئے ہیں۔''

محبوب اس سے رابطہ ختم کر کے سوچنے لگا۔ ''مراد کے ساتھ ایک گن فائٹر مرینہ ہوتی ہے لیکن مراد ماروی کو ناراض کرنے کے لیے مرینہ کو کبھی یہاں ساتھ نہیں لائے گا۔ انٹیلی جنس والوں کے کئی دشمن ہوتے ہیں۔ ان دشمنوں کی ٹیم میں کوئی عورت بھی ہو گی۔''

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے حماد کی بیوہ کو کال کی۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ''میں محبوب علی چانڈیو بول رہا ہوں۔ آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ حماد میرا جاں نثار دستِ راست تھا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آپ خود کو تنہا نہ سمجھیں۔ میں آپ کے دکھ سکھ میں کام آتا رہوں گا۔''

وہ روتے روتے بولی۔ ''بھائی صاحب! مجھ کو اور میرے بچوں کو خدا کے بعد آپ ہی کا سہارا ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ کیا حماد آخری بار

آپ سے کچھ کہہ کر گیا تھا کہ کہاں جارہا ہے؟''

''آخری بار وہ کہیں جانے کی تیاری کررہے تھے۔ تب معروف صاحب نے فون پر ان سے بات کی تھی۔ پھر حماد نے مجھ سے کہا تھا کہ ابھی سمیرا کال کرے گی تو میں ان کا فون اٹینڈ کروں گی۔ ان سے کہوں گی کہ حماد اچانک لاہور گئے ہیں اور جلدی میں فون یہاں چھوڑ گئے ہیں۔''

محبوب نے حیرانی سے پوچھا۔''حماد اور معروف صاحب سمیرا سے جھوٹ کیوں بول رہے تھے؟''

''میں نہیں جانتی وہ ایسا کیوں کررہے تھے۔ جب سمیرا نے حماد کے فون پر کال کی تو میں نے ان کی ہدایت کے مطابق وہی جھوٹ کہہ دیا۔ وہ کچھ پریشان تھی۔ میں نہیں جانتی ان کے درمیان کیا ہورہا تھا؟''

وہ فون بند کرکے سوچنے لگا۔''حماد اور معروف صاحب' سمیرا سے جھوٹ کیوں بول رہے تھے۔ ایسی کیا بات تھی کہ اسے دھوکا دے رہے تھے؟'' یہ باتیں سوچتے رہنے سے سمجھ میں آنے والی نہیں تھیں۔ جو سوالات پریشان کررہے تھے۔ ان کے جواب معروف تجلی سے اور سمیرا سے ہی مل سکتے تھے۔

وہ دونوں کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حماد صدیقی کی ہلاکت ان کی توقع کے خلاف تھی۔ وہ ماروی کو ہلاک کرنے گیا تھا۔ خود اوپر پہنچ گیا۔

سمیرا نے کہا۔''میں نے آپ سے کہا تھا کہ ماروی کو ہلاک نہ کیا جائے۔ میں اسے زندگی دے کر ہی اس کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہتی تھی۔''

''اور میں کئی بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ تم بے حد ذہین ہونے کے باوجود شوہر کے معاملے میں نادان ہو۔ بعض اوقات ماروی کے معاملے میں' اس کی حمایت میں جذباتی فیصلے کرجاتی ہو۔''

وہ صوفے پر پہلو بدل کر بولا۔''کئی بار سمجھایا ہے۔ ہم صرف بزنس کو سمجھتے ہیں۔ ہمیں صرف کاروباری ذہن سے سوچنا اور فیصلہ کرنا چاہیے۔ ماروی کی موت محبوب کو صرف کاروبار کی طرف ہی نہیں' تمہاری طرف بھی لاسکتی ہے۔''

سمیرا نے پوچھا۔''کیا وہ مرگئی؟ ایسے وقت یہ ایمانی کہاوت سمجھ میں آتی ہے کہ جسے اللہ رکھے' اسے کون چکھے۔ جو مارنے گیا تھا وہ خود مرگیا۔''

وہ آگے کہتے کہتے رک گئی۔ ایک ملازم بیرونی دروازہ کھول کر ایک سفری بیگ اور اٹیچی اٹھا کر لارہا تھا۔ اس سامان کو دیکھتے ہی سمیرا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

ملازم انہیں بیڈروم کی طرف لے جارہا تھا۔ پھر دونوں ہی دروازے کی طرف دیکھ کر اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ صبح کا بھولا، شام کو گھر آگیا تھا۔

محبوب نے قریب آکر معروف تجلی سے مصافحہ کیا۔ وہ بولا۔''بیٹے! تم کہاں چلے گئے تھے؟''

وہ بولا۔''آپ تشریف رکھیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

اس نے سمیرا پر ایک نظر ڈالی۔ پھر بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔''یہاں آؤ۔''

وہ اس کے پیچھے کھنچی چلی گئی۔ ملازم سامان رکھ کر واپس آرہا تھا۔ محبوب نے بیڈروم میں پہنچ کر سمیرا کو دیکھا۔ وہ سامنے آکر سر جھکا کر کھڑی تھی۔ محبوب نے اسے گھر سے نکل جانے کو کہا تھا اور وہ اس کی عدم موجودگی میں آگئی تھی۔ یہ دھڑکا لگا تھا کہ وہ پھر اسے گھر سے نکالنے کے لیے آیا ہے۔

محبوب نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھے۔ اس انداز نے سمجھا دیا کہ وہ ناراض نہیں ہے۔ اسے قبول کررہا ہے۔ وہ روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

وہ اسے بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔''ماروی ہماری ازدواجی زندگی کی سلامتی چاہتی ہے۔ اس نے مجھے طلاق دینے سے روک دیا۔ تم میری شریک حیات ہو اور رہو گی۔''

اس نے جھک کر اپنا چہرہ اس کے چہرے پر رکھ دیا پھر کہا۔''میں کبھی واپس نہ آنے کے لیے گیا تھا لیکن ماروی نے پھر تمہاری طرف لوٹا دیا ہے۔ میں ایک اٹل فیصلہ کرکے آیا ہوں کہ میری زندگی میں صرف تم ہی تم رہو گی۔ ماروی نے صاف کہہ دیا ہے کہ میں اسے فون پر بھی اپنی آواز نہ سناؤں۔ لہٰذا میری آواز بھی اس کے لیے مرچکی ہے۔ صرف تم زندہ رہو گی۔''

اس نے فیصلے پر مہر لگانے کے لیے اپنے ہونٹ اس کے لبوں پر رکھ دیے۔ وہ تڑپ گئی۔ مچل گئی۔ ایسے لپٹ گئی جیسے اس کے اندر جذب ہوجانا چاہتی ہو۔

بند کمرے کی خاموش فضاؤ......! گواہ رہنا۔ یہ شوہر کی محبت' یہ ازدواجی لمحات ماروی اسے دے رہی ہے۔

معروف تجلی ڈرائنگ روم میں بیٹھا انتظار کررہا تھا۔ ملازم نے چائے لاکر رکھی تھی۔ اسے پی رہا تھا۔ جن لمحات میں جوانی کی دھوپ سوا نیزے پر ہوتی ہے' ان لمحات میں بوڑھے گرم چائے پی کر بھی ٹھنڈے رہتے ہیں۔

بڑی دیر بعد وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آئے۔ محبوب نے اس کے قریب ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''آپ میرے باپ دادا کے بزنس کو قائم و دائم رکھنے کے

لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ دوسروں کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ ابھی یہ سن کر بڑی تکلیف ہوئی کہ آپ نے حماد کو ماروی کی جان لینے کا مشورہ دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ ماروی جیسی معصوم اور بے قصور عورت کے لیے جلاد بن جائیں گے۔"

معروف نے کہا۔ "جلاد تو تم ہو۔ تم اپنے باپ دادا کے خوابوں کی تعبیر ہو۔ تمہیں بزنس میں ترقی کا گراف اوپر سے اوپر لے جانا چاہیے تھا لیکن تم اسے نیچے سے نیچے لا رہے ہو۔ باپ دادا کی تعبیر کو کچلنے والے جلاد تم ہو۔"

"ایک بیاہتا عورت سے عشق کرنا، خلافِ تہذیب ہے۔ بے غیرتی اور بے حیائی ہے اور تم غیرت اور شرم و حیا کا قتل کرتے آ رہے ہو۔ جلاد کون ہے؟ سمیرا جیسی وفا شعار، ذہین، تعلیم یافتہ اور شانہ بشانہ بزنس کو سنبھالنے والی شریک حیات کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ طلاق کی تلوار سے اس کی گردن کاٹنے والے ہو۔ بولو جلاد کون ہے؟"

سمیرا نے کہا۔ "یہ مجھے طلاق نہیں دیں گے۔"

وہ سمیرا کو ڈانٹ کر بولا۔ "تم چپ رہو۔ یہ شوہر پھسلاتا ہے اور تم پھسل جاتی ہو۔"

"میں سچ کہتی ہوں۔ اب یہ ماروی کا نام بھی نہیں لیں گے لیکن میں اس عظیم عورت کے نام کی مالا جپتی رہوں گی۔ مجھے میرا محبوب، میرے مجازی خدا واپس مل گئے ہیں۔ پلیز معروف صاحب! آپ کچھ نہ بولیں۔"

"میں ہزار بار بولوں گا۔ یہ جلتے انگاروں پر کھڑا ہو کر قسم کھاتے ہوئے کہے گا کہ ماروی کی طلب سے باز آ گیا ہے۔ تب بھی یقین نہیں کروں گا اور تم دیکھو لوگی، جلد ہی کچھ ایسا ہوگا کہ یہ پھر اس کی طرف کھنچا چلا جائے گا۔"

محبوب نے کہا۔ "خدا نہ کرے کہ میں اور ماروی اپنی قسم توڑیں۔ جواب تک ممکن نہ تھا۔ وہ ممکن ہوگا۔ آج سے صرف سمیرا ہی میری زندگی میں رہے گی۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکے گی۔"

"بڑے عزم سے اور ارادے کی پختگی سے بول رہے ہو۔ میں تم دونوں کی بہترین ازدواجی گھریلو زندگی کے لیے دعائیں کروں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "سمیرا! آفس کب آؤ گی؟"

سمیرا نے محبوب کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "میں نے حیدرآباد سے یہاں تک لمبا سفر کیا ہے۔ تھک گیا ہوں۔ اگر ضروری کام نہ ہو تو ہم کل سے روز آیا کریں گے۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی محبوب نے سمیرا کو دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ پھر بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "اب تو تم ہی تم ہو۔ میں تمہاری ذات میں خود کو گم کرتا رہوں گا۔"

☆☆☆

ڈاکٹر انور ادھا اسپتال سے واپس آئی تو اپنی کوٹھی کو خالی دیکھا۔ پنچھی پنجرے سے اُڑ گیا تھا۔ مراد بیڈ پر نہیں تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے بھی کہیں چلے گئے تھے۔

وہ شکست خوردہ انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ خالی بیڈ کی طرف غصے سے دیکھنے لگی۔ جسے حاصل کرنے کے لیے مچل رہی تھی، اسے جگنی بائی چھین کر لے گئی تھی۔

وہ جھنجلا کر اٹھ گئی۔ اس نے ملازم کو بلا کر پوچھا۔ "وہ لوگ یہاں سے کب گئے ہیں؟"

وہ بولا۔ "جب آپ اسپتال گئی تھیں۔ تب ایک گھنٹے کے اندر ہی وہ مریض کو اسٹریچر میں ڈال کر ایک گاڑی میں لے گئے۔"

وہ گھور کر بولی۔ "تم نے مجھے فون پر کیوں نہیں بتایا کہ وہ لوگ جا رہے ہیں؟"

"انہوں نے کہا کہ آپ نے انہیں فون کیا ہے اور مریض کو اسپتال لانے کو کہا ہے۔ میں تو یہی سمجھا کہ وہ لوگ آپ کے حکم سے اسے لے جا رہے ہیں۔"

وہ غصے سے اور تلملا گئی۔ جگنی بائی کی چالبازی زہر لگ رہی تھی۔ اسے چیلنج کر رہی تھی۔ اس نے فون پر اس کا نمبر ملایا پھر اسے کان سے لگا کر انتظار کرنے لگی۔

اس کی آواز سنائی دی۔ "ہاں انور ادھا ---- ! بولو۔"

وہ بولی۔ "تم تو آستین کا سانپ نکلیں۔ میں تمہاری گھا گھرا پلٹن کی اہم رکن ہوں۔ پلٹن کی عورتوں کے کئی خفیہ میڈیکل معاملات سے نمٹتی رہتی ہوں۔ تم نے میری اہمیت کو نظر انداز کر کے ایک مسلمان کو اہمیت دی ہے۔"

"یہ سمجھو وہ مسلمان کتنا اہم ہے کہ تم اس پر مرمٹی ہو۔ اس پاکباز سے گندہ کھیل کھیلنے کے لیے مچل رہی ہو۔ ہمیں درگا مَیا کے کرودھ سے ڈرنا چاہیے۔ اگر کوئی ایمان والا پناہ میں آیا ہے تو اس کی پوری طرح حفاظت کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے ہماری پوجا بھی سپھل ہوتی رہے گی۔"

"باتیں نہ بناؤ۔ تم نے مراد کو لے جا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب وہ یہاں نہیں ہے۔ کوئی یہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ میں نے ایک زخمی مجرم کو اپنے گھر میں لا کر اس کا علاج کیا تھا۔ اب میری نیک نامی قائم رہے گی اور تمہاری شامت آئے گی۔"

''تم کیا کرو گی؟''

''میں پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے کہوں گی کہ تم ایک بدنام زمانہ مجرم مراد علی منگی کو زخمی حالت میں میرے پاس لاکر رازداری سے اس کا علاج کرانا چاہتی تھیں۔ میں نے انکار کر دیا تو تم اسے کسی اور پناہ گاہ میں لے گئی ہو۔ وہاں اسے قانون کی نظروں سے چھپا کر اس کا علاج کرا رہی ہو۔''

''سوچ لو انورادھا...! گھا گھرا پلٹن کی تمام عورتیں تمہاری دشمن ہو جائیں گی اور میرے سائے میں کتنی خطرناک عورتیں پل رہی ہیں، یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔''

وہ بڑی بے باکی سے بولی۔ ''مجھے دھمکی نہ دو۔ جب اسی شہر کے تمام جاسوس اور پولیس والے مراد تک پہنچنے کے لیے تم تمام عورتوں کے پیچھے پڑ جائیں گے تو تم سب اپنے ذاتی اور خفیہ معاملات کو چھپاتی پھرو گی۔ تمہارے تمام خفیہ غیر قانونی دھندے نامعلوم مدت کے لیے بند ہو جائیں گے۔''

جگنی بائی ذرا چپ رہی۔ پھر بولی۔ ''درست کہتی ہو۔ ہمیں آپس میں جھگڑنا نہیں چاہیے۔ میں تم سے سمجھوتا کروں گی۔ کیا مراد تمہیں حاصل ہو جائے تو ہمارا جھگڑا ختم ہو جائے گا؟''

''صرف حاصل نہیں کروں گی۔ اس کا علاج کرنے تک اسے اپنے پاس رکھوں گی۔ اسے جہاں پہنچایا ہے، وہاں مجھے بھی پہنچاؤ۔''

''مجھے شام تک کی مہلت دو۔ میڈونا تمہاری دشمن ہے۔ میں پہلے میڈونا سے نجات حاصل کروں گی تو تمہارا راستہ صاف ہوگا۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ میں شام تک انتظار کروں گی۔''

جگنی بائی نے اس سے رابطہ ختم کر کے عبداللہ کبڈی کو فون پر مخاطب کیا۔ ''تم کہاں ہو؟ تمہیں اب تک یہاں ہونا چاہیے۔''

اس نے کہا۔ ''فکر نہ کریں۔ میں یہاں آگیا ہوں۔ آپ نے کہا تھا۔ مراد کو فارم ہاؤس لے جا رہی ہیں۔ اس لیے مطمئن ہو گیا۔ اسی شہر میں دشمنوں کی بُو سونگھتا پھر رہا ہوں۔ آپ مراد کو چھپانے کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئی ہیں۔ دشمن سکون سے نہیں رہنے دیں گے۔ اسے چھپانے کے لیے اور پتا نہیں کتنی پناہ گاہیں ڈھونڈنی پڑیں گی۔''

''درست کہتے ہو۔ ہمارے درمیان آستین کے سانپ بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر انورادھا ہماری دشمن ہو گئی ہے۔''

وہ کبڈی کو انورادھا کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگی۔ اس نے توجہ سے سننے کے بعد کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ آپ نے اس سے شام تک کی مہلت لی ہے۔ میں شام سے پہلے ہی اس کی زبان بند کر دوں گا۔''

جگنی بائی نے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ کبڈی دوسرا مراد ہے۔ جب تک مراد بستر پر رہے گا۔ وہ میدان جنگ میں رہ کر دشمنوں سے نمٹتا رہے گا۔

اور اسی شہر میں دشمن مراد کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہے تھے۔ بھارت کی اس راجدھانی میں ایک ایک بیمار اور زخمی تک پہنچ رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ گولیوں سے چھلنی ہونے والا زیادہ دنوں تک چھپا نہیں رہ سکے گا۔

سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ کے میکی براؤن کے علاوہ ڈینجرس ریکٹ کا ڈی بلیک، سی آئی اے اور بھارتی سرکار کی تمام جاسوس تنظیمیں، تمام اسپتالوں میں، ویدوں اور حکیموں کے گھروں میں جھانکتی پھر رہی تھیں۔ انہوں نے ایئرپورٹ، ریلوے اسٹیشن اور ہائی وے کے علاوہ ان تمام چھوٹے بڑے راستوں کی بھی ناکا بندی کر دی تھی، جو شہر سے باہر جاتے تھے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ مراد دہلی شہر کے پنجرے میں تھا۔ اسے پنجرے سے باہر نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی دن دشمنوں کی گرفت میں آسکتا تھا۔

ڈینجرس ریکٹ کا سربراہ ڈی بلیک وہاں موجود تھا۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ مراد کو کالکا سے دہلی لایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے شوٹرز کے ساتھ کالکا کے راستے پر گاڑیوں کو چیک کرنے گیا تھا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ مراد بہ حفاظت جگنی بائی کی پناہ میں پہنچ چکا تھا۔

پھر بھی ڈی بلیک کو کسی حد تک اس کا سراغ مل گیا۔ اس نے ایک ایمبولینس کو ایک گیراج میں دیکھا۔ وہ مرمت کے لیے وہاں آئی تھی۔ ڈی بلیک نے اس کے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کیا تم لانگ روٹ کی سواری لے جاتے ہو؟''

اس نے پوچھا۔ ''آپ کہاں جائیں گے؟''

اس نے کہا۔ ''ایک مریض کو یہاں سے کالکا لے جاؤں گا۔''

وہ بولا۔ ''میں کالکا ہی میں رہتا ہوں۔ آج صبح ایک مریض کو وہاں سے یہاں لایا ہوں۔''

ڈی بلیک نے پوچھا۔ ''کون تھا وہ مریض؟ بیمار تھا یا زخمی تھا؟''

''بہت زخمی تھا۔ اسے چھوڑیں۔ میں آپ کے مریض کو کالکا لے جاؤں گا اور پورے پانچ ہزار لوں گا۔''

وہ جیب سے دس ہزار روپے نکال کر دیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے وہاں پہنچادو۔ جہاں تم نے اس زخمی کو پہنچایا ہے۔''

وہ بولا۔ ''صاحب! وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ میں نے اس جوان عورت کے پاس ریوالور دیکھا ہے۔ اس نے راستے میں جنگل سے گزرتے ہوئے گولیاں بھی چلائی تھیں۔''

''میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ عورت یقیناً مرینہ ہوگی تم مجھے دور سے وہ مکان دکھادو۔ جہاں ابھی وہ مریض ہوگا۔''

ڈی بلیک نہیں جانتا تھا کہ میڈونا اپنے باپ سے متنفر ہو کر مراد جیسے جانی دشمن کی دوست ہوگئی ہے۔ وہ اسے مرینہ سمجھ رہا تھا، اسے مراد سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ میکی براؤن نے اس کے لیے پچاس لاکھ ڈالرز کا انعام رکھا تھا جو مراد کو گولی مارتا۔ اسی لیے وہ موت بن کر مراد کو تلاش کررہا تھا۔

ایمبولینس کے ڈرائیور نے اسے دور سے ڈاکٹر انورادھا کی کوٹھی دکھادی۔ ڈی بلیک اس کی کوٹھی کے اندر جانے سے پہلے یہ سوچ کر پریشان ہورہا تھا کہ وہاں مراد کی حفاظت کے لیے مرینہ ہوگی اور اس سے ٹکرانے کا مطلب ناکامی ہے۔

ڈی بلیک ایک بار لندن میں مرینہ سے مقابلہ کر کے مات کھا چکا تھا۔ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس چالباز فائٹر سے روبرو مقابلہ کر کے کبھی مراد کی موت نہیں بن سکے گا۔ وہ اپنے ایک ماتحت سے بولا۔ ''کسی طرح معلوم کرنا ہوگا کہ کوٹھی کے اندر مراد کی حفاظت کے لیے کتنے لوگ ہیں اور مرینہ بھی موجود ہے یا نہیں؟''

ایک ماتحت شوٹر نے کہا۔ ''معلوم کرنے کے لیے اندر جانا ہوگا یا کوٹھی کے دربان سے پوچھنا ہوگا کہ اندر کتنے لوگ ہیں؟''

''دربان کبھی نہیں بتائے گا۔ اسے تاکید کی گئی ہوگی۔ ہم اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کریں گے تو بات بگڑ جائے گی۔ مراد کی حفاظت کرنے والے ہوشیار ہوجائیں گے۔ وہاں مرینہ ہے۔ وہ ہمیں بھاگنے پر مجبور کردے گی۔ پھر وہ مراد کو کسی دوسری جگہ لے جائیں گے۔ ہم پھر اس کی تلاش میں بھٹکتے رہیں گے۔''

وہ پریشان ہوکر سوچنے لگا' کیا کرے؟ اس کے سامنے کوٹھی کے اندر پچاس لاکھ ڈالرز مراد کی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ اتنی بڑی رقم سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ آخر اس نے میکی براؤن کو فون پر کہا۔ ''میں نے مراد کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس وقت میں اس کی خفیہ پناہ گاہ کے سامنے ہوں۔''

وہ خوش ہوکر بولا۔ ''کیا واقعی؟ پھر تو تمہارے پچاس لاکھ ڈالرز پکے ہوگئے۔ کیا اسے گولی مار سکو گے؟''

''میرے لیے یہ کچھ مشکل نہ تھا لیکن جہاں اسے چھپایا گیا ہے' وہاں مرینہ اس کی حفاظت کے لیے موجود ہے۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''کیا بکواس کررہے ہو؟ وہاں مرینہ کہاں سے آجائے گی۔ وہ تو مرچکی ہے۔''

''کیا......؟'' وہ یکلخت اچھل پڑا۔ ''کیا مرینہ مرچکی ہے؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مسٹر براؤن؟''

''تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا ہے۔ مراد نے اسے ہلاک کیا ہے۔ اس نے بھی مرتے مرتے مراد کو زخمی اور اپاہج بنادیا ہے۔''

''آپ درست کہہ رہے ہوں گے لیکن میں نے سنا ہے کہ ایک عورت اسے کالکا سے یہاں لائی ہے۔''

''وہ میری بیٹی میڈونا ہے۔ وہ مجھ سے بدظن ہوکر مراد کے عشق میں گرفتار ہوکر اسے کہیں چھپاتی پھر رہی ہے۔''

وہ بولا۔ ''او گاڈ! میں خوامخواہ اسے مرینہ سمجھ کر سہا ہوا تھا۔ میں ابھی اس کوٹھی کے اندر جاؤں گا۔ جلد ہی آپ کو اس کی موت کی خبر سناؤں گا۔ اس کی لاش کی تصویر بھی SEND کروں گا۔''

اس نے فون بند کر کے دور انورادھا کی کوٹھی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے تین شوٹرز سے کہا۔ ''ہم ابھی مین گیٹ پر جائیں گے۔ دربان کو بڑی خاموشی سے بے ہوش کر کے اس کے کیبن میں اسے ڈال دیں گے۔ اس کے بعد کوٹھی کے اندر جائیں گے۔''

اس تدبیر کے مطابق وہ کوٹھی کی طرف جانے لگے۔ اسی کوٹھی کے پیچھے عبداللہ کبڈی پہنچا ہوا تھا۔ وہ احاطے کی دیوار پھاند کر پچھلے دروازے سے کوٹھی کے اندر آگیا۔ ایک اسٹور روم کے اندر پہنچ گیا۔ اس کے بعد ایک کچن تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے آہٹ سنی وہ فوراً ہی فریج کی آڑ میں ہوگیا۔ کوئی پچھلے دروازے سے چوروں کی طرح اندر آیا تھا۔

وہ ڈی بلیک کا شوٹر تھا۔ وہ لوگ اپنی تدبیر کے مطابق کوٹھی میں اس طرح داخل ہورہے تھے کہ دو پچھلے راستے سے آئے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ مراد کی حفاظت کرنے والے پچھلے راستے سے بھاگنا چاہیں گے تو وہ دو شوٹر انہیں نشانے پر رکھ لیں گے۔

کبڈی نے ان دونوں کے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ کسی نیک ارادے سے نہیں آئے ہیں۔ اس نے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے ایک کے ہاتھ میں گولی

ماری۔ اس کی گن فرش پر گر پڑی۔ دوسرے نے فوراً ہی کبڈی کی طرف گھوم کر نشانہ لیا۔ اس سے پہلے ہی ایک گولی اس کے بازو کا گوشت ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔

پہلا شخص فرش پر گر کر اپنا ریوالور اٹھا رہا تھا۔ تیسری گولی نے اسے بھی زخمی کر دیا۔ وہ دونوں اپنا اسلحہ اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ سہم کر ایک بونے کو دیکھنے لگے۔ وہ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ''فوراً بولنا شروع کر دو' کس ارادے سے آئے ہو اور تمہارے ساتھ کتنے گن مین ہیں؟''

وہ بولنے لگے۔ ایسے وقت ڈی بلیک باقی دو شوٹرز کے ساتھ سامنے والے دروازے سے کوٹھی میں داخل ہوا۔ اندر ایسی خاموشی تھی جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔ جبکہ معلومات کے مطابق مراد کو اور میڈونا کو وہاں ہونا چاہیے تھا۔

انہوں نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے پھر دبے قدموں چلتے ہوئے ایک بیڈ روم میں آئے۔ انورادھا کے سامنے ایک ٹی وی آن تھا۔ اس کے مزاج کے مطابق اسکرین پر ایک گرما گرم پروگرام چل رہا تھا۔ اس نے آہٹ سن کر سر گھما کر دیکھا تو تین اسلحہ برداروں کو دیکھتے ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

''کون ہو تم لوگ؟''

ڈی بلیک نے آگے بڑھ کر چھوٹی سی تپائی پر رکھے ہوئے فون کو اٹھا لیا۔ پھر پوچھا۔ ''مراد کہاں ہے؟''

اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ''کون مراد؟''

ڈی بلیک نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ ''جاؤ اور دیکھو اسے کس کمرے میں رکھا گیا ہے؟''

وہ دونوں چلے گئے۔ ڈی بلیک نے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ ''بہت ہاٹ سین دیکھ رہی ہو۔ یعنی جوانی ستا رہی ہے۔ چلو میں آ گیا ہوں لیکن پہلے مراد... ابھی اسے گولی کھا کر تڑپتے ہوئے' مرتے ہوئے دیکھو گی۔ کم آن سیدھی طرح بتا دو وہ کہاں ہے؟ مجھے اس کمرے میں لے چلو۔''

''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''یعنی میرے آنے سے پہلے تھا۔ میرے آتے ہی غائب ہو گیا۔ خوامخواہ وقت برباد نہ کرو۔ مجھے اس کمرے میں لے چلو۔''

وہ اس کے آگے آگے چلنے لگی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آئے۔ وہاں سے دوسرے کمرے کے دروازے تک پہنچتے ہی ڈی بلیک کے دماغ کو جھٹکا لگا۔ اس کا ایک شوٹر دروازے پر آدھا باہر آدھا اندر مردہ پڑا تھا۔

وہ فوراً ہی انورادھا کو چھوڑ کر چھلانگیں مارتا ہوا ایک الماری کی آڑ میں گیا۔ پھر وہاں سے اپنے دوسرے شوٹر کو آواز دی۔ ''آرتھر... ! تم کہاں ہو؟''

اسے جواب نہیں ملا۔ کبڈی اس الماری کے اوپر بیٹھا ہوا تھا جس کی آڑ میں ڈی بلیک چھپا ہوا تھا۔ اس نے ایک ذرا سر کو آگے کر کے کمرے کے اندر دیکھنا چاہا۔ دروازے پر ایک لاش پڑی تھی۔ دوسری کمرے کے اندر نظر آئی۔ اس کے تو جیسے ہوش اڑ گئے۔ یہی سمجھ میں آیا کہ مراد زخمی ہونے کے باوجود ایکشن میں ہے۔ وہاں سے بھاگنا چاہیے۔

وہ بھاگنے کے لیے الماری کی آڑ سے نکلا۔ اسی وقت کبڈی اوپر سے کود کر اس کے دونوں شانوں پر سوار ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ بے آواز چلنے والے ریوالور کی گولی نے اس کے ہاتھ سے ریوالور کو گرا دیا تھا۔

انورادھا ایک بونے کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ ڈی بلیک سہما ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

وہ بولا۔ ''کیا تم نے بونے مراد کی تصویریں نہیں دیکھی ہیں؟ میں آدھا مراد علی منگی ہوں۔ پورا بیڈ پر آرام فرما رہا ہے۔ بس اسی طرح مجھے اٹھائے رکھو۔''

پھر وہ انورادھا سے بولا۔ ''تمہیں بھی پورا نہیں ملے گا اور یہ آدھا تو اپنی فرمونا کا ہے۔''

اس نے ڈی بلیک کے سر پر چپت مارتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارے لیے یہ گدھا کیسا رہے گا؟''

وہ انورادھا کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تم انٹیلی جنس والوں کو انفارم کرنا چاہتی تھیں کہ جگنی بائی نے مراد کو چھپا کر رکھا ہے۔ ہوس کی اندھی ذلیل عورت میرے یار کی موت چاہتی تھی۔ موت کو کبھی دیکھا ہے؟ نہیں... یہ دیکھ۔''

اس نے گولی مار دی۔ وہ گرم رہنے والی فرش پر گر کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی ہو گئی۔ ڈی بلیک بری طرح سہما ہوا تھا۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ''میری جان نہ لو۔ سمجھوتا کرو۔ تمہیں مالا مال کر دوں گا۔ جو مطالبہ ہو گا وہ پورا کروں گا۔''

کبڈی نے کہا۔ ''میں وہ پچاس لاکھ ڈالرز چاہتا ہوں جو مراد کو قتل کرنے کے بعد حاصل کرنے والے ہو۔''

''نن...... نہیں...... مجھے معاف کر دو میں مراد سے دشمنی نہیں کروں گا۔''

''دشمنی نہیں کر سکو گے تو مجھے پچاس لاکھ نہیں دے سکو گے۔ اب وقت برباد نہ کرو۔ مجھے پچھلے دروازے سے باہر لے چلو۔ میں تھک گیا ہوں۔ ذرا آرام سے لے چلو۔''

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا پچھلے دروازے کی طرف آیا تو وہاں اپنے دو شوٹرز کی لاشیں دیکھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اگلے کسی بھی لمحے میں اس کی باری ہے۔

جب تک سانس چل رہی تھی۔ عاجزی سے گڑگڑا رہا تھا۔ رحم کی بھیک مانگتا ہوا پچھلے دروازے سے باہر آ گیا تھا۔ کبڑی نے کہا۔ ''باؤنڈری وال کے پاس لے چلو۔''

بونا آرام سے سواری کر رہا تھا۔ وہ اسے احاطے کی دیوار کے پاس لے آیا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا پھر بولا۔ ''جاؤ بھاگو۔''

بوجھ سے نجات ملتے ہی وہ پلٹ کر بھاگنے لگا۔ پھر چند قدم کے فاصلے پر ہی لڑکھڑا گیا۔ ایک گولی اس کی پشت میں سوراخ کرتی ہوئی دل میں گھس گئی۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ وہاں پورا مراد نہیں تھا اور آدھا مراد بھی دیوار کی دوسری طرف چھلانگ لگا کر گم ہو گیا۔

☆☆☆

دنیا کی ہر چیز اور ہر شخص فانی ہے۔ صرف شیطان کو فنا نہیں ہے۔ وہ قیامت تک زندہ رہے گا۔ مرینہ بھی آخر اسی کی بیٹی تھی۔ ابھی فنا ہونے والی نہیں تھی۔

جب وہ مراد کے نشانے پر گولیاں کھا کر گری تو اس میں بڑی جان تھی۔ نیم مردہ ہونے کے باوجود وہ جوابی حملے کر سکتی تھی لیکن پرانی تجربہ کار کھلاڑی تھی۔ یہ سمجھ گئی تھی کہ بازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ مراد حاوی ہو چکا ہے۔ اب وہ آخری گولی چلائے گا تو وہ پھڑ پھڑا کے مر جائے گی۔

اس نے فوراً ہی خود کو مردہ بنا لیا اور مراد میں بھی اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ ایک اور فائر کرتا۔ وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر میڈونا کے پاس جا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ مرینہ پتھریلی زمین پر پڑی لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہی تھی۔ مراد کو ٹیکسی میں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ ٹیکسی دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے کراہتے ہوئے اپنے ٹیکسی ڈرائیور کو آواز دی۔

وہ وہاں سے بھاگنے کے لیے اپنی گاڑی کا پہیہ بدل رہا تھا۔ وہ بڑی تکلیف سے کراہتے ہوئے اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ ''مجھے اسپتال پہنچا...... دو...... تم کو لاکھوں روپے دوں گی۔''

اس کا سفری بیگ پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے پہیہ بدلنے کے بعد اس بیگ میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ ہزار کے نوٹوں کی دو موٹی گڈیاں تھیں۔ اس نے اپنی جیبوں میں انہیں ٹھونس لیا۔ مال مفت دل بے رحم۔

وہ مرینہ کے پاس آ کر اس کے پاس سفری بیگ کو پھینکتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے بیگ میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ مجھے لاکھوں روپے کہاں سے دو گی۔ تم تو بولنے کے قابل بھی نہیں رہی ہو۔ اسپتال جانے سے پہلے مر جاؤ گی۔ میں کسی پولیس کیس میں پھنسنا نہیں چاہوں گا۔ تم یہیں مرو۔''

وہ اپنی ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ مرینہ کی جان نکلی جا رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے ایک ہاتھ اٹھا کر رکنے کو کہا۔ لیکن وہ رفتار بڑھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

مراد کو حاصل کرنا مہنگا پڑ رہا تھا۔ وہ اسے جبراً حاصل کرنے کے لیے اپاہج بنا کر لے جانا چاہتی تھی۔ اب خود ہی بے دست و پا‘ بے یار و مددگار اس ویرانے میں پڑی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ موت کس طرح آتی ہے؟ اب اس میں سانس لینے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ زخموں سے لہو بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ دنیا میں جتنی آنکھیں ہیں‘ ان سب کو بند ہونا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔

زندگی بھر اچھلنے کودنے اور موت سے پنجہ لڑانے والی کی لاش ویران راستے پر پڑی تھی۔ اب چیل کوے اور گدھ منڈلانے والے تھے۔ جس کے نصیب میں جو لکھا ہوتا ہے‘ وہی اس کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ یہ ہو رہا تھا کہ وہ ابھی گدھ‘ چیل اور کوؤں کا رزق نہیں بن رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اس ویرانے میں زندگی کا شور ابھرنے لگا۔ اس راستے پر دور سے ایک قافلہ چلا آ رہا تھا۔ ہنسنے بولنے گانے بجانے کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ وہ کسی علاقے کے براتی تھے۔ ایک دلہن کو اپنے گھر لے جا رہے تھے۔ برات میں پیدل چلنے والے بھی تھے۔ دو خچر گاڑیاں تھیں اور ان کے درمیان ایک بڑی سی لینڈ کروزر تھی۔ اس گاڑی میں ایک تانترک مہاراج دلہا اور دلہن کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ قافلہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ ایک شخص نے چیخ کر کہا۔ ''رک جاؤ۔ رک جاؤ۔ ادھر ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔''

تانترک مہاراج سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر لینڈ کروزر سے باہر آئے۔ کچھ فاصلے پر ایک لاش دکھائی دے رہی تھی۔ مہاراج نے زمین پر ادھر ادھر لہو کے دھبے دیکھے۔ پھر قریب آ کر مرینہ کی لاش کو گھور کر یوں دیکھا جیسے اس مردہ جسم کے اندر پہنچ رہے ہوں۔ وہ بہت پہنچے ہوئے مہاگیانی تھے۔ کرشماتی علوم رکھتے تھے۔ اس لیے تانترک مہاراج کہلاتے تھے۔

ان کی نگاہیں ایکسرے کی طرح مرینہ کے اندر اتر گئیں۔ انہوں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''یہ زندہ ہے۔ اسے گاڑی میں ڈالو۔''

فوراً ہی حکم کی تعمیل کی گئی۔ مرینہ کو اٹھا کر لینڈ کروزر کے اندر ایک سیٹ پر لٹادیا گیا۔ مہاراج ویدک ودیا کے بھی حامل تھے۔ جڑی بوٹیوں سے بڑا ہی زود اثر علاج کرتے تھے۔ دواؤں کا بیگ موجود تھا۔ انہوں نے ایک رقیق دوا کے دو قطرے اس کے منہ میں ٹپکائے پھر اس کی کلائی کو تھام کر دیکھا۔ نبض کی رفتار نارمل ہوگئی تھی۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ وہ قسمت کی دھنی تھی۔ مرتے مرتے جی رہی تھی۔ ابھی اپنے آپ سے غافل تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ زندگی کی طرف واپس آنے کے کن مراحل سے گزر رہی ہے؟

جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک کاٹیج کے بستر پر پایا اس کی چھت اور دیواریں لکڑی کی تھیں۔ ایک بوڑھا شخص جس کی ڈاڑھی اور سر کے بال سفید تھے۔ اس کے قریب بیٹھا تھا۔ آس پاس کچھ اجنبی عورتیں اور مرد کھڑے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھی خاتون نے کہا۔ ''یہ تانترک مہاراج ہیں۔ تمہارا علاج کررہے ہیں۔''

وہ مہاراج چمچ کے ذریعے اسے کوئی مشروب پلا رہے تھے۔ اسے پیتے پیتے آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔ زخم ایسے گہرے تھے کہ وہ بھی ہوش میں آنے کے بعد مراد کی طرح اپنے آپ سے غافل ہوگئی تھی۔ بھول گئی تھی کہ اس نے کیا کیا ہے اور اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے؟

اس کا علاج غفلت کے دوران میں بھی جاری رہا۔ زخموں کی مرہم پٹی ہوتی رہی۔ اس نے دوسری صبح آنکھ کھولی۔ تب توجہ سے اس کاٹیج کو اور تانترک مہاراج کو دیکھا۔ بڑی نقاہت سے پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

مہاراج نے کہا۔ ''دشمنوں سے دور ہو۔ یہاں تمہیں کوئی گولی مارنے نہیں آئے گا۔ اپنے دماغ سے فکر اور پریشانیوں کو نکال دو۔''

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ مہاراج نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''کچھ نہ بولو۔ خاموش رہو۔ آرام سے پڑی رہو۔ ذرا اور توانائی حاصل ہوگی۔ تب باتیں کریں گے۔''

اس نے شام کو کھانا کھایا۔ بڑی زود اثر دوائیں کھا رہی تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں توانائی محسوس کرنے لگی۔ رات کو مہاراج نے پوچھا۔ ''کون ہیں تمہارے دشمن؟ مجھے اپنے حالات بتاؤ۔''

وہ بولی۔ ''دشمن بے شمار ہیں۔ مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔ میں انہیں چٹکیوں میں اڑاتی ہوں۔ آہ! دشمن جاں ہے تو بس ایک ہی ہے۔ وہ میرا محبوب ہے۔ میری جان ہے۔''

''کیا جسے تم چاہتی ہو، وہی تمہاری جان کا دشمن ہے؟''

''ہاں، اور میں بھی اس کی دشمن ہوں۔ وہ مجھ سے راضی نہیں ہوتا۔ میرا جانی دشمن بھی نہیں ہے۔ مجھے زخمی کر کے چھوڑ دیتا ہے۔

''میں نے پہلی بار اسے زخمی کر کے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں پہنا کر اسے جبراً حاصل کیا تو وہ مجھے چاہنے لگا لیکن...'' وہ ناگواری سے بولی۔ ''وہ بچپن سے ایک لڑکی کو چاہتا ہے۔ اس کا دیوانہ ہے۔ اسے بیوی بنا چکا ہے لیکن مجھے اپنی منکوحہ بنانے سے انکار کر رہا ہے۔ میں نے پھر اسے زخمی کر کے زنجیریں پہنا کر حاصل کرنا چاہا۔ لیکن وہ مجھے گولیوں سے چھلنی کر کے چلا گیا۔ اس نے میری جان نہیں لی۔ آپ نے آ کر میری جان بچائی ہے۔''

مہاراج نے کہا۔ ''کیا پاگلوں جیسی محبت بھی ہے اور دشمنی بھی۔ تمہیں یہ نئی زندگی ملی ہے۔ کیا پھر اسے حاصل کرنا چاہو گی؟''

''ہاں۔ ایک بار صرف ایک بار اس کے بچے کی ماں بن جاؤں۔ پھر وہ میرے پیچھے آتا رہے گا۔''

''میرے پاس ایسی دوا ہے کہ ایک گولی خود کھاؤ ایک اسے کھلاؤ تو ایک ہی رات میں حمل ٹھہر جائے گا۔''

وہ فوراً ہی اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''مہاراج آپ کی مہربانی ہوگی۔ وہ گولیاں مجھے دیں۔''

''جس رات اس کے ساتھ رہو گی۔ اسی شام کو وہ گولیاں تیار کر کے دوں گا۔ اسے پہلے سے بنا کر نہیں رکھا جاتا۔ تم یہ سوچو کہ اسے راضی تو کر نہیں سکو گی۔ کیا پھر یہی موت کا کھیل کھیل کر جبراً حاصل کرنا چاہو گی؟''

''جیسے بھی ہوگا۔ بس ایک بار اس کا بچہ میری کوکھ میں آجائے۔ پھر موت کا یہ کھیل کھیلنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں بچے کو اس کی بہت بڑی کمزوری بنا دوں گی۔''

''وہ تمہیں نیم مردہ کرنے کے بعد کہاں گیا ہوگا؟ اسے کہاں تلاش کرو گی؟''

''ابھی تو وہ خود کسی اسپتال میں یا کسی خفیہ پناہ گاہ میں زیر علاج ہوگا۔ میں نے بھی اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔''

''ہے بھگوان! میں پہلی بار ایسا عشق دیکھ رہا ہوں۔ عاشق اور معشوق ایک دوسرے پر گولیاں چلاتے رہتے ہیں۔''

اس کی حیرانی بجا تھی۔ وہ ایک طویل عمر گزارنے کے بعد ایسے لیلیٰ مجنوں دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ '' ادھر

تمہارے زخم بھریں گے۔ ادھر وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگا تو پھر وہی لہو اچھالنے کا کھیل شروع ہوجائے گا۔''

''اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ آپ تانترک مہاراج ہیں۔ ناممکن کو ممکن بناتے ہوں گے۔ میرے لیے کوئی تدبیر کریں۔ اس بار اسے آسانی سے حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ کے خون خرابے سے تھک گئی ہوں۔''

''میں تمہارے لیے آسانی پیدا کروں گا۔ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ وہ کہاں چھپا ہوگا؟''

وہ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ ''وہ دہلی گیا ہوگا۔ وہاں اسے پناہ دینے والا ایک منسٹر دھرم داس ہے۔ ایک ڈاکٹر ٹمی سن اور گھا گھرا پلٹن کی کمانڈر جگنی بائی ہے۔''

''جگنی بائی......؟'' وہ ذرا سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ ''وہ تو میری منہ بولی بیٹی ہے۔ میں نے پچھلے چھ برسوں میں اس کی پلٹن کی کئی زخمی عورتوں کا علاج کیا ہے۔''

''کیا آپ اپنی منہ بولی بیٹی سے یہ اگلوا سکیں گے کہ مراد اس کی پناہ میں زیر علاج ہے۔''

''میں شہری ہنگاموں سے دور رہنے کے لیے پچھلے برس یہاں آگیا تھا۔ جگنی سے کہہ دیا تھا کہ کہیں دور جاکر دھیان گیان میں مصروف رہوں گا۔ کسی سے فون پر بھی بات نہیں کروں گا۔ اب اسے کال کروں گا تو وہ خوشی سے کھل جائے گی۔ اگر میں یہ کہوں گا کہ دہلی آرہا ہوں تو وہ میرے راستے میں اپنا دل اپنی آنکھیں بچھائے گی۔''

اس نے مہاراج کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''پھر تو آپ اسے کال کریں۔ اس سے اچھی بات کیا ہوگی کہ یہاں بستر پر پڑے پڑے مجھے اس جلاد محبوب کا سراغ مل جائے گا۔''

''تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں دواؤں سے اور کالے منتروں سے کس طرح اس کا دل پھیر سکتا ہوں۔ وہ ساری دنیا کو بھول کر صرف تمہارا ہوکر رہے گا۔''

''اگر ایسا ہوجائے گا تو میں آپ کے پاؤں دھو کر پیوں گی۔ آپ کی داسی بن کر رہوں گی۔''

''پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمہاری طرف مائل کیوں نہیں ہوتا ہے۔ جو چیز اسے روکتی ہے' پہلے اسے ختم کروں گا۔''

وہ بولی۔ ''ایک تو وہی اس کے بچپن کی محبت ماروی ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ میں ماروی سے اس کا دل پھیر دوں گا۔''

''میرے راستے میں دوسری رکاوٹ نماز ہے۔ وہ کہتا ہے' میرے ساتھ گناہ گار بنے گا تو اس کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی۔ وہ اللہ سے بہت ڈرتا ہے۔ میں نے کہا تھا گناہ نہ کرو۔ مجھے منکوحہ بنالو لیکن وہ ماروی پر سوکن لانا نہیں چاہتا تھا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ میں اسے تمہاری طرف مائل کروں گا تب بھی نماز رکاوٹ بنے گی؟''

''ہاں۔ میں سمجھتی ہوں' نماز ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کسی طرح نماز چھوٹ جائے تو پھر وہ گناہ اور ثواب کے جھمیلے میں نہیں پڑے گا۔''

''یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یوں چٹکی بجا کر اس کی عبادت چھڑا دوں گا۔''

وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''وہ بہت فولادی ارادوں کا مالک ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ نماز اسے گناہوں سے دور رکھتی ہے۔ وہ کئی بار نماز پڑھتے وقت معجزاتی طور پر گناہوں سے بچتا رہا ہے۔''

''تم دیکھو گی۔ میرے منتر تمام معجزوں کا سرو ناش کر دیں گے۔ وہ تمہارے قدموں میں لوٹنے لگے گا۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''میں کتنے دنوں میں چلنے پھرنے کے قابل ہوسکوں گی؟''

''تم کسی اسپتال میں بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے زیر علاج رہتیں تو زخم بھرنے اور چلنے پھرنے میں مہینوں لگ جاتے۔ میں تمہیں دس بارہ دنوں میں اچھلنے کودنے کے قابل بنادوں گا۔''

''میں مراد سے پہلے صحت یاب ہونا اور ایکشن کے قابل ہوجانا چاہتی ہوں۔''

''میں دہلی جاؤں گا۔ جگنی کا اعتماد حاصل کر کے اس کا علاج کروں گا تو وہ مہینوں تک بستر پر پڑا رہے گا۔ میں اس کے زخم بھرنے نہیں دوں گا۔''

''پھر تو میں آسانی سے اس پر حاوی ہوجاؤں گی۔''

''لیکن میں مراد کے علاج کے لیے ادھر جاؤں گا تو ادھر تمہارا علاج ادھورا رہ جائے گا۔ تم میری غیر موجودگی میں دوائیں کھا سکتی ہو۔ لیکن زخموں کی مرہم پٹی مجھے ہی کرنی ہوگی۔ یا پھر تمہیں بھی اپنے ساتھ دہلی لے جانا ہوگا۔''

''میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ وہاں مراد کے بہت قریب پہنچ کر اطمینان حاصل ہوگا۔''

''میں فی الحال دو دنوں تک یہاں تمہارا علاج کرتا رہوں گا۔ تمہیں وہاں تک سفر کرنے کے قابل بناؤں گا۔ میرے آدمی دہلی والے مکان میں جاکر اس کی صفائی کریں گے۔ اسے ہمارے رہنے کے قابل بنائیں گے۔ پھر ہم وہاں جائیں گے۔''

پھر دو دنوں تک یہی کیا گیا۔ مہاراج اس کے زخموں کو صاف کر کے دوائیں لگا تا رہا اور زیرِ لب منتر پڑھتا رہا۔ کھانے کی دوائیں بھی حیرت انگیز اثر دکھا رہی تھیں۔ وہ چوتھے دن خود ہی اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گئی۔

تانترک مہاراج نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''درگا میا کی کرپا سے .... دس دنوں میں تمہارے زخم بھر جائیں گے۔ اب میں جگنی سے بات کرتا ہوں۔''

اس نے فون پر اس کے نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک برس پہلے جگنی کے یہی نمبر تھے۔ ہو سکتا ہے اس نے سم بدل دی ہو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔''

مرینہ نے کہا۔ ''میرے فون میں جگنی بائی کے نمبر ہیں۔ رابطہ نہ ہوا تو ان نمبروں...''

مہاراج نے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ دوسری طرف سے جگنی بائی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ حیرت سے اور مسرت سے کہہ رہی تھی۔ ''مہاراج! پائے لاگوں۔ آپ نے ایک مدت کے بعد مجھے یاد کیا ہے۔ میں بڑی بھاگوان ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟ میں آپ کے چرنوں میں آنا چاہتی ہوں۔''

''میں تمہیں ضرور بلاؤں گا۔ بلکہ تمہارے پاس آؤں گا۔ ایک سال سے زیادہ سے بیت گیا ہے۔ میں انسانوں سے دور رہ کر ایک جنگل میں تپسیا کرتا رہا ہوں۔ کل رات میں نے تمہیں سپنے میں دیکھا۔ بڑا ہی بھیانک سپنا تھا۔ ایک جوان عورت جانے کیوں تمہاری دشمن ہو گئی تھی۔ وہ تم پر گولیاں چلا رہی تھی۔ تم بری طرح زخمی ہو گئی ہو۔ بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہو۔ مجھے پکار رہی ہو۔ مہاراج آؤ۔ میرے زخموں کو آپ ہی بھر سکتے ہیں۔ مجھے آپ ہی چلنے پھرنے کے قابل بنا سکتے ہیں۔''

جگنی بائی متاثر ہو کر سن رہی تھی۔ مہاراج کا سپنا کسی حد تک درست تھا۔ زخمی وہ نہیں ہوئی تھی مراد ہوا تھا۔ مہاراج نے پوچھا۔ ''میری بیٹی! تم خیریت سے ہو نا؟ کوئی تم سے دشمنی کر رہا ہے تو بولو۔ میں اس کی چتا میں اسے پہنچا دوں گا۔''

''نہیں مہاراج! میری کوئی دشمنی نہیں ہے میں سر سے پاؤں تک خیریت سے ہوں۔''

''کیا تمہاری گھا گھرا پلٹن میں کوئی عورت زخمی ہے؟''

''نہیں مہاراج! کوئی زخمی نہیں ہے۔ یہاں سب منگل کشل ہیں۔ مجھ پر کوئی بپتا آئے گی تو پہلے آپ کو پکاروں گی۔''

''درگا میا تمہیں سکھ شانتی سے رکھے۔ میں دو چار دنوں میں وہاں آنے والا ہوں۔''

''میں سواگتم کہتی ہوں۔ آپ جلدی آئیں۔ میں آج سے آپ کا انتظار کرتی رہوں گی۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ جگنی بائی اپنے فون کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ مراد کے علاج کے سلسلے میں پریشانیاں درپیش ہیں۔ جو قابلِ اعتماد ڈاکٹر رازداری سے اس کا علاج کر رہا تھا، وہ بہت زیادہ تجربہ کار نہیں تھا۔ اس کے برعکس مہاراج اپنی تانترک ودیا سے اور ویدک تجربات سے مراد کو ایک آدھ ہفتے میں چلنے پھرنے کے قابل بنا سکتا تھا۔

جگنی بائی جانتی تھی کہ مہاراج دواؤں سے اور کالے منتروں سے مراد کے تمام زخم بھر دے گا۔ رازداری سے علاج کرانے کی تمام مشکلیں دور کر دے گا۔ اس کے باوجود اس نے مہاراج سے مراد کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی اس کا علاج کرنے کے لیے مہاراج سے التجا کی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تانترک مہاراج مسلمانوں کا دشمن تھا۔ ایک برس پہلے مہاراج نے ایک بہت بڑے عالم دین سے ٹکر لی تھی۔ اپنے تانترک ہتھکنڈوں سے عالم دین کی روحانی قوتوں کو جھٹلانا چاہا تھا۔ پھر بری طرح ناکام ہو کر دہلی شہر چھوڑ کر بہت دور ایک چھوٹی سی بستی میں آ گیا تھا۔ وہاں پورے ایک برس تک دھیان گیان میں مصروف رہا تھا۔ گھور تپسیا کے ذریعے اپنی آتما شکتی کو مستحکم کرتا رہا تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ناقابلِ شکست ہو گیا ہے۔ کبھی عالم دین سے سامنا ہو گا تو شکست کا بدلہ لے کر اپنی آتما شکتی کو منوا سکے گا۔ اس نے جگنی بائی سے رابطہ ختم کرنے کے بعد مرینہ سے

مسکرائیے

بیوی (غصے سے) ''میرا جینا حرام ہو گیا ہے میں جا رہی ہوں اپنے میکے۔''

خاوند۔ ''جان چھوڑو خدا کے واسطے۔''

بیوی۔ (واپس آتے ہوئے) آپ کی یہی بات بری ہے کہ ''جان'' کہہ کر اور ''خدا کے واسطے'' دے کر روک لیتے ہیں۔

☆☆☆

جو لوگ پسند کی شادی نہیں کرتے وہ زندگی بھر لڑتے اور روتے رہتے ہیں اور جو لوگ پسند کی شادی کرتے ہیں...... ہوندی انہاں نال وی کتے آلی اے۔ پر دسدے نہیں (ان کے ساتھ بھی کتے والی ہوتی ہے مگر وہ بتاتے نہیں ہیں)

کہا۔ ”تمہارے من کی مراد، جگنی کی پناہ میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو وہ اس کے علاج کے لیے مجھے فوراً آنے کو کہتی۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میں نہیں مانتی۔ جگنی بائی نے اسے بیٹا بنایا ہے۔ اس کی ہر مصیبت میں کام آتی ہے۔ مراد اپنی اس ماں کے پاس ضرور گیا ہوگا۔“

وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”مراد کے چاہنے والوں میں ایک ڈاکٹر ٹمنی سن ہے اور ایک منسٹر دھرم داس ہے۔ یہ دونوں بھی اسے کہیں چھپا کر رکھ سکتے ہیں۔ میں اس کے تمام چاہنے والوں کو جانتی ہوں۔ ہم وہاں رہ کر اسے آسانی سے ڈھونڈ نکالیں گے۔“

”ٹھیک ہے، ہم جائیں گے اور کچھ روز انتظار کرو۔ ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ۔ میرے علاج سے جلد ہی تمہارے زخم بھرتے رہیں گے۔“

”کیا میں مراد سے پہلے چلنے پھرنے اور اس پر جھپٹنے کے قابل ہو جاؤں گی؟“

”ہو جاؤ گی۔ دھیرج رکھو۔“

وہ اپنے چہرے کو چھو کر بولی۔ ”اس نے میری یہ صورت دیکھ لی ہے۔ اور میں بھی اسے موجودہ بہروپ میں پہچان سکتی ہوں۔ مجھے پھر خود کو بدلنا ہوگا۔“

”بدل جاؤ گی۔ فکر نہ کرو۔ دہلی والے مکان میں رازداری سے سب کام ہو جائے گا۔“

”آپ میرے معاملے میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں کہ یہ پرسکون جگہ چھوڑ کر شہری ہنگاموں میں جا رہے ہیں۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ آپ مراد کو میری جھولی میں ڈالیں گے۔ میں آپ کی داسی بن کر رہا کروں گی۔“

”میں اپنے مقصد کے لیے بھی وہاں جا رہا ہوں۔ اس مولانا صلاح الدین اجمیری نے مجھے نیچا دکھایا تھا۔ اب میں اسے نیچے گراؤں گا۔ وہ میری آتما شکتی کے آگے ٹھہر نہیں سکے گا۔ آئندہ وہ شہر چھوڑ کر منہ چھپانے کے لیے کسی ویرانے کی طرف بھاگے گا یا میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ مجھے ہتھیاروں سے کھیلنا نہیں آتا۔ تم میرے اس دشمن کو مارو گی۔“

”یہ میری خوش نصیبی ہوگی کہ آپ کے کام آؤں گی۔ آپ دہلی پہنچ کر اس مولانا کا پتا ٹھکانا بتائیں گے پھر وہ ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے سکے گا۔“

اس نے خلا میں تکتے ہوئے مولانا اجمیری کو تصور میں دیکھا پھر کہا۔ ”پتا نہیں، وہ کہاں رہتا ہے۔ نماز کے وقت دہلی کی جامع مسجد میں نظر آتا ہے......“

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے اسے ذلت دیتا ہے۔

یا اللہ......! ہم سب کی خیر ہو۔

مولانا صلاح الدین اجمیری مسجد کے فرش پر بیٹھے عبادت میں مصروف تھے۔ ظہر کی نماز ادا کر چکے تھے۔ اب کچھ زیرلب پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان کے بے شمار عقیدت مند تھے جو نماز کے بعد ان سے مصافحہ کرتے اور اپنے حق میں ان سے دعائیں چاہتے تھے۔

وہ عبادت سے فارغ ہو کر مسجد کے ساتھ والے حجرے میں چلے جاتے تھے۔ وہاں مریض اچھی خاصی تعداد میں موجود ہوتے۔ وہ حجرہ ایک چھوٹا سا شفاخانہ تھا۔ مریضوں کو اور متاثرین کو وہاں سے ہر درد کی دوا ملتی تھی۔ وہ فرشی نشست پر آ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ عبداللہ کبڈی نے ان کے سامنے دوزانو ہو کر کہا۔ ”میرا ایک جانی یار ہے۔ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ دشمن کی گولیوں سے زخمی ہو کر بے دست و پا ہو کر بستر پر پڑا ہے۔ وہ مجبور ہے آپ کی خدمت میں آنے کے قابل نہیں ہے۔“

انہوں نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جس حد میں رکھتا ہے، اسی حد میں رہنا چاہیے۔ حد سے باہر مصیبتیں منتظر رہتی ہیں۔“

”آپ درست فرما رہے ہیں۔ اس کی چاردیواری سے باہر دشمن موت بن کر پھر رہے ہیں۔“

انہوں نے کہا۔ ”اس کے دونوں پیروں میں گولیاں لگی ہیں اور ایک شانے کی ہڈی تڑخ گئی ہے۔“

کبڈی نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔ کچھ بتانے سے پہلے ہی وہ مریض کا حال جانتے تھے۔ انہوں نے فرمایا۔ ”جان جاتی ہے تب بھی وہ نماز نہیں چھوڑتا۔ میں ایسے نمازیوں سے باخبر رہتا ہوں۔ رب العزت اسے عزت اور سلامتی دے رہا ہے۔“

وہ ایک بڑی سی ڈبیا کبڈی کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔ ”دو روز بعد نماز جمعہ سے فارغ ہو کر پلاستر ہٹا دو اور شانے پر اس دوا کی لیپ چڑھاؤ۔“

انہوں نے دوسری ڈبیا دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ معجون ہے۔ اسے تینوں وقت کھلایا کرو۔ اب جاؤ۔ دوسرے مریض منتظر ہیں۔“

وہ سر جھکا کر اٹھ گیا۔ سلام کر کے حجرے سے باہر آ گیا۔

مراد ایک خفیہ پناہ گاہ میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت میڈونا اس کی تیمار داری میں مصروف تھی۔ ایک بھیگے

تولیے سے اس کے بدن کو پوچھ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر غسل کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس لیے لیٹے ہی لیٹے وہ صاف ستھرا ہوا کرتا تھا۔

یوں میڈونا کی حسرتیں پوری ہو رہی تھیں۔ وہ اس بہانے اسے چھو رہی تھی۔ اسے دیکھ رہی تھی۔ دونوں ہاتھ اس کے چٹان جیسے جسم پر جگہ جگہ سے گزر رہے تھے۔

یہ کام جگنی بائی ایک ماں کی حیثیت سے کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے تنہائی میں عاجزی سے التجا کی۔ ''ماتا جی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی مجھے زیادہ سے زیادہ مراد کے پاس رہ کر اس کی خدمت کرنے دیں۔''

جگنی بائی نے سمجھایا۔ ''بیٹی! عقل سے کام لو۔ ایسی خدمت کرتے وقت جذبات بھڑکتے رہیں گے۔ میرا بیٹا زخمی ہے۔ مجبور ہے۔ اسے نہ بھڑکاؤ۔''

''آپ کا بیٹا ضدی ہے۔ فولاد ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ نہ میں بہکاؤں گی' نہ وہ بہکے گا۔''

سچ یہ ہے کہ بہکنے سے پہلے باتیں بنائی جاتی ہیں۔ بہکنے کے بعد کچھ کہنے کے لیے نہیں رہ جاتا۔ جگنی بائی اسے ٹوک سکتی تھی۔ روک نہیں سکتی تھی۔ وہ مراد کو بار بار گناہوں سے بچتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں اپنے بیٹے کو سمجھتی ہوں۔ وہ پھسلنے والا نہیں ہے۔ جاؤ' اس کی خدمت کرو۔ اسے اعتراض کرنا ہوگا تو خود ہی کرے گا۔''

وہ غسل کرانے کا سامان کمرے میں لے آئی۔ وہ چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''ایمان علی کہاں ہے؟ یہ کام اسے کرنا چاہیے۔''

وہ بولی۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا۔ مجھے خدمت گزاری سے نہیں روکو گے۔ تمہاری قربت مجھے نہیں بہکائے گی۔ تم بھی اپنے مضبوط ارادوں پر قائم رہو۔'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''میرا دعویٰ ہے کہ شیطان مجھے نہیں بہکائے گا' کیا تمہیں بہکائے گا؟ تم تو بڑی قوتِ ارادی کے مالک ہو۔ کیا تمہارا ایمان کمزور ہے؟''

اس نے تصور میں ماروی کو دیکھا۔ وہ بڑی محبت سے مسکرا رہی تھی۔ اس سے پوچھ رہی تھی۔ ''خیریت تو ہے؟ مجھے یاد کر رہے ہو؟ کیا تمہیں میری ضرورت ہے؟''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ میری نگاہوں کے سامنے موجود رہو۔ میں ایک امتحان سے گزرنے والا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''میں رہوں گی تو میرے ساتھ پل صراط سے گزر جاؤ گے۔''

مراد نے بڑے اعتماد سے اپنی شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ ''آؤ صفائی کرو۔''

وہ تولیے کو پانی میں اچھی طرح بھگو کر اس کے پاس آئی۔ اس کے چٹان جیسے پھیلے ہوئے سینے کو اس سے پونچھنے لگی۔ پہلے ہی مرحلے پر میڈونا کے ذہن میں دھند چھا گئی۔ دل ادھر جانے کے لیے سینے کی دیوار سے ٹکرانے لگا۔

کیسے کیسے خیالات تھے؟ وہ سوچتے وقت جہاں تک جاتی' گیلے تولیے کے ساتھ وہاں پہنچ جاتی تھی لیکن ایک حد تک... بدن اور ہاتھوں کے درمیان تولیے کی دیوار تھی۔ اس کے ہاتھ پھسل سکتے تھے۔ جکڑ نہیں سکتے تھے۔

وہ ٹھہر ٹھہر کر چور نظروں سے مراد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ چاروں شانے چت پڑا ہوا چھت کو تک رہا تھا۔ اس سفید اجلی چھت پر اجلی اجلی سی ماروی اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ صفائی کرکے کمرے سے چلی گئی اور دوسرے کمرے میں جاکر جذباتی طوفان کو روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ ایک کھیلی ہوئی عورت تھی۔ اپنے جنون کو تھپکنا' سہلانا اور ٹھنڈا کرنا جانتی تھی۔ وہ مراد کے سامنے پارسا تھی۔

جگنی بائی نے مراد کے پاس آکر کہا۔ ''میں نے میڈونا کی ضد مان لی تھی۔ تم نے بھی مان لی۔ تم بیمار ہو۔ کیا تمہارے دل اور دماغ پر بوجھ نہیں پڑا؟''

وہ بولا۔ ''اس نے دعویٰ کیا تھا کہ شیطان اسے نہیں بہکائے گا۔ میرا بھی یہی دعویٰ تھا۔ آپ دیکھ رہی ہیں۔ میں نارمل ہوں۔''

پھر اس نے چھت کی طرف تکتے ہوئے کہا۔ ''میرے دل میں ماروی بیٹھی ہے اور سر میں نماز کا سودا سمایا ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

جگنی بائی بڑی محبت سے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ایسے وقت عبداللہ کبڈی نے وہاں آکر سرہانے کی میز پر دوائیں رکھیں۔ جگنی بائی نے پوچھا۔ ''کیا یہ دوائیں بابا اجمیری نے دی ہیں؟''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ آج پہلی بار ان کے سامنے گیا تھا۔ وہ ایک سیدھے سادے فرشتہ صفت انسان ہیں لیکن ان کی شخصیت میں عجیب سی روحانی کشش ہے۔ میں ان سے نظریں ملا کر بات نہ کر سکا۔ میرا سر جھکا ہی رہا تھا۔''

وہ مراد کے ہاتھ کو تھام کر بولا۔ ''وہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا اور وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ تمہارے بارے میں کہہ رہے تھے کہ جان جاتی رہے۔ تب بھی نماز نہیں چھوڑتے ہو۔ وہ تمہارے جیسے نمازی سے باخبر رہتے ہیں۔''

مراد نے خوش ہو کر کہا۔ ''یہ میرے لیے فخر کی بات ہے۔ وہ عالم دین' اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں' مجھ سے باخبر رہتے ہیں۔ پتا نہیں روحانیت کے کیا اسرار ہیں وہ اپنی نمازوں کے وقت کسی عالم نامعلوم میں مجھے نمازیں پڑھتے ہوئے دیکھتے ہوں گے۔''

وہ بڑے جذبے اور عقیدت سے بولا۔ ''اب میں کسی ڈاکٹر کی دوا استعمال نہیں کروں گا۔ بابا صاحب نے جو تبرک بھیجا ہے' اسی پر اکتفا کروں گا۔''

جگنی بائی نے کہا۔ ''تمہارا روحانی علاج کرانا چاہتی تھی۔ تانترک مہاراج کی آتما شکتی کو مانتی ہوں لیکن مہاراج پر مجھے بھروسا نہیں ہے۔ شکر ہے کہ تم بابا اجمیری کی نظروں میں ہو اور وہ تمہارا علاج کررہے ہیں۔''

بے شک دواؤں سے بیماریاں دور ہوتی ہیں لیکن ان سے زیادہ دعائیں تب اثر دکھاتی ہیں' جب ایمان اور عقیدہ مضبوط ہوتا ہے اور دعائیں مانگنے والے مریض بہترین اعمال سے اپنے رب کو راضی رکھتے ہیں۔

مراد کے معاملے میں کہا جاسکتا تھا کہ رب اس سے راضی ہے۔ تب ہی بابا صلاح الدین اجمیری کا وسیلہ اسے نصیب ہوا تھا۔ اس نے شانے سے پلاسٹر جیسی چڑھی ہوئی دواؤں کے لیپ کو ہٹادیا تھا۔ بابا صاحب سے ملنے والی دوا کی مالش کرارہا تھا اور معجون کھارہا تھا۔ وہ ایسی زود اثر دوائیں تھیں کہ ایک ہی ہفتے میں ہڈی جڑ گئی تھی۔ پیروں کے زخم بھر رہے تھے۔ وہ اٹھنے بیٹھنے اور کمرے میں ٹہلنے کے قابل ہوگیا تھا۔

دوسری طرف مرینہ کے بھی زخم بھر رہے تھے اور وہ زخم دینے والے کو یاد کررہی تھی۔ اسے حاصل کرنے کا جنون کبھی ختم نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ جنون اس روز ختم ہوجائے گا۔ جب وہ اس کے ایک بچے کو جنم دے کر اس بچے کو باپ کی کمزوری بنادے گی۔

وہ بھی کسی حد تک چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی تھی۔ مراد کو صحت مندی اور خوش نصیبی ملتی تھی تو وہ نماز شکرانہ ادا کرتا تھا۔ وہ عبادت گزار نہیں تھی۔ اس نے کئی بار مراد کو خوش کرنے کے لیے نمازیں پڑھی تھیں۔ پھر چھوڑ دی تھیں۔ اب پھر اس کی کایا پلٹ ہونے لگی۔

اس نے کمرے میں چلتے پھرتے ہوئے سوچا۔ ''میں مسلمان ہوں۔ آج مجھے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔''

پھر ذہن میں بات آئی کہ تانترک مہاراج مسلمانوں کا کٹر دشمن ہے۔ اسے نماز پڑھتے دیکھ کر آگ بگولا ہوجائیں گے۔ علاج الٹا کرکے اسے اپاہج بنادیں گے۔

اس کے دماغ میں کمزور سا ایمان آتا جاتا رہتا تھا۔ ابتدا سے اس کے مزاج کو سمجھا جائے تو وہ مراد کی دشمن نہیں تھی۔ دیوانی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اسے حاصل کرنے کے لیے عارضی طور پر بدترین دشمن بن جاتی تھی۔

وہ مراد کے جسم کے ایسے حصوں پر گولیاں مارتی تھی کہ وہ زخموں سے چور ہونے کے بعد بھی زندہ رہتا تھا۔

مراد بھی یہی کرتا آرہا تھا۔ اسے جان سے مار ڈالنے والی دشمنی کبھی نہیں کرتا تھا۔

اگر دونوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا جاتا تو ماہرین نفسیات یہی کہتے کہ دونوں لاشعوری طور پر دوست ہیں۔ اپنی جنگجو فطرت کے باعث وہ تشدد کے ذریعے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ جب بھی ایک دوسرے سے بچھڑیں گے اور دور ہوں گے تو قریب آنے کے بہانے ڈھونڈیں گے اور ان کے ساتھ اب بھی یہی ہورہا تھا۔ وہ پہلی بار کمرے میں چلتے پھرتے وقت بے اختیار مراد کو یاد کررہی تھی۔ مہاراج ایک طرف بیٹھا اپنی دواؤں کی تاثیر دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''شام کو مائی آکر دوا کی مالش کرے گی۔ تم جلد ہی دوڑنے اور اچھلنے کودنے کے قابل ہوجاؤ گی۔''

وہ بولی۔ ''مہاراج! آپ نے کمال کیا ہے۔ پلیز آپ مجھے ان دواؤں کا فارمولا بتائیں پتا نہیں' ہم دونوں پھر کب ایک دوسرے کے ہاتھوں زخمی ہوں گے۔ ایسے وقت یہی دوائیں استعمال کرتی رہوں گی۔''

اس نے کہا۔ ''یہ دوائیں تانترک ودّیا سے تیار کی جاتی ہیں۔ تم یہ ودّیا نہیں سیکھ سکوگی۔ میں دوائیں تیار کرکے دوں گا۔ تم انہیں اپنے پاس حفاظت سے رکھ لینا۔''

وہ دیکھ رہی تھی کہ کالا جادو اور مہاراج کی آتما شکتی واقعی جادوئی اثر دکھاتی ہیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ مراد جیسے قوت ارادی رکھنے والے کی نمازیں بھی کرامات دکھاتی ہیں۔

وہ روحانی قوتوں سے انکار نہیں کرسکتی تھی۔ یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ مراد کی ضرورت اسے روحانیت کی طرف لے جاتی تھی۔ اس وقت اس کا دل ضد کررہا تھا کہ نماز پڑھے۔ وہ ضرور کرے جو مراد کرتا ہے۔

اس نے کہا۔ ''مہاراج...! اب میں خود ہی اشنان کرنے کے قابل ہوگئی ہوں۔ آج یہاں کی کسی عورت کو

نہیں بلاؤں گی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں شام کو آؤں گا۔"

مرینہ نے اس کے جاتے ہی دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ باتھ روم میں جاکر غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ اس کے بعد ایک صاف ستھری چادر بچھا کر نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔

کیا تلون مزاجی تھی۔ پٹڑی بدلتی رہتی تھی۔ کبھی شعلہ بن جاتی تھی۔ کبھی شبنم ہوجاتی تھی۔

وہ دونوں پیروں سے چلنے کے قابل ہوتے ہی مراد کو پالینے کے لیے بے چین ہوگئی تھی۔ دماغ میں یہ بات آئی تھی کہ وہ نمازیں پڑھ کر مرادیں حاصل کرتا ہے۔ وہ بھی نماز پڑھ کر گن چلائے بغیر اسے حاصل کرسکتی تھی۔

اسے قرآن مجید کی ایک بھی آیت یاد نہیں تھی۔ اتنا یاد تھا کہ نماز کے وقت پہلے سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑے رہنا چاہیے پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکنا ہے۔ اس کے بعد دوزانو ہوکر سجدہ کرنا ہے پھر اسی طرح دوزانو رہ کر کچھ پڑھا جاتا ہے۔

وہ پوری نماز میں اللہ تعالیٰ سے لین دین کا سودا کرتی رہی اور کہتی رہی۔ "یا اللہ مراد نمازیں پڑھ کر تجھے راضی کرتا ہے۔ وہ مجھ سے راضی ہوجائے گا تو میں بھی روز نمازیں پڑھا کروں گی۔"

پوری نماز کے دوران میں آگے مراد تھا۔ پیچھے شیطان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر بولی......
"یا اللہ...! مراد کو پالینے کا کوئی آسان راستہ دکھادے۔ میں خون خرابے سے تھک گئی ہوں۔ اسے پیار سے حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

شیطان نے پیچھے سے کہا۔ "بہت آسان راستہ ہے وہ آسانی سے تیرے پاس آئے گا جو فساد کی جڑ ہے۔ اسے ختم کردے۔ جو تجھے مراد کی منکوحہ بننے سے روک رہی ہے اسے فنا کردے تیرا کام ہوجائے گا۔"

وہ نماز پڑھ کر اٹھی تو بہت خوش تھی۔ اسے آگہی ملی تھی۔ اس کے دماغ سے سارا بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ خود کو ہلکی پھلکی محسوس کررہی تھی۔ اس نے پہلے بھی تدبیر سوچی تھی کہ ماروی کو چپ چاپ ختم کردے۔ مراد کو معلوم نہ ہو کہ اس نے میٹھی چھری بن کر اسے ہلاک کیا ہے۔ لیکن اب تک اس تدبیر پر عمل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کبھی تو اہم مصروفیات نے روکا تھا۔ کبھی اس نے مراد کی محبت سے سرشار ہوکر ماروی کو نظر انداز کردیا تھا۔ اب اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بہ ظاہر مراد کو نظر انداز کرے گی، اسے یہ تاثر دے گی کہ اس کی طلب سے باز آگئی ہے۔ آئندہ ان کے درمیان کبھی گولی نہیں چلے گی۔

اب گولی چلے گی صرف ماروی پر...

☆☆☆

اس دن سے حالات بدل گئے۔ مراد اور مرینہ کا طریقہ علاج بدل گیا۔ ادھر مرینہ کے ساتھ آتما شکتی تھی۔ ادھر مراد کے ساتھ بابا اجمیری کی روحانی قوت تھی۔

دن گزر رہے تھے اور دونوں میں بہتری آرہی تھی۔ مراد کے شانے کی ہڈی جڑ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ مرینہ کمرے کے اندر چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی۔ تانترک مہاراج کے ساتھ لینڈ کروزر میں آرام سے چھپ کر دہلی تک جاسکتی تھی۔ وہ اپنی نئی پلاننگ کے بارے میں تانترک مہاراج سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن بات کرنے سے پہلے مہاراج نے کہا۔ "ہم آج رات کو دہلی جارہے ہیں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "اتنی جلدی......؟ آپ نے کہا تھا کہ اچھی طرح میرا علاج کرنے کے بعد جائیں گے۔"

"اپنی فکر نہ کرو۔ تم سفر کرنے کے قابل ہو۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

وہ کچھ پریشان تھا۔ بڑ بڑانے کے انداز میں بولا۔ "وہ قابو میں نہیں آرہا ہے۔"

مرینہ نے پوچھا۔ "کون...؟"

"وہی صلاح الدین اجمیری۔" وہ ادھر سے ادھر پہلو بدل کر بولا۔ "مجھے دہلی پہنچ کر کچھ ایسا کرنا ہے کہ اجمیری مجھے نظر آجائے۔ وہ سامنے ہوگا تو میں اسے اپنی تانترک ودیا اور آتما شکتی سے مٹی میں ملاسکوں گا۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر غصے سے منہ بنا کر بولا۔ "اسے منتروں سے جلا کر بھسم کردوں گا۔"

مرینہ نے کہا۔ "آپ تو جانتے ہیں کہ وہ مولانا اجمیری نماز پڑھنے وہاں کی جامع مسجد میں جاتا ہے۔ اس کا سامنا بڑی آسانی سے ہوسکتا ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "مشکل ہے۔ ہم کالا جادو جاننے والے ناپاک رہتے ہیں۔ مسجد کے قریب نہیں جاتے۔ اگر جائیں گے تو وہاں ہمارا جادو بے اثر ہوجائے گا۔" وہ ناگواری سے بولا۔ "میں اس اجمیری کو وہاں زیر نہیں کرسکوں گا۔ اسے کسی دوسری جگہ گھیرنا ہوگا۔"

"آپ دہلی جا کر کیا کریں گے؟"

"میں وہاں کے شمشان گھاٹ میں چالیس دنوں تک گھور تپسیا کروں گا۔ اس اجمیری کے خلاف اور تمہارے مراد کے خلاف منتر پڑھتا رہوں گا۔"

وہ بڑی بڑی انگاروں جیسی آنکھیں پھیلائے خلا میں تکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "چالیسویں رات کو اجمیری اپنی روحانی قوتوں سے محروم ہو جائے گا۔ میرے منتروں کے شکنجے میں آکر گرتا پڑتا ہوا شمشان گھاٹ میں آکر میرے پاؤں پکڑ لے گا۔"

پھر وہ نعرہ لگانے کے انداز میں بولا۔ "جے ماتا جی کی۔ وہ میرے قدموں میں گرے گا۔ میں اس کی بلی چڑھاؤں گا۔"

ایسا کہتے وقت اس کی آنکھیں اور زیادہ انگاروں کی طرح دہکنے لگی تھیں۔ مرینہ نے متاثر ہو کر کہا۔ "او گاڈ.... ! وہ کیسا بھیانک منظر ہوگا۔ میں نے پہلے کبھی جادوئی تماشا نہیں دیکھا ہے۔ اس رات میں آپ کے پاس رہ کر دیکھوں گی۔"

پھر اس نے پوچھا۔ "آپ مراد کے خلاف بھی منتر پڑھیں گے کیا وہ بھی شمشان گھاٹ میں آئے گا؟"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "اوشے آئے گا۔ اس کا دماغ الٹ چکا ہوگا۔ میں اس پر آخری منتر پڑھ کر پھونک ماروں گا۔ وہ ہمیشہ کے لیے تمہارا غلام بن جائے گا۔"

مرینہ نے خوش ہو کر اس کے چرنوں کو چھو کر کہا۔ "جے ہو مہاراج کی۔ یہی میری دلی تمنا ہے۔ وہ میرا تابعدار لائف پارٹنر بن جائے گا تو میں خواہ مخواہ ماروی کو ہلاک نہیں کروں گی۔ مراد کو اپنی آغوش میں رکھ کر اسے جلنے کڑھنے کے لیے زندہ چھوڑ دوں گی۔"

وہ ایک طرف تھوکتی ہوئی بولی۔ "تھو ہے... ماروی نے مجھے بہت جلایا ہے۔"

اس نے اس کے گھٹنوں کو چھو کر کہا۔ "مہاراج! مراد میرے لیے خواب ہو گیا ہے۔ میں جب بھی اسے حاصل کرنا چاہتی ہوں، وہ ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے۔ پلیز آپ مجھے یقین دلائیں کہ وہ صرف میرا محبوب بن کر رہے گا۔"

"چالیس دنوں کے بعد یقین ہو جائے گا۔"

وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "آپ ناراض نہ ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لیں کہ کسی وجہ سے آپ کا جادو اس پر اثر نہیں کرے گا۔ وہ مجھ سے راضی نہیں ہوگا تو پھر آپ کس طرح اسے میری طرف جھکائیں گے؟"

اس نے گھور کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اناڑی ہوں؟ سڑک چھاپ جادوگر ہوں؟ میں تانترک وڈیا کا مہا گنی ہوں۔ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "شما چاہتی ہوں۔ یہ مانتی ہوں کہ آپ اپنی وڈیا سے سیاہ کو سفید اور دن کو رات بنا دیتے ہیں۔ میں پھر ایک بار آپ سے شما چاہتی ہوں۔"

مہاراج نے ناگواری سے کہا۔ "میں تیرے یار کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اگر وہ میرے منتروں کے شکنجے میں نہیں آئے گا تو میرے پاس ایک آخری ماش کے دانے ہوتے ہیں۔ میں ان دانوں پر پڑھ کر پھونک مار کر جس پر پھینکتا ہوں، وہ اسی دم پھڑ پھڑا کے مر جاتا ہے۔"

وہ تڑپ کر انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں مہاراج نہیں.... میں اس کے لیے سر سے پاؤں تک زخم کھاتی رہتی ہوں۔ اس کی موت کبھی نہیں چاہوں گی۔" وہ پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "آپ سے بنتی کرتی ہوں۔ آپ اسے ہلاک نہ کریں۔ وہ زندہ رہے گا تو اسے کسی اور طرح سے حاصل کر لوں گی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "چالیس دنوں کی گھور تپسیا کے باعث میرا بدن اور میرا دماغ گرم رہے گا۔ میں کرودھ کی حالت میں کسی کی نہیں سنتا۔ جو میرے قابو میں نہیں آتا ہے۔ اسے مار ڈالتا ہوں۔" وہ تیزی سے جاتے ہوئے دروازے پر رک گیا۔ پھر بولا۔ "تو نہیں جانتی میری تانترک وڈیا سے پتھر پگھل جاتے ہیں۔ تیرے یار کا دل بھی پگھل جائے گا۔ تو دیکھ لینا' وہ شمشان گھاٹ کی اس رات سے تیرے قدموں میں لوٹنے لگے گا۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے کے باہر چلا گیا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے کو دیکھتی ہوئی سوچنے لگی۔ "مراد ضدی ہے اور ڈھیٹ ہے۔ اگر مہاراج کے منتروں کے اثر میں نہ آیا تو کیا ہوگا...؟"

وہ دیکھتی آرہی تھی کہ اس کی نمازیں اسے آفات سے بچاتی رہتی ہیں۔ اگر کالا جادو اس پر اثر نہیں کرے گا تو کیا مہاراج غصے اور جنون میں جتلا ہو کر اسے مار ڈالے گا؟

اس نے انکار میں سر ہلا کر سوچا۔ "نہیں۔ میں مراد پر آنچ بھی نہیں آنے دوں گی وہ میرے لیے زندہ رہے گا۔ پھر میں وہی کروں گی، جو سوچ لیا ہے۔ میں چالیس دنوں کے بعد رازداری سے پاکستان جاؤں گی۔ ماروی کو صفحہ ہستی سے مٹاؤں گی۔"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ ”ہاں۔ تب ہی راستہ صاف ہوگا۔ پھر میں مراد کے غم میں شریک ہونے اور اس کا اعتماد پھر سے حاصل کرنے یہاں واپس آجاؤں گی۔“

وہ رات کے ایک بجے مہاراج کے ساتھ دہلی کے لیے روانہ ہوئی۔ لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹ پر آرام سے لیٹ گئی۔ گویا پھر میدان جنگ میں جارہی تھی۔ اس بار جنگ کا طریقہ کار بدل رہی تھی۔ یا تو اسے تانترک وڈیا سے اپنا تابعدار بنانا چاہتی تھی یا پھر ماروی کو ہلاک کر کے اس نامراد کے موم ہونے کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ یہ یقین تھا کہ مراد اپنی ماروی سے محروم ہونے کے بعد صرف اسی کی آرزو کرے گا۔ صرف وہی اس کے لیے ضروری تھی۔ وہ ایک دن اسی کی طرف لوٹ کر آنے والا تھا۔

مہاراج گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھا گیان دھیان میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا اور یہ گیان حاصل کر رہا تھا کہ حضرت صلاح الدین اجمیری کہاں ہوں گے؟ کل دہلی پہنچنے کے بعد ان سے کہاں سامنا ہو سکتا ہے؟

مہاراج کا ایک چیلا ڈرائیو کر رہا تھا۔ دو چیلے مرینہ کے سامنے والی درمیانی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تمام چیلے گن فائٹر نہیں تھے۔ اپنے گرو مہاراج سے کالا جادو سیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کئی منتر یاد کر لیے تھے۔ کالے عمل میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔

اس وقت سفر کے دوران مہاراج کے حکم سے ایک مہامنتر پڑھ رہے تھے، جس کا بار بار جاپ کرتے رہنے سے چھپا ہوا دشمن نظر آجاتا ہے۔ مہاراج بھی اگلی سیٹ پر بیٹھا وہی خاص منتر بڑی لگن سے پڑھ رہا تھا۔

تقریباً سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ان تینوں کے منتروں نے کام دکھایا۔ باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی سامنے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دور تک راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ مہاراج کو اپنے سامنے ونڈ اسکرین پر اچانک ہی بابا اجمیری دکھائی دیے۔

مہاراج سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اونچی آواز میں منتر پڑھنے لگا۔ وہ بزرگ ونڈ اسکرین کے پار تیز رفتاری سے دوڑنے والی گاڑی کے بونٹ پر دو زانو بیٹھے تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے۔

مہاراج معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں نماز پڑھ رہے ہیں؟ اس وقت دہلی کے کس علاقے میں ہیں؟

یہ معلوم کرنے کے لیے لازمی تھا کہ وہ تینوں منتروں کا جاپ کرتے رہتے۔ ان کا سراغ مل رہا تھا۔ اب وہ انہیں منتروں کی گرفت میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے بڑی گرم جوشی سے اونچی آواز میں پڑھ رہے تھے۔

جاپ کرنے کی آوازیں سن کر مرینہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ مہاراج اور اس کے دو چیلے اونچی آواز میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”یہ انہیں اچانک کیا ہوا ہے؟“

ڈرائیور نے کہا۔ ”وہ دشمن اجمیری نظر آرہا ہے۔“

مرینہ نے گاڑی کے اندر اور باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں ہیں وہ؟“

”وہ ہماری گاڑی کے بونٹ پر بیٹھے نماز پڑھ رہے ہیں۔“

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کہاں ہیں؟ مجھے تو نظر نہیں آرہے ہیں۔“

”وہ صرف منتر پڑھنے والوں کو نظر آرہے ہیں۔ ہم دونوں انہیں نہیں دیکھ سکیں گے۔“

اور وہ دیکھ رہے تھے۔ گاڑی کی ونڈ اسکرین جیسے سینما کی اسکرین بن گئی تھی۔ وہ نماز سے فارغ ہو کر جانے لگے تو معلوم ہوا' وہ ایک مکان کے اندر ہیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہونے والا تھا کہ وہ مکان کیسا ہے اور کہاں ہے؟

وہ بزرگ زیر لب درود شریف پڑھتے ہوئے ایک راہداری سے گزر رہے تھے۔ ان کے منتروں کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ اس راہداری میں ایک شخص چٹائی پر سو رہا تھا۔ وہ تینوں اسے دیکھتے ہی چونک گئے۔

ایک چیلے نے کہا۔ ”گرو دیو! یہ تو آپ کا نوکر راجو ہے۔“

مہاراج نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ارے یہ کتا میرے دشمن کے گھر میں کیسے پہنچ گیا؟“

مہاراج نے اس ملازم کو اپنے مکان کی صفائی کے لیے دہلی بھیجا تھا۔ اس نے شام ہی کو فون پر کہا تھا کہ صفائی ہو گئی ہے۔ تمام سامان کو بھی جھاڑ پونچھ کر اچھی طرح رکھ دیا ہے اور اب وہ دہلی میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔

وہ تینوں دیکھ رہے تھے۔ بابا اجمیری اس ملازم کے پاس سے گزرتے ہوئے زیر لب پڑھتے ہوئے ایک کمرے میں آگئے تھے۔ اس کمرے کو دیکھتے ہی مہاراج نے چیخ کر کہا۔ ”ارے یہ تو میرا پلنگ ہے اور... اور وہ الماری بھی میری ہے۔ یہ تو میرا کمرا ہے اور اس راہداری کی دیواروں کا رنگ ہلکا سبز تھا۔ یہ... یہ میرا مکان ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

وہ بول رہا تھا۔ اپنی سیٹ پر پہلو بدل رہا تھا۔ حیرانی

سے منتر پڑھنا بھول گیا تھا۔ بابا اجمیری وہاں سے چلتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئے۔ مہاراج نے پھر چیخ کر کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ میری پوجا پاٹ کا کمرا ہے۔ یہاں مہا کالی درگا میا کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ وہ کہاں گئی؟“

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ مورتی اب وہاں نہیں تھی۔ پوجا کا تمام سامان بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ دیواروں پر جو تصویریں تھیں، وہ بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔

اس کے دونوں چیلے منتر پڑھ رہے تھے۔ یہ صاف سمجھ میں آ رہا تھا کہ بابا اجمیری اس کے مکان میں ہیں۔ وہاں اپنے دین و ایمان کے مطابق انہوں نے تبدیلیاں کی ہیں۔

مہاراج نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، دشمن نے میرے مکان پر قبضہ جما لیا ہے۔ یہ مجھ کو للکار رہا ہے۔ میں ابھی اس کا سروناش کروں گا۔“

وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر پچھلی سیٹ پر آیا۔ اس کے دونوں چیلے وہاں سے اٹھ گئے۔ وہ اس سیٹ پر لیٹتے ہوئے بولا۔ ”اب میں اپنی آتما شکتی سے اس کے پاس جاؤں گا۔ اسے اپنے مکان سے نکالوں گا۔ پھر اسے ایسی موت ماروں گا کہ وہ میرے چرنوں میں تڑپ تڑپ کر مرے گا۔“

اس کے دونوں چیلے اسی سیٹ کے پاس نیچے بیٹھ گئے۔ مہاراج نے چاروں شانے چت لیٹ کر اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھ لیا تھا۔ اپنے چیلوں سے کہا۔ ”گھڑی دیکھتے رہنا۔ میں دس منٹ میں آنکھیں نہ کھولوں تو میری آتما کو میرے اندر لانے کا منتر ضرور پڑھنا۔ خبردار بھولنا نہیں۔“

اس نے انہیں ہدایت دینے کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کوئی خاص منتر پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے ہونٹ ساکت ہو گئے۔ اس کا دم نکل گیا۔ اس کی آتما باہر آتے ہی اس کے اپنے مکان میں پہنچ گئی۔

اس نے راہداری میں آ کر دیکھا۔ اس کا ملازم راجو چٹائی پر گہری نیند میں تھا۔ وہ وہاں سے اپنے کمرے میں آیا۔ وہاں وہی اس کا اپنا پلنگ تھا۔ اپنی الماری تھی۔ دیواروں پر دیویوں اور دیوتاؤں کی جو تصویریں تھیں، وہ اب نظر نہیں آ رہی تھیں۔

وہ اپنے پوجا کے کمرے میں آیا۔ وہاں نہ مورتی تھی۔ نہ پوجا کا کوئی سامان تھا۔ کالا جادو کرنے کے سلسلے میں ایک مردہ انسانی کھوپڑی، سیندور کا پیکٹ اور ماش کی دال کا تھیلا تھا۔ وہ تمام سامان غائب ہو چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ دشمن وہاں آیا تھا۔ اسی نے اپنی تمام ناپسندیدہ چیزوں کو وہاں سے ہٹا دیا ہے۔ کیونکہ انہیں وہاں تہجد کی نماز ادا کرنی تھی۔

اس نے اسٹور روم کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہاں مہا کالی درگا مائی کی مورتی اور پوجا کے سامان کے ساتھ کالے جادو کا تمام سامان بھی موجود تھا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔ مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا تھا اور ایک مسلمان وہاں آ کر اس کے گھر میں نماز پڑھ کر گیا تھا۔ یہ ایک خاموش چیلنج تھا کہ آؤ اور جو جوابی کارروائی کرنا چاہو کرو۔

اس نے راہداری میں آ کر ملازم کو ایک لات ماری۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے آتما دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ غصے سے بولا۔ ”کتے کے بچے! تو کتنی گہری نیند سو رہا تھا؟ میرا دشمن یہاں آیا اور چلا گیا اور تو مردہ پڑا رہا۔“

وہ آواز کی سمت ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”گرو دیو! شما چاہتا ہوں۔ میں ابھی دیکھتا ہوں، وہ دشمن کیا چرا کے لے گیا ہے۔“

وہ اٹھ کر دوڑتا ہوا پوجا گھر میں آیا۔ مہاراج نے کہا۔ ”یہاں کا تمام سامان اسٹور روم میں ہے۔ چل انہیں یہاں لا کر رکھ۔ میں صبح دس بجے تک آ رہا ہوں۔“

اس کی آتما شکتی یہی تھی کہ وہ اپنے جسم سے نکل کر کہیں بھی پہنچ جاتا تھا۔ دشمن کہیں بھی چھپے ہوں، وہ آتما سے نہیں چھپ سکتے تھے۔ اس نے مکان سے باہر آ کر دیکھ لیا۔ بابا اجمیری جامع مسجد کے پیچھے اپنے مکان میں تھے۔ یقیناً نماز پڑھنے کے بعد سو رہے ہوں گے۔

مہاراج کی آتما اس مکان کے باہر ہی رک گئی۔ وہ اندر جانا چاہتا تھا لیکن آگے قدم بڑھانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کی آتما ایک نادیدہ رکاوٹ سے ٹکرا کر رک رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ بابا اجمیری نے اپنے مکان کے اطراف روحانی حصار باندھا ہے۔ وہ آگے نہیں جا سکے گا۔

آتما کو کم سے کم وقت میں جسم سے باہر رکھنا پڑتا ہے اور جلد سے جلد واپس اپنے جسم میں آنا لازمی ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ آتما زیادہ دیر تک باہر رہے گی تو جسم کمزور ہوتا جائے گا۔ اگر زیادہ دیر ہو جائے گی تو آتما انتہائی کمزور جسم میں داخل نہیں ہو سکے گی۔

وہ اسی وقت لینڈ کروزر کے اندر آ گیا۔ اس کا مردہ جسم ایک سیٹ پر پڑا تھا اور وہ کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ آتما اس کے اندر آتے آتے رک رہی تھی۔ ایسے وقت اس کے

قریب بیٹھے ہوئے چیلے گھڑی دیکھنے کے بعد اس کا سکھایا ہوا منتر پڑھ رہے تھے۔ جس کے اثر سے آتما کسی طرح اس کے اندر پہنچ ہی گئی۔

وہ آنکھیں کھول کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس نے واپس آنے میں دیر کر دی تھی۔ یہ سوچ کر گیا تھا کہ اپنے مکان میں پہنچتے ہی بابا اجمیری سے ٹکرائے گا۔ انہیں ہلاک کرے گا اور جلد ہی واپس آجائے گا۔

لیکن بابا صاحب نے اسے مکان کے اندر دیر تک دوڑایا تھا۔ پھر وہ جامع مسجد کے پیچھے ان کے مکان کے اندر پہنچنے میں ناکام رہا تھا۔ اسے غصہ اور انتقام کے جوش و جنون میں وقت گزرنے کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اگر اس کے چیلے منتر کا جاپ نہ کرتے رہتے تو اس کے اندر واپس آنے والی آتما کی شکتی کمزور ہو جاتی۔ اس کے اندر پہنچ نہ پاتی۔ کہیں بھٹک جاتی اور وہ مردہ پڑا رہ جاتا۔

وہ ایک بیمار کی طرح آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمزوری کے باعث کراہتے ہوئے بولا۔ ''ہے درگا میا...! ہے ماں جگدمبے...! بڑی بھول ہوئی۔ ٹھیک سے کا دھیان نہیں کیا۔ مرتے مرتے بچ گیا۔ اس دشمن کو مار ڈالنے کی دھن میں خود ہی مرنے والا تھا۔''

مرینہ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے مہاراج؟ آپ اچانک ہی بیمار جیسے لگ رہے ہیں؟''

وہ اپنے چیلے سے بولا۔ ''میرا بیگ لاؤ۔ مجھے شکتی پانے کی دوا کھلاؤ۔ ہر آدھے گھنٹے بعد کھلاتے رہو۔ میں شام تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔ جے ہو۔ درگا میا نے مجھ کو بچا لیا ہے۔''

پھر وہ مرینہ کو بتانے لگا کہ ابھی اس کی آتما شکتی اتنی ہی ہے کہ وہ اپنی آتما کو صرف دس منٹ کے لیے بدن سے الگ کر سکتا ہے۔ آئندہ وہ پوری طرح دھیان رکھے گا۔

وہ ارادہ کر کے چلا تھا کہ دہلی پہنچتے ہی بابا اجمیری پر حملہ کرے گا لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے نہ تو اس نے حملہ کیا تھا اور نہ ہی بابا اجمیری نے اس کے خلاف کوئی کارروائی کی تھی۔ وہ خود ہی ان کا پیچھا کرتے ہوئے بیمار اور کمزور ہو گیا تھا۔

وہ دہلی پہنچ کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس روز چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ دراصل اس کی آتما بیمار ہو گئی تھی۔ اور بیمار آتما کا مطلب یہی تھا کہ پوری طرح شکتی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ پوری طرح شکتی حاصل کرنے کے لیے چالیس دنوں کی چلہ کشی لازمی ہو گئی تھی۔

وہ دوسرے دن چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ اس کے دونوں چیلے اس کے حکم کے مطابق مرگھٹ میں آئے۔ وہاں چتائیں جلائی جاتی تھیں۔ مرنے والے اپنے آخری انجام کو پہنچتے تھے۔ وہ جگہ کسی زندہ شخص کے لیے نہیں تھی۔

مہاراج کے لیے وہ جگہ ضروری ہو گئی تھی۔ اس کے چیلوں نے وہاں اس کے لیے چالیس دنوں تک دن رات رہنے کا اور کھانے پینے کا انتظام کیا۔ وہ آدھی رات کے بعد وہاں آکر دھونی رما کر بیٹھ گیا۔

اب وہ چالیسویں رات تک زندہ انسانوں سے ٹوٹ کر مردہ انسانوں کی بستی میں رہنے والا تھا۔ اس عرصے میں وہ اپنے چیلوں سے بھی بات نہ کرتا۔ زیادہ سے زیادہ دھیان گیان میں غرق رہتا۔ انسان دنیا میں سدا نہیں رہتا لیکن جب تک نہیں مرتا' دوسروں کو مارنے کے ہتھکنڈے آزماتا رہتا ہے۔

وہ مرینہ کو چالیس دنوں کی دوائیں دے کر گیا تھا۔ اس کے زخم بھرتے جا رہے تھے۔ وہ توانائی حاصل کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ذرا اور دوڑنے بھاگنے اور کسی حد تک ایکشن میں رہنے کے قابل ہو جائے گی تو مراد کی تلاش میں نکلے گی۔

اس نے مراد کے پرانے فون نمبروں کو آزمایا۔ کسی نمبر پر بھی رابطہ نہ ہوا۔ وہ سوچنے لگی کیا کرے؟ اس کے دماغ میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ جس طرح وہ رفتہ رفتہ صحت یاب ہو رہی ہے' اسی طرح مراد بھی معصیت بننے کے لیے تگڑا ہو رہا ہوگا۔

وہ سوچ رہی تھی۔ ''اس سے پہلے کہ وہ رازداری سے میرا اتا پتا ٹھکانا معلوم کرے' مجھے اس کے متعلق بہت کچھ معلوم کر لینا چاہیے۔ اب کسی طرح کی محاذ آرائی نہیں ہوگی۔ کوئی گولی نہیں چلے گی۔ میں پھر ایک بار اس کا اعتماد اور اس کی محبت حاصل کروں گی۔''

وہ پھر اسے دوست بنانے کے لیے میکی براؤن جیسے دشمن کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے فون پر کہا۔ ''ہائے... کیا میری آواز سے مجھے پہچان رہے ہو؟''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''مرینہ! یہ تم ہو۔ مائی گاڈ! تم ہی ہو... تم زندہ ہو؟''

''ہاں۔ جسے دل دیا تھا' وہ میری جان لے چکا تھا۔ اس نے تو مجھے مار ہی ڈالا تھا مگر دیکھو بچ گئی ہوں۔ پھر میرے ہاتھوں میں گن ہے اور دشمن کی تلاش ہے۔ اس بار میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ بس وہ کہیں مل جائے۔''

وہ اس سے متاثر ہو کر بولا۔ ''تم زبردست ہو مرینہ! موت کو بار بار پچھاڑ دیتی ہو۔ میں ہر قیمت پر تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کم بخت میری بیٹی کو لے اُڑا ہے۔''

یہ اس کے لیے نئی اطلاع تھی۔ وہ حیرانی سے بولی۔ ''کیا میڈونا اس کے ساتھ ہے۔ ہاں یاد آرہا ہے۔ وہ آخری بار اس کے ساتھ ٹیکسی میں گیا تھا۔ میں جلد سے جلد اس کی شہ رگ تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے بتاؤ تمہاری بیٹی کے ساتھ وہ کہاں ہوگا؟''

میکی نے کہا۔ ''یہ معلوم ہوتا تو وہ اب تک کہیں زندہ نہ رہتا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ دشمن بیٹی کے ساتھ ہے اور باپ کو اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں ہے؟''

وہ نفرت سے بولا۔ ''وہ اس کے عشق میں پاگل ہوگئی ہے۔ مجھ کو، میری تمام دولت کو اور عیش و آرام کو چھوڑ کر اس زخمی اپاہج کے ساتھ کہیں چھپتی پھر رہی ہے۔''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''یہ ماننا پڑتا ہے کہ مراد کی مردانگی اور پرسنالٹی ایسی ہے کہ لیڈی کلر بن گیا۔ جو اسے دیکھتی ہے، ہزار جان سے عاشق ہو جاتی ہے۔''

پھر وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''میں نہیں مانتی کہ وہ سر پھرا پتھر دل تمہاری بیٹی کو گھاس ڈال رہا ہوگا۔ وہ تو صرف ماروی کے لیے جی رہا ہے اور اسی کی خاطر میرے ہاتھوں ضرور مرے گا۔''

پھر وہ دل میں بولی۔ ''وہ نہیں مرے گا۔ میرے ہاتھوں ماروی کی موت لکھی جا چکی ہے۔''

میکی نے کہا۔ ''مراد کے سب ہی دشمن یہ جانتے ہیں کہ وہ دہلی میں ہے۔ زخموں سے چور ہونے کے باعث اس شہر سے باہر جانے کے قابل نہیں رہا ہے۔ یہاں سیکڑوں کی تعداد میں پولیس اور انٹیلی جنس والے اور کرائے کے شوٹر اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ وہ جلد ہی نظروں میں آجائے گا۔''

''مجھ سے وعدہ کرو کہ اس کا سراغ ملے گا تو مجھے فوراً اطلاع دو گے۔ صرف ایک بار معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے پھر تو میں زمین کھود کر اسے نکال لاؤں گی۔''

''میں مانتا ہوں۔ تم نے اس سے دوستی بھی غضب کی، کی ہے اور اب تمہاری دشمنی بھی غضب ناک ہو گی۔ مجھے جیسے ہی معلوم ہوگا، میں تمہیں ضرور اطلاع دوں گا۔''

ازدواجیات

شوہر۔ ''آج کیا پکاؤ گی؟''

بیوی۔ ''جو آپ کہیں۔''

شوہر۔ ''دال چاول بنالو۔''

بیوی۔ ''ابھی کل ہی تو پکائے تھے۔''

شوہر۔ ''سبزی پکالو۔''

بیوی۔ ''بچے نہیں کھاتے۔''

شوہر۔ ''پھر قیمہ بنالو۔''

بیوی۔ ''وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

شوہر۔ ''پراٹھے بنالو۔''

بیوی۔ ''دن کو پراٹھے کون کھاتا ہے؟''

شوہر۔ ''پھر کیا پکاؤ گی؟''

بیوی۔ ''جو آپ کہیں۔''

☆☆☆

''سنا ہے تم اپنی بیوی کے ساتھ گھر کے برتن دھوتے ہو۔''

''تو کیا ہوا وہ بھی تو میرے ساتھ روٹیاں پکاتی ہیں۔''

☆☆☆

بیوی۔ ''آپ تو کہتے تھے شادی کے بعد بھی میں تم سے اتنا ہی پیار کروں گا۔''

شوہر۔ ''سوری یار اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ میری شادی تم سے ہو جائے گی۔''

☆☆☆

باپ۔ ''بیٹے اپنی ماں سے اونچی آواز میں بات مت کرو ورنہ میں تمہاری پٹائی کروں گا۔''

بیٹا۔ ''مجھے پتا ہے آپ جل رہے ہیں کیونکہ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔''

مرسلہ۔ فرح گل، رعنا گل، درابن کلاں

☆☆☆

بیوی۔ ''اگر میں مرگئی تو کتنے عرصے بعد شادی کرو گے؟''

شوہر۔ ''مہنگائی کا دور ہے بیگم لہٰذا کوشش تو یہی ہوگی کہ ''قل'' کے ساتھ ہی ''ولیمہ'' بھی ہو جائے۔''

مرسلہ۔ سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ

میکی براؤن سے یہ امید نہیں تھی کہ اسے مراد نظر آئے گا تو وہ کسی کو اطلاع دینے میں وقت ضائع کرے گا۔ اس کے شوٹرز تو اسی لمحے میں اسے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ وہ فون بند کر کے سوچنے لگی کہ کیا کرے؟

ایک آسان راستہ یہ تھا کہ وہ ماسٹر کو بو بو سے رابطہ کرے۔ پہلے اس کا اعتماد حاصل کرے۔ اگر وہ پھر سے اس کی خدمات حاصل کرے گا تو شاید مراد کا پتا اسے بتا دے گا۔ پھر اس نے انکار میں سر ہلایا۔ اپنے ہی خیال کی نفی کی۔ ”نہیں۔ ماسٹر تو مراد پر اندھا اعتماد رکھتا ہے۔ وہ بھی مجھے اس کی طرف جانے کا راستہ نہیں بتائے گا۔“

اس نے بلّے کے متعلق سوچا۔ لندن میں اس سے دوستی ہوگئی تھی۔ وہ مایوس ہو کر اپنے آپ سے بولی۔ ”وہ بھی مراد کا جاں نثار ساتھی ہے۔ اب میرا دوست نہیں رہے گا۔ بلکہ مجھ سے سخت نفرت کر رہا ہوگا۔“

مرینہ کو اور مہاراج کو جگنی بائی پر یقین کی حد تک شبہ تھا کہ اس نے منہ بولے بیٹے کو کہیں چھپایا ہے۔

مہاراج کو اس بات کا غصہ تھا کہ جگنی بائی منہ بولی بیٹی ہو کر اس سے جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ دہلی آ کر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ جگنی بائی سے مل کر اس کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد مراد تک مرینہ کو پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے اپنے معاملات سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ وہ بابا اجمیری کے مقابلے میں زیادہ بلوان اور مہاشکتی مان ہونے کے لیے شمشان گھاٹ میں اپنے دن رات گزار رہا تھا۔ وہاں سے چالیس دنوں کے بعد آنے والا تھا۔

مزید دس دنوں کے بعد مرینہ کے زخم اچھی طرح بھر گئے۔ وہ پہلے کی طرح صحت مند دکھائی دینے لگی۔ اس کے باوجود کمزوری تھی پوری طرح ایکشن میں آنے کے قابل نہیں تھی لیکن اسے تلاش کرنے کی دُھن سوار تھی۔ وہ پوری طرح تیار ہو کر ایک رینٹڈ کار لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑی۔

وہ مہاراج کی لینڈ کروزر کو استعمال نہیں کر رہی تھی۔ جگنی بائی اور گھا گھرا پلٹن کی عورتیں اس گاڑی کو پہچانتی تھیں۔ اس نے شملہ جانے سے پہلے چہرہ تبدیل کیا تھا۔ رنجنا کے نام سے ایک فلم پروڈیوسر کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ جگنی بائی اسے موجودہ چہرے سے پہچان نہیں سکتی تھی۔ ہاں یہ اندیشہ تھا کہ میڈونا نے کہیں سے چھپ کر دیکھا تو اسے پہچان لے گی۔ مراد سے جان لیوا مقابلہ ہوتے وقت میڈونا وہاں موجود تھی۔ صرف میڈونا اور مراد ہی اسے موجودہ بہروپ میں پہچان سکتے تھے۔

اس نے عارضی میک اپ کے ذریعے چہرے پر معمولی سی تبدیلی کی تا کہ فوراً ہی پہچانی نہ جاسکے پھر وہ رینٹڈ کار ڈرائیو کرتی ہوئی کبھی جگنی بائی کی کوٹھی پر نظر رکھنے لگی۔ کبھی گھا گھرا پلٹن کے دفتر کے چکر لگانے لگی۔ وہ اس فارم ہاؤس کی طرف بھی گئی تھی' جہاں مراد سے اور بو نے مراد سے مقابلہ ہوا تھا لیکن وہ فارم ہاؤس اب ویران پڑا تھا۔ وہاں صرف دو چوکیدار ڈیوٹی پر دکھائی دیے۔

مراد پرانی دہلی میں تھا۔ وہاں ایم این اے دھرم داس کا ایک ذاتی مکان تھا۔ انڈین انٹیلی جنس والے اس مکان میں بھی گھس کر اسے ڈھونڈنے کے بعد مطمئن ہو گئے تھے۔ مراد کو بھی اطمینان ہو گیا تھا۔ منسٹر کے اس مکان میں وہ لوگ دوبارہ آنے والے نہیں تھے۔ لہٰذا اس نے وہاں آ کر پناہ لی تھی۔

جگنی بائی اور ایمان علی نے کہا۔ ”ہمیں ادھر نہیں آنا چاہیے۔ کوئی بھی ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں آسکتا ہے۔“

اب وہاں مراد کی تیمارداری کے لیے میڈونا اور عبداللہ کبڈی رہ گئے تھے۔ عبداللہ بھی وہاں دن رات نہیں رہتا تھا۔ اپنی فرمونا کے پاس بھی جایا کرتا تھا۔ یوں مراد ایک حسین اور جوان عورت کے ساتھ رہ کر آزمائشوں سے گزر رہا تھا۔ وہ بھی کسی حد تک دوڑنے اور اچھلنے کودنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن وہاں سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ دوست اور دشمن میڈونا کو بھی دور سے دیکھتے ہی پہچان لیتے۔ لہٰذا وہ دونوں ایک مکان کی چار دیواری میں قیدی بن گئے تھے۔

مراد کے ساتھ صرف چھپنے اور آئندہ دشمنوں سے نمٹنے کے ہی مسائل نہیں تھے۔ حسین عورتیں بھی مسئلہ بنتی آ رہی تھیں اور میڈونا تو اپنے پیار سے' قربانیوں سے اور خدمت گزاریوں سے مراد کو متاثر بھی کر رہی تھی۔

وہ مجرم ماں باپ کو اور بے انتہا دولت اور جائداد کو چھوڑنے کے بعد انصاف کی مستحق ہو گئی تھی اور انصاف کا تقاضا تھا کہ مراد اسے اپنا لے۔ وہ دن میں بھی ایک بار یا دو بار ماروی سے فون پر باتیں کرتا تھا۔ یہ سن کر وہ خوش تھی کہ اس کا مجازی خدا صحت یاب ہو رہا ہے اور یہ سن کر مرجھا گئی تھی کہ اس خفیہ پناہ گاہ میں میڈونا اس کے ساتھ ہے۔ نصیب میں جو مرد لکھ دیا گیا تھا' وہ کیا خوب تھا۔ عورتیں اسے چھیننے کے لیے قطار باندھے چلی آ رہی تھیں۔ پہلے دن جب معلوم ہوا تو وہ غصے سے جھنجلا کر بولی۔ ”تمہارے پاس عورتیں ہی کیوں آتی ہیں؟ کوئی مرد وہاں تیمارداری کے لیے کیوں نہیں رہتا؟“

وہ پیار سے بولا۔ ''میں تمہارے ان سوالوں کا کیا جواب دوں؟ یہ عورتیں اپنے مقدر سے آتی ہیں۔ میں انہیں بلانے نہیں جاتا۔ پلیز مجھ پر اعتماد کرو۔''

''پہلے تم نے کہا تھا' دشمنوں سے جنگ لڑتے رہنے کے لیے مرینہ ضروری ہے۔ پھر جہاں تم نے اسے موت کے گھاٹ اتارا اسی جگہ سے میڈونا تمہارے لیے ضروری ہو گئی ہے۔''

''یہ بری خبر سنادوں کہ مرینہ زندہ ہے۔''

وہ رونے کے انداز میں بولی۔ ''یا اللہ! ابھی وہ عذاب میرے لیے زندہ ہے۔''

''میڈونا نہ ہوتی تو آج میں زندہ نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے میری نئی زندگی کا وسیلہ بنایا ہے۔ کاتب تقدیر نے یہ لکھ دیا ہے کہ میری خفیہ پناہ گاہ میں یہی رہے گی۔ کیونکہ یہ بھی چھپ کر رہتی ہے۔ کوئی دوسرا میری خدمت کے لیے آئے گا تو دشمن کسی دن اس کے پیچھے چلے آئیں گے۔ کیا تم ایسا چاہتی ہو؟''

وہ ذرا چپ رہی۔ حالات ایسے تھے کہ تقدیر کے فیصلے کے خلاف کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنے حقوق کسی بھی طرح کسی کو دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں کیا کروں؟ بولو مر جاؤں؟''

''نہیں...... میں مر جاؤں گا۔ میڈونا کے لیے بھی چھپ کر رہنا ضروری ہے۔ اس لیے اس محفوظ پناہ گاہ میں اسے چھوڑ کر اپنے لیے کوئی دوسری جگہ ڈھونڈوں گا۔''

''ہرگز نہیں۔ تم اتنی محفوظ پناہ گاہ کیوں چھوڑو گے۔ اسے کسی دوسری جگہ جانے دو۔''

''یہ سراسر خود غرضی ہو گی۔ میں مرد ہو کر اس... چار دیواری سے نہیں جاؤں گا اور اس قربانی دینے والی عورت سے کہوں گا کہ وہ اپنا رستہ لے۔ کیا میری غیرت اور مردانگی یہ گوارا کرے گی؟''

''وہاں تم مجبور ہو۔ یہاں میں مجبور ہوں۔ میں اپنے مرد کے ساتھ کسی عورت کو کبھی برداشت نہیں کروں گی۔''

''ماروی! میرا کام ہے سمجھانا۔ میں سمجھا رہا ہوں۔ میں جس دنیا میں جی رہا ہوں۔ وہاں حالات کے مطابق خود کو بدلنا پڑتا ہے۔''

''تم بھی میرے ساتھ اسی دنیا میں ہو۔ لیکن خود کو بدلنا نہیں چاہتی ہو۔ خدا کے لیے اپنے دل کو سمجھاؤ۔''

''یہ عورتیں میری زندگی میں جانے کے لیے آتی ہیں تم ہمیشہ رہنے والی ہو۔ تمہاری جگہ اس دنیا کی کوئی عورت نہیں لے سکے گی۔''

''تم خود غرض ہو۔ یہ نہیں سمجھ رہی ہو کہ میں کتنے مشکل حالات سے گزر رہا ہوں۔ کیا اندازہ کر سکتی ہو کہ میں اپنی نیکی اور پارسائی کو قائم و دائم رکھنے کے لیے ایک حسین عورت کی تنہائی میں گناہ کے تقاضوں سے کس طرح لڑتا رہتا ہوں۔''

''ہمارے دین میں حکم ہے کہ عورت اور مرد نامحرم ہیں تو انہیں ایک چار دیواری میں تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ اگر مجبوراً تنہا رہنا پڑے تو گناہ سے بچنے کے لیے نکاح پڑھا کر ازدواجی رشتے میں منسلک ہو جانا چاہیے۔''

''تم مسلمان ہو۔ مکمل ایمان سے بولو' کیا دینی احکامات کے مطابق گناہ سے نہیں بچنا چاہیے؟''

وہ تڑپ کر چیخ کر بولی۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا میڈونا سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

''تم میرے سوال کا سیدھا سا جواب دو۔ کیا مجھے گناہ سے نہیں بچنا چاہیے؟''

وہ پھر چیخ کر بولی۔ ''میں کسی سوکن کو برداشت نہیں کروں گی مراد... مجھ سے کوئی سوال نہ کرو......''

''سوکن کو برداشت نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں گناہ گار بن جاؤں۔ یہی تمہارا جواب ہے نا؟''

وہ غصے سے بولی۔ ''ہاں۔ اسے بیوی کے حقوق نہ دو۔ اسے میری سوکن نہ بناؤ۔''

''مجھے افسوس ہے ماروی! میں مر جاؤں گا لیکن گناہ نہیں کروں گا۔ میں پہلے مسلمان ہوں۔ پھر تمہارا مجازی خدا ہوں۔ پہلے دین کے احکامات کی پابندی کروں گا۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ نماز میری طاقت ہے اور پاکیزگی اور پارسائی کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ میرے اندر اللہ کی دی ہوئی نماز کی جو طاقت ہے۔ اسے کبھی کم نہیں ہونے دوں گا۔''

''میں فون بند کر رہا ہوں۔ تم اپنے اندر جھانک کر دیکھو اور سمجھو کہ تم نے شوہر کو کتنا غلط مشورہ دیا ہے۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ ماروی اپنے فون کو ایک طرف پھینک کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ چاچی اور بشریٰ وہاں بیٹھی فون پر ہونے والی باتیں سن رہی تھیں۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک چپ رہیں تاکہ وہ رو رو کر دل کا غبار نکال لے۔

پھر بشریٰ نے کہا۔ ''یہ مرد دل کا درد ہوتے ہیں۔ گھر والی کتنی ہی وفادار ہو وہ باہر منہ کالا کرنے سے باز نہیں آتے۔''

چاچی نے کہا۔ ''مراد کے لیے ایسا نہ کہو۔ اس نے یہاں آکر ماروی کو بتایا تھا۔ جب سے اس نے نماز شروع کی ہے' تب سے کسی عورت کا سایہ بھی خود پر پڑنے نہیں

دیا ہے۔"

چاچی نے ماروی سے کہا۔ "جب تم کن ستی میں تھیں۔ تب بھی وہ گناہ سے بچنے کے لیے مرینہ کو منکوحہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ ہمارے دین میں سمجھایا گیا ہے کہ مرد بحالت مجبوری دوسری شادی کر سکتا ہے لیکن تم نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اسے چھوڑ کر یہاں چلی آئیں۔

"بیٹی! ذرا سوچو' وہ تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ مرینہ اس کی مجبوری نہیں ہے، اس کے لیے ضروری نہیں ہے تو اس نے تمہاری خاطر دوسری شادی کی عیاشی نہیں کی۔ اسے ٹھکرا دیا۔ یہ مانتی ہو نا؟"

ماروی نے کہا۔ "جو ماننے کی بات ہے اسے ضرور مانوں گی۔ چاچی! تم ابھی اسے فون کرو۔ اسے سمجھاؤ کہ کسی بھی طرح میڈونا سے نجات حاصل کرے۔"

"میری بیٹی! وہ کس طرح نجات حاصل کرے گا؟"

بشریٰ نے کہا۔ "اسے دھکے مار کر وہاں سے نکال دے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ جس عورت نے اپنے باپ سے دشمنی مول لے کر اس کی جان بچائی ہے' اس کا علاج کراتی ہوئی' اس کے جسم میں نیا خون پہنچاتی ہوئی' اسے نئی زندگی دیتی ہوئی' ہزاروں میل کا سفر طے کرتی ہوئی اسے ایک محفوظ پناہ گاہ میں لے کر آئی ہے' اسے تم اسی پناہ گاہ سے دھکے مار کر نکالنے کو کہہ رہی ہو؟"

بشریٰ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ ماروی نے کہا۔ "وہ وہاں رہے گی تو مراد اسے میری سوکن بنا دیں گے۔"

"بیٹی! وہ مرینہ کے معاملے میں مجبور نہیں تھا۔ اس نے اسے تمہاری سوکن نہیں بنایا۔ میڈونا کے ساتھ اس کی مجبوریوں کو سمجھو وہ قربانیاں دینے والی عورت کو ایک محفوظ پناہ گاہ سے نہیں نکالے گا اور گناہ گار بھی نہیں بنے گا۔"

وہ ماروی کے قریب بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "اپنی ضد اور اپنے جذبات پر دینی احکامات کو ترجیح دو۔ اس کی نمازوں کا تقاضا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک رہے۔

"روح کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لیے جسم کی پاکیزگی لازمی ہے اور روح کسی گناہ گار کے ناپاک جسم میں پاکیزہ نہیں رہ سکتی۔ تم چاہتی تھیں وہ پاک دامن رہے۔ آج وہ پاک دامن رہ کر ہزار آزمائشوں سے گزر رہا ہے تو کیوں رو رہی ہو؟"

"روؤں نہیں تو کیا خوشیاں مناؤں؟"

"خوشیاں نہ مناؤ۔ دینی احکامات کے آگے سر جھکا لو۔"

"اس کی زندگی میں اسی طرح عورتیں آتی رہیں گی۔ وہ دینی احکامات پر عمل کرتا رہے گا اور میں جلتی کڑھتی مرتی رہوں گی۔"

"اس کے دل میں خدا کا خوف ہے وہ دینی احکامات کو عیاشی کا ذریعہ نہیں بنائے گا۔ دوسری' تیسری شادیاں کرنے کے سلسلے میں دین کی سخت گرفت ہے۔"

"میں پوچھتی ہوں' اس کی زندگی میں عورتیں کب تک آتی رہیں گی؟ میں کب تک برداشت کرتی رہوں گی؟"

"یہ سوال اپنے آپ سے کرو۔ تم نادان بچی نہیں تھیں۔ یہ دیکھ رہی تھیں کہ وہ جرائم کی دنیا سے کبھی نکل نہیں پائے گا اور چھوٹے بڑے جرائم میں عورتوں کا بھٹکتا ہوا وجود لازمی ہوتا ہے۔

"میری بچی! تم نے اس سے نکاح قبول کرنے سے پہلے ان عورتوں کی آمد و رفت کا حساب اس سے کیوں نہیں کیا؟ اس وقت محبوب سے کترانے کے لیے اور مراد کے نکاح میں آنے کے لیے تڑپ رہی تھیں کیا اچھا ہے' کیا برا ہے' سب بھول گئی تھیں اور جب سب کچھ بھول کر اسے قبول کر چکی ہو تو پھر برداشت کرو۔"

بشریٰ نے کہا۔ "بھابی! چاچی کی بات دل کو لگ رہی ہے۔ مراد بھائی بہت اچھے ہیں۔ وہ آپ کی محبت کسی کو نہیں دیں گے۔ ان کی زندگی میں جو دوسری آ رہی ہے، وہ محبت نہیں ہے' ضرورت ہے۔ مجبوری ہے۔ آپ مراد بھائی کے دل میں بیٹھ کر سوچیں گی تو آپ کا دکھ کم ہو جائے گا۔"

ماروی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بشریٰ کو اور چاچی کو دیکھا پھر وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا اور وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ عورت خواہ کتنی ہی ضدی' ہٹ دھرم اور انا پرست ہو۔ اسے مرد کی ضرورت کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔

☆☆☆

میڈونا اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ ادھر سے ادھر کروٹیں یوں بدل رہی تھی جیسے انگاروں پر لوٹ رہی ہو۔ اے سی کی ٹھنڈک بھی اسے ٹھنڈا نہیں کر رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ "اب مراد کے کمرے میں نہیں جاؤں گی۔"

یہ انسانی ضرورت بڑی ظالم ہوتی ہے۔ تنہائی میں شیطانی خواہش کو ٹھنڈا کرنے کے باوجود مراد کے کمرے میں جاتے ہی بدن گرم ہو جاتا تھا۔ پکڑے جانے اور جکڑے جانے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے اور یہ فطری

مطالبہ پورا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہی نادانی کر رہے تھے۔ انسانی فطرت کے خلاف دور دور رہ کر ایک دوسرے کو آنچ دے رہے تھے۔ دستک دے رہے تھے۔ کسی وقت بھی گناہ کا دروازہ کھل سکتا تھا۔

اس نے خود ہی ضد کی تھی کہ مراد جب تک پوری طرح صحت یاب نہیں ہوگا۔ تب تک ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر اس کی تیمارداری کرے گی۔ اسے یقین تھا کہ مراد اس کی طرف مائل ہو جائے گا۔ لیکن اب اس کے ساتھ رہنا اسے مہنگا پڑ رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر آ کر ماہیِ بے آب کی طرح اندر ہی اندر پھڑپھڑانے لگی۔

پھر یہ کہ اس کی شرافت اور عبادت گزاری متاثر کر رہی تھی۔ اس نے اپنی بیس برس کی زندگی میں وہ پہلا شخص دیکھا تھا جو چٹانی ارادوں کا حامل تھا اور نماز کے معاملے میں حسین عورتوں کو صفر کر دیتا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ ارادہ کر رہی تھی کہ اس مرد کے مسلک پر چلے گی۔ اس کے طریقوں پر عمل کرے گی اور اس کی طرح نماز پڑھے گی۔

نماز پڑھنے سے رب ملتا ہے تو بندہ کیوں نہیں ملے گا؟

کیا نماز معجزہ دکھائے گی؟ کیا وہ میری طرف آئے گا؟

کاتبِ تقدیر انسانوں کا مقدر اس طرح لکھتا ہے کہ پہلے سے بات بنتی چلی آتی ہے۔ وہ معجزہ ہو، کرشمہ ہو، کرامات ہو، کچھ بھی ہو وہ اسی وقت آ گیا۔ ابھی اس نے نماز نہیں پڑھی تھی۔ صرف ارادہ کیا تھا اور وہ دستک دے رہا تھا۔

اس نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم نادانی کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی ضرورت سے انکار کر رہے ہیں۔"

میڈونا دھڑکتے ہوئے دل سے آگے سننا چاہتی تھی کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ "میں کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کروں گا۔"

وہ فوراً ہی بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میں ابھی مسلمان ہو جاؤں گی۔ مجھے بتاؤ میں کیسے تمہارے جیسی ہو سکتی ہوں؟"

وہ بولا۔ "یوں تو مسلمان بن جانا آسان ہے۔ جو کلمہ پڑھاؤں گا، اسے دل سے پڑھو گی۔ اللہ تعالیٰ کو ایک اور لاشریک مانو گی اور رسول ﷺ کو آخری نبی تسلیم کرو گی تو میرے دین میں داخل ہو جاؤ گی لیکن......"

اس نے پوچھا۔ "لیکن......؟"

"میں چاہتا ہوں، کسی عالم دین کے روبرو بیٹھ کر اسلام قبول کرو۔ میں ابھی کبڈی کو فون کرتا ہوں۔ وہ ہمارے نکاح..... کے انتظامات کرے گا۔ اس سے پہلے تمہارے بدن کو اور تمہارے لباس کو پاک وصاف ہونا چاہیے۔ جاؤ غسل کرو اور لباس تبدیل کرو۔"

نصیب کو بدلتے اور حالات کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔

میڈونا خوشی کے مارے ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے رونے لگی۔ خوشیاں ناقابلِ برداشت ہوں تو رونا بھی آتا ہے۔

بڑے انتظار کے بعد من کی مراد پوری ہو رہی تھی۔

اس نے غسل کرنے کے بعد جینز اور شرٹ پہنی اس کے پاس ایسے ہی جینز، اسکرٹس اور شارٹس وغیرہ تھے۔ مشرقی انداز میں خود کو پوری طرح ڈھانپنے والا لباس نہیں تھا۔

مراد نے کہا۔ "تمہیں دین اسلام قبول کرتے وقت اسلامی طرز کا لباس پہننا چاہیے۔ ابھی میرے ساتھ چلو۔ میں تمہارے لیے بہترین لباس خریدوں گا۔"

وہ حیرت اور مسرت سے بولی۔ "مجھے شاپنگ کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤ گے لیکن باہر تو......"

مراد نے کہا۔ "خطرہ ہے۔ لیکن ہم محتاط رہیں گے تو کوئی ہمیں دیکھ نہیں سکے گا۔ تم اسکارف سے نصف چہرہ چھپا کر رکھو گی کسی دکان میں پہنچ کر سب سے پہلے عبا اور نقاب پہنو گی۔ میرے موجودہ چہرے سے کوئی دشمن مجھے پہچان نہیں سکے گا۔ ہم جلد ہی یہاں لوٹ آئیں گے۔"

فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ عبداللہ کبڈی کال کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ہیلو مراد! ابھی تم نے کال کی تھی۔ میں اٹینڈ نہ کر سکا۔ فون گھر میں بھول کر چلا گیا تھا۔ اب بولو، خیریت سے ہو نا؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ ہم بخیریت ہیں۔ ابھی میں نے میڈونا سے نکاح پڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

وہ چہک کر بولا۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ تم گناہوں سے بچنے کے لیے بہت بڑا قدم اٹھا رہے ہو۔ تمہارے حالات کا تقاضا بھی یہی ہے۔"

پھر اس نے پوچھا۔ "نکاح کب پڑھانا ہے۔ کیا ابھی آ جاؤں؟ یہ بتاؤ، مجھے کیا کرنا ہے؟"

"کسی عالم دین سے ملاقات کرو۔ میں چاہتا ہوں، میڈونا ان کے سامنے اسلام قبول کرے۔"

وہ بولا۔ "کسی عالم دین کے پاس نہیں جاؤں گا ابھی سیدھا بابا صلاح الدین اجمیری کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ ان سے گزارش کروں گا کہ وہ میڈونا کو مشرف بہ اسلام کریں اور تم دونوں کا نکاح پڑھائیں۔"

مراد نے خوشی سے جھوم کر کہا۔ ”واہ کبڈی! اس سے زیادہ ایمان افروز بات کیا ہوگی کہ وہ محترم بزرگ ہمارا نکاح پڑھائیں گے۔ تم ابھی جاؤ۔“

”ابھی جارہا ہوں دعا کرو' ان سے ملاقات ہو جائے۔ میں تھوڑی دیر بعد کال کروں گا۔“

”میں ابھی میڈونا کے ساتھ قریبی شاپنگ سینٹر کی طرف جارہا ہوں۔ اس کے لیے حسبِ حال مشرقی لباس اور عبا وغیرہ خریدنا بہت ضروری ہے۔“

وہ پریشان ہوکر بولا۔ ”یار! کیوں خطرہ مول لے رہے ہو۔ تمہیں تو کوئی نہیں پہچان پائے گا لیکن میڈونا کو دوست اور دشمن سب ہی پہچان لیں گے۔ میکی براؤن نے اس کی تصویر یہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو بھی دی ہوگی۔“

مراد نے کہا۔ ”میڈونا یہاں سے چادر لپیٹ کر' آدھا چہرہ اسکارف سے ڈھانپ کر دکان میں پہنچتے ہی سب سے پہلے عبا اور نقاب میں چھپے گی تم فکر نہ کرو۔ یہاں سے کسی دکان تک اچھی طرح چھپ کر جائے گی۔ میں بہت محتاط رہوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ اپنی خود اعتمادی سے جاؤ۔ میں بابا اجمیری سے ملاقات کرنے کے بعد تمہیں کال کروں گا۔“

اس سے رابطہ ختم ہوگیا۔ میڈونا نے اس کے سامنے ایک اسکارف سے اپنے سر کو' گردن کو اور پورے چہرے کو اس طرح چھپایا کہ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ”کوئی نہیں پہچانے گا۔ آنکھیں سن گلاس میں چھپالو۔“

وہ سن گلاس پہن کر چادر لپیٹ کر اس کے ساتھ ... چار دیواری سے باہر آگئی۔ وہ تقریباً ایک ماہ کے بعد کھلی فضا میں آئے۔ مراد کے زخم بھر گئے تھے۔ زخموں کے وہ نشانات لباس میں چھپے ہوئے تھے نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ لیکن دوڑنے بھاگنے اور ایکشن میں رہنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ چپ چاپ جائیں گے اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر واپس آجائیں گے۔

وہ باہر مین روڈ پر آکر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اگر وہ دھرم داس کو کال کرتا تو اس کے لیے گاڑیاں آجاتیں۔ لیکن اس نے قابل اعتماد دھرم داس جیسے میزبان کو بھی نہیں بتایا کہ وہ چار دیواری سے باہر جارہا ہے۔

وہ دونوں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مراد فاصلہ رکھنے کا عادی تھا۔ وہ قریب رہ کر بھی ذرا دور تھے۔ دونوں منتظر تھے اور بے تاب تھے۔ چند گھنٹوں کے بعد فاصلہ ختم ہونے والا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بدن کو چھونے والے اور ایک جان اور ایک قالب ہونے والے تھے۔

انسان کی یہ ازلی ہوس بھی کیا ہے؟ پوری نہ ہو تو پاگل بنا دیتی ہے۔ مراد مضبوط قوتِ ارادی کا حامل ہونے کے باوجود ایک ماہ سے اسے قریب دیکھتے دیکھتے جنون میں مبتلا ہو رہا تھا۔ میڈونا پر ہسٹیریا کا دورہ پڑنے والا تھا۔ اب شکر کا مقام تھا کہ دو چار گھنٹے میں شیطانی خواہشات فنا ہونے والی تھیں۔ وہ تہذیب کے مطابق میاں بیوی بن کر رہنے والے تھے۔

وہ ایک شاپنگ پلازا کے سامنے ٹیکسی سے اُتر گئے۔ اس عمارت کے اندر جانے لگے۔ وہ بولی۔ ”مجھے لوگوں کی بھیڑ میں تمہارے ساتھ چلتے ہوئے اچھا لگ رہا ہے۔ او گاڈ! تمہارے ساتھ دین اور ایمان بدل رہا ہے۔ زندگی پہلے کچھ تھی اب بہت کچھ ہو رہی ہے۔“

وہ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اسی وقت میڈونا ایک موٹی بھدی عورت سے ٹکرا گئی۔ ٹکرا کر گرنے والی تھی۔ مراد نے فوراً ہی بازوؤں میں دبوچ لیا۔ فاصلے یکبارگی ختم ہوگئے۔ دونوں کے دل دھماکے کرتے ہوئے دھڑکنے لگے۔ تنہائی میں جو ہونا تھا' وہ بیچ بازار میں ہونے لگا۔

صرف چند لمحوں کی بات تھی۔ وہ فوراً ہی الگ ہوگئے۔ اسکارف کھل گیا تھا۔ وہ جلدی سے چہرہ چھپانے لگی۔ تقدیر تو پلٹنے کے لیے ہوا کا رخ بدلنے کے لیے بہانہ ڈھونڈ لیتی ہے۔

دو متلاشی آنکھوں نے اسے دیکھ لیا۔

اس شہر میں ایک نہیں، سیکڑوں تلاش کرنے والے پچھلے ایک ماہ سے بھٹک رہے تھے۔ اب وہ ایسے بھی خوش نصیب نہیں تھے کہ کسی کی نظروں میں کبھی نہ آتے۔ کبھی تو ظاہر ہونا تھا۔ تقدیر نے پہلے تو ایک دوسرے کے سامنے جوانی کا چارا ڈالا۔ پھر انہیں تڑپا کر نکاح خوانی کے لیے آمادہ کیا۔ پھر ضروری شاپنگ کے لیے مجبور کیا۔ پھر دونوں کو مجبوریوں کی تھال میں سجا کر پیش کر دیا۔

اور تقدیر نے کیا غضب کا پلٹا کھایا۔ انہیں دیکھا بھی تو پہلے مرینہ کی ہی آنکھوں نے دیکھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

بہروپ

ابراہیم جمالی

بہت دلچسپ تماشا ہوتا ہے جب انسان تھوڑی ردوبدل سے اپنے چہرے، اپنی شخصیت میں تبدیلی لے آتا ہے لیکن جب تبدیلی کا یہ عمل مستقل بہروپ دھار لے تو ایسے میں سایہ بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔ کچھ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے معصوم لوگوں کے نظریات اور اعتقاد سے کھلواڑ اپنا دلچسپ مشغلہ بنالیا تھا۔

جب تک بے وقوف زندہ ہیں عقلمند کھاتے رہیں گے کی عکاس تحریر

میں اللہ بخش مست کی زیارت کرنے اروڑ جا پہنچا تھا۔

میں نے پرانی اور زبوں حال مسجد کے قریب گھوڑے کو روکا اور نیچے اتر آیا۔ روہڑی سے اروڑ تک گویا ہوا میں اڑتے ہوئے مسلسل سفر کیا تھا۔ گھوڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کے سم مٹی اور پسینے سے اٹ گئے تھے۔ میں نے اسے ایک ببول کے تنے کے ساتھ باندھ کر پیار سے تھپکی دی۔ یہ میرا پرانا ساتھی ہے۔ یہ ہر مصیبت اور مشکلات میں میرا وفادار رہا ہے۔ میں اسے پیار سے کپتان کہتا تھا۔

میں پیروں فقیروں پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ میں راہزن اور خونی ہوں۔ مجھے اپنی رائفل اور یونانی خنجر پر اعتماد ہے۔

اپنی قوت پر اعتبار ہے۔ جسے چاہوں، جب چاہوں قتل کر دیتا ہوں۔ جاں بخشی صرف ان کی ہو سکتی ہے جو قرآن پاک سامنے لا کر امان طلب کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو صرف لوٹنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس حد تک کہ ان کے جسم پر موجود لباس بھی اتروا لیتا ہوں...... لیکن میرا جگری یار عارب ماچھی کسی کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔ اس کے سامنے جو زیادہ گڑگڑاتا تو وہ اسے بلا تاخیر ختم کر دیتا تھا لیکن ایک رات عارب ماچھی کہیں اچانک گم ہو گیا۔

اللہ بخش مست کی کرامات کے قصے سن کر میں یہ فیصلہ کر کے روانہ ہوا تھا کہ اگر مست نے عارب ماچھی کے بارے میں کوئی خبر نہیں دی تو اپنی رائفل کی تمام گولیاں اس کے سینے میں اتار دوں گا۔

میں نے ڈھاٹا کھول کر پسینا پونچھا اور اردگرد نظر دوڑائی۔ دور دور تک آدم زاد نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے رائفل پر گرفت مضبوط کی اور شکستہ دیواروں، ٹوٹی پھوٹی بنیادوں، ادھر ادھر بکھری ہوئی سرخ اینٹوں کو روندتا ہوا اروڑ کے کھنڈرات میں داخل ہو گیا۔ میرے عقب میں قدیم قبرستان اور سامنے خوفناک پہاڑی نشیب تھے۔ میں نے اچانک اس خاموشی اور سناٹے میں اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ کچھ پتھر لڑھکتے، قلابازیاں کھاتے نشیب میں جا گرے۔ میں نے نیفے میں اڑسے ہوئے خنجر کے دستے پر ہاتھ رکھ کر بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

''کون ہے؟'' میں نے للکارا۔

وہ ٹھٹک کر رکا اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ دبلا پتلا اور کمزور سا شخص تھا۔ کالی چادر اور اجرک کا ڈھاٹا دیکھ کر ڈر گیا اور ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ''کک...... کون ہو تم؟''

''مسافر ہوں۔''

''خوش آمدید۔'' اس نے اپنا کمزور سا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

''میں اللہ بخش مست کی زیارت کرنے آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''بسم اللہ سائیں۔''

''وہاں تک پہنچنے کا راستہ بتاؤ گے؟''

''میں خود بھی سائیں کو سلام کرنے کے لیے نکلا ہوں۔ ساتھ چلتے ہیں۔''

وہ یہیں کا باشندہ تھا۔ کھنڈرات کی اونچی نیچی راہوں سے بخوبی آگاہ ہونے کے سبب اس کے قدم اعتماد اور پختگی کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ وہ میرے آگے چل رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''میں میر بحر ہوں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''یہاں پہلی بار آئے ہو؟''

''ہاں۔''

''مجاہد کی مسجد کے قریب تمہارا گھوڑا بندھا ہوا ہے؟''

''مجاہد......! کون مجاہد؟''

''محمد بن قاسم۔''

''ہاں میرا گھوڑا ہے۔''

ہم سرخ اینٹوں پر قدم رکھتے، قلعے کے کھنڈرات میں سے گزرتے ہوئے ایک سالم اور بہتر حالت میں موجود مسجد کے قریب پہنچے۔

''یہ مسجد بھی مجاہد نے تعمیر کرائی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''یہ بہتر حالت میں ہے۔''

''اللہ کی رحمت ہے اس پر۔''

مسجد کے عقب میں پہاڑی پگڈنڈی پر نیچے کی طرف چلتے ہوئے اس نے کہا۔ ''مجاہد نے اس سرزمین سے کفر کا خاتمہ کیا۔''

میں نے چلتے چلتے رک کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اب یہاں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔''

میری بات پر اسے غصہ آ گیا۔ وہ باقی پگڈنڈی پر دوڑتے ہوئے نیچے پہنچ گیا۔ پہاڑ کی ترائی میں پہنچ کر کپڑوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، جیسے وہ مجھ پر ہنس رہا ہو۔ میں پہاڑ کی خوفناک پگڈنڈی پر پھسلتا، لڑکھڑاتا اور گرتا پڑتا نیچے پہنچ گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شرارت تیر رہی تھی۔ اس نے چند قدم اٹھائے، اپنے کمزور ہاتھ کمر پر رکھے اور ایک جگہ رک گیا۔

''اس میدان میں سلائج کے بیٹے چچ نے دھوکے سے رانی مہیرت کو قتل کر دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

میں چچ اور مہیرت کے ناموں سے متاثر نہیں ہوا۔ دونوں میرے لیے اجنبی تھے لیکن میں نے دونوں کے درمیان کھڑی دھوکے کی دیوار کو ضرور دیکھ لیا۔ صدیوں سے چلنے والی ہوائیں بھی فریب کو مٹانے میں ناکام رہی تھیں۔

میں نے قمیص کے نیچے موجود خنجر کے دستے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ زمین دھوکے اور فریب کو جنم دیتی رہی ہے؟''

وہ میرے خنجر کو تو نہ دیکھ سکا لیکن میرے جملے کے

مفہوم کو سمجھ گیا۔ وہ نفرت سے مجھے گھورنے لگا۔ بزدل اور کمزور نہ ہوتا تو ضرور مجھے تھپڑ مار دیتا۔ ''گالیاں برداشت کرلو گے؟'' یکایک اس نے عجیب سوال کیا۔

''کس میں اتنی ہمت ہے......؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''مست!''

''اوہ...... اچھا۔ اپنی مراد پانے کے لیے مست کی گالیاں بھی سہہ لوں گا۔''

میں اللہ بخش مست کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ لوگوں نے بتایا تھا کہ وہ سوالیوں کو گالیاں بکتا ہے۔ ان پر گند کچرا پھینکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی کرامات کے قصے بھی سنے تھے۔ جوان عورتوں کے جن نکالتا تھا۔ بے اولاد لوگ وہاں سے اولاد اور نامراد، مرادیں پاتے تھے۔ اس کے فیض سے فراق کے مارے عاشق شربتِ وصل سے سیراب ہوتے تھے۔ مجھے بھی اپنے دوست کی تلاش تھی۔ عارب ماچھی میرا جگری یار تھا۔ میں مذاق ہی مذاق میں اسے کھو بیٹھا تھا۔ میں نے ایک رات بھنگ میں دھتورا گھوٹ کر اسے پلا دیا تھا۔ وہ اپنی قمیص کا گریبان چاک کر کے رات کی تاریکی میں جانے کہاں گم ہوگیا تھا۔ میں نے اسے سندھ کے ہر گوشے میں تلاش کیا...... لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ کہیں نہ ملا۔ جب میں ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو اللہ کے ایک نیک بندے کی زبانی اللہ بخش مست کی کرامات کے قصے سن کر اپنی مراد پانے کے لیے اروڑ آنکلا۔

''اروڑ مدرسہ عارفی کے حوالے سے مشہور ہے۔ یہاں طالبِ علم مفت دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔'' اجنبی نے کھنڈروں کے درمیان چلتے ہوئے بتایا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ مزید بتانے لگا۔ ''اس پہاڑ کے پیچھے درگاہ عارفی ہے اور درگاہ کے سامنے کالکا دیوی کا غار اور مندر ہے۔''

میں نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ میں مستقل مست کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''کالکا دیوی کی مورتی اور مندر کے بت مدرسہ عارفی کے طلبا نے توڑ دیے ہیں۔'' وہ پھر بولنے لگا۔ میری توجہ اللہ بخش مست کی جانب مبذول تھی اس لیے میں اس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے ٹوپی اتار کر بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''تمہاری ذات کیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''عارفی۔''

''کام کیا کرتے ہو؟''

''یہاں اروڑ میں سندھی ماسٹر ہوں۔''

''یعنی عالم ہو۔''

اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ میری اس بات سے بہت خوش ہوا تھا۔ ایک گہری سانس کھینچ کر بولا۔ ''بھائی! تمہیں کیا بتاؤں...... اس زمانے میں عالم کی کوئی قدر ہی نہیں ہے۔''

''ہاں۔ تمہاری بات سو فیصد درست ہے۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا۔

سفید گنبد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''یہ شاہ شکر گنج کا مقبرہ دیکھ رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''زمین کا یہ سارا حصہ بھی شاہ شکر گنج کا ہے۔''

''اللہ بخش مست کا آستانہ کتنی دور ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''تھک گئے کیا؟''

''نہیں...... ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔''

''وہ سامنے فصیل کے آثار نظر آرہے ہیں نا...... بس اس کے پیچھے اللہ بخش مست کی درگاہ ہے۔''

پھر اس نے بتایا کہ راجا داہر کے سپاہی اس فصیل پر پہرا دیتے تھے۔ جہاں سے ہم گزر رہے تھے، وہ سنگلاخ زمین تھی۔ کسی زمانے میں یہاں پانی بہتا ہوگا کیونکہ پانی کے بہاؤ کے باعث وہ پتھریلی زمین خاصی چکنی ہو رہی تھی۔ تھوہروں کی قطار سے آگے انار کے پیڑ نظر آرہے تھے۔ میں نے تصدیق کی خاطر اس سے پوچھا۔ ''یہ انار کے درخت ہیں نا؟''

''ہاں، یہ انار کے درخت ہیں۔'' اس نے بتایا اور اپنا بازو ایک جانب پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ سامنے دودھ کا کنواں ہے۔''

''دودھ کا کنواں؟''

''ہاں۔ آؤ تمہیں دکھاؤں۔''

ہم کنویں کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ میں نے اندر جھانکا۔ وہ خشک تھا۔ اس کی تہ میں پتھر بھرے ہوئے تھے۔

''یہ دودھ کا کنواں اور انار کا باغ شاہ شکر گنج کی ملکیت ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اس میں پتھر بھرے ہوئے ہیں سائیں!''

''ہاں...... لیکن پرانے زمانے میں اس کنویں سے

دودھ نکلتا تھا اور انار کے پیڑ بھی پھل دیتے تھے۔''

میں اسے گھورنے لگا۔ اس نے کنویں کے پاس سے ہٹتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''شاہ کی وفات کے بعد ان کے لالچی مجاوروں نے دودھ اور انار بیچنا شروع کردیا تھا۔ ایک دن کنواں خشک ہوگیا اور درختوں نے پھل دینا بند کردیے۔ اب انار کے پیڑوں پر پھول تو آتے ہیں لیکن پھل نہیں۔''

میں نے دیکھا درخت سرخ پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ میں نے ایک نظر گنبد پر ڈالی۔ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولتا رہا۔ اس نے گنبد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''مقبرے کے پیچھے سفید پتھر کا جو میدان ہے، چاند کی چودھویں رات کو وہاں زبردست جوا ہوتا ہے۔ سکھر، روہڑی، شکارپور اور جیکب آباد کے بڑے سیٹھ، زمیندار اور افسر یہاں جوا کھیلنے آتے ہیں۔''

''میں آنے والی چودھویں رات کو اپنے دوستوں کے ساتھ آؤں گا اور جواریوں کی ساری دولت لوٹ کرلے جاؤں گا۔'' میں نے اسے بتایا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو بھائی......'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہاں فنکار قسم کے جواری آتے ہیں۔ لاکھوں کا جوا ہوتا ہے۔ یہاں ہم مسکینوں کا کیا کام؟''

میں نے رائفل کو دائیں کاندھے سے اتار کر بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔ ''میں جس رات آؤں گا، اس رات یہاں کے سب جواری اپنی جھولیاں میرے سامنے خالی کردیں گے۔'' دبلا پتلا کمزور سا ماسٹر میری بات پر ہنسنے لگا۔

''پولیس بھی آتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ایک دو صوبیدار اور کچھ سپاہی آتے ہیں لیکن وہ کوئی روک ٹوک نہیں کرتے۔''

''میں جس رات یہاں آؤں گا، اس رات اروڑ میں چکرانے والی ماضی کی روحیں بھی تڑپ اٹھیں گی۔''

''یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو......؟ اروڑ کرامتوں کا شہر ہے۔''

''شہر یا کھنڈر؟''

اسے میری بات بری لگی۔ ہم فصیل کے قریب پہنچ گئے تھے۔ دوسری جانب اللہ بخش مست کی درگاہ تھی۔ درگاہ کے سامنے تنگ سا برآمدہ تھا جہاں لوگوں کی بے پناہ بھیڑ تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ میں غلط راستے سے آیا تھا۔ ایک پختہ سڑک بھی تھی جو گھوٹکی تک جاتی تھی۔

میرے ساتھ آنے والے ماسٹر نے وہاں پہنچ کر کہا۔ ''یہاں کسی کی نہیں چلتی۔ اب خود راستہ بناؤ اور مست تک پہنچو۔''

وہ مجھ سے ہاتھ ملاکر بھیڑ میں گم ہوگیا۔ اس ہجوم میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ تھی۔ دیہاتی، غریب مسکین...... اور گوری چٹی، صحت مند شہری عورتیں بھی ان میں شامل تھیں۔ چالاک، چست اور ہوشیار۔

میں بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ہر آدمی دھکم پیل میں شریک تھا اور گرتا پڑتا آگے بڑھنے کی کوشش میں تھا۔ میں بھی آخرکار مست کی کوٹھری کے سامنے جا پہنچا۔ وہ اس وقت اپنی کوٹھری میں کسی عورت کا جن نکالنے میں مصروف تھا۔ اندر سے آنے والی دبی دبی نسوانی چیخوں اور کراہوں کے ساتھ مردانہ غراہٹیں اور وقفے وقفے سے نامانوس نعرے کی آواز سن کر وہاں موجود سائل ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ''جن بڑا ضدی معلوم ہوتا ہے...... مست سے جھگڑا کررہا ہے۔''

کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ ایک نوجوان عورت چادر میں لپٹی باہر آئی اور بے ترتیب بالوں کو سمیٹتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ننگ دھڑنگ اللہ بخش مست بھی باہر آگیا۔ نیکر کے علاوہ اس کے جسم پر کچھ نہیں تھا۔ بھرا بھرا کسا ہوا وجود۔ سر، ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بکھرے ہوئے اور سرخ آنکھیں۔ وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے چھوٹتے ہی گالیوں کی بوچھاڑ کردی۔ میں نے بھی برداشت کی حد کردی۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ اس نے گھور کر میری آنکھوں میں دیکھا۔ کچھ دیر تک دیکھتا رہا پھر جھپٹ کر میری چادر کھینچ لی۔ میں بدستور خاموش رہا۔ اس نے میرے ڈھاٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے کہا۔ ''میری عزت رکھنا مست!''

اس نے ہاتھ ہٹا دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آؤ۔''

میں اس کے پیچھے کوٹھری میں داخل ہوگیا۔ وہ دروازہ بند کرکے میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ''کیوں آئے ہو؟''

''میں اپنے دوست کی تلاش میں ہوں۔'' میں نے ادب سے جواب دیا۔ ''میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا ہے لیکن وہ نہیں ملا۔''

وہ سرخ انگارا آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ پھر وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''تم عبدالرحمان ڈاکو ہو۔''

یہ سن کر میرے پورے وجود میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ میں بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی روشن ضمیری دیکھ کر میرا دل عقیدت سے بھر گیا۔

''اور تم اپنے دوست عارب ماچھی کی تلاش میں ہو۔'' اس نے کہا۔ میں نے اللہ بخش مست کے بارے میں جو سنا تھا، وہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن رہا تھا۔ پورا سندھ پیروں فقیروں سے بھرا ہوا ہے لیکن سائیں اللہ بخش مست جیسا پہنچا ہوا شاید ہی کوئی ہو۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس کے ایک ایک لفظ میں سچائی تھی۔

''تم سکھر والی پرانی درگاہ کے گدی نشین میاں سکل کی سرپرستی میں ہو۔''

''بس سائیں بس......!'' میں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ میرا دوست عارب ماچھی کہاں ہے؟''

سائیں اللہ بخش مست نے مجھے کندھوں سے تھام کر کھڑا کیا اور اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا۔ پھر وہ اسی طرح مجھے دیکھتا ہوا میری پشت پر جا کھڑا ہوا۔ اچانک وہ دھاڑا۔ ''عارب ماچھی مر گیا۔ تم بھی سورج غروب ہونے سے پہلے اروڑ سے چلے جاؤ۔''

اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور مجھے دھکا دے کر باہر نکال دیا۔ میں سر جھکائے ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ میں سندھ کا بدنام ڈاکو ہوں۔ میاں سکل سندھ کا نامی گرامی پتھاریدار ہے۔ بڑے بڑے خونی اور نامور ڈاکو اس کے پاس آکر سکون اور سلامتی کی زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ ان کے پالے ہوئے چیلوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ اس کے پاس ایسے مشہور راہزن، ڈاکو اور خونی رہتے ہیں کہ ان کے نام سن کر ہی اردگرد کے گوٹھ اور شہر کانپ اٹھتے ہیں۔ عارب ماچھی جیسے خونخوار راہزن کی گمشدگی کا سن کر لوگوں نے خوشیاں منائی تھیں۔ میں کچھ عرصے کے بعد اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔

''کہو...... کیا ہوا......؟ تم نے من کی مراد پالی؟''

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے وہی ماسٹر کھڑا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''ایسا ہو نہیں سکتا...... ارے میاں! اس مست نے پتھر سے پانی نکالا ہے۔''

''تمہارے لیے نکالا ہوگا۔''

''تم کرامات پر یقین بھی تو نہیں کرتے۔''

''ایسے ہی کیسے یقین کرلوں۔''

''مست نے تم سے کیا کہا؟''

''کہا ہے کہ میرا دوست مر گیا ہے۔''

''تو مر گیا ہوگا۔''

''کیسے مر گیا ہوگا......؟'' میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ میرا یار زندہ ہے۔''

''تم غلطی پر ہو جوان! مست کی بات کو پتھر کی لکیر سمجھو۔''

میں نے غصے سے کہا۔ ''میں تم سب اور تمہارے مست کو گولیوں سے بھون ڈالوں گا۔''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''آج یہاں موجود لوگوں کے بھرم اور میری تلاش کی آخری شام ہے۔'' میں نے کہا اور رائفل پر گرفت مضبوط کر کے ایک عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ماسٹر میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

''کیسے خوبرو اور طاقتور جوان ہو۔'' اس نے کہا۔ ''اپنی جوانی ہی پر رحم کرلو اور واپس لوٹ جاؤ۔''

میں نے ماسٹر کو گھور کر دیکھا۔ پھر اس سے کہا۔ ''اچھا...... یہ مست بتا سکے گا کہ میرا دوست کہاں دفن ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' اس نے فخر سے جواب دیا۔

''ارے، مست بہت پہنچا ہوا ہے۔''

''سنو......!'' اس نے زور دے کر کہا۔ اس کے لہجے میں عجیب سا جوش اور عقیدت کا رنگ سمایا ہوا تھا۔ ''کچھ سال پہلے، اللہ بخش مست اس فصیل کے قریب بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی اور قمیص کا گریبان چاک تھا۔ اس کے سینے پر گہرے گھاؤ کا نشان تھا۔''

''کالی قمیص...... گہرا گھاؤ......'' میں زیر لب بڑبڑایا اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے ماسٹر کو ایک طرف دھکا دے کر بھیڑ میں گھس گیا۔ سیدھا اللہ بخش مست کی کوٹھری کے سامنے جا پہنچا۔ اس وقت وہ نذرانہ وصول کرنے کے لیے دو نوجوان عورتوں سمیت کوٹھری میں داخل ہو رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ عورتیں ڈر کر ایک طرف ہو گئیں۔ مست نے گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور گرفت مضبوط کرلی۔ سائلوں کا ہجوم ایکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نے ڈنڈا اٹھا لیا، کسی نے کلہاڑی بلند کی اور کوئی ادھر ادھر سے پتھر اٹھانے کو لپکا۔ میں نے اللہ بخش مست کو کوٹھری کے اندر دھکیلا اور خود ہجوم کی طرف رائفل سیدھی کر کے کھڑا ہو گیا۔

''خبردار!'' میں دہاڑا۔ ''میں عبدالرحمان ڈاکو ہوں۔''

خلق پر گویا برف گر پڑی۔ جو لوگ جوش میں آگے بڑھ آئے تھے، دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ کسی نے کہا۔ ''چھوڑ دو اسے۔ مست خود ہی سیدھا کر دے گا۔''

میں نے اندر جا کر کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا۔ مست

کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مغلظات بکنے لگا۔ میں نے ڈب سے خنجر نکال کر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ ''تم جھوٹے اور مکار ہو۔'' میں غرایا۔

وہ جواب میں گالیاں بکنے لگا۔ میں نے اس کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔ ''تم عارب ماچھی ہو......''

اس کی آنکھوں میں لپکنے والے شعلے ماند پڑنے لگے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر آئی اور وہ میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ''پہلی نظر میں تم بھی مجھے نہیں پہچان سکے تھے نا!''

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بانہوں میں لے لیا۔ میں نے سرگوشی کی۔ ''بڑے بہروپیے بن گئے ہو۔''

''بننا پڑا یار!''

''واپس نہیں آؤ گے؟''

''بیٹھو تو سہی۔'' اس نے کہا اور ہم دونوں کھجور کی بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ جو عرصہ جدائی میں گزرا تھا، اس کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ آخر کار میں نے کہا۔

''یار عارب! تمہارے بغیر کلہاڑی کو زنگ لگ گیا ہے۔''

''میرے مجاور بن جاؤ۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیوں اپنی چمڑی کے دشمن ہو رہے ہو۔'' میں نے کہا اور دونوں قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ ''پہلے تو تم کہتے تھے کہ ڈاکے نہیں ڈالو گے تو مر جاؤ گے۔ اب کیسے زندہ ہو؟''

اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی......

''بےوقوف! یہاں کے لوگوں کو کلہاڑی اور بندوق کے بغیر بھی لوٹا جاسکتا ہے۔''

اس نے چٹائی کا کونا اٹھا کر، اس کے نیچے بنے ہوئے گڑھے میں موجود زیورات اور نوٹوں کے انبار دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کسی دن آ کر یہ سب لے جانا۔''

''بڑی دولت سمیٹی ہے تم نے۔'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے جواب دیا۔ ''جھوٹے پیر بن جاؤ یا راہزن ڈاکو...... دونوں کام ایک سے ہیں۔ دونوں میں ایک سی کمائی ہے۔''

''کفر بکتے ہو، بدبخت!''

''ڈاکو کے لیے تو قانون موجود ہے لیکن کسی پیر کے لیے نہیں۔'' اس نے بڑی گہری بات کہہ دی تھی۔

''تم تو شیطان کے بھی استاد نکلے۔''

''اس جملے کے لیے کان ترس گئے تھے یار! تم نے پرانے دن یاد دلا دیے۔''

''واپس چلو گے نا؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ابھی اور دولت جمع کرنی ہے۔''

''تم کہیں پکڑے نہ جاؤ۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اب میں ماہر ہو گیا ہوں۔ اس واردات میں کوئی خوف اور خطرہ نہیں۔ غریب اور ناسمجھ لوگ خود گھر کا سامان بیچ کر نذرانہ دے جاتے ہیں۔''

باہر لوگوں میں بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ان کی آوازیں اندر تک آرہی تھیں۔ ہلچل نے زور پکڑ لیا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے پوچھا۔ ''تم نے مستقل یہاں رہنے کا ارادہ کر لیا ہے کیا؟''

''ہاں، جب تک راز، راز رہے گا۔ جھوٹا پیر بنا رہوں گا۔ دوسری صورت میں تم سے آن ملوں گا۔''

''میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''یہاں معصوم لوگوں کے درمیان پاگلوں کو پیر اور دیوانوں کو پہنچا ہوا سمجھا جاتا ہے۔''

''اچھا عارب......! اب میں چلتا ہوں۔ آج میں بہت خوش ہوں کہ آخر کار تمہیں ڈھونڈ نکالا۔''

''ٹھہرو۔'' وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''تم نے میرا کام خراب کر دیا ہے۔ میں باہر جا کر بیٹھتا ہوں۔ تم سب کے سامنے میرے پیر چھو کر ایک طرف چلے جانا۔''

میں اس سے گلے مل کر رخصت ہونے لگا۔ ''مشٹنڈے ہو گئے ہو۔''

''خالص خوراک اور الھڑ جوانیوں کی مہربانی ہے۔''

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اپنی کوٹھری سے باہر نکل گیا۔ لوگوں کی زبان گنگ رہ گئی تھی۔ وہ حیرت اور عقیدت سے آنکھیں پھاڑے مست کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں بھی باہر آیا اور عارب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے پاؤں چھوئے۔ لوگوں کا اعتقاد مزید پختہ ہو گیا۔ کہیں سے آواز آئی۔

''واہ مست بادشاہ! تم نے عبدالرحمان جیسے ڈاکو کو جھکا دیا۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا اور گردن جھکائے ایک جانب نکل گیا۔ کسی نے کہا۔ ''سائیں کی کرامت تو کوئی کوٹھری میں دیکھے۔''

میں نے فصیل سے گھوم کر اروڑ کے شکستہ قلعے کا رخ کیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ کھنڈروں اور پہاڑوں پر رات کی تاریکی نے اپنی چادر پھیلا دی تھی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب دور دور سے یگانۂ روزگار لوگ کھنچ کھنچ کر برصغیر میں داخل ہو رہے تھے۔ بخارا کے ایک جید عالم عطاء اللہ محمود نے بھی ایک طالع آزما کی طرح برصغیر کا رخ کیا اور دشوار گزار راہوں کو طے کرتے ہوئے پشاور کے راستے برصغیر میں داخل ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا شیخ حمید الدین بھی تھا۔ یہ نوجوان بیٹا بھی اپنے علم اور فراست میں لاجواب تھا۔ بیٹے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کا باپ محض فکرِ معاش میں اتنا طولانی سفر کیوں کر رہا ہے؟ راہ میں جہاں کوئی دشواری پیش آتی۔ بیٹے نے دبی زبان میں سوال کر دیا۔ ''باوا جان! کیا بخارا میں خدا نہیں ہے جو ہمارا رزق پہنچاتا؟''

باپ جواب دیتا۔ ''بیٹے! وطن چھوڑ کر کہیں اور بس جانا سنت نبوی ﷺ ہے۔''

بیٹا اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا، بولا۔ ''باوا جان! اگر ترکِ وطن معیشت کی خاطر ہے تو یہ سنتِ نبوی ﷺ نہیں ہو سکتی۔''

شیخ ناگوری

ضیا تسنیم بلگرامی

انسان کی فطرت میں اتنے پیچ و خم ہیں که سیدھے راستے پر چلنا اس کے لیے ایک بڑی آزمائش سے کم نہیں ہوتا مگر... جنہیں اللہ یه توفیق دیتا ہے ان کے لیے ہر آزمائش اپنا دامن سمیٹ کر ایک طرف ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہے کیونکه وہ جانتی ہے که وہ جس بندے کو آزمانے چلی ہے اسے خدا کی طرف سے نمایاں حوصله اور صراط مستقیم پر چلنے کی ہمت عطا کر دی گئی ہے لہذا اسے اپنے راستے سے ہٹانا اس کے بس کی بات نہیں۔ آپ کا شمار بھی ایسے ہی برگزیدہ اور پسندیدہ لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں اللہ کی طرف سے روحانی دولت بڑی فراوانی سے عطا کی جاتی ہے۔

محبتیں تقسیم کرنے والے اللہ کے

ایک ولی کا قصہ

باپ اپنے بیٹے کی باتوں سے لاجواب ہوگیا۔
یہ دونوں دہلی میں داخل ہوئے۔ بیٹا حمید الدین غیر معمولی پڑھا لکھا تھا۔ اس نوجوان کی علمیت اور لیاقت کا ایک زمانہ معترف تھا۔ باپ نے دہلی میں مختلف ملازمتیں کیں لیکن حمید الدین کو کام نہیں کرنے دیا۔ اتفاق کی بات کہ باپ کا جلد ہی انتقال ہوگیا اور حمید الدین کو معیشت کی فکر ستانے لگی۔ ان کی علمیت اور لیاقت کا شہرہ تو تھا ہی، انہیں بڑی آسانی سے قاضی کا منصب مل گیا۔ انہیں ناگور بھیج دیا گیا۔
مقدیات کی بھرمار رہنے لگی غرض مند انہیں رشوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے مگر یہ حد درجہ متقی اور پرہیزگار تھے۔ طبیعت میں بلا کی قناعت تھی۔ شاطر اور چالاک لوگ ان کی دین داری اور تقویٰ سے عاجز آگئے اور ان کی شکایتیں دہلی دربار کو بھیجنے لگے۔ ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں لیکن یہ تناور اور مضبوط درخت کی طرح اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ سب سے زیادہ وہ لوگ پریشان تھے جو مدعیان یا مدعا علیہان کی طرف سے قاضیوں کو رشوتیں پہنچا کر اپنا کام چلایا کرتے تھے اور ان کی معاش کا انحصار ہی دلالی پر تھا۔ یہ شاطر لوگ جب ہر طرف اور ہر طرح سے مایوس ہوگئے تو ان میں کا ایک دلال حمید الدین کی خدمت میں پہنچا اور صاف صاف باتیں کیں۔
اس نے کہا۔ ”محترم قاضی! کیا آپ کو مال وزر سے ذرا سی دلچسپی نہیں؟“
آپ نے فرمایا۔ ”مجھ کو مال وزر سے بس اتنی ہی دلچسپی ہے کہ اس سے میری ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں۔“
شاطر شخص نے مسکرا کر کہا۔ ”واہ جناب! یہ کیا بات ہوئی؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کی جو تیری سمجھ میں نہ آسکے۔“
شاطر نے کہا۔ ”جناب! کتنے مال وزر کی کب ضرورت پیش آئے گی اور ہمارے پاس کتنا مال وزر ہر وقت موجود رہنا چاہیے...... کس کو معلوم؟ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ ہر انسان کے پاس مال وزر کی وافر مقدار اتنی ضرور ہونا چاہیے کہ بہ وقتِ ضرورت انسان خود کو مجبور اور بے بس نہ سمجھنے لگے۔“
آپ نے بڑی بے نیازی سے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جناب حرص وہوس کہیں جب اپنے پاؤں کہیں گاڑ لیتی ہے تو بہ آسانی ہتھیار نہیں ڈالتی۔ اس لیے میں اپنے لیے بطورِ خاص قناعت پسند کرتا ہوں۔“
شاطر نے طنزاً کہا۔ ”اگر آپ واقعی اتنے نااہل اور سخت دل واقع ہوئے ہیں تو پھر آپ کو یہ پیشہ نہیں اختیار کرنا چاہیے تھا۔“
آپ نے ذرا سی دیر کے لیے سکوت اختیار کیا اور منہ پھیر کر بیٹھ گئے پھر کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”او شیطان کے پرستار دفعان ہوجا میرے پاس سے، ورنہ میں اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر تیرا کام تمام کرادوں گا۔“
وہ شخص گھبرا کر چلا گیا۔ اس دن آپ سارا دن بہت اداس اور پریشان رہے۔ رات کو عشا کی نماز پڑھی اور سوچ میں پڑ گئے۔ آخر رقت زدہ آواز میں گڑگڑانے لگے۔ ”یا اللہ! یہ تیری آزمائش ہے یا شیطان کی؟ میں بہت حیران ہوں کہ انسان کو یہ کیا ہوگیا ہے یہ لوگ میری بربادی کے درپے کیوں ہیں؟ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ اگر انہوں نے مجھ کو بہت زیادہ تنگ کیا تو میں بدرجہ مجبوری قاضی کا منصب چھوڑ دوں گا کیونکہ میں وہ سب نہیں کرسکتا جو اب تک دوسرے کرتے رہے ہیں اور اب بھی کررہے ہیں۔ خدایا! ترغیب و تحریص کے جھکڑ چل رہے ہیں، یہ مجھے بھی اڑا لے جانے کی کوشش کررہے ہیں...... اگر تیری مدد شاملِ حال نہ ہو تو کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔“
ان کا گداز دل موم کی طرح پگھلا ہوا تھا۔ کافی رات گئے بستر پر گئے تو ان کی نیند اڑ چکی تھی۔ بڑی دیر تک کروٹیں بدلتے رہے مگر اس کا کوسوں کوئی پتا نہ تھا۔
ان کی آنکھ لگی تو دیکھا رسول مقبول ﷺ ان کے پاس تشریف لائے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ اے حمید، سچ سچ بتا تو اتنا پریشان کیوں ہے؟
حمید الدین کا پیمانہ صبر چھلک گیا، کہا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ! میں عاجز وناتواں انسان، مجھ کو جو منصب عطا ہوا ہے اس پر دیانت داری سے برقرار رہنا بہت دشوار ہے۔ میرا دل دنیا سے اچاٹ ہے۔ آپ میری راہنمائی فرمائیے، میں کیا کروں؟“
آپ نے فرمایا۔ ”حمید الدین! دنیا میں رہ مگر مسافر کی طرح، تجھے پرسوز دل اور عالمانہ دماغ عطا ہوا ہے۔ ان دونوں سے کام لے۔ سیاحت کر اور ان لوگوں سے ملاقات کر جو دنیا میں رہ کر بھی دنیا میں نہیں ہیں اور جنہیں دولتِ علم سے نوازا گیا ہے۔“
حمید الدین علی الصباح اٹھے اور دنیا کو چھوڑ دیا۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔ بغداد پہنچے وہاں ان کی

ملاقات شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے ہوگئی۔ حمید الدین کچھ عرصہ ان کی صحبت میں رہے اور اتنے متاثر ہوئے کہ ارادت نے مریدی کی شکل اختیار کر لی۔

شہاب الدین سہروردی کے پاس دوسرے کئی بزرگ بھی تشریف رکھتے تھے۔ ان میں ایک بزرگ ایسے بھی تھے جو حمید الدین کو سب سے زیادہ گرویدہ کرتے رہے۔ شہاب الدین سہروردی کے بعد اگر کسی کی صحبت میں حمید الدین کا بہت زیادہ جی لگتا تھا تو وہ یہی بزرگ تھے۔ ان کا نام خواجہ قطب الدین بختیار کا کیؒ تھا۔

حمید الدین ایک سال تک اپنے پیر مرشد کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس کے بعد ان سے اجازت حاصل کر کے مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ یہ جب روضہ رسول ﷺ کی زیارت سے شادکام ہوئے تو ان کی حالت ہی کچھ اور ہوگئی۔ آپ نے رسول اللہؐ کے روضے کی مجاوری اختیار کی۔

یہ کیفیت ایک سال دو ماہ اور آٹھ دن قائم رہی پھر رسول اللہؐ کی اجازت سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور خانہ خدا کی تین سال تک مجاوری کرتے رہے۔ یہاں بڑے بڑے اولیاء کرام سے ملاقاتیں ہوئیں اور باطنی فیوض حاصل کیے۔

ایک دن آپ نے ایک بزرگ کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا تو ایسا محسوس کیا گویا ان کی کشش حمید الدین کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے آپ سے اور کچھ تو ہو نہیں سکا، بس قدم اٹھانے میں ان کی اتباع کرنے لگے۔ ان بزرگ کے قدموں پر اپنے قدم رکھ رکھ کر طواف کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد ان بزرگ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پوچھا۔ ''حمید الدین! یہ تو کیا کر رہا ہے؟''

حمید الدین نے جواب دیا۔ ''اگر آپ یہ جان سکتے ہیں کہ میں کچھ کر رہا ہوں تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔''

بزرگ نے فرمایا۔ ''ظاہری عمل سے تجھے کیا مل جائے گا۔ میرے قدموں پر قدم رکھ کر تو کوئی بھی چل سکتا ہے مگر یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو میرے باطنی اعمال کی اتباع کر سکے۔''

حمید الدین نے پوچھا۔ ''آپ کا کوئی ایک بھی باطنی عمل ایسا ہے جس کی تقلید محال ہو۔''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''یہ کہ میں طوافِ کعبہ کے دوران اپنے ہر بنِ مو سے کلام اللہ کی تلاوت کرتا رہتا ہوں۔''

حمید الدین نے دل میں سوچا یہ محض دعویٰ ہے یا واقعہ بھی۔ اگر یہ واقعہ ہے تو اس پر یقین کس طرح کیا جائے؟

ان بزرگ نے فرمایا۔ ''کیا سوچ رہا ہے حمید الدین؟ یہ محض میرا دعویٰ نہیں واقعہ ہے۔ آ، میرے قریب آجا اور خود بھی سن لے۔''

حمید الدین ان بزرگ کے قریب آگئے تو ایسا محسوس ہوا گویا بہت سے قاری آہستہ آہستہ کلام پاک کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ حمید الدین پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ بے ہوش ہوگئے۔ جب ہوش آیا تو ان بزرگ کا کہیں پتا نہ تھا۔

کئی سال مکہ معظمہ میں رہنے کے بعد یہ برصغیر واپس آئے، دہلی کا رخ کیا۔ یہاں ایک بار پھر قطب الدین بختیار کا کیؒ سے ملاقات ہوگئی اور ان کے قرب میں رہنے لگے۔

سہروردیہ سلسلے میں سماع جائز نہیں ہے لیکن حمید الدین کو سماع سے بڑی دلچسپی تھی اور خواجہ بختیار کا کیؒ کے ساتھ محفلِ سماع میں ضرور تشریف لے جاتے تھے۔

اس دور میں چند ایسے جید اور با اثر عالم بھی تھے جو سماع کے سخت خلاف تھے۔ ان علماء کے پرستاروں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ سلطان شمس الدین التمش کا زمانہ تھا۔ اس کی سفید کوشک کے قریب علی شوریدہ نامی ایک درویش رہتا تھا۔ اس نے ازراہِ عقیدت و محبت حمید الدین اور بختیار کا کیؒ کی دعوت کی اور محفلِ سماع کا بھی انتظام کیا۔ یہ دونوں صاحبان اس محفل میں تشریف لے گئے۔

سماع کے مخالف بلکہ دشمن علماء میں مولانا رکن الدین سمر قندی کا بڑا نام تھا۔ مولانا کو کسی نے خبر کر دی کہ حمید الدین اور خواجہ بختیار کا کیؒ بادشاہ کے سفید کوشک کے پڑوس میں درویش علی شوریدہ کے گھر میں سماع سننے میں مشغول ہیں۔ ان کا فرطِ جوش سے چہرہ سرخ ہوگیا۔ فوراً حکم دیا کہ میرے ارادت مند اور پرستار اسی وقت میرے پاس جمع ہو جائیں۔ اس حکم کے بعد چشم زدن میں ان کے گرد لوگوں کا ہجوم ہوگیا۔

ایک پُرجوش نوجوان نے پوچھا۔ ''حضرت! ہمارے لیے کیا حکم ہے؟''

مولانا نے جواب دیا۔ ''مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ حمید الدین محفلِ سماع میں موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں اس محفل کو قوت استعمال کر کے اجاڑ دوں کیونکہ میرا یہ فعل اللہ کے نزدیک مقبول اور مسموع ہوگا۔''

ارادت مندوں نے مولانا کا یہ ارشاد سنا تو بے اختیار ڈنڈے سنبھالے اور جوش میں بھرے ہوئے درویش علی شوریدہ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ اس وقت محفل رنگ پر آئی ہوئی تھی۔

مولانا نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک شخص ان کے پاس گیا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

مولانا نے پوچھا۔ ''کیا اندر حمیدالدین موجود ہیں؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''ہاں، اندر موجود تو ہیں۔''

مولانا نے کہا۔ ''اچھا تو اندر جا اور علی شوریدہ کو میرے پاس بھیج دے۔''

اس شخص نے اندر جا کے علی شوریدہ کو صورتِ حال سے مطلع کیا۔ وہ بہت گھبرایا اور خواجہ بختیار کا کیؒ کو صورتِ حال بتا کے پوچھا۔ ''حضرت! اگر مولانا اپنے ارادت مندوں کو لے کر اندر آ گئے تو ساری محفل اجڑ جائے گی اور لوگ زخمی ہو جائیں گے۔ اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ یہ مصیبت ٹل جائے؟''

خواجہ بختیار کا کیؒ نے حمیدالدین کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''تم بتاؤ علی شوریدہ کیا کرے؟''

حمیدالدین نے جواب دیا۔ ''بس ایک کام کرے اور کچھ نہیں۔ مولانا کی مجال نہیں جو کسی قسم کا شور و شر کر سکیں۔''

علی شوریدہ نے بے چینی سے پوچھا۔ ''مثلاً کیا؟''

حمیدالدین نے جواب دیا۔ ''تم اپنے گھر میں کہیں روپوش ہو جاؤ اور اپنے آدمیوں کو سختی سے منع کر دو کہ وہ مولانا کو تمہاری بابت کچھ بھی نہ بتائیں۔''

علی شوریدہ کو اس تجویز نے اور پریشان کر دیا کیونکہ اس کے خیال میں یہ بڑی پھسپھسی تدبیر تھی اور مولانا پر اس کا کوئی شدید ردِعمل کس طرح ہو سکتا تھا۔

حمیدالدین نے مزید کہا۔ ''علی شوریدہ، تو اس گھر کا مالک ہے۔ تو کیوں خوف زدہ ہو رہا ہے؟''

علی شوریدہ نے جواب دیا۔ ''اگر میں مولانا سمرقندی سے ملاقات بھی نہ کروں تو کیا اس طرح یہ فتنہ دب جائے گا؟''

حمیدالدین نے جواب دیا۔ ''ایسا یوں ممکن ہے کہ مولانا عالم ہیں، معاشرتی آداب سے واقف ہیں۔ ان کی یہ مجال نہیں کہ صاحبِ خانہ کی اجازت کے بغیر اندر داخل ہوں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو میں ان سے مواخذہ کروں گا۔''

خواجہ بختیار کا کیؒ اس تجویز سے بہت خوش ہوئے فرمایا۔ ''حمیدالدین صحیح کہتا ہے۔''

اسی وقت ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور عرض کیا۔ ''علی! تجھ کو مولانا سمرقندی بلا رہے ہیں۔''

علی شوریدہ نے اس شخص کو الگ لے جا کر سمجھایا۔ ''جا مولانا سے کہہ دے کہ میں علی شوریدہ کو تلاش کر رہا ہوں جیسے ہی ملیں گے ملوا دوں گا۔''

اس شخص نے یہی جواب مولانا کو پہنچا دیا۔ مولانا نے جز بز ہو کر فرمایا۔ ''جا اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کر، علی شوریدہ کو تلاش کر کے میرے پاس لے آ۔''

یہ شخص دوبارہ اندر داخل ہوا۔ اس وقت تک علی شوریدہ نے واقعی خود کو روپوش کر لیا تھا۔ وہ شخص بڑی دیر تک علی کو تلاش کرتا رہا اور ناکام ہونے کے بعد مولانا کو مطلع کر دیا۔ ''مولانا! گھر میں تو علی شوریدہ کا کہیں پتا نہیں، اگر وہ کہیں باہر ہوں گے تو آپ تو دروازے پر موجود ہی ہیں۔ یہیں ملاقات ہو جائے گی۔''

مولانا نے اس شخص کو بہت غور سے دیکھا۔ انہیں اس جواب پر یقین نہیں آ رہا تھا، بولے۔ ''کہیں تو جھوٹ تو نہیں بول رہا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''مولانا! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کے عرض کر رہا ہوں کہ میں نے علی شوریدہ کو بہت تلاش کیا اور ناکام ہو کر آپ کے پاس واپس آ گیا۔''

مولانا کے پرستار یہ گفتگو سن رہے تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر درخواست کی۔ ''حضرت! آپ ہمیں حکم تو دیں، ہم دروازے توڑ کر اندر گھس جائیں گے اور پوری محفلِ خرافات کو درہم برہم کر کے رکھ دیں گے۔''

مولانا نے فرمایا۔ ''تم لوگ نادان ہو، بات کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر ہم اس گھر میں جبراً داخل ہوئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

ایک عمر رسیدہ شخص نے پوچھا۔ ''حضرت! وہ کس طرح؟''

مولانا نے جواب دیا۔ ''اندر دو جید ترین ہستیاں موجود ہیں۔ حمید الدین اور قطب الدین۔ اگر میں اس گھر میں صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر داخل ہوا تو اس کا مجھ سے بڑا سخت مواخذہ ہوگا اور میں قاضی اور بادشاہ کے روبرو کوئی صفائی بھی پیش نہیں کر سکوں گا۔''

ایک پرستار نے پوچھا۔ ''تو حضرت اب کیا ہوگا؟''

مولانا سمر قندی نے جواب دیا۔ ''ہمیں صاحب خانہ کے باہر آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔''

اندر سے قوالوں کی آوازیں آرہی تھیں اور مولانا سمر قندی اپنے ساتھیوں سمیت بے دست و پا کھڑے صاحب خانہ کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد پھر کسی نے کہا۔ ''علی شوریدہ کہاں ہے، اس کو بلواؤ۔''

اس بار پھر وہی جواب ملا۔ ''وہ گھر میں موجود نہیں ہیں۔''

مولانا سمر قندی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''میں علی شوریدہ کی غیر حاضری اور عدم موجودگی کا مفہوم سمجھ چکا ہوں۔ حمید الدین اور قطب الدین نے بڑی خوب صورتی سے مجھے ناکام کر دیا ہے، اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔''

یہ لوگ اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ کئی دن بعد مولانا سمر قندی نے حمید الدین سے ملاقات کی اور سماع کی شب والا واقعہ بیان کر کے کہا۔ ''شیخ! آپ نے غضب کی ترکیب اختیار کی تھی۔''

حمید الدین نے جواب دیا۔ ''مولانا! مزاج میں کچھ نرمی بھی پیدا کیجیے۔ محض پیچ و تاب سے کام نہیں چلتا۔ انسان میں سوز و ساز بھی ہونا چاہیے۔''

حمید الدین میں تحمل اتنا تھا کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ان کے ہم عصروں میں علماء کا ایک طبقہ بھی تھا جو بحری کہلاتا تھا۔ یہ علماء بھی اپنے عقائد اور مسلک میں نہایت سخت بلکہ پتھر تھے۔ ان میں مولانا شرف الدین بحری کا نام سب سے نمایاں تھا۔

مولانا شرف الدین بحری کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ حمید الدین نے سنا تو بے چین ہو گئے۔ آپ کے مریدوں کو آپ کے ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے مولانا بحری کے پاس جانے سے منع کیا۔ ایک مرید نے عرض کیا۔ ''آپ اگر مولانا اشرف الدین کی عیادت کے لیے جانا چاہتے ہیں تو جائیں لیکن اگر اس سلسلے میں ہم مریدوں کی رائے لیں گے تو ہر کسی کو اس سے اختلاف ہوگا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''مریض کی عیادت کو جانا سنتِ نبوی ﷺ ہے اور میں اس سنت کو ترک نہیں کر سکتا۔''

کسی دوسرے مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! خطرہ اس بات کا ہے کہ مولانا شرف الدین آپ کو اپنے پاس نہیں آنے دیں گے۔ دروازے پر سے ہی واپس کر دیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''وہ ان کا اپنا فعل ہوگا لیکن میں اپنے نیک فعل سے کیوں باز رہوں۔''

اس مرید نے کہا۔ ''حضرت! جہاں تک مجھے معلوم ہے مولانا شرف الدین بحری آپ سے نفرت و عناد کے معاملے میں مولانا سمر قندی سے بھی آگے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''وہ کچھ بھی سہی لیکن میں مولانا کی عیادت کو ضرور جاؤں گا۔''

مرید خاموش ہو گئے۔ آپ مولانا کی عیادت کو چلے گئے۔ مولانا بحری کے در پر ان کے پرستاروں کا ہجوم تھا۔ انہوں نے شیخ حمید الدین کو پہچان لیا اور انہیں دروازے پر ہی روک لیا، بولے۔ ''شیخ! ہمیں پہلے مولانا سے آپ کے سلسلے میں اجازت حاصل کرنا ہوگی، آپ یہیں باہر ہی ٹھہریں۔''

آپ دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ اندر کسی عقیدت مند نے مولانا کو مطلع کیا۔ ''حضرت! شیخ حمید الدین آپ کی عیادت کو حاضر ہوئے ہیں۔ اندر آنا چاہتے ہیں، آپ کا کیا حکم ہے؟''

مولانا سوچ میں پڑ گئے، کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ''نہیں، انہیں اندر نہ آنے دیا جائے۔''

جب شیخ کو مولانا کے فیصلے سے مطلع کیا گیا تو انہوں نے کہا۔ ''براہِ کرم مولانا سے یہ معلوم کیا جائے کہ وہ مجھے کیوں روک رہے ہیں؟''

اس سوال کے جواب میں مولانا نے جواباً کہلوا دیا۔ ''شیخ حمید الدین چونکہ سماع سنتے ہیں جو کسی طور پر جائز نہیں، اس کے علاوہ یہ صوفی لوگ خدا کو محبوب کہتے ہیں جو انتہائی گستاخی ہے۔ اس لیے میں اللہ کے اس گستاخ بندے کی شکل دیکھنا بھی کفر سمجھتا ہوں۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''مولانا کی مرضی۔ میں نے سنتِ نبوی ﷺ ادا کر دی لیکن افسوس کہ میں مولانا کی مرضی کے خلاف ان کے گھر میں کس طرح داخل ہو سکتا ہوں۔''

بعد میں علماء نے شیخ کے خلاف ایک محاذ بنا لیا اور ان لوگوں نے شیخ حمید الدین اور سماع کے خلاف ایک فتویٰ تیار کیا اور اس پر

ان سب کے دستخط لیے گئے۔ اس عہد میں ایک مشہور فقیہہ مولانا داؤد تبریزی تھے۔ مولانا، شیخ کی لیاقت اور علمی مقام سے آگاہ تھے لیکن علماء کے دباؤ میں آکر انہوں نے بھی اس فتوے پر لکھ دیا۔ ''مرقوم داشتہ درست است۔''

شیخ پر اس فتوے کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ جس حال اور جس روش پر تھے قائم رہے۔

مولانا داؤد تبریزی کسی فقہی مسئلے پر شیخ کی رائے لینے کے لیے حاضر ہوئے تو شیخ نے ان سے شکایت کی اور کہا۔ ''مولانا! آپ تو واقف ہیں کہ میں فقہی اور مذہبی امور میں کیا مقام رکھتا ہوں۔''

مولانا نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''حضرت! ایک میں ہی کیا ایک زمانہ آپ کے علمی تجربے کا قائل ہے۔''

شیخ نے کہا۔ ''پھر آپ نے اس فتوے پر دستخط کیوں کیے؟''

مولانا نے ندامت سے جواب دیا۔ ''شرما حضوری اور جبر سے۔ مجھے علماء نے مجبور کر دیا تھا۔''

شیخ نے غصے میں کہا۔ ''تمام علماء کا یہی حال ہے کہ شرما حضوری، جبر اور حسد سے غلط سلط فتوے دے کر اپنی عاقبت خراب کرتے رہتے ہیں۔ وہ تمام علماء علمی سطح پر اتنے ہیں کہ ابھی گویا اپنی ماؤں کے پیٹ سے باہر نہیں آئے اور آپ مولانا داؤد! ان میں آپ کی حیثیت بس اتنی ہے کہ پیدا تو ہو گئے ہیں مگر ابھی اتنی طاقت نہیں آئی کہ ماں کا دودھ بھی پی سکیں۔ مولانا! اخلاقی جرأت پیدا کیجیے اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح قرار دینے کا مذموم سلسلہ بند کر دیجیے۔''

مولانا سر جھکائے سنتے رہے آخر میں کہا۔ ''شیخ! میرا وعدہ کہ آئندہ میں خود کو ان علماء سے الگ ہی رکھوں گا۔ بس اس بار آپ مجھ کو معاف کر دیجیے۔''

شیخ نے انہیں معاف کر دیا لیکن مولانا تبریزی ان سے زندگی بھر آنکھ نہ ملا سکے۔

☆☆☆

بظاہر تو شیخ کے پرستاروں کی خاصی بڑی تعداد تھی اور ان میں کے اکثر خود کو شیخ کا مرید بھی ظاہر کرتے تھے مگر خود شیخ کا یہ حال تھا کہ کسی کو مرید نہیں کرتے تھے۔ پوری زندگی میں صرف تین کو مرید بنایا۔ ان میں کے ایک شیخ احمد نہروالی بدایونی، دوسرا عین الدین قصاب اور تیسرا شیخ شاہی رسن تاب بدایوانی تھے۔ آپ نے ان تینوں کو جن بلند مراتب تک پہنچا دیا اور اپنے کمالات ان میں جس حد تک منتقل کر دیے، اس عہد کا ہر پاک باطن اس سے واقف تھا۔ آپ خود تو کرامات اور خرقِ عادت کا مظاہرہ نہ فرماتے مگر آپ اپنے تینوں مریدوں کے ذریعے بہت کچھ دکھا دیتے۔

شیخ احمد نہروالی کپڑا بننے کا کام کرتے تھے۔ ایک شب ان کے گھر میں ایک چور داخل ہوا۔ پورے گھر کی تلاشی لینے کے بعد جب وہ مایوس ہو گیا تو واپسی کی نیت سے دروازے کی طرف چلا۔ شیخ احمد نے اس کا راستہ روک لیا اور آہستہ سے کہا۔ ''خالی ہاتھ مت جاؤ۔''

چور گھبرایا کہ پکڑا گیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ چور نے خوشامد کی۔ ''حضرت! اس بار آپ مجھے معاف فرما دیں، آئندہ میں کبھی چوری نہیں کروں گا۔''

شیخ احمد نے فرمایا۔ ''میں نے تجھے پکڑا ہی کب ہے۔ میں نے تجھے اس لیے روک لیا ہے کہ تو یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہ جائے اس گھر میں تجھے کچھ بھی نہیں ملا، بس وہ کپڑا جو میں بُن چکا ہوں بمشکل دس بارہ گز ہوگا اس کو لیتا جا۔''

چور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن جب دس بارہ گز کپڑا اس کے حوالے کر دیا گیا تو وہ حیران رہ گیا۔ شرم و ندامت سے وہاں رکنا محال ہو گیا، کپڑا لے کر فرار ہو گیا۔

دوسرے دن شیخ احمد کے در پر ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی اور بچے بھی جوان بھی بوڑھے بھی۔ انہی میں رات والا چور بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں رات کا کپڑا بھی تھا۔

آپ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

چور نے جواب دیا۔ ''حضرت! رات کو تو میں شرم و ندامت سے بھاگ کھڑا ہوا تھا لیکن اس وقت میں اپنے پورے خاندان کے ساتھ حاضر ہو گیا ہوں، میں تائب ہونے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے پورے خاندان کو اپنا مرید بنا لیں۔''

آپ نے قدرے تامل سے فرمایا۔ ''سوچ لے، یہ بڑی دشوار راہ ہے۔''

چور نے جواب دیا۔ ''میں چوری کرتا رہا ہوں، یہ راہ بھی دشوار تھی۔''

آپ نے متبسم ہو کر ان سب کو اپنا مرید کر لیا اور چور نے زہد و ریاضت میں وہ مقام حاصل کر لیا کہ ایک مثالی انسان قرار پایا۔

جب حمید الدین کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو فرمایا۔ ’’شیخ احمد میں میرا فیضان جاری ہے، ایک زمانہ اس سے فیض پائے گا۔‘‘
شیخ احمد کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جب یہ جامع مسجد تشریف لے جاتے تو ان کے ساتھ مریدوں کا ایک ہجوم ہوتا۔ درویش علی شوریدہ جب یہ منظر دیکھتے تو شرما کر پوچھتے۔ ’’شیخ احمد! آپ کے پیر مرشد نے تو اتنے مرید نہیں بنائے۔ آپ نے ایسا کیوں کیا اور مریدوں کو ساتھ لے کر چلنے میں کیا مصلحت ہے؟‘‘
شیخ احمد نے جواب دیا۔ ’’مجھ کو پیر مرشد نے بہت زیادہ مرید کرنے سے منع بھی نہیں کیا ہے اور رہا اس سوال کا جواب کہ میں اتنے سارے مریدوں کو ساتھ لے کر کیوں چلتا ہوں، کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھائے رکھتا ہوں۔‘‘
ان باتوں کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ شیخ احمد نے ایک جگہ کسی شخص کو ترک سپاہی کے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اس ترک کو منع کیا کہ اس شخص کو نہ مارے۔ لیکن ترک نہیں مانا۔ آپ نے فرمایا۔ ’’خدا نے حکم دیا ہے کہ برائی کو جبراً روک دیا جائے۔ اب میں اس پر مجبور ہوں کہ تجھ کو ظلم سے جبراً باز رکھوں۔‘‘
ترک سپاہی نے پوچھا۔ ’’وہ کس طرح؟‘‘
آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ مظلوم کو اپنے گھیرے میں لے لو اور اس ترک کا ہر وار خود جھیلو۔ خبردار جو اس غریب کو ہلکی سی ضرب بھی آئے۔
مریدوں نے اس پر حرف بہ حرف عمل کیا اور ترک سپاہی کو مجبور اور بے بس کر دیا۔
اتفاق کی بات کہ اسی وقت ادھر سے علی شوریدہ کا گزر ہوا علی شوریدہ ایک با اثر شخص تھا۔ اس نے یہ منظر جو دیکھا تو شیخ احمد سے پوچھا۔ ’’شیخ احمد یہ معاملہ کیا ہے؟‘‘
شیخ احمد نے پورا واقعہ سنایا تو علی شوریدہ نے ترک سپاہی کو ڈانٹ پھٹکار کے بھگا دیا اور بعد میں شیخ احمد سے کہا۔ ’’حضرت! آپ نے اپنے مریدوں سے کام خوب لیا۔‘‘
شیخ احمد نے جواب دیا۔ ’’اس لیے میں اپنے مریدوں کو اپنے ساتھ لیے پھرتا ہوں۔‘‘
علی شوریدہ اپنے سابقہ سوال کا جواب پا کر بہت لطف اندوز ہوا اور فرطِ مسرت سے مسکرانے لگا۔

☆☆☆

شیخ حمید الدین کے دوسرے مرید شیخ عین الدین قصاب تھے۔ انہیں بھی شیخ حمید الدین نے یہ دعا دی تھی کہ دوسروں کے کام آؤ اور ان کی حاجتیں پوری کرو۔
شیخ عین الدین قصاب کو اتنا بلند مقام حاصل تھا کہ شیخ نظام الدین اولیا بھی ان کی صحبت میں رہنے کو اپنے حق میں مفید سمجھتے تھے۔
اسی عہد کے ایک مشہور شخص قاضی فخر الدین قاطلہ نے شیخ حمید الدین کے پاس جانا شروع کر دیا۔ شیخ نے ان سے کہا۔
’’فخر الدین! تم جو کچھ چاہتے ہو اسے شیخ عین الدین کی صحبت میں رہ کر حاصل کر لو۔‘‘
فخر الدین نے عرض کیا۔ ’’حضرت! وہ تو آپ کے مرید ہیں، ان سے مجھے کیا ملے گا؟‘‘
شیخ نے جواب دیا۔ ’’تقسیم کا کام میں نے اپنے تینوں مریدوں کو دے رکھا ہے، میں براہ راست کچھ بھی نہیں دیتا۔‘‘
فخر الدین یہاں سے اٹھ کر شیخ عین الدین قصاب کی خدمت میں پہنچ گئے۔ عین الدین انہیں دیکھ کر مسکرائے اور کہا۔ ’’اچھا تو تم اپنے آپ سے یہاں نہیں آئے۔‘‘
فخر الدین نے عرض کیا۔ ’’حضرت! میں کوئی روشن ضمیر تو ہوں نہیں، کسی راہنمائی کے بغیر میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔‘‘
شیخ عین الدین نے کہا۔ ’’اچھا تو تم پابندی سے میرے پاس آیا کرو۔‘‘
فخر الدین کے جی میں آئی کہ کہہ دیں۔ حضرت! میں تو آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں لیکن شرم دامن گیر رہی اور یہ کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ بس آتے اور ان کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر سکون و طمانیت حاصل کرتے۔ سوچتے کہ دیکھیے کب گوہرِ مراد حاصل ہوتا ہے۔
ایک دن اچانک شیخ عین الدین نے فخر الدین کو آواز دی۔ ’’فخر الدین کہاں چلے گئے؟‘‘
فخر الدین ذرا فاصلے پر موجود تھے۔ بھاگتے ہوئے آئے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ مؤدبانہ عرض کیا۔ ’’غلام حاضر ہے۔‘‘
شیخ عین الدین نے پوچھا۔ ’’میں پوچھتا ہوں کیا تم میرے پاس بے غرضی سے رہ رہے ہو؟‘‘

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں کیا عرض کروں پہلے تو میں آپ کے پیر مرشد کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے آپ کے پاس بھیج دیا۔ اب مزید آگے کیا عرض کروں۔''

شیخ عین الدین نے کہا۔ ''بات مختصر کرو تم چاہتے کیا ہو؟''

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''میں کسی شہر کا قاضی بننا چاہتا ہوں۔''

شیخ نے کہا۔ ''پیر مرشد نے بڑی ذمے داریاں دے رکھی ہیں، جاؤ تمہیں قاضی مقرر کر دیا گیا ہے۔''

فخرالدین نے غیر یقینی سے پوچھا۔ ''کہاں جاؤں؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں کہہ رہا ہوں جاؤ۔ تمہارے گھر پر پروانہ تقرری پہنچ چکا ہے۔''

فخرالدین افتاں وخیزاں گھر پہنچے تو واقعی ان کے نام قاضیِ شہر بنائے جانے کا پروانۂ تقرری آ چکا تھا۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ فخرالدین کے دوستوں نے انہیں مبارک بادیاں دیں۔ ایک دوست نے پوچھا۔

''فخرالدین! تم قاضیِ شہر بنا دیے گئے، یہ بڑا مشکل کام تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تم نے کس بااثر شخص کی سفارش حاصل کی تھی؟''

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''کسی کی بھی نہیں۔''

دوست نے کہا۔ ''میں مان نہیں سکتا۔ اتنا بڑا کام کسی سفارش اور وہ بھی بہت بڑی سفارش کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ جس دنیا میں تم رہتے ہو، اس میں، میں بھی رہتا ہوں۔ وہ ذریعہ اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو تمہاری مرضی۔''

فخرالدین نے کہا۔ ''دوست! اس میں ایک مردِ حق آگاہ کی سفارش کارفرما ہی ہے۔''

اس کے بعد پوری روداد سنا دی۔ دوست کسی سوچ میں پڑ گیا فخرالدین نے پوچھا۔ ''کیا سوچنے لگے دوست؟''

دوست نے جواب دیا۔ ''کیا یہ سب کچھ درست ہے...... میں کس طرح یقین کروں؟''

فخرالدین نے کہا۔ ''میں نے جو کچھ بتایا ہے نہ تو اس میں مبالغہ ہے نہ شمّہ برابر جھوٹ۔ اگر تم یقین نہیں کرتے تو نہ کرو، اس سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

دوست نے پوچھا۔ ''اگر میں شیخ عین الدین کے پاس جانا چاہوں تو کیا مجھے بھی پہلے ان کے پیر مرشد کے پاس جانا پڑے گا؟''

فخرالدین نے جواب دیا۔ ''مناسب تو یہی ہے ویسے تمہاری مرضی۔''

دوست فخرالدین کے پاس سے اٹھ کر شیخ حمیدالدین کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آپ نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ یہ شخص بھی چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد شیخ نے اپنے پرستاروں سے کہا۔ ''اللہ والوں کی حالت بھی معالجین جیسی ہوتی ہے۔ جب کسی مریض کو اپنے معالج سے حیرت انگیز فائدہ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ فرطِ جوش میں ہر جگہ اپنے معالج کی تعریفیں کرتا پھرتا ہے۔'' اس کے بعد اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ غرض مند بھی کسی کا بھیجا ہوا یہاں آیا ہے۔''

اس شخص نے بڑی عاجزی سے درخواست کی۔ ''حضرت! اگر آپ اجازت دیں گے تو میں شیخ عین الدین قبلہ کی خدمت میں چلا جاؤں گا۔ اگر منع فرمائیں گے تو چپ ہو رہوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو جا سکتا ہے۔ عین الدین تیرا کام بھی کر دے گا۔''

یہ شخص ادب سے بدستور بیٹھا رہا، آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ''اب یہاں کیوں بیٹھا ہے جاتا کیوں نہیں؟ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہا ہے؟''

یہ شخص اٹھا اور سیدھا عین الدین کے پاس پہنچ گیا۔ عین الدین نے دیکھتے ہی کہا۔ ''اچھا تو تو بھی سفارش لے کر آ گیا۔''

اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! مجھے یہاں آنے کی اجازت دی گئی ہے تو میں آیا ہوں ورنہ ہرگز نہ آتا۔''

عین الدین نے کہا۔ ''تب پھر چپ چاپ کان دبائے پڑا رہ مجھ سے کیا۔''

یہ شخص فخرالدین سے زیادہ چپکو ثابت ہوا۔ شب و روز ان کی خدمت میں رہنے لگا۔ ایک دن عین الدین نے پوچھا۔ ''کیا تیرا گھر بار نہیں ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''سرِدست تو میرا کوئی گھر بار نہیں۔ میں نے تو حضرت کے اس آستانے ہی کو اپنا گھر سمجھ لیا ہے۔''

عین الدین نے تیوری چڑھا کے کہا۔ ''خوب! یہ کیسی زبردستی ہے کہ میرے آستانے ہی کو اپنا گھر کہنے لگا۔ یہ تو بتا تو میرا اچھا

کس طرح چھوڑے گا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔''حضرت! اب میں خود کیا عرض کروں۔ میں کیا چاہتا ہوں، یہ بھی آپ کو بتانا پڑے گا؟''

عین الدین نے منہ بنا کر کہا۔'' کیسے کیسے خطرناک لوگ آجاتے ہیں۔ اپنا مطلب تک بیان نہیں کرنا چاہتے۔''

اس شخص نے بچوں کی طرح مچل کر عرض کیا۔''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں اپنی زبان سے کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔ مجھ کو تو اس پر ناز ہے کہ میں خود سے نہیں آیا آپ کے پیر مرشد سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ اگر میں یہاں سے بے نیل و مرام واپس ہوا تو سیدھا آپ کے پیر مرشد کے پاس پہنچ جاؤں گا اور کہہ دوں گا کہ جس کے پاس آپ نے بھیجا تھا اس نے خالی ہاتھ واپس کر دیا۔''

عین الدین نے کہا۔''اچھا اب تو اپنے گھر جا، وہاں امیر داد کے منصب کا پروانہ تقرری تیرا انتظار کر رہا ہے۔ شاید تو چاہتا بھی یہی تھا۔''

اس شخص کی فرطِ جذبات سے حالت غیر ہوگئی۔ بے اختیار اٹھ کر اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ وہاں منصبِ امیر داد کا پروانہ تقرری واقعی اس کا منتظر تھا۔

ان دونوں واقعات نے بڑی شہرت حاصل کی اور غرض مند لوگ ان دونوں کے پاس پہنچنے لگے۔ یہ لوگ شیخ عین الدین کے پاس جانے اور ان سے اپنی مطلب برآری کا طریقہ کار معلوم کرنے لگے۔ ان دونوں نے ایک ہی طریقہ کار اختیار کیا تھا، انہیں ڈر محسوس ہوا کہ اگر ان کے بھیجے ہوئے لوگوں میں ایسے لوگ بھی شیخ عین الدین کی خدمت میں پہنچنے لگے جن کی خواہشات ادنیٰ اور سفلہ ہوئیں تو کتنی شرمناک بات ہوگی۔ ان دونوں نے ہر ایک کو ٹالنا شروع کر دیا۔

انہی غرض مندوں میں مولانا وجیہہ الدین نامی ایک شخص بھی شامل تھے۔ یہ بھی قاضی فخر الدین کے پاس پہنچے اور اپنا مدعا بیان کیا۔

قاضی فخر الدین نے ہچکچاتے ہوئے عرض کیا۔''مولانا! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں شیخ مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں۔''

مولانا وجیہہ الدین نے کہا۔''قاضی صاحب! میں جو مقصد لے کر ان کے پاس جاؤں گا، اس سے آپ کے شیخ بھی خوش ہو جائیں گے۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔''

قاضی فخر الدین نے ساری تفصیل بتادی اور کہا۔'' جب تک پیر مرشد شیخ حمید الدین وہاں جانے کی اجازت نہ دے دیں، آپ نہ جایئے گا۔ یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔''

مولانا نے جواب دیا۔''آپ مطمئن رہیں، نہ تو میں خود شرمندہ ہونا چاہتا ہوں اور نہ ہی آپ کو شرمندگی سے دوچار کرنا چاہتا ہوں۔''

قاضی صاحب نے فرمایا۔''تب پھر آپ خدا کا نام لے کر چلے جایئے۔ خدا آپ کو کامیاب کرے۔''

مولانا یہاں سے اٹھ کر شیخ حمید الدین کے پاس پہنچے۔ شیخ نے مولانا کو دیکھتے ہی متبسم ہو کر فرمایا۔''آیئے مولانا! مجھے آپ کا ہی انتظار تھا۔ واللہ آپ دونوں سے افضل ہیں۔''

مولانا نے انکساری سے عرض کیا۔''حضرت! میں کیا ہوں شاید کچھ بھی نہیں۔ ہاں اگر آپ کی نظرِ کرم ہوگئی تو شاید کچھ ہو جاؤں۔''

شیخ نے فرمایا۔''آپ اسی وقت عین الدین کے پاس تشریف لے جائیں، وہ آپ پر پوری توجہ دے گا۔ اس سے فرمایئے گا کہ میں نے آپ کو اصرار کر کے بھیجا ہے۔''

مولانا کچھ دیر شیخ کی صحبت میں موجود رہے، اس کے بعد شیخ عین الدین کی خدمت میں پہنچ گئے۔ عین الدین بھی انہیں دیکھ کر مسکرائے، بولے۔''مولانا! آپ نے یہاں آنے میں دیر کیوں کردی؟''

مولانا نے جواب دیا۔''شیخ! میں نے کیا دیر کی جب حکم ربی ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔''

شیخ عین الدین نے فرمایا۔''اچھا، آپ آئے تو ہیں اپنی مرضی سے لیکن واپس جائیں گے میری مرضی سے۔ آپ کچھ عرصے میرے پاس ضرور رہیں گے۔''

مولانا نے جواب دیا۔''حضرت! آپ کچھ عرصے کی بات کر رہے ہیں، میں پوری زندگی آپ کی صحبت میں بسر کر دینا چاہتا ہوں۔''

عین الدین نے فرمایا۔''مولانا! آپ جو منصب چاہتے ہیں وہ بھی عظیم ہے، آپ فکر نہ کریں۔''

مولانا وجیہہ الدین شیخ عین الدین کی خدمت میں رہنے لگے۔ پہلی ملاقات کے بعد تو مولانا کو یہ محسوس ہونے لگا کہ شاید شیخ نے انہیں بالکل ہی بھلا دیا ہے، وہ دوسروں سے ہمکلام بھی ہوتے مگر مولانا سے کوئی بات نہ کرتے۔ مولانا کو اس صورتِ حال سے

وحشت ہونے لگی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔ کبھی سوچتے شیخ سے عرضِ حال کیوں نہ کر دیا جائے۔ کبھی یہ سوچتے کہ کیوں نہ ایک بار پھر ان کے پیر مرشد کی صحبت میں جا کے ان سے کچھ کہلوا دیا جائے۔ مولانا انہی وسوسوں میں گرفتار تھے کہ ایک دن شیخ عین الدین نے انہیں آواز دی۔ ''مولانا! ذرا تشریف تو لائیں میرے پاس۔''

مولانا کا دل دھڑکنے لگا۔ عجلت میں ان کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ ''حضرت! خیریت تو ہے؟''

شیخ نے ناگواری سے کہا۔ ''مولانا! یہ کن وسوسوں میں مبتلا رہنے لگے ہو۔ بخدا میں تمہاری عزت کرتا ہوں اور تم معلوم نہیں کیا سوچتے رہتے ہو۔ تم پڑھے لکھے معقول آدمی ہو اور اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہو کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ میں اس کا انتظار کر رہا تھا اور تم اپنا گوہرِ مراد بہ تعجیل حاصل کرنے کی فکر میں تھے۔''

مولانا نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''میں شرمندہ ہوں، مجھ کو معاف کر دیجیے۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''اچھا، اب آج مجھے بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

مولانا پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ''یعنی حضرت! اب آج میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔''

شیخ نے برہمی سے کہا۔ ''یہ حیرت سے دیدے کیوں پھاڑ رہے ہو؟ میں علم غیب تو نہیں جانتا کہ تمہارے بتائے بغیر ہی تمہارا مطلب پالوں۔''

مولانا نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ علم غیب تو نہیں رکھتے لیکن روشن ضمیر تو ہیں۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو، اپنا مطلب بیان کرو۔''

مولانا نے کہا۔ ''حضرت! میں چاہتا ہوں کہ عالم ربانی ہو جاؤں۔ بے مثل اور عدیم النظیر عالم ربانی۔ دور دور تک میرے علم کا شہرہ ہو اور اس سے میں اسلام کے فروغ اور احیاء کی خدمت انجام دے سکوں۔''

شیخ نے فرمایا۔ ''بس یا اور کچھ؟''

مولانا نے جواب دیا۔ ''میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

شیخ نے کہا۔ ''تب پھر میرے پاس کیوں پڑے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔''

مولانا نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''تو میں کچھ لیے بغیر ہی چلا جاؤں؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''مولانا! آدمی خوب ہو تم۔ تم نے جو کچھ مانگا تھا وہ دے دیا گیا۔ اب یہ تکرار کیسی؟ جاؤ اپنا کام کرو جا کر۔''

مولانا انہیں سلام کر کے اپنے گھر چلے گئے اور اسی دن سے انہوں نے اپنے آپ میں حیرت انگیز تبدیلیاں محسوس کرنا شروع کر دیں۔ انہیں ایسا لگنے لگا گویا علم ان پر القا ہو رہا ہے، علوم کے مخفی اور دقیق گوشے اس طرح آشکار ہونے لگے گویا ان میں کبھی دقائق اور اسرار تھے ہی نہیں۔ مولانا وجیہہ الدین بہت جلد عالم ربانی کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔

☆☆☆

شیخ حمید الدین کے تیسرے مرید شیخ شاہی رن تاب بدایونی تھے۔ آپ نے انہیں بدایوں بھیج دیا تھا۔ ان پر بھی اپنے پیر مرشد کی خاص نظر رہتی تھی۔ یہ رسیاں بٹا کرتے تھے، یہی ان کا کسبِ معاش تھا۔ ان کا کشف بھی بے حد مشہور تھا۔ شیخ حمید الدین بدایوں اور اس کے قرب و جوار کے لوگوں کو شیخ شاہی کے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور فخریہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے اس مرید اور خلیفہ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کوئی دانستہ یا نادانستہ انہیں دھوکا دینا بھی چاہے گا تو شیخ شاہی اپنے کشف سے اس سے واقف ہو جائیں گے۔

ایک شخص شیخ حمید الدین کے پاس سے چل کر بدایوں پہنچا اور شیخ شاہی کی صحبت میں اس لیے رہنے لگا کہ وہ کسی موقع پر شیخ شاہی کا امتحان ضرور لے گا اور یہ دیکھے گا کہ آخر وہ کس طرح اپنے کشف کے ذریعے کسی دھوکے سے مطلع ہو جاتے ہیں۔

شیخ شاہی نے اس کو اپنے مریدوں میں داخل کر لیا اور اس پر خاص نظرِ کرم رہنے لگی۔ سفر و حضر میں یہ شخص آپ کے ساتھ ہی رہتا۔ آپ اس سے اکثر فرماتے رہتے کہ دیکھو کسی فقیر کا امتحان نہ لینا کیونکہ اس میں تمہیں بھی پریشانی اٹھانا پڑے گی اور فقیر کو بھی اذیت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

وہ شخص جواب دیتا۔ ''میری یہ مجال کہ میں کسی فقیر کا امتحان لوں، توبہ توبہ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

شیخ شاہی نے کہا۔ ”میں نے جو بات کہی ہے، وہ ایک نہ ایک دن سچ ثابت ہو جائے گی۔“

چند ماہ بعد شیخ شاہی اپنے مریدوں کے ساتھ ایک باغ میں قیام فرما تھے۔ ان میں وہ شخص بھی شامل تھا جس سے امتحان اور آزمائش کی باتیں ہو چکی تھیں۔ شیخ شاہی نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ آج کھیر کھانے کو جی چاہتا ہے، تیار کرو۔

حکم کی دیر تھی، تین مرید کھیر پکانے میں مشغول ہو گئے اور ان میں وہ شخص بھی شامل تھا۔

جب کھیر تیار ہو گئی تو آپ اپنے درویشوں کے ساتھ کھیر کھانے بیٹھ گئے۔ ابھی کھیر کا پہلا ہی چمچہ منہ میں ڈالا تھا کہ ہاتھ رک گیا اور اپنے مریدوں سے کہا۔ ”وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے کھیر پکائی ہے؟“

مریدوں نے کھیر پکانے والے تینوں ساتھیوں کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

آپ نے ان سے کہا۔ ”دوستو! میں نے کھیر چکھی تو پہلے ہی لقمے میں مجھے محسوس ہو گیا کہ اس میں خیانت ہوئی ہے۔“

اس شخص نے جس سے کچھ باتیں ہو چکی تھیں جواب دیا۔ ”خیانت سے آپ کی کیا مراد ہے؟ میں سمجھا نہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ کہ کھیر کا کچھ حصہ پہلے ہی کھایا جا چکا ہے۔ یہ بعد میں ہمارے پاس لائی گئی۔“

اس شخص نے انکار کیا۔ ”حضرت! ایسا نہیں ہوا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔“

آپ نے اصرار کیا۔ ”دیکھ تو سوچ لے، میں نے کھیر کو چکھتے ہی خیانت کی بو سونگھ لی ہے۔“

اس شخص نے اپنے ذہن پر زور دیا اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں نے کھیر تو نہیں کھائی مگر جب میں دودھ پکا رہا تھا تو وہ میری غفلت سے ابل کر ادھر ادھر گرنے لگا تھا۔ میں نے اس کو ضائع نہیں ہونے دیا اور تھوڑا سا پی لیا تھا۔“

شیخ شاہی نے فرمایا۔ ”یہ صریحاً خیانت ہے۔“

خطا کار نے عرض کیا۔ ”حضرت! اب تو غلطی ہو ہی گئی جو سزا تجویز فرمائیں گے، میں بھگتنے کو تیار ہوں۔“

شیخ نے حکم دیا۔ ”اس کو دھوپ میں کھڑا کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ یہ پسینے میں نہا جائے اور جتنا دودھ پیا ہے اس کے لگ بھگ اس کا پسینا بہہ جائے۔“

اس شخص کو دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا اور ذرا۔۔۔ دیر بعد ہی اس کے جسم سے پسینا بہہ نکلا۔

کچھ دیر بعد آپ نے اس کو سائے میں بلا لیا اور ایک مرید کو حکم دیا کہ جا کسی حجام کو بلا لا۔

چنانچہ ایک حجام بھی حاضر کر دیا گیا۔ آپ نے حجام کو حکم دیا۔ ”میں نے خیانت کے جرم میں اپنے ایک دوست کو دھوپ میں کھڑا کر کے پسینے سے شرابور کر دیا تھا۔ اب میں دوستی کے ناتے سے اپنے جسم سے اتنا ہی خون نکلوانے کو تیار ہوں۔“

مریدوں کو حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔ حجام کو اس حکم کی تعمیل میں تامل تھا۔

آپ نے سختی سے فرمایا۔ ”میں نے تجھے جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل کر۔“

آخر آپ نے اس کو بالکل مجبور کر دیا۔ حجام نے استرے اور نہرنی سے آپ کے جسم کے کئی حصوں کو نشتر لگا لگا کر لہولہان کر دیا۔ آپ کے کپڑے تر ہو گئے اور زمین کی مٹی تر ہو گئی۔ آخر مریدوں سے نہیں رہا گیا، رونے لگے اور گزارش کی خدا کے لیے بس کیجیے، بہت ہو چکا۔

آپ نے فرمایا۔ ”میں نے اس شخص کو پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ فقیر کو آزمائش میں نہ ڈالنا۔ اس سے دونوں کو ہی پریشان ہونا پڑے گا۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”آپ نے خیانت کی سزا دی یہ تو انصاف تھا لیکن پسینے کے عوض اپنا خون بہا دیا، اس کو کیا کہیں گے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر وہ انصاف تھا تو یہ حقِ دوستی تھا۔“

لوگوں نے جب یہ واقعہ حمید الدین ناگوری کو سنایا تو آپ غمگین ہو گئے فرمایا۔ ”وہ میرا مرید ہے، اس کو یہی کرنا چاہیے تھا۔“

☆☆☆

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا وصال ہو گیا۔ شیخ کو اس کا ازحد ملال ہوا۔ ہمیشہ آزردہ و غمگین رہے۔

یہ سلطان شمس الدین التمش کا دور تھا۔ اس سال موسم برسات یوں ہی گزر گیا۔ فصلیں برباد ہو گئیں۔ شہر قحط سالی کا شکار ہو گیا۔ رعایا پرور شریف سلطان بہت پریشان رہنے لگا۔ اس نے اپنے مصاحبین سے مشورہ کیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

مصاحبین نے متفقہ عرض کیا۔ ”اس سلسلے میں اہلِ اللہ کی دعائیں حاصل کرنی چاہئیں۔“

سلطان نے جواب دیا۔ ''تب پھر تم لوگ شہر میں پھیل جاؤ اور اہلِ اللہ کو تلاش کر کے ان سے میری طرف سے درخواست کرو۔ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں، رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا ہوں، کرنے کو تیار ہوں اور کرتا رہوں گا۔ لیکن یہ کام میرے اختیار کا نہیں کہ میں اپنے شاہی اختیارات سے بارش کروادوں۔ یہ کام اہلِ اللہ کا ہے، وہ مستجاب الدعوات ہوتے ہیں۔ وہ اس میں میرا ساتھ دیں اور مخلوق کو تباہی و بربادی سے بچالیں۔''

سلطان کے آدمی پورے شہر میں پھیل گئے مگر ان میں کے بیشتر شیخ حمید الدین ناگوری کے پاس پہنچے اور سلطان کا پیغام انہیں پہنچادیا۔

آپ نے فرمایا۔ ''میں سلطان کی خواہش پر دعا کر تو سکتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ سلطان علماء ظاہر کے کہنے پر مجھ پر سختی نہ شروع کردیں۔''

سلطان کے آدمیوں نے پوچھا۔ ''کس قسم کی سختی؟ آخر ایسا کیوں ہوگا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''ایسا اس لیے ہوگا کہ وہ لوگ سماع سننا پسند نہیں کرتے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ بارش سماع کی برکت ہی سے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں؟''

مصاحبین نے آپ کی بات سلطان تک پہنچادی۔ سلطان نے مبتسم ہو کر فرمایا۔ ''اگر شیخ ایسا فرمارہے ہیں تو فوراً ہی محفلِ سماع کا انتظام کر دیا جائے کیونکہ اس جواب میں یہ اشارہ موجود ہے کہ بارش سماع کے طفیل ہی ہوگی۔''

سلطان کے حکم پر محفلِ سماع منعقد کر دی گئی۔ شیخ حمید الدین اور شہر کے دوسرے صوفی بھی وہیں پہنچ گئے۔ سلطان بھی ان کے پیشواؤں میں شامل تھا۔ شہر کے بہترین قوالوں کو طلب کر لیا گیا۔ اس محفل میں جو صوفی شریک ہوئے تھے، وہ بہت بلند پایہ تھے۔ آپ نے قوالوں کو حکم دیا کہ شروع کریں۔

سماع کا آغاز ہوا۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ تیری رحمت پر بھروسا کر کے مجمع لگالیا ہے، میں تجھ پر ناز کرتا ہوں، تو مجھے شرمندہ نہ ہونے دے۔''

جب محفل ذرا رنگ پر آنے لگی تو بوندا باندی شروع ہوگئی۔ آپ نے لوگوں کو منع کیا کہ اگر بارش تیز ہو جائے تو یہاں سے اٹھا نہ جائے۔ چنانچہ کچھ ہی دیر بعد موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ قوال مست و بے خود تھے اور سامعین بھی اپنے حواسوں میں نہیں تھے۔ وہ بارش میں تربتر، شرابور ہو چکے تھے مگر انہیں وہاں سے جانے کا ہوش نہیں آرہا تھا۔

سلطان نے شیخ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا، آپ نے فرمایا۔ ''سلطان! آپ خود بھی درویش ہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے رب کا شکریہ ادا کیجیے۔''

سلطان نے عرض کیا۔ ''میں نے اپنے رب کا شکر پہلے ہی ادا کرلیا لیکن واسطے کا کام چونکہ آپ نے انجام دیا ہے، اس لیے مجھ پر آپ کا شکریہ بھی لازم ہے۔''

یہ ۶۰۵ھ کے ۹ رمضان المبارک کا دن تھا۔ آپ بہ پابندی روزے رکھ کر رات کی تراویح پڑھایا کرتے تھے۔ اس شب آپ نے تراویح میں پورا قرآن ختم فرمادیا۔ آخر میں نمازِ وتر ادا کی اور آخری سجدے میں کافی دیر پڑے رہے۔ ارادت مندوں کو اس طویل سجدے پر حیرت ہوئی اور ڈرتے ڈرتے آپ کے پاس کھڑے ہو کر آواز دی لیکن شیخ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

آخر ایک شخص نے خود بھی سجدے میں جا کر شیخ کے کان سے اپنا منہ لگادیا بولا۔ ''حضرت! خیریت تو ہے، پہلے تو کبھی آپ نے اتنا طویل سجدہ نہیں کیا تھا؟''

آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

اس شخص نے اپنے دونوں ہاتھوں سے آپ کو اٹھانے کی کوشش کی تو آپ ایک طرف ڈھلک گئے اور اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ کی روحِ مبارک حالتِ سجدہ میں ہی پرواز کر چکی ہے۔

ماخذات

بساتین السلاطین	تاریخ فرشتہ	عہد سلاطین دہلی	بدون تاریخ	فرمانروایان اسلام	ماثر الامرا
مرزا ابراہیم زبیری	محمد قاسم فرشتہ	صلاح الدین ناسک	طبا طبائی	لین پول	صمصام الدولہ شاہنواز خان

تیرے نیناں

ثمر عباس

حسن قدرت کا ایک خوب صورت تحفہ ہے جو ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا لیکن... جنہیں مل جائے انہیں یا تو اس کا احساس ہی نہیں ہوتا یا پھر جنہیں اس کا خوب ادراک ہوتا ہے وہ اس کا استعمال بھی بہت خوبی سے کرتے ہیں جیسے کہ اس نے کیا... جس کی آنکھوں میں ایک عجیب کشش تھی جس کے حصار میں لوگوں کو قید کرکے وہ انہیں اپنی انگلی پر نچا کر خوش ہوتی تھی... مگر ایسا کب تک ہوتا... پھر ایک دن اسی قدرت نے اس کی انگلی کے سارے پیچ و خم اور دم نکال کرنا کارہ کردیا۔

ایک حسینہ کی ساحرانہ فطرت کا شیطانی انداز
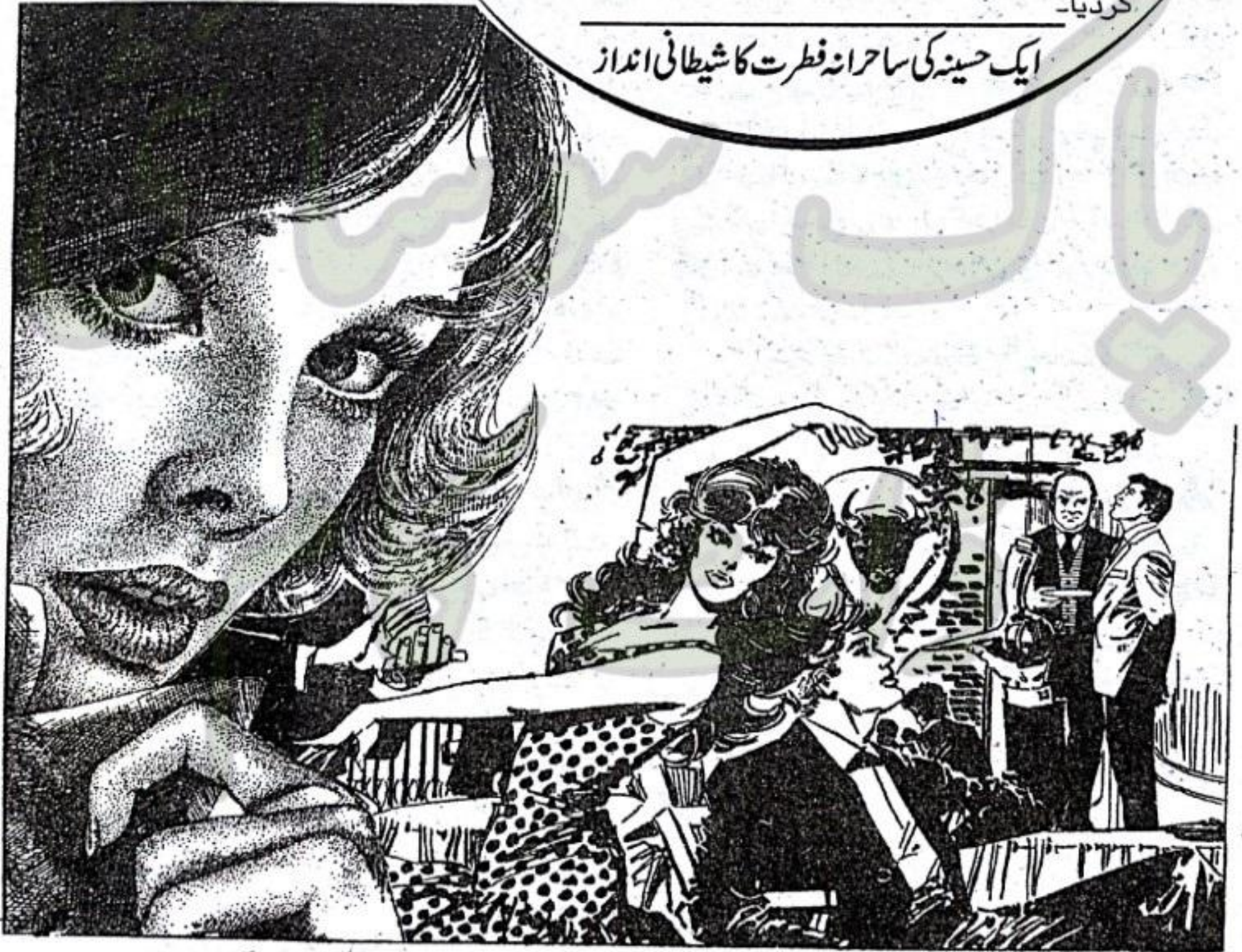
میرا بھائی کارل ہمیشہ سے ہی بے پروا اور لا ابالی رہا ہے۔ اس نے زندگی مین کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کیا جس کی وجہ سے اسے اکثر و بیشتر نقصان اٹھانا پڑا لیکن اس نے کبھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کی اور نہ ہی اس کو پچھتاوا ہوا۔ لوگ اس سے نفرت کرتے تھے لیکن اس نے کبھی اس بارے میں پریشانی ظاہر نہیں کی۔ بچپن میں اپنی شرارتوں اور بدتمیزیوں کی وجہ سے اسے ہمیشہ ٹھکرادیا گیا۔ نوجوانی میں وہ دوسروں کے طنز اور تضحیک کا نشانہ بنتا رہا۔ بڑا ہونے پر دوستوں سے

محروم رہا۔ وہ کبھی اچھا انسان، شوہر، بزنس مین اور بھائی ثابت نہ ہوسکا۔ اسی وجہ سے میرے دل میں اس کے لیے نفرت بڑھتی گئی۔ اس کے باوجود میں اس کی جارحیت اور حالات سے نمٹنے کی صلاحیت کو رشک سے دیکھتا تھا۔ شاید یہی وہ خوبیاں... اگر انہیں خوبی سمجھا جائے تو تھیں جن کی بدولت وہ بے فکری کی زندگی گزار رہا تھا۔ میں ذاتی زندگی میں غیر متحرک واقع ہوا ہوں البتہ کام کے معاملے میں ہمیشہ پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ ایک ایسا شخص جو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو تقدیر کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

ایولین کہا کرتی تھی کہ نہ جانے لوگ تمہاری سوچ اور خواہش کے مطابق عمل کیوں نہیں کرتے اور ویسے کیوں نہیں بن جاتے جیسا تم انہیں دیکھنا چاہتے ہو۔

چار سال پہلے میرے اور ایولین کے درمیان جو سنگین حادثہ ہوا تھا، اس کے بعد سے میری اور کارل کی بات چیت بند تھی۔ اس دوران اس نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی مجھے اس کی یاد آئی۔ میں نے اپنے طور پر کتاب زندگی سے اسے ایک ناکارہ ورق کی طرح پھاڑ پھینکا تھا۔ اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی اگر وہ میرا بھائی نہ ہوتا تو میں اس کی جان لے لیتا۔ تاہم اب بھی اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ البتہ اس کی ڈھٹائی تھی کہ جب اسے کاروبار میں گھاٹا ہوا اور وہ دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچا تو ضرورت کے وقت اسے میری یاد آئی اور وہ بے دھڑک دندناتا ہوا میرے دفتر پہنچ گیا۔

میری فرم کا نام ویسٹ ویلی سیمی کنڈکٹرز ہے اور ہم برقی آلات کے علاوہ الیکٹرونکس پارٹس بھی بناتے ہیں۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان ہوں اور کام کے دوران کسی دوسری جانب متوجہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ میرا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور مجھے کبھی پیسوں کی تنگی محسوس نہیں ہوئی۔ کارل کو اتنی تمیز بھی نہ تھی کہ وہ لمحہ بھر کو ریسیپشن پر رک کر اپنی آمد کی اطلاع دیتا۔ اس کے برعکس وہ مزے سے ٹہلتا ہوا میرے کمرے میں چلا آیا اور چہرے پر مخصوص مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

"لارنس! ہماری ملاقات کافی عرصے بعد ہو رہی ہے اگر اب تک تم نے مجھے ایولین والے واقعے پر معاف نہیں کیا ہے تو میں اس کے لیے تمہیں الزام نہیں دوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہیں اس سے بہت محبت تھی لیکن وہ ہی بے وفا نکلی۔ خیر وہ بات اب پرانی ہوئی اور بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا ہے۔ میں تمہارے پاس بڑی امید لے کر آیا ہوں اور جانتا ہوں کہ صرف تم ہی مجھے مکمل تباہی سے بچا سکتے ہو۔"

"میں نے تمہیں معاف نہیں کیا اور نہ ہی کروں گا پھر تمہیں کیوں بچاؤں؟"

"اس لیے کہ ہمارے درمیان بھائی کا رشتہ اب بھی قائم ہے۔"

"یہ ایک حادثہ تھا کہ تم نے میری ماں کی کوکھ سے جنم لیا اور اس بہانے میرے بھائی کہلانے کے حق دار ہو گئے لیکن اطمینان رکھو کہ اب تم مجھ سے ایک پھوٹی کوڑی بھی حاصل نہ کر سکو گے۔"

اس نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ نہ سنا ہو۔ وہ اطمینان سے اپنی پتلون کی کریز درست کرتا ہوا میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی خوش لباس تھا اور یہ جامہ زیبی اس کے بہت کام آتی تھی۔ اس نے اپنی اس خوبی سے اپنی سابقہ بیوی، ایولین اور چند دوسری عورتوں کو متاثر کیا اور انہوں نے اس کے کاروبار میں سرمایہ کاری کر دی لیکن اب اس کے ظاہری رکھ رکھاؤ میں کمی آگئی تھی اور وہ دیکھنے میں ایک مایوس اور دل شکستہ انسان نظر آرہا تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اس حالت کو نہ پہنچا ہوتا تو کبھی میرے پاس نہ آتا۔

"ایک لاکھ ڈالرز سے میرا کام چل جائے گا۔" اس نے ایسے کہا جیسے وہ ایک لاکھ نہیں بلکہ سو ڈالرز مانگ رہا ہو۔ "میں تمہیں دو سال کا پرامیسری نوٹ لکھ کر دے سکتا ہوں۔"

"تمہارے یہ بے وقعت پرامیسری نوٹ پورے شہر میں گردش کر رہے ہیں۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "بہرحال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"گویا تم میرے نقصانات پر نظر رکھے ہوئے ہو اور ان سے لطف اندوز ہو رہے ہو!"

"میں اتنا گرا ہوا نہیں ہوں کہ دوسروں کی بدنصیبی پر قہقہے لگاؤں۔"

"چاہے وہ ایولین ہی کیوں نہ ہو۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ بار بار ایولین کا نام بیچ میں لا رہا تھا جبکہ مجھے اس کے ذکر سے ہی الجھن ہو رہی تھی۔

"اس نے گزشتہ برس راجر فریڈرک سے شادی کر لی تھی۔ غالباً یہ بات تو تمہارے علم میں ہوگی؟"

"ہاں، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے فریڈک

سے شادی کیوں کی تھی۔ اس میں محبت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ اس سے پندرہ سال بڑا تھا اور انتہائی پست ذہنیت رکھنے والا شخص ہے اور کوئی عورت اس میں کشش محسوس نہیں کرسکتی۔ اس کی پہلی بیوی نے اسی لیے طلاق لی کیونکہ وہ اس پر ذہنی اور جسمانی تشدد کرتا تھا۔ وہ بہت امیر اور ممتاز سماجی حیثیت کا حامل تھا۔ اس نے فریڈرک الیکٹرونکس کا سائز میری کمپنی کے مقابلے میں دوگنا کردیا اور اس کی کامیابی کا تناسب تین گنا بڑھ گیا۔''

یہ کہہ کر میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور بولا۔ ''بہرحال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ ایولین اپنی راتیں قانونی یا غیر قانونی طور پر کس کے ساتھ گزار رہی ہے۔''

''سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے؟''

''نہیں۔''

''کیوں، تم تو اس کے دیوانے تھے خاص طور پر اس کی آنکھوں کے بارے میں تو بہت کچھ کہا کرتے تھے۔''

''کیا؟'' میں نے اس کی لفاظی پر برہم ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہارا پسندیدہ جملہ تھا، ہر وقت اس کی آنکھیں دیکھتا رہوں۔''

مجھے یاد آگیا۔ وہ آنکھیں ہی اس کا قیمتی اثاثہ اور غرور تھیں۔ بڑی بڑی روشن جھیل جیسی آنکھیں جن میں ڈوب جانے کو دل چاہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ ایولین ہر اعتبار سے خوب صورت عورت تھی۔ سنہری... بال، نرم ملائم چھریرا بدن، کتابی چہرہ اور بھرے بھرے ہونٹ لیکن اس کی آنکھیں سب سے پہلے توجہ کا مرکز بنتیں اور دل موہ لیتی تھیں۔

''میرا خیال تھا کہ تم اب بھی اس پر نظر رکھے ہوئے ہوگے کیونکہ تم اتنے تلخ نہیں ہوسکتے۔''

''اس سے جدائی کا صدمہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا تھا اور میں نے اس سے شادی کو کامیاب بنانے کے لیے کتنے جتن کیے لیکن اس کے باوجود میں تمہیں اس کو بہکانے سے نہ روک سکا۔''

''میں نے اسے بہکایا۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس نے مجھے آگے بڑھنے کی ترغیب دی تھی۔''

''تم یہ جھوٹ پہلے بھی بول چکے ہو لیکن میں نے اس پر کبھی یقین نہیں کیا۔'' میں نے بےزاری سے کہا۔

''یہ جھوٹ نہیں ہے۔ دراصل میں نے اس کے حسن اور دلکشی سے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن افسوس کہ کامیاب نہ ہوسکا۔ بدقسمتی سے خوب صورتی میری کمزوری ہے اور تم خود ہی اعتراف کر رہے ہو کہ وہ بےانتہا خوب صورت ہے پھر میں اس کے حسن سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔''

میرے ذہن کے پردے پر بدنما مناظر رینگنے لگے۔ ایولین کی بہت سی حرکتوں کی وجہ سے مجھے اس کی وفاداری پر شبہ ہونے لگا تھا۔ ایک دن میں اس کا تعاقب کرتا ہوا ہیڈلے ول میں واقع ایک ہوٹل پہنچا تاہم مجھے قوی امید تھی کہ میرے خدشات بےبنیاد ثابت ہوں گے لیکن میری امید اس وقت دم توڑ گئی جب میں نے اسے ہوٹل کے ایک کمرے میں کارل کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھا۔ حیرت کی بات تھی کہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے باوجود انہیں بالکل بھی شرمندگی نہیں ہوئی اور اس سے زیادہ افسوس یہ ہوا کہ میرے گھر میں نقب لگانے والا کوئی اور نہیں بلکہ میرا سگا بھائی تھا۔ غصے اور نفرت کی لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی لیکن میری فطری بےعملی کے سبب وہ چند لمحوں میں دم توڑ گئی۔ میں ان کے سامنے بے یارومددگار اور خاموش کھڑے رہنے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔

اس کے بعد مجھ میں غم اور صدمے کی ایسی کیفیت ابھری جس نے کئی مہینوں تک مجھے ناامیدی اور مایوسی میں مبتلا رکھا۔ کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ یہ آپ کے پیاروں کی موت کا غم بھلا دیتا ہے۔ اس کے سامنے ایولین کی بےوفائی کیا حقیقت رکھتی تھی، چنانچہ میں بھی دھیرے دھیرے اس کیفیت سے باہر آگیا لیکن میری... خوداعتمادی کبھی واپس نہ آسکی۔

اس کے بعد میں نے کارل کو کبھی نہیں دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی شکل سے نفرت ہوگئی تھی اور چاہتا تھا کہ کبھی وہ میرے سامنے نہ آئے۔ اب چار سال بعد وہ منہ اٹھائے چلا آیا تب بھی میں اس کی جانب دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ میں نے اپنا منہ دوسری جانب کرلیا لیکن دیوار پر لگے ہوئے آئینے میں اس کا عکس واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ مطمئن اور پرسکون نظر آرہا تھا۔ صورت حال خواہ کیسی بھی ہو وہ بات کرتے وقت خود... کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ میں پہلا شخص نہیں تھا جس سے اس نے تمہارے ساتھ شادی کرنے کے بعد تعلقات استوار

کیے تھے۔"

"یہ ایک اور جھوٹ ہے۔" میں نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے کہا۔

"حالانکہ ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ یہ ایک تلخ سچائی ہے۔"

میں اس حقیقت سے واقف تھا لیکن کارل کے سامنے اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ خود مجھے بھی اپنے سامنے اس کا اعتراف کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔ ممکن ہے کہ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا یا دوسرا، تیسرا مرد نہ ہو لیکن میرا بھائی ہوتے ہوئے اس دھوکا دہی سے دور رہنا چاہیے تھا اور نہ ہی ایولین کے لیے یہ مناسب تھا کہ وہ میرے بھائی پر ڈورے ڈالتی۔

"تم یقیناً اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرو گے لارنس۔" اس نے کہا۔ "لیکن اس کے جانے کے بعد تم بہتر زندگی گزار رہے ہو۔ اگر وہ تمہارے ساتھ رہ رہی ہوتی تو تمہارا جینا حرام کر دیتی جیسا کہ اس نے فریڈرک کے ساتھ کیا ہے۔"

"تم اس کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"یہ کہ ان دنوں انہیں جن مسائل کا سامنا ہے ان میں وہ فریڈرک کی طرح برابر کی شریک ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ کئی مرتبہ اس کے ساتھ بھی بے ایمانی کر چکی ہے۔ شاید بے وفائی اس کی سرشت میں شامل ہے۔"

"کیا وہ اب بھی تم سے ملتی ہے؟"

"نہیں، میں تو چار سال ہو گئے اس سے نہیں ملا۔"

"مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں ہے؟"

"اگر میں اس سے مل رہا ہوتا تو یہ بات تمہیں بھی معلوم ہو جاتی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"ضروری نہیں ہے، اگر تم ضرورت محسوس کرو تو ان ملاقاتوں کو خفیہ بھی رکھ سکتے ہو۔"

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "بے چارہ فریڈرک، وہ تو اسے طلاق بھی نہیں دے سکتا کیونکہ ایسی صورت میں اسے بے پناہ مالی نقصان برداشت کرنا ہوگا۔ جس کا وہ فی الوقت متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"تم یہ سب کس طرح جانتے ہو؟"

"مجھے فریڈرک نے ہی بتایا تھا وہ میرا دوست ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو تم اس سے پیسے کیوں نہیں مانگ لیتے تا کہ تمہاری ضرورت پوری ہو جائے۔"

"میں یہ کوشش کر چکا ہوں۔"

"اور اس نے انکار کر دیا؟"

"ہاں کیونکہ اس کی مالی حالت خاصی پتلی ہے پھر اسے ایولین کو بھی ماہانہ جیب خرچ دینا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ مجھے اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا۔ اگر پہلے جیسے حالات ہوتے تو اس کے لیے ایک لاکھ ڈالرز کا انتظام کرنا کچھ مشکل نہ تھا لیکن ایولین کی شاہ خرچیوں نے اسے کہیں کا نہ رکھا اور اب وہ کئی بینکوں کا مقروض ہے لیکن مجھے امید ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔ کیا تم مجھے انکار کر سکتے ہو لارنس؟"

یہ نہ تو کوئی سوال تھا نہ ہی التجا، کارل کی آواز بھی آئینے میں نظر آنے والے اس کے عکس کی طرح پرسکون تھی لیکن میں اس کا کھوکھلا پن محسوس کر سکتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تم مجھے ایک لاکھ ڈالرز دے سکتے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے بے رخی سے کہا۔ "ایک پینی بھی نہیں ملے گی۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔" اس کی آواز میں تھوڑی سی تلخی آ گئی۔ "میں نے ماضی کو دفن کر دیا ہے کسی قدیم داستان کی طرح۔ کیا ہم پرانی باتیں بھلا کر آگے نہیں بڑھ سکتے؟"

میں نے اس کی بکواس بہت سن لی تھی اور مجھ میں مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ماضی کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ ماضی تھا ہی نہیں۔ تم نے ایولین کے ساتھ مل کر جو کچھ کیا اس کی یاد آج بھی میرے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

میرا سخت رویہ دیکھ کر وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ "خدا کے واسطے سمجھنے کی کوشش کرو ہم آپس میں بھائی ہیں۔ تم ایسے وقت میں مجھے اس طرح نہیں دھتکار سکتے۔"

"کیوں نہیں دھتکار سکتا بلکہ میں ایسا ہی کر رہا ہوں۔ تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ میں تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔"

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولا۔ "جہنم میں جاؤ۔ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے اگر تم نے مجھے پیسے نہ دیے تو میں کوئی بھی الٹی سیدھی حرکت کر سکتا ہوں۔"

"نکل جاؤ یہاں سے۔" میں نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں عمارت کے چوکیدار کو بلاتا ہوں اور

دوبارہ یہاں کبھی نہ آنا۔"

وہ چلا گیا لیکن جانے سے پہلے مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالنا نہیں بھولا۔ وہ اپنے چہرے پر شائستگی کا جو نقاب چڑھا کر آیا تھا، وہ پل بھر میں تار تار ہو گیا اور اس کا اصل چہرہ سامنے آ گیا۔ اس نے جو رقم مانگی تھی میں اس کا پانچ گنا دے سکتا تھا لیکن اس رقم سے بھی اس کے مسئلے حل نہ ہو پاتے اور یہ رقم اسے ڈوبنے سے نہیں بچا سکتی تھی۔ وہ اب اس منزل سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ جہاں اسے کوئی بچا سکتا۔ اب وہ خود بھی کوشش کرتا تو اسے کامیابی نہ ہوتی۔

☆☆☆

کارل کے آنے سے میرے دل کے زخم پھر ہرے ہو گئے اور ایولین پوری شدت سے میرے دماغ پر قابض ہو گئی جسے میں نے بڑی مشکلوں سے اپنے خیالوں سے نکالا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ میں اب بھی اسے تلاش کر رہا ہوں۔ جیسے لوگ ٹارچ لے کر گم شدہ چیزیں ڈھونڈتے ہیں بالکل اسی طرح میری نظریں بھی اسے کھوج رہی تھیں۔ شاید وہ کسی کونے کھدرے میں سمٹی سکڑی پڑی ہو اور اچانک ہی میری نظر اس پر چلی جائے۔ وہ جسمانی طور پر مجھ سے دور ہوئی لیکن کارل کے آ جانے سے اسے بھی میرے ذہن میں جگہ بنانے کا موقع مل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کہیں نہیں گئی تھی بلکہ میرے ذہن کے نہاں خانوں میں ہی کہیں چھپی ہوئی تھی۔

میں ایک بار پھر اس کے تصور میں کھو گیا۔ اس کی آنکھیں دو روشن نقطوں کی طرح میرے سامنے اوپر نیچے اور دائیں بائیں گردش کر رہی تھیں۔ میں ہمیشہ ان آنکھوں کے سحر میں کھویا رہا۔ ان آنکھوں سے وہ کئی کام لیتی تھی۔ کبھی ستاتی کبھی رلاتی تو کبھی دوسروں کو اپنے مذاق کا نشانہ بناتی تھی۔ جب میں نے پہلی بار اس کے اور کارل کے تعلق کے بارے میں سنا تو وہ بڑی ڈھٹائی سے بولی۔ "تمہیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ میں تمہارے اس احمق بھائی کے ساتھ کسی کمرے میں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" پھر جب میں نے ان دونوں کو ایک ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو وہ ڈھیٹ بنتے ہوئے بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ پہلی بار اس طرح کا واقعہ پیش آیا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ وقت کا حساب لگانے میں غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں آخری بار اس سے ملا تھا اور جب میں نے اپنے اندر سلگتے ہوئے شک کو سوال کی شکل دی تو وہ بولی۔ "احمقانہ باتیں نہ کرو۔

کارل ایک ہارا ہوا جواری ہے اور وہ مجھے ایک چھوٹی سی بے ضرر تفریح کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا۔ وہ تمہارے مقابلے میں کچھ نہیں، مجھے یقین ہے کہ تم طلاق دینے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کرو گے۔"

لیکن میں تقریباً اپنا ذہن تبدیل کر چکا تھا اور میں اپنے آپ کو سمجھاتا رہا کہ اس کے بغیر بہت بہتر زندگی گزار رہا ہوں اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مجھے لگا کہ یہی سچ ہے۔ میری زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا اور میری ان تمام پارٹیوں، سماجی تقریبات اور مہنگے تفریحی دوروں سے جان چھوٹ گئی تھی جو میں ایولین کو خوش رکھنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ اب میری تمام تر توجہ اپنے کام اور نت نئے منصوبوں پر تھی جن کی بدولت بہت تھوڑے عرصے میں میری فرم ویسٹ ویلی الیکٹرونکس انڈسٹری میں ایک چھوٹی سی قوت بن کر ابھری۔ میں بہت خوش تھا میری زندگی میں ہر آسائش موجود تھی اور مجھے عورت کے سوا کسی قسم کی کمی کا احساس نہ تھا اور یہ کوئی ایسا سنجیدہ مسئلہ نہیں تھا جس کی وجہ سے میں ایولین جیسا کوئی ڈھول دوبارہ گلے میں ڈال لیتا۔

میں جتنا چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں نہ سوچوں اور تنہا رہنے کو ترجیح دوں، اتنا ہی مجھے اپنی کوششوں میں ناکامی ہوئی۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں چند سیکنڈ یا منٹ ضرور ایسے ہوتے ... جب میں تصور ہی تصور میں اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں پاتا اور اس کی آنکھوں کے سحر میں کھو جاتا۔

☆☆☆

کارل اس کے بعد مجھ سے ملنے گھر یا فیکٹری نہیں آیا۔ اس نے مجھے فون کال نہیں کی، کوئی ای میل یا پیغام نہیں بھیجا۔ اس کی خاموشی نے مجھے تھوڑا سا حیران ضرور کیا لیکن میں نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ میرا ذہن تبدیل کرنے کے لیے کم از کم ایک کوشش ضرور کرے گا لیکن اسے یہ ضرور احساس ہو گیا ہو گا کہ اس طرح کی کوئی بھی کوشش بے معنی ہو گی یقیناً اسے اب بھی ایک لاکھ ڈالرز کی ضرورت ہو گی۔ اگر اس نے کسی اور سے پیسے ادھار لیے ہوتے تو مجھے ضرور پتا چل جاتا۔ چاہے وہ اپنے طور پر مجھ سے یہ بات چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرتا۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ میں نے اس دوران اس کے بارے میں کوئی بات نہیں سنی اور نہ ہی اس کی حرکتوں کے بارے میں کوئی نیا انکشاف ہوا۔ یہ بالکل انہونی

بات تھی کہ کارل جیسا شخص اس طرح خاموشی اختیار کر لے، خاص طور پر ایسے وقت جب وہ دِ والیا ہونے کے قریب ہو۔ یہ سب کچھ بہت حیران کن تھا اور میں اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھا لیکن ڈھائی ہفتے بعد منظر بالکل ہی بدل گیا۔

☆☆☆

میں دن بھر کا تھکا ہارا سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس وقت کون ٹیلی فون کر سکتا ہے یقیناً یہ کارل ہی ہوگا۔ اسی سے اس بدتمیزی کی توقع کی جا سکتی تھی لیکن دوسری طرف سے آواز سننے کے بعد میرا خیال غلط نکلا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھی مجھے فون کر سکتی ہے۔

''میں ایولین بول رہی ہوں' خدا کا شکر ہے کہ تم اس وقت گھر پر ہی ہو۔''

اس کی آواز غیر معتدل تھی جیسے ہسٹریائی انداز میں بول رہی ہو' مجھے یوں لگا جیسے کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔ میرا گلا خشک ہونے لگا۔ میں نے اپنے کندھوں میں سردی لہر محسوس کی۔

''ایولین تم کیا چاہتی ہو؟'' میں نے اپنا لہجہ معتدل رکھنے کی کوشش کی۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے پلیز تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔''

''اس وقت میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''میرے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ ایک خوفناک حادثہ۔''

''کس قسم کا حادثہ' یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم ٹھیک تو ہو نا ایولین؟''

''میں ٹھیک ہوں لیکن...... لیکن کارل میرے خدا! وہ مر چکا ہے۔''

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ یوں لگا جیسے کسی نے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ میں نے یقین نہ کرنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کیا کہا تم نے؟ کارل مر چکا ہے؟''

''ہاں...... یہیں میرے لیونگ روم میں۔ وہ یہاں راجر سے پیسے ادھار مانگنے آیا تھا۔ اس کی دیوانگی اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ یہاں بھی مسلح ہو کر آیا تھا اور جب راجر نے اسے پیسے دینے سے انکار کیا تو اس کا ماتھا گھوم گیا اور اس نے اپنی گن نکال کر راجر کو دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ ان دونوں کے درمیان شدید تکرار اور ہاتھا پائی شروع ہو گئی اور اس کا خاتمہ کارل کی موت پر ہوا۔ اس چھینا جھپٹی کے دوران گولی چل گئی جو کارل کو لگی لیکن گرتے گرتے اس نے گن قابو میں کر کے راجر کو گولی مار دی۔ اس طرح وہ بھی مر گیا۔ میرے خدا وہ دونوں مر چکے ہیں۔''

میرا بھائی مر گیا، اس کا شوہر بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ دونوں کی موت ایک ہی ہتھیار سے واقع ہوئی جو میرا بھائی لے کر آیا تھا جو ہمیشہ کسی آتشیں ہتھیار سے ڈرتا رہا۔ جہاں تک میرے علم میں ہے۔ اس نے پوری زندگی کسی ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور میرے خیال میں تو اسے اس کا استعمال بھی نہیں آتا ہوگا۔

میرے لیے یہ ایک افسوس ناک خبر تھی۔ یوں لگا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں سنبھل چکا تھا اور مجھے کچھ بھی کھونے کا احساس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ کارل تو میرے لیے چار سال پہلے ہی مر چکا تھا، جب اس نے میری امانت میں خیانت کرتے ہوئے میری بیوی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسایا تھا۔

''لارنس! میں نہیں جانتی کہ کیا کروں گو کہ تمہارے ساتھ جو سلوک کر چکی ہوں اس کے بعد تم سے کچھ پوچھنے کا حق تو نہیں رہتا لیکن تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں جس سے رجوع کر سکوں۔''

''کیا تم نے پولیس کو اطلاع دی؟''

''نہیں ابھی تک تو نہیں۔'' اب اس کی آواز میں ایک نیا رنگ نمایاں ہو گیا تھا۔ ''اگر انہوں نے شک ظاہر کیا کہ میں بھی اس معاملے میں ملوث ہوں تو پھر کیا ہوگا؟''

''وہ ایسا کیوں سوچیں گے؟''

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ دونوں مر گئے ہیں اور اس واقعے کا میرے علاوہ کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں ہے۔ راجر کے ساتھ گزشتہ چند ہفتوں سے میرے تعلقات ٹھیک نہیں تھے جبکہ راجر کسی زمانے میں میرا محبوب رہ چکا تھا۔ اس پس منظر کو دیکھتے ہوئے وہ مجھے بھی موردِ الزام ٹھہرا سکتے ہیں اور میں جیل جا سکتی ہوں۔ اس لیے تمہیں میری مدد کے لیے آنا ہوگا۔''

''میں کیوں آؤں؟ میرا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

''کارل تمہارا بھائی تھا۔''

یہ کوئی معقول وجہ نہیں تھی، صاف لگ رہا تھا کہ اسے فریڈرک، کارل یا میری کوئی پروا نہیں تھی اور وہ صرف اپنے بارے میں پریشان ہو رہی تھی۔

''تم مجھ سے کیا توقع کر رہی ہو؟ میں اس سلسلے میں کیا

کر سکتا ہوں۔''

''تم کہہ سکتے ہو کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں اس وقت یہیں پر تھا اور تم نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا یا تم کارل کی لاش یہاں سے لے جاؤ اور میں کہہ دوں گی کہ کوئی نامعلوم شخص راجر کو گولی مار کر فرار ہو گیا۔ تم یہاں آ جاؤ تو اس بارے میں سوچتے ہیں کہ کون سا طریقہ مناسب رہے گا۔''

''اوہ میرے خدا۔'' میں نے ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا۔ یہ عورت نہ جانے کیا بکواس کر رہی تھی۔

''تم آؤ گے، ضرور آؤ گے۔ تمہیں میری مدد کرنے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہوگا۔ جانتی ہوں کہ تم اب بھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہو اور شاید تم یقین کرو یا نہیں، میں بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں۔ میں اپنے اور تمہارے درمیان ہونے والے اختلافات دور کردوں گی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم پھر سے ایک ہو جائیں گے یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

وہ بڑے یقین سے یہ سب کہہ رہی تھی جیسے میں اس کی باتوں میں آ جاؤں گا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ لوگ تو جائے واردات سے دور ہونے کا ثبوت ڈھونڈتے ہیں اور وہ مجھے وہاں پہنچنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ میں وہاں اپنی موجودگی کا کیا جواز پیش کرتا۔ فریڈرک میرا دوست تھا اور نہ واقف کار۔ میں کبھی اس کے گھر نہیں گیا تھا پھر میں پولیس کو وہاں آنے کی کیا وجہ بتاتا۔ دوسرا مشورہ اس سے زیادہ احمقانہ تھا۔ میں نے کارل کو قتل نہیں کیا لیکن اس کی لاش کو غائب کرنے کا الزام اپنے سر لے لوں۔ اسے کہتے ہیں آ بیل مجھے مار، دراصل ایولین نے ساری زندگی مردوں کو استعمال کیا تھا۔ چاہے وہ کارل ہو، فریڈرک یا میں، نہیں معلوم اور کتنے لوگ ہوں گے اب وہ مجھے دوبارہ استعمال کرنا چاہ رہی تھی۔

اب وہ باقاعدہ التجا پر اتر آئی تھی جیسے مجھ سے بھیک مانگ رہی ہو۔ ''پلیز لارنس...... پلیز۔''

''نہیں۔'' میں نے دل سخت کر کے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے پولیس کو فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دے دی۔

☆☆☆

اس کیس کا تفتیشی افسر لیفٹیننٹ راب تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کارل اور فریڈرک کے ساتھ دراصل کیا ہوا تھا۔ اس کی زبانی واقعے کی تفصیل سننے کے بعد مجھے بالکل بھی حیرانی نہیں ہوئی۔ ایولین نے جو کچھ بتایا وہ بالکل جھوٹ تھا۔ انہوں نے چھینا جھپٹی کے دوران ایک دوسرے کو نہیں مارا تھا بلکہ انہیں قتل کرنے والی ایولین ہی تھی۔ کارل حادثاتی طور پر مارا گیا جبکہ فریڈرک کی موت اس کے چند سیکنڈ بعد دہشت کی وجہ سے ہوئی۔ جب میں نے جائے واردات پر آنے سے انکار کر دیا تو ایولین نے وہاں نقشہ تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اس نے اپنے اناڑی پن سے سارا کام خراب کر دیا۔ پولیس کی پوچھ گچھ کے دوران وہ اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکی اور بالآخر اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔

کارل نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ ایولین سے نہیں ملتا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ گزشتہ ایک سال سے پھر اسے چاہنے لگا تھا، چنانچہ ان دونوں نے فریڈرک کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ ایولین کے ہاتھ میں اس کی دولت اور جائداد کا کنٹرول آ جائے اور اس سے کارل اپنے قرض خواہوں کو ادائیگی کر سکے۔ منصوبہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ فریڈرک کی موت کسی نامعلوم حملہ آور کی فائرنگ کے نتیجے میں واقع ہو۔ وہ نامعلوم حملہ آور کارل تھا جس نے فریڈرک پر اس وقت گولی چلانی تھی جب وہ گھر میں داخل ہوتا لیکن عین وقت پر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ ایسا کرنے کے قابل نہ رہا۔

ایولین نے اس کے ہاتھ سے گن چھین لی اور فائر کر دیا لیکن گولی اس کے شوہر کے بجائے کارل کو لگ گئی۔ وہ دوسری گولی چلانے والی تھی کہ فریڈرک اس کی جانب لپکا اور دوسری گولی نے اس کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس طرح دو آدمی لالچ، مایوسی، دہشت اور خود غرضی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اگر میں ایولین کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جاتا تو میرا انجام بھی اس سے مختلف نہ ہوتا۔

ایولین کا ارادہ کارل کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی کہ گولی اس کے شوہر کے بجائے کارل کو لگ گئی کیونکہ راہداری میں نیم تاریکی تھی اور وہ دونوں بالکل قریب قریب کھڑے ہوئے تھے۔ ایولین نظر کی کمزوری کی وجہ سے ان دونوں میں فرق محسوس نہ کر سکی کیونکہ اس کی دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا۔ اس کا علاج ممکن تھا اگر وہ لیزر سرجری پر آمادہ ہو جاتی لیکن آپریشن کے نام سے ہی اسے خوف آتا تھا۔ یہ وہی آنکھیں تھیں جن پر میں دل و جان سے فدا تھا، وہی عین وقت پر دھوکا دے گئیں۔

رشتے کا زہر

شہاب جمال

رشتہ کوئی بھی ہو، سمجھنے، سمجھانے اور نباہنے سے ہی مضبوط ہوتا ہے مگر جب... یہی رشتے تنفر اور تفکر میں مبتلا کردیں تو احساسات میں آہستہ آہستہ نفرت کا زہر گھلتا چلا جاتا ہے... اب چاہے نفرت کا زہر ہو یا چاہت کی چاشنی، یہ تو انسان کی فطرت اور نیت کا پھل ہوتا ہے جو چاہے اپنے حصے میں لکھ لے... کوئی کتنی ہی چالبازیوں سے کام لے... قدرت کی بساط کا اپنا ہی ایک الگ رنگ اور مزاج ہوتا ہے جس کا ہر مہرہ ساری الٹی چالیں سیدھی کرنے کے لیے بازی مات کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی ماں نے بھی جتنی تدبیریں کیں تقدیر کے آگے ایک نہ چلنے پائی... بات گو ذرا سی ہے مگر جس کی سمجھ میں آجائے اس کی تدبیریں ہوں یا چالیں بڑی روانی سے بازی مات کردیتی ہیں۔ حالات کی الجھی ڈوری دیکھ کر ان کے دلوں کی بے ترتیب دھڑکنوں نے بھی انہیں وسوسوں اور اندیشوں میں مبتلا کیا ہوا تھا لیکن... انہیں یقین تھا کہ دھیرے دھیرے سلجھانے اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے سے ڈوری کا آخری سرا اور منزل کا اشارہ مل سکتا ہے اور بالآخر ایسا ہی ہوا کیونکہ... یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم پر انہیں کامل یقین تھا۔

کشور بیٹی بن کر نیلام ہوئی تو وہ کچھ نہ بول سکی مگر عورت بن کر نیلام ہونے کے لیے وہ تیار نہ ہوئی تو ایک ہی سال کے اندر اس کے ماتھے پر طلاق اور بانجھ پن کا ٹھپا لگا دیا گیا۔

اپنوں کا منہ بند کرنے کے لیے ماں نے اپنے ہی آشنا کے ساتھ بیٹی کو بیاہ دیا تھا جسے کشور قبول کرنے پر مجبور تھی کیونکہ جیسی ماں ویسی بیٹی کے مفروضے پر وہ اپنوں کی دہلیز پر قدم رکھنے کی بھی جرأت نہیں کرسکتی تھی۔ کجا یہ کہ وہ ان کی چھت کے نیچے سلگتی ہوئی لکڑی بن کر رہتی۔ ماں تو مکمل عورت تھی اس لیے اس کے پاس زبان تھی جس میں شوہر کی موت کے بعد اور بھی تیزی آگئی تھی وہ رشتے داروں کا کوئی ایسا روگ پالنا بھی نہیں چاہتی تھی جو اس کی آزاد فطرت پر زنجیر بن جاتا۔ جو دبی زبان میں یہ تک کہہ چکے تھے کہ کشور اس کی ناجائز اولاد ہے جو شوہر کی جائداد ہتھیانے کے لیے اس نے خاندان پر مسلط کردی ہے۔ کشور اسی ناجائز اولاد کے لیبل تلے بڑی مشکل سے دسویں جماعت ہی پاس کرسکی تھی۔

طلاق کا زخم ابھی ذرا مندمل نہ ہونے پایا تھا کہ اس کی ماں نے خود اجمل کے باپ سے ازدواجی اشتراک کر کے دونوں پر سوتیلے پن کا رشتہ مسلط کردیا۔ کالج کے نوجوان طالب علم کو بھی ایسا لگا گویا اس کے باپ نے کشور کی ماں سے شادی کر کے اس کے جسم پر ایک نہیں دو دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیے ہیں۔ پچھلے چار ماہ سے سوتیلے پن کی آگ میں جلنے کے دوران کشور کو اجمل ایک ایسی مظلوم سی اچھائی محسوس ہونے لگا تھا جو اس کے پاؤں میں آگری ہو۔ جسے اٹھا کر نہ وہ اپنے دامن کی زینت بنا سکتی تھی، نہ ہی اس کے اکھڑے اکھڑے کمزور پاؤں ماں کی شہ پر اسے کچلنے کی ہمت کرسکتے تھے کیونکہ خود اجمل نے سوتیلے پن کی تیز و تند لپٹ سے بچنے کے لیے اپنے اور دونوں ماں بیٹی کے درمیان نفرت کی دیوار اس طرح کھڑی کردی تھی کہ کشور یا اس کی ماں اجمل سے بات کرنا تو کجا اس سے آنکھ ملانے کی جرأت بھی نہ کرسکی تھیں۔ البتہ چند ایک مرتبہ آمنا سامنا

ہونے پر اس نے کشور کو یہ احساس کیے بغیر تیز و تند نگاہوں سے گھورا ضرور تھا کہ وہ بھی اجمل ہی کی کتاب کا دوسرا ورق ہے۔ حتیٰ کہ دونوں ایک دوسرے کی آواز تک سے نا آشنا تھے کشور تو یہ تک محسوس کرنے لگی تھی کہ اجمل گونگا ہے، پتا نہیں کالج میں کیسے پڑھتا ہوگا۔ وہ اپنے کمرے سے بھی صرف اس وقت نکلتی جب دونوں باپ بیٹا گھر پر نہ ہوتے۔

آخر تیز بخار کی شکل میں اندر کا لاوا باہر بہنے لگا۔ فرض کے اس احساس کے باوجود کہ ماں کے حکم کے مطابق اسے اجمل کے لیے دوپہر کا کھانا تیار کر کے الگ سے رکھنا تھا، وہ چارپائی سے نہ اٹھ سکی۔ اس پر سرسام سی کیفیت طاری تھی، باہر کے دروازے پر دستک کی شدت اس کے حساس اعصاب سے ہتھوڑے کے مانند ٹکرائی اور ٹکراتی چلی گئی۔ ٹانگیں کپکپانے کے باوجود وہ ہمت کر کے اس خوف سے دروازے کی طرف بھاگ اٹھی کہ دروازہ کھولنے سے بیشتر ہی کہیں اس کی ٹانگیں جواب نہ دے جائیں۔ گھر میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔

تھکن سے ستے چہرے پر اجمل کی آنکھوں میں نفرت، غصے اور جھنجلاہٹ کا طوفان بھپر رہا تھا جبکہ بخار کی شدت سے خود اس کی آنکھیں بھی شعلے سے کم نہیں تھیں۔ جو پہلی نظر میں جوانی کے خمار کے سوا کوئی تاثر نہیں دے سکتی تھیں۔ ہانپتی ہوئی بڑی مشکل سے دروازے کا پٹ تھامے وہ اجمل کے اندر آنے کی منتظر تھی۔

''اندر...... آ...... جاؤ۔'' اس نے بڑی مشکل سے خشک ہوتے ہوئے حلق سے آواز نکالی۔ ساتھ ہی اس کا ذہن اور آنکھیں گھومنے لگیں پھر اسے اتنا ہی احساس رہا کہ دروازے کا پٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دھڑام سے اس کے پاؤں کے پاس ہی فرش پر آرہی تھی۔

بوجھل پلکوں کے جھروکوں سے ہر چیز دھندلی دکھائی دینے کے ساتھ احساس کی ہلکی سی لہر نے اس کے نرم تلوؤں پر کسی نرم چیز کے رینگنے کا شعور دیا۔ دوسرا احساس اپنے ماتھے پر کسی ٹھنڈی چیز کا تھا۔ گدگدی سے بچنے کے لیے اس نے ٹانگیں سمیٹنے کی ناکام کوشش کے بعد پوری آنکھیں کھول کر اپنے پاؤں کی جانب دیکھا جہاں تھکن اور پریشانی سے مزید مرجھایا ہوا اجمل کا چہرہ ملائم آنکھوں کی ٹھنڈک بکھیر رہا تھا۔ یہ اجمل نفرت سے تنے ہوئے اجمل سے قطعی مختلف تھا۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر اجمل کی آنکھوں میں کامیابی اور سکون کی بے پناہ چمک لہرائی اور کشور کے جلتے ہوئے بدن میں ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔

وہ اجمل کے اس طرزِ عمل پر حیران ہوگئی مگر چھ ماہ کی رفاقت کے دوران نفرت کی مضبوط دیوار میں پہلی دراڑ پڑ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں حتیٰ کہ آواز تک سے نا آشنا تھے۔

''اب کیسی ہو؟'' لہجے کی ہمدردی شہد بن کر پہلی مرتبہ کشور کی روح میں گھل گئی۔

''اے...... پھر نہ بے ہوش ہو جانا......'' اس کے لہجے میں معصوم سی شوخی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ نفرت سے سڑتے ہوئے کسی پھل کا ذائقہ اتنا میٹھا بھی ہوسکتا ہے۔ ''اس وقت اکیلا ہوں، بالکل نہیں سنبھال سکوں گا۔'' اس نے اچانک آگے جھک کر لرزتی ہوئی انگشت شہادت سے کشور کا رخسار چھوا تو اس کا سارا وجود سنسنا اٹھا۔ کشور کے جسم میں ابلتا ہوا لاوا کمزور جھرنوں کی طرف بڑھنے لگا اور وہ تڑپ کر اپنے ہی تکیے میں چہرہ چھپا کر اسے سسکیوں سے چھلنی کرنے لگی۔ اچانک اسے اپنے سر کے پچھلے حصے پر سانپ کی طرح اجمل کی نرم انگلیوں کا لمس محسوس ہوا تو اس نے تڑپ کر سر جھٹکا۔

''اجو......'' اس نے بے بسی سے دیکھتے ہوئے غرانے کی کوشش کی۔ اجمل کے ساتھ وہ خود بھی اپنے بے ساختہ لہجے کی بے تکلفی پر حیران ہوئی۔ ''مجھے تنہا چھوڑ دو...... میں...... میں......'' سسکیوں کے سیلاب میں اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ آگے کیا کہے۔ اس نے ہاتھ کھینچتے ہوئے حیرانی سے کشور کو دیکھا۔

''خاموشی کا یہ مطلب نہیں کہ میں بالکل ہی بے حس جانور ہوں۔'' سپاٹ لہجے کے باوجود اجمل کے الفاظ شہد بن کر کشور کی روح میں گھل گئے۔ چند لمحے پہلے کی ملائمت بھی اجمل کے چہرے سے غائب ہوگئی تھی۔

''ڈاکٹر کا بے رحم ہاتھ سمجھ کر تھوڑی دیر اور مجھے برداشت کرلو۔'' اس کے تحکمانہ لہجے کی حقارت کی تہ میں بھرپور مٹھاس تھی۔ اس نے تکیے پر گرا گیلا کپڑا اٹھا کر دوبارہ اس کے جلتے ماتھے پر رکھ دیا۔ کشور کی سوچ منتشر ہوگئی۔

''میں...... میرا...... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' کشور نے پگھلتے ہوئے آنسوؤں کو اندر ہی بھاپ بنانا چاہا۔ دونوں اپنی اپنی کمزوری چھپا کر دشمنوں کی طرح ایک دوسرے پر حملہ آور ہورہے تھے۔

''تمہارے مطلب سے مجھے کیا غرض...... ابھی لیٹی رہو۔'' اس نے کشور کو اٹھتے دیکھ کر ڈانٹا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ڈانٹ کے پسِ پردہ اس کی تمام تر معصوم شرارتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''تمہاری ماں کہاں گئی؟'' استفسار کی سادگی کے

باوجود وہ نفرت کی راکھ نہیں سمیٹ سکا۔ اس کے باوجود اجمل کا بے تکلف طرزِ تخاطب کشور کے لیے سکون کا باعث تھا۔ اس نے بھری بھری نگاہوں سے تنے ہوئے اجمل کو دیکھا۔

''تمہارے ابا کے ساتھ کسی عزیز کے ہاں۔'' گو اس نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا تھا تو بھی اس میں جھجک اور خوف سا تھا۔

''تمہیں کس نام سے بلاؤں؟'' اس نے کسی چلتے ہوئے راہ گیر کی طرح بے نیازی سے پوچھا۔ کشور کا ذہن گھوم گیا۔ گویا اجمل نے پوری قوت اور نہایت بے دردی سے اس کا سر دیوار پر دے مارا ہو۔

''کیا تمہیں مجھ سے اتنی نفرت ہے کہ ایک ہی گھر میں چھ ماہ تک اتنا قریب رہ کر بھی میرا نام جاننا ضروری نہیں سمجھا؟ کیا میں چھوت کی بیماری ہوں جو نام کی طرح تمہیں لگ جاتی؟'' جسم کی بند دیواروں میں تکرار کی یہ گونج بڑی خوف ناک تھی۔ اس نے تکیے کی اندھیر کوٹھری میں اپنا تپتا ہوا چہرہ چھپالیا۔

''میرا نام تو تم نے خود میرے ماتھے پر لکھ دیا ہے پھر پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس نے کراہ کر کہا۔

''اس غلیظ نام کو اپنے سینے سے لگا کر بستر تک لانے کی کیا ضرورت تھی، گندگی سمجھ کر گلی میں پھینک دیتے۔'' اس نے سسکیوں کے درمیان سر اٹھا کر اجمل کو دیکھنا چاہا مگر...... مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک اور دھچکا...... یہ فضول آنسو اور تاثر سے خالی یہ مصنوعی سسکیاں جن میں سانس کا زیروبم کوئی نغمہ نہ بن سکا۔ شاید وہ پتھر سے سر پھوڑنے جا رہی تھی۔ اس نے آج تک ایسی نفرت کا زہر نہیں چکھا تھا۔ دکان بدل جانے سے کھلونے کی حیثیت نہیں بدلتی۔ اس کا تلخ تجربہ اسے ابھی ابھی ہوا تھا۔ چند منٹ پہلے کی ہمدردی نے اس کے اندر مستقبل کے کئی چراغ روشن کردیے تھے جو بے رخی کی ایک ہی پھونک سے بجھ گئے۔

باورچی خانے میں کسی برتن کے گرنے کی آواز سے وہ ایک دم سہم گئی۔ دل کی دھڑکن جیسے اس کی کنپٹیوں پر ہتھوڑے برسانے لگی تھی۔ باورچی خانے کے تعلق سے اسے یکایک اجمل کی بھوک کا احساس ہوا۔ تیزی سے بستر سے اترتے ہوئے اس نے پاؤں میں چپل پھنسائی اور ہانپتی ہوئی باورچی خانے کے دروازے پر جا رکی۔ دروازے کی طرف پشت کیے اجمل جھکا ہوا کسی برتن سے کوئی چیز نکال رہا تھا۔ اس کے آنے پر چونک کر سیدھا ہوتے ہوئے دروازے کی طرف گھوما تو وہ کسی معصوم سے بچے کی طرح سہم گیا۔ کشور نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ نم نم سی

جلتی ہوئی نگاہوں کی اوٹ میں اجمل کے ایک ہاتھ میں آدھی باسی روٹی اور دوسرے میں پیاز کی گانٹھ تھی جسے اس نے ٹوکری سے نکالا تھا۔ پھر وہ اس طرح شرمندہ شرمندہ سا دکھائی دینے لگا گویا چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ کشور پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ باسی روٹی اور پیاز کی گانٹھ...... کیا اتنے بڑے گھر میں اس کے لیے اتنی چھوٹی سی چیز کھانے کو رہ گئی تھی۔

''کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ماں کی آنکھ بچا کر پیاز کھالیا کرتا تھا۔'' اس کی زخمی سی مسکراہٹ میں کئی نشتر تھے۔ کشور کو لگا جیسے اس نے کند چھری اس کے دل میں اتار دی ہے۔

''اجو!'' حلق کے بل قدرے غرانے سے اس کے گلے میں پھندا لگ گیا اور وہ بے اختیار نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

''میں نے کہا تھا تمہیں ابھی بستر سے نہیں اٹھنا چاہیے...... تم بیمار ہو۔'' اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھامتے ہوئے ہمدردی کا ایک اور خنجر کشور کے وجود میں اتار دیا۔

''ہاں...... میں بیمار ہوں۔'' اس نے تلملاتے ہوئے جھٹکا دے کر بازو چھڑا لیا۔

''اور اب...... تم بھی مجھے ایک کمزور عورت سمجھ کر بار بار قتل کر رہے ہو...... کیوں؟ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح تن کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا۔'' اس نے بڑی نرم آواز میں کہا مگر خواہش کے باوجود اسے کوئی نام نہ دے سکا۔ اسی لیے اس کے سوکھے سے ہونٹ اب بھی کھلے تھے۔

''پکارو!......'' اچانک کشور کی جذباتی آواز کمزور سی شاخ کے مانند جھول گئی۔

''مجھے اپنے کسی بھی پسندیدہ نام سے پکارو، جس سے میری ماں کی کوئی نسبت نہ ہو۔'' وہ اپنے طوفانی لہجے پر خود بھی حیران تھی۔

''مجھے اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا...... میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے بڑے دکھ سے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ہے اجو!...... ہے......'' اس نے تڑپ کر ہذیانی سے انداز میں اس کی کلائی کو جھنجوڑ دیا۔

''یہ تمہاری نادان جذباتی سوچ کا انداز ہے اسے بدلو۔'' اس نے بڑے بزرگانہ انداز میں کشور کو نصیحت کی۔

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو......'' اس نے گہری تھکی ہوئی لمبی سانس لی۔ اجمل کی نگاہیں پہلی مرتبہ کشور کا گہرا جائزہ

لے کر اسے ٹٹول رہی تھیں۔

''مجھ سے...... میرا اپنا پن مت چھینو...... صندل!'' اس نے بڑے پرسوز لہجے میں خوشبو کے مانند ''صندل'' کا نام کشور کے پورے وجود... اور اس کی روح پر چھڑک دیا۔

''مرد اور عورت کے درمیان مبہم دوستی کے رشتے کا قائل نہیں ہوں۔'' اس کی گونجتی ہوئی سی آواز کشور کے رگ و پے میں آگ بھر گئی۔

اس نے اجمل کو پیاز سے روٹی کھانے سے روکتے ہوئے...... توا چولہے پر رکھ کر بڑی آسودگی سے کہا۔ ''اور مرد عورت کے درمیان تم دوستی کو مانتے ہی نہیں ہو۔''

''ہاں صندل! میں نے غلط نہیں کہا۔'' اس نے انڈا توڑ کر پیالے میں ڈالتے ہوئے پہلے سے قدرے پرسکون آواز میں کہا۔ ''دوستی صرف وہاں ہوتی ہے جہاں کسی اور رشتے کی گنجائش نہ ہو۔ اب یہ تم فیصلہ کر لینا کہ ہمارے درمیان کون سا رشتہ مناسب رہے گا۔'' اس نے پیالے پر نگاہیں جما کر دھیمے لہجے میں کہا۔

''کوئی سا بھی نہیں۔'' اس نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے بے اختیار شوخی سے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ کسی بھی رشتے کے قابل نہیں ہوں۔'' ایک ہی لمحے میں اس کا جلتا چیختا ماضی اس کے احساسات سے گزر گیا۔

''تب میں تمہیں ایک مشورہ دوں گا صندل۔'' اس نے ساکن نگاہوں سے صندل یعنی کشور کا جائزہ لیا۔ ''آئندہ مجھے چھونے کی کوشش نہ کرنا۔ رشتے کی قید سے آزاد تمہارا ایک اشارہ ہی مجھے میرے باپ کے برابر کھڑا کر سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم صندل کے نام کی لاج رکھو گی ورنہ میں اپنی نگاہوں میں گر جاؤں گا، مجھے روٹی دے دو۔ کمرے میں کھا لوں گا۔'' اس نے بڑی سادگی سے مگر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ وہ سٹپٹا گئی۔

توا ابھی تک اس کی طرح جل رہا تھا۔ دونوں جلی ہوئی انگلیاں اسے احساس دلا رہی تھیں کہ اس جیسی باسی روٹی کوڑے کی ٹوکری کی نذر ہو چکی تھی۔ اس کی ذرا سی جذباتی غلطی اس شگاف کو دوبارہ پر کر سکتی تھی جو ایک حادثے کی پیداوار تھا اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اندر سے ٹوٹ ٹوٹ کر تھکنے کے باوجود کسی کے پاؤں میں ڈھیر نہ ہوا جائے۔

''آخر کب تک اس طرح بیگانی بن کر گھر میں گزارہ کر سکتی ہو؟'' اجمل سے تصادم کے تیسرے روز آخر اس کی ماں نے زبان کھولی کیونکہ وہ اجمل کے باپ کے پاس چائے لے جانے سے ہچکچا رہی تھی۔ کشور نے بے بس نگاہوں سے ماں کو دیکھا جو جلتی پر تیل کا کام کر گئیں۔

''اب کوئی کنواری لڑکی تو ہو نہیں جو ہر قدم پر یوں مجھے دیکھو۔ یہ کڑوا گھونٹ بھی میں نے تیری وجہ سے بھرا ہے۔'' ماں کا انداز بڑا اکھڑا ہوا تھا۔

''چار ماہ کے بعد بھی اگر تم نے قدم جمانے کی کوشش نہیں کی تو میں کہاں تک تیری پہاڑ جیسی جوانی کو سہارا دے سکوں گی۔ جاؤ چائے دے آؤ۔ آخر وہ تمہارے باپ کی جگہ پر ہے۔'' آخری الفاظ ماں نے نرمی اور شفقت سے ادا کیے تھے۔

''مگر ماں......'' اس نے کہنا چاہا۔

''میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میری ایک ہی دھمکی پر تمہارے خصم نے بیٹھے بیٹھے طلاق کا کاغذ لکھ دیا تھا۔ تم کیا سمجھتی ہو مجھے۔'' اس نے فخر و غرور سے بیٹی کو قائل کیا اس کے لہجے میں چھپے طنز کے نشتر نے کشور کی زبان کاٹ دی تھی۔ وہ مجبوراً چائے اٹھا کر چل دی۔

آہٹ پر اجمل کے باپ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تو کشور کا ہاتھ لرز سا گیا اور اس نے جلدی سے چائے میز پر رکھ دی۔ اجمل کے باپ نے مسکراتے ہوئے کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا تو وہ پسینے میں نہا گئی۔

''آپ کو کچھ اور تو نہیں چاہیے؟'' کشور نے خود کو سنبھالنے کے لیے خوامخواہ ہی پوچھا۔ اس نے عجیب سی نگاہوں سے کشور کو دیکھا اور پھر مسکرا پڑا۔

''فی الحال، بس اپنا خیال رکھو...... اب تو یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔''

''جی شکریہ۔'' اس نے پرسکون آواز میں جواب دیا اور ٹرے اٹھا کر جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔

اجمل سے ٹکراؤ کے بعد وہ دلجمعی سے گھر کے انتظام میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس کے باوجود کہ اجمل کا رویہ جذبات کے تبادلے کے باوجود پہلے سے زیادہ محتاط اور پراسرار ہو گیا تھا۔ تلخی اور عدم تحفظ کا احساس اب بھی اپنی جگہ موجود تھا۔ وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس نے سوتیلے باپ کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا وہ ماں کی موجودگی میں کبھی کبھی اس کے ساتھ کھانا بھی کھانے لگی لیکن اجمل گھرانے کے فرد کی طرح کھانے کی میز پر اب تک نہیں بیٹھا تھا اور یہی بات کشور کے اندر ہلچل مچا دیتی تھی۔

''کیا بات ہے اجمل بیٹا ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوتا؟'' آخر ایک رات کھانے کی میز پر ماں

نے پہلے کشور کو دیکھ کر اجمل کے باپ سے پوچھا۔

''اکلوتا ہونے کی بنا پر ذرا لاڈلا تھا اس لیے ذرا ضدی ہے۔'' اجمل کے باپ نے بات ٹالی۔ ماں مسکرا پڑی۔

''قدرتی بات ہے...... ویسے اسے بھی پیار سے سمجھا دیجیے آخر کب تک یوں الگ تھلگ رہے گا۔ کوئی بیگانہ تو نہیں ہے۔ کشور کی طرح اب میں اس کی بھی تو ماں ہوں۔'' ماں کا انداز بہت ملائم اور آواز میں مٹھاس تھی۔ گویا اس کے اندر اجمل کے لیے واقعی ممتا کا چشمہ پھوٹ رہا ہو۔ اجمل کا باپ جز بز سا ہو کر کشور کو دیکھنے لگا جو پلیٹ کی طرف جھک گئی تھی۔

''مناسب وقت پر سمجھا دوں گا مگر وہ بچہ تو نہیں...... اتنی چھوٹی سی تبدیلی کو اسے قبول کر لینا چاہیے۔'' اس نے ماں کو گہری نگاہوں سے دیکھا، وہ خود بھی ہٹ دھرم تھا۔

''خیر جانے دیجیے، جوان جہان بچے پر دباؤ ڈالنا بھی ٹھیک نہیں۔'' ماں نے بڑی حکمت سے موضوع بدل دیا مگر کشور کو پتا نہیں کیوں محسوس ہوا جیسے ماں نے خشک پتوں میں چنگاری ڈال دی ہے۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی ماں ان سے ایسی بات کرنے کی؟'' باورچی خانے میں برتن سنبھالتے ہوئے کشور نے دبے لفظوں میں کہا۔ ایسا کہتے وقت اسے اپنا دل اچھل کر حلق میں آتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''تم نے ابھی ایک ہی مرد کی شکل دیکھی ہے بیٹی۔'' ماں کی سرگوشی میں غراہٹ تھی۔ ''اس گھر میں تمہاری بھی تو جگہ بنانی ہے۔'' ماں کی آنکھوں اور لہجے کا انداز بڑا زہریلا تھا۔ کشور کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

''میں کب تک اس گھر میں رہ سکتی ہوں؟'' اس نے بڑے دکھ سے کہا اور ماں جیسے سکتے میں آگئی۔

''کوئی اور گھر دیکھ لیا ہو تو ابھی چلی جاؤ۔'' ماں نے سانپ کی طرح پھنکار کر کہا تو وہ سہم گئی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا ماں۔ آخر کب تک تم پر بوجھ بنوں گی؟'' اس نے بات گھمانا چاہی۔

''یہ بات طلاق لینے سے پہلے سوچتی تھی۔'' وہ پھولے ہوئے غبارے کی طرح پھٹ پڑی۔ ''تو کیا سمجھتی ہے، تیرے خصم سے طلاق لینا آسان تھا...... جاؤ جو کچھ کرنا چاہتی ہو کرو۔ تیرا خصم راستے میں تجھے اٹھا کر نہ لے جائے تو اپنی ماں پر تھوک دینا۔'' وہ تیز و تند نگاہوں کے تیر بیٹی پر برساتی باورچی خانے سے نکل گئی۔ وہ جلتے ہوئے چولہے کا حصہ بن گئی۔

گھر کی بند چار دیواری میں نظریں گھوم کر اجمل ہی پر ٹھہرتی تھیں مگر اس کی خاموشی اور سرد مہری اس کے حوصلے کی ہر اینٹ اس طرح گرا دیتی کہ خود ہی اس کی چوٹ بھی برداشت کرتی۔ وہ اس طرح اجمل کو ماں کے ارادوں کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتی تھی جس سے اجمل یہ تاثر نہ لے کہ وہ اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اپنی ہی ماں کے خلاف زہر اگل رہی ہے۔

''تم اپنے آپ سے بہت زیادہ بے پروا ہوتے جا رہے ہو۔'' ایک دن موقع پا کر اس نے باورچی خانے میں اجمل سے کہا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوالیہ نگاہوں سے کشور کو دیکھا اور پھر کھانا اٹھا لیا۔

''معلوم ہوتا ہے تم نے اپنے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے اس لیے صرف اپنا خیال رکھو۔'' اس نے بڑی سرد مہری سے کہا اور کھانا لے کر غائب ہو گیا۔

دن خاموشی سے گزرنے لگے تھے لیکن اسے ہر لحہ طوفان کے پھٹ پڑنے کا دھڑکا لگا رہا۔ اجمل بھی خوش فہمی کے سوا کچھ نہ تھا کیونکہ گندی نالی کا پانی اتنی جلدی نہیں تھر سکتا تھا کہ اسے اجمل ایسا شخص فوراً ہی پینے پر تیار ہو جاتا۔

چھٹی کے روز دوپہر کے کھانے میں تاخیر ہو گئی تھی اس لیے جب اجمل نے باورچی خانے میں جھانک کر دیکھا تو دونوں ماں بیٹی کھانا بنانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ دونوں نے بیک وقت اسے دیکھا مگر کشور کو دیکھتے وقت اجمل کی نگاہوں میں قدرے ملائمت دیکھ کر ماں چوکنی ہو گئی۔

''بس تھوڑی دیر اور بیٹے۔'' ماں نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ ''پھر اکٹھے ہی کھا لیں گے، روز روز کہاں ایسا موقع ملتا ہے۔'' مگر جواب میں اجمل نے جن نگاہوں سے ماں بیٹی کو دیکھا، کم از کم وہ انداز کشور کے لیے بڑا حوصلہ شکن تھا۔ وہ خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔

''کیا تمہاری آپس میں آج تک کوئی بات نہیں ہوئی؟'' ماں کام کرتے کرتے ہاتھ روک کر ایک دم بیٹی پر جیسے حملہ آور ہوئی۔

''نہیں۔'' کشور نے وقفہ لیے بغیر بڑی بے نیازی سے کہا اور ماں اس کے سراپا کا جائزہ لے کر پرسکون گہری سانس لیتے ہوئے کام میں مشغول ہو گئی۔ کھانے کی میز پر ماں ہی نے بات چھیڑ کر اجمل کے باپ کو اجمل کو بھی کھانے میں شریک کرنے کے لیے مجبور کیا۔

''ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ لائبریریاں چوبیس گھنٹے

کھلی نہیں رہتیں۔'' ملک صاحب نے پررعب آواز میں حکم دیا۔ دونوں ماں بیٹی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''ایک بہت ضروری نوٹ تیار کر رہا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو......''

''بکواس بند کرو......'' ملک صاحب ایک دم پھٹ پڑے۔ ''باپ کا حکم کتابوں سے آگے نہیں ہوتا۔''

''مجبوری بیان کر رہا تھا ابو...... ابھی مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے پہلی مرتبہ قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''بدتمیز، بے لگام۔'' ملک صاحب نے دانت پیستے ہوئے ایک بھرپور تھپڑ اجمل کے رخسار پر جما دیا۔ دونوں ماں، بیٹی گھبرا کر کھڑی ہوگئیں۔ گالیوں کا طوفان کمرے کی ہر چیز کو الٹ پلٹ کر گیا تھا۔

''ہے...... ہے...... جوان جہان بچے پر یوں ہاتھ نہیں اٹھایا جاتا۔'' ماں نے بڑی ہمدردی سے پہلی مرتبہ دخل اندازی کی۔

''تم چپ رہو بیگم۔ میں بہت دنوں سے اس کی گستاخی برداشت کر رہا ہوں۔ جیسے تم سے شادی کر کے میں نے کوئی جرم کیا ہے۔'' ملک صاحب نے بدستور گرجتے ہوئے کہا۔ کشور نے دزدیدہ نگاہوں سے اجمل کو دیکھا جس نے ابھی تک گال پر ہاتھ جمایا ہوا تھا۔ ''گھر کو گھر نہیں سمجھ سکتے تو بے شک یہاں سے دفع ہوجاؤ۔ اب تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو۔''

''جی بہتر ہے۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

اجمل نے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے باری باری دونوں ماں بیٹی کو بڑی زخمی نگاہوں سے دیکھا اور پھر اتنی تیز و تند نگاہیں باپ پر ڈالیں کہ وہ مزید کوئی گالی دیتے دیتے رک گیا۔ اس کے گال پر باپ کی پانچوں انگلیوں کے نشان ابھر آئے تھے۔

''آپ کو اتنی سختی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔'' اجمل کے رخصت ہوجانے کے بعد ماں نے لیپا پوتی کرنا چاہی۔

''اس نے اپنی زبان درازی سے مجھے اتنی سختی پر مجبور کر دیا تھا۔'' اس نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے غرا کر کہا۔ اس نے دوبارہ پلیٹ اپنے آگے کھسکاتے ہوئے زرد رو کشور کو قدرے ملائم نظروں سے دیکھا۔

''ارے، تم کیوں کھڑی ہو؟'' اچانک مخاطب کیے جانے پر کشور سٹپٹا گئی۔ ''تم اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ آج نہیں تو کل یہ بات ہونی ہی تھی۔'' اس نے بڑی شفقت سے اسے تسلی دیتے ہوئے خود بھی کھانا پلیٹ میں نکال لیا، گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

اجمل کا بند کمرا دیکھ کر کشور کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے جو اسے مگر مچھ کے محسوس ہوئے۔ وہ پہلے بھی اس کے لیے کچھ نہیں تھا اور اب تو خیر وہ کچھ بھی نہیں تھا مگر ''تھا''۔ کاش وہ اجنبیت کی دیواروں میں اتنا چھوٹا سا شگاف بھی نہ بناتا کہ تنگ جگہ سے گزرتا ہوا یاد کا جھونکا سوئی کی تیز نوک بن جاتا۔

ماں کی آواز پر اس نے بے قابو آنسوؤں کو ضبط کیا۔

''دیکھ میں نے کتنی ہوشیاری سے تیرے راستے کی ایک مضبوط دیوار گرادی ہے۔ تو بھی ذرا عقل مندی اور ہوش سے کام لے گی تو اس گھر پر راج کرے گی۔'' باورچی خانے میں ماں نے جوشیلی سرگوشی کی تو کشور نے پہلی مرتبہ بے خوفی سے ماں کو دیکھا۔

''پھر بھی بیٹی، بیٹے کی جگہ تو نہیں لے سکتی ماں۔'' اس نے کھل کر کہا۔ طوفان تو گزر چکا تھا پھر وہ خوف زدہ کیوں ہوتی۔ دہشت تو طوفان آنے سے پہلے ہوتی ہے۔

''ہشت......!'' ماں نے نشۂ کامیابی میں پیار بھری گھرکی دی۔ ''حالات کے مطابق سوچ بدل کیونکہ سوچ کے مطابق حالات نہیں بدلتے اور پھر عورت تو بڑی طرح ہوتی ہے۔ ہزار طریقوں سے مرد کو لپیٹ لیتی ہے۔'' ماں کی مسکراہٹ ذومعنی تھی۔ کشور حیران ہو کر سوچتی چلی گئی کہ آخر ماں اسے کس راستے پر لے جانا چاہتی ہے۔

''یہ کام تو تو کر چکی ہے ماں۔'' اس نے گھٹی ہوئی آواز میں قدرے جرأت سے کہا۔ اسے یقین تھا کہ ماں اس کی بے باکی پر بال نوچ ڈالے گی مگر خلافِ توقع اس نے بڑی پیار بھری نگاہوں سے کشور کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''میں تو سمجھتی تھی تو سہمی ہوئی بھیڑ ہی رہے گی۔ شاید تو بھی ابھی تک اس چھوکرے کی وجہ سے ڈرتی رہی تھی۔'' ماں نے بڑی پرامید نگاہوں سے اپنی بات کی تصدیق چاہی۔ وہ بیٹی کو چابی والا کھلونا سمجھ کر گھما رہی تھی۔

''شاید...... ورنہ ملک صاحب کا وہی تھپڑ میرے گال پر بھی پڑ سکتا تھا۔'' کشور نے گمبھیر سنجیدگی سے کہا۔ اسے اپنے اندر ایک نئی عورت ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک نئی کشور کیونکہ چند دن پہلے اجمل کی لگائی ہوئی صندل کی سوکھی سی شاخ قد آور درخت تو نہیں بن سکتی تھی۔

''ہاں مجھے بھی یہی خطرہ تھا، کہیں اس چھوکرے کی طرح کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھے۔'' ماں کا تعریفی لہجہ خوشی سے

بھرپور تھا۔

''پتا نہیں بے چارہ کہاں گیا ہوگا؟'' کشور بے اختیار سوچتی چلی گئی۔

وہ اب ہر قدم پر ماں کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کررہی تھی تاکہ اپنے غیر یقینی مستقبل کے بارے میں کوئی یقین حاصل کرسکے جواب میں ماں کا طرز عمل بھی بدلا اور سوتیلے باپ کی نگاہ بھی نرم اور شفیق ہوگئی اور وہ مطمئن ہوکر اپنی دانست میں اجمل کی کمی پوری کرنے لگی۔

دونوں کے نرم رویے سے اعصابی تناؤ کم ہوا تو اجمل ہوا کا گزرا ہوا جھونکا بن گیا۔ البتہ کبھی کبھی چند لمحوں کے لیے مستقبل کا خوف کشور کو بے حد مضطرب کردیتا۔ پہاڑ سی زندگی کسی کی رفاقت کے بغیر کیسے گزرے گی کیونکہ ماں اس کے مستقبل کے ذکر سے بالکل گریز کررہی تھی اور اب بھی دوپہر کے وقت جب اس کی ماں کھانا کھانے کے بعد گہری نیند سو رہی تھی، کشور ادھڑی ہوئی اون کی طرح الجھ گئی تھی۔ دروازے پر اچانک محتاط مگر مانوس دستک سن کر اس کا تمام خون چہرے میں کھنچ آیا۔ یہ وقت کالج سے اجمل کی واپسی کا تھا۔ اس نے شدید کشمکش کے عالم میں سوئی ہوئی ماں کو دیکھا اور دوسری دستک پر پاؤں میں اسفنج کی چپل پھنسا کر دبے قدموں باہر کے دروازے پر پہنچی اور پٹ ذرا سا کھول دیا۔

اجمل کسی سخت اور سپاٹ چٹان کی طرح اس کے سامنے کھڑا گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ کشور کی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ ٹانگیں کپکپانے لگیں کیونکہ اجمل کی آنکھوں میں نفرت و حقارت کے کوندے لپک رہے تھے۔

''آج تو بیمار نظر نہیں آرہی ہو۔'' اس نے کشور کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر کھر کھراتی آواز میں کہا۔

''ماں سو رہی ہے۔'' اس کے لہجے میں دراڑ پڑ گئی۔ اتنے دنوں کے سکون کے بعد اسے اجمل کی آمد طوفان سے کم محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''سو رہی ہے تو جگا دو، میں کوئی چوری کرنے تو نہیں آیا۔'' اس نے کشور پر جیسے پتھر اچھال پھینکا۔ اس نے دروازے میں قدم رکھ دیا تھا۔ ''جب تک میرا باپ مجھے عاق نہیں کردیتا، میں اس گھر میں بلا اجازت آسکتا ہوں۔''

وہ بے وزن روئی کی طرح ایک طرف پچک گئی۔ ''امید ہے آپ اس گھر سے مانوس ہوگئی ہوں گی۔'' وہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سرگوشی کرتا گیا۔ اس کا لہجہ بے حد زہریلا تھا۔ کشور اپنے اندر کا ابال روکنے پر مجبور ہوگئی تب اسے محسوس ہوا کہ ہوش میں رہتے ہوئے زبان بند رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ آنسوؤں کی ٹھنڈک کے بجائے بے بسی کی آگ میں اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

''لڑکی تو جہاں پیدا ہوتی ہے، سالوں وہاں رہنے کے باوجود مانوس نہیں ہو پاتی۔'' کشور نے زخمی لہجے میں جواب دیا۔ الفاظ کی طرح جیسے اس کے اعضا بھی بکھر گئے مگر اجمل بے نیاز مسکراہٹ سے ان اعضا کو روندتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور وہ کسی خادمہ کی طرح اس وقت تک دروازے پر کھڑی رہی تا آنکہ وہ چند کتابیں لیے دوبارہ دروازے پر نہ آگیا۔

''وفادار چوکیدار ہو۔'' اس نے طنز بھری شریر مسکراہٹ سے کہا۔ ''اس لیے میرے باپ کو نہ بتا سکو تو اپنی ماں کو ضرور بتا دینا کہ میں آیا تھا ورنہ مفت میں ماری جاؤ گی۔'' اس نے کتابیں لہرائیں۔ ''میں صرف یہ کتابیں لینے آیا تھا۔'' اجمل کی آنکھوں میں فاتحانہ سی چمک تھی۔

''تمہارے پاس کہنے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں؟'' اس نے پہلی دفعہ بڑے کرب سے پوچھا۔ اجمل نے ایک لمحے تیز نگاہ ڈالی۔

''ہے......!'' اس نے تیزی سے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بھاری آواز سے کہا۔ ''یہ بھی لیے جا رہا ہوں تاکہ آئندہ آؤں تو تمہیں دروازہ کھولنے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔'' اس نے اپنی مٹھی کشور کے سامنے کھول دی جس میں باہر کے دروازے کی چابی تھی۔ خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کے باوجود وہ کشور کو نہ ٹوٹنے والی سکی محسوس ہوا۔

''تم بھی اپنے باپ سے کم نہیں ہو۔'' بے بسی کی حالت میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکی۔

''مگر شکر کرو، اپنے باپ کی طرح نہیں ورنہ دو جڑواں بچوں کی طرح پہچان مشکل ہوجاتی۔'' مسکراہٹ کے باوجود نگاہوں میں طنز کا تیر تھا۔

''تم نے پہلے بھی میری ماں پر ایک احسان کیا تھا۔'' اس نے چابی جیب میں ڈالتے ہوئے خفیف سی جھجک سے کہا۔ اس کی آواز نرم تھی۔ وہ اس چانک تبدیلی پر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی، ان چند لمحوں میں اس کے دل کی دھڑکن جیسے تھم گئی تھی۔

''ایک احسان اور کرو......'' اجمل کی آواز بے حد سنجیدہ ہوگئی اور وہ کشور کے چہرے پر ردعمل دیکھنے لگا مگر وہ خاموش رہی۔ ''یہاں ایک بوڑھا پھیری والا آیا کرتا ہے۔ کئی ماہ ہوئے وہ نہیں آیا۔ میری ماں اس کا بہت خیال رکھتی تھی کیونکہ بجری کے ایک ہی ٹرک پر مزدوری کرتے ہوئے

اس کے چاروں جوان بیٹے حادثے کی نذر ہو گئے تھے۔'' اجمل کی آواز سلگ رہی تھی۔ کشور کا سانس اوپر کا اوپر رہ گیا۔ اس نے دروازے کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

''محلے سے بیک وقت چار جوان جنازے اٹھے تو ایک قیامت کا سماں تھا۔'' اجمل کی آواز جیسے خود بھیگ گئی۔ اس نے نظریں بھی ہٹالی تھیں اور قدم دروازے کے باہر رکھ دیا تھا۔

''اگر وہ میری عدم موجودگی میں کبھی آئے تو اس کا خیال رکھنا۔ میری ماں، بیٹی کی طرح اصرار سے اسے کھانا کھلاتی تھی۔'' اس نے جلدی جلدی کہا۔ ''وہ بھیک نہیں مانگتا بہت خوددار ہے۔'' اس نے تیزی سے بات کی اور ہوا کے جھونکے کی طرح باہر کی جانب چل دیا۔

''جاؤ...... خدا حافظ۔ ہر دفعہ پتھر سمجھ کر مجھ پر ہتھوڑے نہ برسانے آیا کرو۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز سے کہا تو وہ ٹھہر کر ذرا سا گھوم گیا، اداس نگاہوں سے کشور کے سراپا کا جائزہ لیا۔

''معاف کرنا، شاید میں نے تم پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے اور تم پتا نہیں کون سے سہانے سپنے دیکھ رہی ہو مگر ایک بات یاد رکھنا......'' اس کا انداز بے پناہ سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ ''خواب جتنا سہانا ہوتا ہے، ٹوٹنے پر اتنی ہی تکلیف بھی دیتا ہے۔'' وہ ایک ہی جست میں اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تو کشور کو لگا جیسے وہ اسے گردن تک زمین میں دبا گیا ہے۔

''بے رحم...... وحشی...... درندہ۔'' وہ بڑبڑاتی چلی گئی مگر اس کی اپنی ہی ماں اس سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی تو بھلا وہ اجمل کو کیا الزام دیتی۔ کبھی کبھی تو اسے اپنے سوتیلے باپ سے بھی دہشت محسوس ہوتی جیسے وہ ماں کے ساتھ مل کر اس کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہو۔

''کیا بات ہے جو جلتی ہوئی ہنڈیا کا بھی ہوش نہیں؟'' ماں آندھی بن کر باورچی خانے میں داخل ہوئی تو وہ ہڑبڑا کر چوکی سے کھڑی ہو گئی اور بے خیالی میں گرم گرم پتیلی بغیر کپڑے کے چولہے سے اتار دی۔

''کچھ نہیں ماں، بس ایسے ہی سوچنے لگی تھی۔'' اس نے انگلیوں کی جلن کو ضبط کرتے ہوئے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تو ماں نے خلاف توقع آگے بڑھ کر ایک دم اسے گلے سے لگا لیا۔ جواب میں کشور بے اختیار ہچکیاں لینے لگی۔

''تو یہ نہ سمجھ کہ مجھے تیرا خیال نہیں۔'' وہ کشور کو سہلاتے ہوئے نرم اور محتاط بھری آواز میں سرگوشی سی کرنے لگی۔ ''جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا، اب آگے کی سوچ۔'' اس نے ملائمت سے کہا تو وہ ماں سے الگ ہو کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ ''میں تمہاری دشمن نہیں مگر حالات نے مجھے بھی... بے بس کر دیا ہے اس لیے حالات سدھارنے کے لیے تمہیں بھی میرا ہاتھ بٹانا ہوگا۔'' ماں کا لہجہ بڑا میٹھا تھا۔ ''تمہارے ہاں کوئی بچہ ہی ہو جاتا تب بھی کچھ نہ کچھ ہو سکتا تھا مگر میری طرح شاید تو بھی بانجھ......'' ماں ایک دم خاموش ہوئی تو کشور کے خون میں چنگاریاں بھر گئیں۔ وہ بت بن کر خاموش نگاہوں سے ماں سے جلتا ہوا سوال پوچھنے لگی۔

''اگر تو بانجھ ہے تو پھر میں کہاں سے ٹپک پڑی؟'' ماں کے لبوں پر کھسیانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میرا مطلب ہے اگر بیٹا نہ ہو تو عورت خود کو آدھی بانجھ سمجھتی ہے۔'' ماں نے جلدی سے وضاحت کرکے اسے مطمئن کرنا چاہا۔ ''تیرے خصم نے اسی بہانے تجھے طلاق دی ہے کیونکہ وہ اپنے اوپر الزام لے کر طلاق دینے پر آمادہ نہیں تھا۔'' ماں نے انجانے میں قصاب کی طرح کشور کے گلے پر چھری پھیری تو وہ تڑپ اٹھی۔

''ماں......!'' اس نے شکستگی انداز میں احتجاج کیا۔ ''تم نے مجھے آج تک یہ بات نہیں بتائی۔''

''تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ماں نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

''تمہارا مقصد طلاق لینا تھا خواہ وہ کسی بنیاد پر ملتی۔'' ماں نے الزام کا سارا بوجھ بیٹی پر ڈال دیا۔

''کیا میں قصوروار تھی؟'' کشور زخمی بلی کی طرح غرائی تو ماں عجیب انداز میں مسکرا پڑی۔

''مان لیتی ہوں قصور تمہارا نہیں تھا مگر تم بتاؤ میرے پاس اور کون سا راستہ تھا۔ تمہارے باپ کے رشتے داروں نے میرے چاروں طرف اپنی نفرت کا زہر اس طرح پھیلا دیا تھا کہ کوئی شریف خاندان بدنامی کی دہلیز پار کر کے حقیقت جاننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہہ کر بڑی شفقت سے کشور کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''مگر میں کس جرم کی سزا بھگت رہی ہوں؟'' کشور کا احتجاج بے بسی کی تصویر میں ڈھل گیا۔

ماں کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''اب ایک مشورہ دیتی ہوں اگر تمہاری سمجھ میں آجائے تو......'' اس نے ہمدردی کا مرہم رکھنا چاہا۔ جواب میں وہ بنجر چٹان کی طرح ساکن ہو گئی۔ ''مرد کے سائے میں عورت برہنہ بھی ہو تو

کسی کو انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی اور اجمل کا باپ تو بارسوخ آدمی بھی ہے۔ کئی بڑے بڑے گھرانوں سے اس کے تعلقات بھی ہیں۔ اگر پیار محبت سے تم اپنے سوتیلے باپ کو اعتماد میں لے لو......"

"ماں......" کشور نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"پہلے میری پوری بات سن لو پھر جو چاہے کرنا۔" ماں نے قدرے ناگواری سے کشور کو ٹوکا۔

"تم اب بچی نہیں ہو جو تمہیں گود میں بھر کر کسی جگہ لے جاؤں، باپ کے ساتھ کہیں آؤ جاؤ گی تو کوئی مناسب رشتہ مل جائے گا۔ یہ نہ سوچو کہ اجمل کی طرف میری نگاہ نہیں اٹھی تھی۔" اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر اپنی بات کا ردِعمل دیکھا۔ کشور کے بدن میں سوئیاں اتر گئیں۔ "مگر ملک صاحب کسی بانجھ کو بہو بنانا پسند نہیں کریں گے اور پھر یہ اچھا بھی نہیں لگتا کہ ماں بیٹی ساس بہو بھی کہلائیں۔"

"میں یہ سب کچھ نہیں سوچ رہی ماں۔" وہ بلبلا اٹھی۔ ماں اتنی تیز دھار تلوار بھی بن سکتی ہے اس کا اسے گمان تک نہ تھا۔

"میرا کام تمہیں راستہ دکھانا تھا، چلنے نہ چلنے کا فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے...... اور جتنی جلد فیصلہ کرلو اتنا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔" ماں نے پہلی مرتبہ رکھائی سے دو ٹوک فیصلہ سنا دیا۔ کشور سناٹے میں آ گئی۔

"مشورے کا شکریہ ماں۔" کشور نے ابلتے ہوئے ذہن کو قابو میں کر کے مردہ آواز میں کہا۔ لگتا تھا ماں نے اپنا دیا ہوا خون بیٹی کے جسم سے نچوڑ لیا ہے۔ آخر اس نے سوتیلے باپ سے مکمل سمجھوتا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ رویے میں اک ذرا سی تبدیلی ہی تو کرنی تھی پھر ماں کی موجودگی میں خطرہ بھی کس بات کا تھا۔ جواب میں ملک صاحب کے رویے میں بھی شوخی اور شفقت گھل مل گئی جیسے اس نے اپنے بیٹے اجمل کے نام کا لیبل کشور کے ماتھے پر لگا دیا ہے۔

گاڑی جیسے صحرا سے ہرے بھرے کھیتوں میں داخل ہو گئی۔

تقریباً ہفتے بھر بعد دوپہر کے کھانے کے بعد کشور نے دروازے پر ٹک ٹک کی نامانوس آواز پر پٹ کھول کر جھانکا تو اجمل کا تصور ایک دفعہ پھر اس کے سامنے مجسم ہو گیا۔ سر پر چھوٹی سی پھلوں کی بھری ٹوکری، گرد آلود کھچڑی ڈاڑھی، دھندلی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک جس کے پیچھے ایک آنکھ اپنا نور کھو چکی تھی۔ ہاتھ میں ٹیڑھی لاٹھی جس پر سالوں سے میل جما آیا تھا۔ پاؤں میں دو مختلف پھٹے پرانے جوتے جنہیں جوتا کہنا بھی موچی کی توہین تھا اور اس کا جسم سر پر رکھی ٹوکری کی شاخوں کی طرح کمزور نظر آرہا تھا۔ وہ اپنی دوسری سلامت مگر دھندلی آنکھ سے حیرانی سے کشور کو دیکھنے لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس بڑھاپے میں وہ کتنی ہمت سے سر پر وزن اٹھائے پھرتا ہے۔ اسی لیے اس نے بے اختیار خود آگے بڑھ کر ٹوکری اس کے سر سے اتار کر فرش پر رکھ دی۔

"خدا تیرا نصیب اچھا کرے بیٹی۔" پھولی ہوئی سانس کے باوجود بوڑھی آواز کشور کے کانوں میں رس گھول گئی اور اسے یقین نہیں آیا کہ کسی بوڑھی آواز میں اتنی بھی مٹھاس ہو سکتی ہے۔

"بیٹھ جاؤ بابا۔" اس نے اس کی لاٹھی سہار کر فرش پر بیٹھنے میں مدد دی۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ "کیوں اتنا وزن اٹھائے پھرتے ہو؟" اس نے میٹھے لہجے میں شکایت کی۔

"بس بیٹا، پیٹ کا گڑھا جو بھرنا ہوتا ہے۔" اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر پھر کشور کو حیرانی سے دیکھا۔ "اللہ تجھے سلامت رکھے......کون ہو بیٹی؟ کیا پہلے والے بابو یہ گھر چھوڑ گئے؟" اس کے انداز میں واضح طور پر مایوسی تھی۔

"اب تو ڈھنگ سے نظر بھی کام نہیں کرتی۔" اس نے جیسے معذرت کی۔

"نہیں بابا...... سب لوگ یہیں ہیں۔" اس کی پیاسی روح میں عجیب طرح کی فرحت گھل گئی اور وہ خود بخود پنجوں کے بل اس گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ گئی۔

"اوپر والا یہ گھر سلامت رکھے، تجھے دیکھ کر بیگم صاب یاد آ گئی۔ اللہ بخشے بڑی پیار کرنے والی بیٹی تھی۔" اس کی آواز بھرا گئی اور دوسرے ہی لمحے اس کی ایک آنکھ سے آنسو ڈھلک پڑا۔

"کیا تم چھوٹے بابو کے گھر سے ہو...... کب شادی کی اس نے؟" اس نے اپنی بے انتہا میلی قمیص سے آنسو صاف کیے۔

"نہیں بابا، ابھی چھوٹے بابو کی شادی نہیں ہوئی۔ میں تو مہمان آئی ہوں۔" کشور نے سلگتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"معاف کرنا بیٹی، بہت دنوں کے بعد آیا ہوں اس لیے کچھ پتا نہیں...... دل نہیں مانا، تو چلا آیا۔ پچھلے کئی مہینوں سے بیمار ہوں نا۔" اس نے ایک دفعہ پھر غور سے کشور کی صورت دیکھ کر ذہن نشین کرنا چاہی۔

"کہاں رہتے ہو بابا؟ میں تمہاری خدمت کروں گی۔" اس نے بڑی سرشاری سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ

اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

''اللہ تجھے اپنے گھر میں آباد رکھے بیٹی۔'' اس نے اپنا ایک ہاتھ چھڑا کر پدرانہ شفقت سے کشور کے سر پر پھیرا۔ ''تجھے دیکھ کر ہی جی ہلکا ہوگیا ہے۔ چھوٹے بابو گھر میں نہیں ہیں؟'' اس نے کشور کا ڈھلکا ہوا دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... ابھی پڑھ کر واپس نہیں آئے۔'' اس نے جھوٹ بولا۔

''ابھی تک پڑھ رہا ہے چھوٹا بابو۔'' اس نے تعجب سے کہتے ہوئے ٹوکری اپنی طرف کھسکالی۔ ''جب آئے تو اسے میرا پیار دینا۔ بڑا اچھا بچہ ہے، بالکل اپنی ماں کی طرح میرا خیال کرتا ہے۔'' اس نے چند پھل چن کر کشور کی جھولی میں زبردستی ڈال دیے۔

''یہ کیا بابا...... یہ تو تمہاری روزی کا ذریعہ ہیں۔'' اس نے پھل واپس ٹوکری میں ڈالنے چاہے تو اس نے کشور کا ہاتھ روک دیا۔

''روزی صرف اوپر والے کے ہاتھ میں ہے بیٹی۔'' اس کی بوڑھی آواز جذبات سے کپکپارہی تھی۔ ''تمہیں پہلی دفعہ دیکھا ہے تو باپ کے ناتے کچھ نہ کچھ فرض بنتا ہے...... دیکھو میرا دل نہ توڑنا۔'' اس کی آواز بھرا کر اور بھی دھیمی ہوگئی۔ ''بیٹی گھر میں ہوتی ہے تو رحمت کے فرشتے سایہ کیے رہتے ہیں۔'' ٹپ ٹپ کئی آنسو پھلوں پر جگمگا اٹھے۔ اگر اجمل اسے پس منظر نہ بتا گیا ہوتا تو وہ بوڑھے کے غم کی ذرا سی بھی آنچ محسوس نہ کرسکتی۔

''بابا......!'' وہ خود بھی تڑپ گئی۔ ''ہم دونوں مل کر تمہاری خدمت کریں گے۔'' اس نے جذباتی لہجے میں دلی خلوص سے کہا۔

''اللہ تم دونوں کو اپنے گھر میں خوش رکھے۔ خدمت تو قسمت سے ملتی ہے...... اچھا میں اب چلتا ہوں، چھوٹے بابو کو پھر دیکھنے آؤں گا۔'' اس نے ٹوکری کو سمیٹ کر چلنے کی تیاری کی تو اس نے زبردستی بوڑھے کو بٹھالیا۔

''بغیر خدمت کا موقع دیے چلے جاؤ گے تو مجھے رنج ہوگا بابا۔ کھانے کے بغیر نہیں جانے دوں گی۔'' اس کی معذرت کے باوجود وہ تیزی سے اٹھ کر باورچی خانے میں آئی۔ جب گرما گرم کھانا کھا کر بوڑھا اسے دنیا بھر کی دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوگیا تو اس کا ذہن گدلے پانی کی طرح نتھر کر پرسکون ہوگیا۔

☆☆☆

باہر کے دروازے پر ہلکے سے کھٹکے پر وہ چونکی۔ یہ وقت اجمل کے آنے کا تو ہرگز نہیں تھا اور جس فیصلہ کن انداز میں اس نے آخری مرتبہ گھر چھوڑا تھا، اس کے پیش نظر اس کی آمد قطعی ناممکن تھی۔ دوسرا فوری خیال کسی چور کا آیا اور وہ لاشعوری طور پر مدافعت کے لیے تیار ہوگئی کیونکہ ماں باپ دونوں گھر سے کتنی دیر پہلے جاچکے تھے لیکن جب مزید کوئی کھٹکا نہیں ہوا تو وہ وہم سمجھ کر مطمئن سی ہوگئی لیکن کسی اور کمرے کے کھلنے کی واضح آہٹ پر اس کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ چند لمحوں کے لیے کشور کے ہاتھ پاؤں سے جان نکل گئی لیکن ردعمل میں اس کی قوت مدافعت انگڑائی لےکر بیدار ہوئی تو وہ ننگے پاؤں ہی تیزی سے کمرے سے باہر آگئی۔

اس کے سوتیلے باپ کا کمرا کھلا ہوا تھا جبکہ باہر کا دروازہ بند تھا۔ اس کے وجود سے خوف کی ایک شدید لہر گزر گئی۔ گھر کا کوئی فرد اتنی خاموشی یا رازداری سے گھر آنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ لاشعوری طور پر حفاظت خود اختیاری کے لیے اس نے کسی چیز کو نگاہوں سے تلاش کیا مگر کچھ نہ پاکر اس کے ذہن میں باہر ہی سے دروازہ بند کردینے کی ترکیب آئی۔ دبے قدموں دروازے تک پہنچ کر کپکپاتے ہوئے دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکا اور ایک بے انتہا تھکا ہوا سانس لے کر رہ گئی۔ اس کا سوتیلا باپ کپڑوں کی الماری کھولے اس کے پٹ پر ہاتھ رکھے کسی سوچ میں غرق تھا۔ کشور کی ذرا سی جھلک پر اس کی نگاہ بے اختیار اٹھی اور پھر کھسیانی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بڑی عجیب لگی۔ کچھ یہی حالت کشور کی بھی ہوئی گویا دو چوروں کا آمنا سامنا ہوجائے۔

''معاف کرنا، ذرا کپڑے بدلنے آیا تھا۔'' اس کا انداز معذرتی تھا۔

''جی اچھا۔'' خوف کا اثر کشور کی لرزتی آواز سے نمایاں تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر گھومنے لگی۔

''شاید میری خاموش آمد نے تمہیں ڈرادیا ہے۔'' وہ پٹ چھوڑ کر کمرے کے درمیان آگیا۔ کشور چہرے میں خون کی تیز گردش کی سوئیاں چبھتے ہوئے محسوس کرنے لگی۔

''کیا تمہاری ماں ابھی تک نہیں لوٹی؟'' اس نے سگریٹ سلگانے سے پہلے مسکراتی نگاہوں سے کشور کو دیکھا۔

''جی نہیں۔'' اس کی آواز گھٹ گئی۔

''خیر کوئی بات نہیں...... اچھی سی چائے بنا کر پلاؤ۔ بڑی طلب ہورہی ہے۔'' وہ آرام سے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔

''جی اچھا۔'' کہنے کے بعد وہ دھڑکتے ہوئے دل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

- ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

کے ساتھ باورچی خانے میں داخل ہوئی تو اپنے آپ کو مضبوط پنجرے میں بند محسوس کرنے لگی۔

''ارے، ایک ہی کپ لائی ہو بے بی۔'' شکایتی لہجے میں چاشنی گھلی ہوئی تھی۔ اس نے ٹرے جلدی سے تپائی پر رکھ دی۔ ''اتنے ماہ بعد بھی اتنی اجنبیت کوئی اچھی بات تو نہیں۔'' ہلکی سی مسکراہٹ کشور کو بڑی عجیب لگی۔

''جی میں پی چکی ہوں۔'' اس نے سادگی سے کہہ کر اپنی اندرونی بداعتمادی پر پردہ ڈالنا چاہا۔

''گھر میں تو آدمی دس مرتبہ بھی پی لے تو کوئی فرق نہیں پڑتا...... جاؤ، جاؤ، اپنے لیے بھی کپ لے آؤ۔ میرے لیے اس گھر کی رونق تو اب تم ہی ہو۔'' اس کے انداز میں ایک ایسی شفقت کروٹیں لے رہی تھی جو کشور جیسے زخم خوردہ بچوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

''ہاں...... یہ بات ہوئی نا۔'' جب وہ اپنے لیے بھی کپ لے آئی تو اس نے کسی شوخ بچے کی طرح چہک کر کہا۔ ''اسی بہانے کچھ تبادلہ خیال بھی ہو جائے گا۔ تم بھی شاید ماں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی لیے دیے رہتی ہو۔'' اس نے کشور کو کپ میں چائے انڈیلتے دیکھ کر بے تکلفی سے کہا۔

''جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے جلدی سے اٹک اٹک کر کہا جیسے ڈور کہیں پھنس گئی ہو۔

''ایسی بات نہیں تو پھر گھٹی گھٹی کیوں رہتی ہو؟ ابھی تو تمہارے ہنسنے بولنے کے دن ہیں۔'' اجنبیت کی دیوار تھوڑی سی گرانے کی کوشش کے ساتھ ہمدردی کا مرہم بھی شامل تھا۔ وہ سعادت مندی سے سر جھکائے اس کی بات سنتی رہی۔

''خوش رہا کرو، دھوپ چھاؤں تو آتی جاتی رہتی ہے، کیا خیال ہے اگر اپنے بارے میں مزید تعارف کرواؤ۔'' اس نے فاصلہ کم کرنا چاہا۔ کشور نے الجھی نگاہوں سے اپنے سوتیلے باپ کو دیکھا۔

''جی، سب کچھ تو آپ کے علم میں ہے۔'' اس نے نگاہیں جھکا کر دبی آواز میں کہا۔

''نہیں...... صرف اتنا جتنا تمہاری ماں نے مناسب سمجھا لیکن اب تم میری ذمے داری ہو اس لیے تمہارے بارے میں مزید جاننے کا حق بھی رکھتا ہوں۔''

کشور کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور ہو گئی ورنہ اس کے دل میں چھپا بداعتمادی کا چور پکڑا جاتا۔ یوں بھی اب اسے گھر میں رہنا تھا۔ نرم رویے اور ہمدرد نگاہوں نے کشور کو ذرا سا مطمئن کر دیا تو ذرا آزادی سے شوہر کے بارے میں طلاق تک کی روداد دہرا دی۔ وہ خود بھی دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

''اب مستقبل میں کیا ارادہ ہے؟ ظاہر ہے زندگی اس طرح تو نہیں گزاری جا سکتی۔'' سوتیلے باپ کے لہجے میں کچھ ایسی پرچھائیں رقص کر رہی تھی جس سے ڈر کر وہ پھیلتی پھیلتی ایک دم سکڑ گئی۔ یہی سوال تو طلاق کے فوری بعد اسے پریشان کرنے لگا تھا۔

''میرے مستقبل کا فیصلہ تو...... اب آپ ہی کو کرنا ہے۔'' اس نے دبی آواز میں جواب دیا۔ اس نے بڑی چمکیلی نگاہوں سے سہم کر بدکنے والی اس ہرنی کو دیکھا۔

''میں تو چاہتا ہوں تمہارا مستقبل میرے ہی گھر سے وابستہ ہو جائے۔'' یہ کہتے وقت اجمل کے باپ کی آواز بڑی نرم بڑی میٹھی ہو گئی۔ کشور کا سارا خون اس کے چہرے پر لہریں لینے لگا تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ دلفریب نظر آنے لگی، مسکراتا ہوا اجمل اس کی گردن میں پھولوں کا ہار بن کر جھول گیا۔

''ملک صاحب تو کسی مطلقہ کو بہو بنانا پسند نہیں کریں گے۔'' ماں جھوٹی ہے، مجھ سے حسد کرنے لگی ہے۔ اس کے پورے بدن میں شرارے پھوٹنے لگے۔ اس پر مدہوشی سی طاری ہونے لگی۔

''تم اپنی ماں کے مقابلے میں زیادہ اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہو۔'' کشور کو پتھر کی طرح خاموش مگر انگارے کی طرح دہکتے دیکھ کر ملک صاحب کے مضبوط ہاتھ نے اچانک اس کی کلائی گرفت میں لے لی۔ وہ گولی کھانے والے اس شخص کی طرح سکتے میں آ گئی جو چند لمحوں کے لیے گولی لگنے کے احساس سے محروم ہو جائے۔ وہ پھٹی ہوئی نگاہوں سے سوتیلے باپ کی تیزی سے سرخ ہوتی نگاہوں میں پیوست ہو گئی۔ اس کے حواس بھی معطل ہو گئے۔

''تمہاری نرم و نازک یہ انگلیاں بہتر طریقے سے مرہم لگا سکتی ہیں۔'' کشور کی انگلیاں ملک صاحب کے ہونٹوں سے جا لگیں۔

''ملک صاحب......'' وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح خرخرائی مگر کلائی پر ملک صاحب کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔

''یہ کلائی چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑی بے بی...... میں نے پورے ارادے کے ساتھ اسے تھاما ہے۔'' ملک صاحب کی آواز میں پورا مردانگی لینے لگا۔

''آئندہ مجھے نہ چھونا ورنہ تم باپ بیٹے میں تمیز کھو بیٹھو گی۔'' اجمل کے الفاظ گولیوں کی پوری باڑ کی طرح کشور کے ذہن سے ہوتے ہوئے پاؤں کے انگوٹھے سے نکل گئے۔ پھٹتے ہوئے آتش فشاں کی طرح وہ اچھلی اور پوری

قوت سے جھٹکا مار کر کلائی چھڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بھاگی۔ ردعمل میں ملک صاحب کا اپنا ہی ہاتھ گال پر پڑا اور نگاہوں میں چنگاریاں اڑ گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ دو ہی جستوں میں کواڑوں کو بند کر کے دروازے سے پیٹھ لگا کر ہانپتے ہوئے وحشی بھوکے درندے کی طرح زرد ہوتی ہوئی کشور کو دیکھنے لگا۔ کشور نے تیزی سے پیچھے ہٹ کر چائے کی کیتلی مضبوطی سے پکڑلی۔ دوپٹے سے بے نیاز اس کا سینہ لوہار کی دھونکنی بن گیا تھا۔

''نادان مت بنو، مجھے تمہارا مستقبل عزیز ہے۔'' سوجے ہوئے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے پھر بپھری ہوئی شیرنی کو رام کرنا چاہا مگر وہ چوکنی نگاہوں سے اسے گھورتی رہی۔ ''تمہاری بدنام ماں اور تمہارے خود مطلقہ ہونے کے پیشِ نظر مجھ سے بہتر آدمی اور اس گھر سے زیادہ بہتر کوئی اور گھر تمہیں نہیں مل سکتا۔'' نرم آواز میں کہتے ہوئے اس نے اپنی پیٹھ کی اوٹ میں زنجیر چڑھا دی۔

''مجھے باہر جانے دیجیے۔'' وہ ان سنی کرتے ہوئے گھگیائی۔

''کسی فیصلے کے بغیر نہیں......'' اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''مجھے امید ہے حالات کی روشنی میں تمہیں میری تجویز پسند آئے گی کیونکہ تمہاری ماں مجھ سے یا میرے گھر سے وفادار نہیں ہے۔ وہ اب بھی اپنے پرانے یاروں سے ملتی ہے جبکہ تم قابلِ اعتماد ہو، تم شروع دن ہی سے مجھے اچھی لگی ہو اس طرح تمہارا مستقبل بھی محفوظ ہو جائے گا۔'' اس نے اسے قائل کرنے کے لیے تعریف میں احساسِ تحفظ کی شیرینی بھی ملا دی۔

''میں کچھ نہیں جانتی...... اللہ کے لیے مجھے باہر جانے دیجیے۔'' اس کی زخمی آواز گھٹ گئی۔

''تمہاری مرضی......!'' وہ اس طرح مسکرا کر دروازے سے ذرا سا ہٹا گویا کشور کی بے بسی نے اسے متاثر کیا ہو۔

''اندر باہر سب برابر ہے۔ رہنا تو تم نے اسی گھر میں ہے۔'' اس نے کنڈی کھول دی۔ وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح دروازے کی طرف جھپٹی مگر دوسرے ہی لمحے ملک صاحب کے بازوؤں کا تنگ حلقہ اسے اپنے جسم و روح کو پیستا ہوا لگا۔ دوسرے لمحے ملک صاحب نے کسی گڑیا کی طرح کشور کو بستر پر اچھال دیا۔ جونہی وہ بستر کے قریب پہنچا، کشور اسپرنگ کی طرح اچھل کر دوسری جانب میز کے پیچھے جا کھڑی ہوئی، اس کی سانسیں قابو سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔

''میں آپ کی...... بیٹی کے برابر ہوں۔'' ٹوٹے لہجے میں الفاظ کو مربوط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اندھوں کی طرح میز پر پڑا شیشے کا ٹھوس پیپر ویٹ اٹھا لیا۔ ملک صاحب کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ہاں بیٹی کے برابر ہو مگر بیٹی نہیں ہو اس لیے تم اس گھر کی مالکن بھی بن سکتی ہو۔'' کہتے کے ساتھ ہی وہ چیتے کی سی پھرتی سے پلنگ پر سے ہوتا ہوا اس کے مقابل میز کی دوسری جانب ایستادہ ہو گیا۔ کشور نے مضبوطی سے پیپر ویٹ ہاتھ میں تھام لیا۔ ملک صاحب نے دھوکے سے ذرا سے جھپاکے سے کشور کا پیپر ویٹ والا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا، جس کے نیچے گرتے ہی کشور زخمی شیرنی کی طرح تڑپی اور خلاف توقع پوری قوت سے اسے دھکا دے دیا، اس کی کلائی میں موچ آ گئی مگر ملک صاحب چاروں خانے پلنگ پر چت ہو گئے۔ سر کا پچھلا حصہ پلنگ کی پٹی پر پڑنے سے چنگاریاں سی اڑ گئیں۔

''تم بے غیرت ہو جسے خدا کا بھی خوف نہیں۔'' اب تک کی جدوجہد سے اس میں ایک نئی خود اعتمادی پیدا ہوئی تو اس نے آخر تک مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

''خوشی سے میری بات مان لو گی تو اس گھر کی عزت بن کر رہ سکو گی۔ میں تمہیں سچ مچ اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتا ہوں۔'' خلافِ توقع اس نے نرم آواز میں اپنا اعتماد بحال کرنا چاہا۔

''پھر مجھے اس کمرے سے نکلنے دو، مجھے سوچنے کی مہلت دو۔'' اس نے سلگتی ہوئی آواز میں جھانسا دینے کی کوشش کی۔

''موجودہ حالت میں دونوں باتیں ناممکن ہیں۔ تمہیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے ابھی اور اسی وقت کرنا ہے۔'' دھمکی آمیز لہجے میں ارادے کی سختی بھی تھی۔

''تم میرے بے جان جسم کو تو بستر پر ڈال سکتے ہو لیکن جب تک سانس ہے میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔'' کشور میں ایک نئی کشور ابھری۔ وہ دل ہی دل میں اپنی ماں کو بھی کوسنے لگی، جو اپنی بے پروائی سے اسے ایک درندے کے رحم و کرم پر چھوڑ گئی تھی۔ مگر درندہ اس پر حملہ آور ہو گیا اور جھکائی دینے کے باوجود اس کے لمبے بال اس کی گرفت میں آ گئے۔ اس کی ٹھوڑی صوفے کی پشت سے ٹکرا کر اس کے حواس معطل کر گئی۔

''مجھے چھوڑ دے درندے...... اتنی بے رحمی سے میری کمزوری کا فائدہ نہ اٹھا...... میں تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' وہ اس کی مضبوط گرفت میں پھڑپھڑاتی ہوئی گھگیائی۔

"میں تیری عزت بنانا چاہتا ہوں بے وقوف لڑکی۔"
اس نے کشور کو بالوں سے پکڑ کر پلنگ کی طرف گھسیٹا۔ کچھ نہ پا کر اس نے اپنی انگلیوں کے ناخن ملک صاحب کی پنڈلی میں

گھسا دیے۔

"مجھے چھوڑ دے...... مجھے چھوڑ دے وحشی درندے...... ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔" اس نے ملک صاحب کی کلائی میں اپنے دانت پیوست کرنے چاہے تو وہ نیم بے ہوش سی ہوگئی اور اسی نیم بے ہوشی میں اس کے ذہن میں صندل کی بازگشت گونجی۔ گویا اجمل نے اسے پکارا ہو۔ ایک نئی قوت اور ایک نیا جذبۂ مدافعت اس کے سراپا میں کرنٹ بن کر دوڑ گیا۔ شدید بے بسی کی حالت میں اس کا یقین سسکنے لگا۔

"صندل......!" پورے ہوش و حواس میں اجمل کی محتاط آواز اسے سنائی دی جو اس کی سماعت کا دھوکا نہیں تھا کیونکہ ملک صاحب کی گرفت ایک دم ڈھیلی پڑ گئی تھی...... بے پناہ خوشی سے اس کا ذہن ماؤف سا ہوگیا۔

"صندل۔" دروازے کے باہر چاپ کی آواز تھمتے ہی پکار کی تڑپ اسے بھی تڑپا گئی۔ اس کا مقصد تھا اجمل کو شک ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کے سکون کے بعد ایک خوف ناک خیال کشور کے ذہن کو کاٹتا چلا گیا۔ اگر اجمل نے موجودہ صورتِ حال کا غلط تاثر لے لیا تو......تو...... وہ دہشت زدہ ہوگئی۔

"اج......" کشور کی پکار ادھوری ہی رہ گئی۔ ملک صاحب کا بے رحم ہاتھ پوری مردانہ قوت سے اس کے ہونٹوں پر جم گیا تھا۔ دم گھٹنے کی وجہ سے اس نے تڑپ کر ٹانگیں چلائیں تو صوفہ دھڑام سے الٹ گیا۔

"صندل!" صوفے کی پرشور آواز پر اجمل کی وحشت زدہ آواز ابھری۔ کشور کو پہلی مرتبہ بے پناہ سکون ملا۔

"یہاں کوئی صندل نہیں بدتمیز۔" ملک صاحب غصیلے لہجے میں جھنجلا کر پہلی مرتبہ بولے۔ "تمہیں یہاں کس نے آنے کی اجازت دی ہے؟" ملک صاحب نے کشور کو پسلیوں کے ساتھ دباتے ہوئے پاس کی میز کی دراز سے ہاتھ بڑھا کر پستول نکال لیا۔

"اگر ذرا بھی آواز نکالی تو چھلنی کر دوں گا۔" بھاری بھرکم سرگوشی اور غصے سے کپکپاتے ہاتھ میں پستول کشور کو مفلوج کر گیا۔ ناموں کے اختلاف سے ملک صاحب خود الجھ گئے تھے۔

"صندل! تم کیا اندر ہو؟" اجمل کی آواز وحشت زدہ اور لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ "صندل! مجھے یقین ہے کہ اسی کمرے میں ہو کیونکہ سارا گھر خالی پڑا ہے۔ اگر جواب نہیں دو گی تو میں سمجھوں گا کہ دروازہ تمہاری مرضی سے بند ہوا ہے۔" اس کا انداز بے حد شکست خوردہ تھا۔

"بے وقوف! تم کسے بار بار آواز دے رہے ہو یہاں کوئی صندل نہیں ہے۔" اجمل کے باپ نے کشور کے ہونٹ کھلتے دیکھ کر اس پر پستول تان دیا۔ اس وقت غصے میں اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

"بہتر ہے ابو۔" اس کی آواز اس سپاہی کی طرح ڈوب گئی جس نے ہار مانتے ہوئے بندوق دشمن کے قدموں میں گرا دی ہو۔ "مگر یاد رکھیے صندل میری بیوی ہے۔" اس نے مردہ لہجے میں کہا مگر کشور کے پورے وجود میں جیسے بم کا دھماکا ہوا۔

"اجو......!" وہ زندگی موت سے بے پروا ہو کر ہسٹریائی انداز میں چیخ پڑی کیونکہ بم کا یہ دھماکا اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ ویسے بھی بیوی کے مقدس لفظ نے اس کے خوف کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اس کی...... بے اختیار چیخ سے اجمل کے باپ کا ہاتھ کپکپا گیا تو وہ حیرانی سے تیزی سے بدلتی ہوئی کشور کو دیکھنے لگا۔ جس وجود سے صندل اس طرح ابھر رہی تھی جیسے اگربتی جلنے سے خوشبودار دھوئیں کی لکیر ابھرتی ہوئی بل کھاتی ہے۔

"ابو، دروازہ کھول دیجیے، ورنہ میں اسے توڑ دوں گا۔" اجمل کی غصے سے کھولتی ہوئی آواز سن کر کشور کو بے پناہ طمانیت اور تحفظ کا احساس ہوا۔ اجمل کا باپ اس بدلتی ہوئی صورتِ حال پر منجمد سا ہوگیا۔ جونہی کشور ایک ہی جست میں دروازے کے قریب پہنچی، وہ جھرجھری لے کر ہوش میں آگیا۔

"اگر کنڈی تک ہاتھ پہنچا تو گولی مار دوں گا۔" اس نے غرا کر دھمکی دی۔ وہ ٹھٹک گئی مگر اسے یہ بھی محسوس ہوگیا کہ اب اس دھمکی میں پہلے جیسی گھن گرج نہیں تھی۔

"بے شک مار دیجیے...... باہر میری زندگی، میرا مان موجود ہے۔" کشور نے لاشعوری طور پر کسی مست شرابی کی طرح جواب دیا۔ اس کے باوجود کہ بیوی کا لفظ اب بھی اس کے ذہن میں سوئیاں چبھو رہا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے کنڈی پر ہاتھ ڈال دیا۔

"تو کشور سے صندل کب بنی؟" چکراتے ذہن کے ساتھ اجمل کے باپ کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ گو وہ اب بھی زد پر تھی۔ کشور کے لبوں پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ سی پھیل گئی۔

"پتا نہیں۔" ایک جھٹکے سے جونہی اس نے پٹ کھولا،

اجمل کے تپتے ہوئے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کا تمام تناؤ جیسے یکلخت غائب ہوگیا۔ وہ کٹے ہوئے تنے کی طرح ذرا سا جھول گئی۔ اجمل کی نگاہوں نے چند منٹ تک بکھری بکھری کشور کو بڑے کرب سے دیکھنے کے بعد جونہی اپنے باپ کو حصار میں لیا، اندرونی جوش وغضب سے اس کے جبڑوں کی ہڈیاں بھنچ گئیں۔ اس کے باپ کے چہرے پر راکھ بکھر گئی تھی۔

''کاش پستول میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں اپنی بیوی کی طرح آپ کا سینہ بھی کھول دیتا۔'' غصے کی آگ میں اس کے الفاظ شعلے بن کر لپکے مگر اس کا باپ غیر یقینی مگر بے پناہ حیرانی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ جونہی قدم آگے بڑھا کر اس نے صندل کو تھاما، وہ زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑائی اور بے ہوش ہوکر اجمل کی بانہوں میں جھول گئی۔ اس نے دوبارہ خون برساتی نگاہوں سے باپ کو گھورا جو دیکھنے کے باوجود اندھوں کی طرح سوچے جا رہا تھا کہ اس کی ناک کے عین نیچے اتنی بھرپور نقب کیسے لگی۔ کیا اس کی بیوی خود اس ڈرامے کی مصنفہ تھی؟

''اسے لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ اس سے پہلے کہ میں کچھ کر بیٹھوں۔'' وہ گرم گرم خون کے مانند ابل پڑا۔

''حرافہ...... کمینی......'' آخر کے الفاظ بڑبڑا کر اس نے گویا خود کو تسلی دی۔

چہرے پر مسلسل سرد پانی کے چھینٹوں کے ساتھ حلق میں پانی کے چند قطرے جانے سے وہ جلد ہی ہوش میں آگئی۔ وحشت زدہ نگاہیں جونہی اجمل کے چہرے سے ٹکرائیں، سر کے بالوں سے لے کر انگوٹھے کے ناخن تک درد کی ایک شدید لہر گزر گئی۔ اجمل کی نگاہوں میں چنگاریاں اور ہاتھوں میں اب بھی رعشہ تھا۔

''اجو......'' وہ سوجی ہوئی کلائی والا ہاتھ بہ مشکل اس کی گود میں رکھتے ہوئے روہانسی آواز میں منمنائی۔ ''میری کلائی اتر گئی ہے۔'' اس کا لہجہ گداز مگر انداز بے انتہا مظلومانہ تھا۔ خاموش آنسو اور بھی آگ لگانے لگے مگر جواب میں اجمل نے عجیب بے نیازی سے اس کا بازو اٹھا کر احتیاط سے اس کے پہلو میں رکھ دیا تو اسے دھچکا سا لگا۔ وہ اور بھی بکھرنے لگی تو تڑپ کر اپنا چہرہ اس کی گود میں چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

''تم...... تم...... مجھے اکیلا چھوڑ گئے ہو......'' اس کی ہچکیاں اس کے الفاظ تیز دھار چھری کی طرح تھے۔ ''میں تمہاری کچھ نہیں ہوں مگر...... مگر دشمن بھی تو نہیں ہوں۔'' اس نے اور بھی شدت سے اپنا چہرہ اس کی گود میں چھپانے کی کوشش کی۔ چند لمحوں تک تو وہ برف کی سل کی طرح منجمد رہا مگر پھر اسے اپنی گود سے الگ کرتے ہوئے احتیاط سے اسے پلنگ پر سیدھا کرتے ہوئے چادر اوڑھا دی۔

''آرام سے لیٹی رہو۔'' اجمل کا لہجہ ایک دم سپاٹ اور روکھا تھا۔ ''میں اب بھی کسی ڈاکٹر کا بے رحم ہاتھ ہوں۔'' وہ اتنی قربت کے بعد اس کے بیگانے رویے پر سناٹے میں آگئی۔

''تم جھوٹے ہو۔'' وہ تڑپ کر گھٹی ہوئی آواز میں غرائی۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم کیا کہہ رہے تھے؟'' بے بسی کی کچکچاہٹ کے ساتھ آنسوؤں کی جھڑی کچھ اور تیز ہوگئی۔

''اس وقت وہی مناسب تھا کیونکہ تم ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائیں اور ایک درندے کو تم سے دور ہٹانے کے لیے یہی ایک کارآمد گولی تھی۔'' اس کا انداز، اس کا لہجہ بدستور سپاٹ تھا جیسے تلخ گھونٹ پیتے پیتے اس کی ساری شیرینی بھی نمک بن گئی ہو۔ وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اس بنجر تودے کو دیکھنے لگی جس کے چہرے پر خود روگھاس کا کوئی تنکا بھی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے سچائی کی آگ میں جلتا ہوا اجمل یکا یک پھر سے جھوٹ کا سرد پہاڑ دکھائی دینے لگا۔

''تم پھاڑ کھانے والے درندے سے بھی زیادہ بے رحم ہو۔'' اس کی آواز ریت کے پھپسے ذروں کی طرح منتشر ہونے لگی۔ ''تم بند دروازے پر کیوں آگئے تھے...... کیوں اجو...... آخر کیوں؟'' وہ لمبی لمبی سسکیاں بھرنے لگی۔

''کیونکہ درندے شکار بانٹ کر نہیں کھا سکتے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بے حد رکھائی سے بولا۔ ''بلکہ ایک دوسرے سے پوسے کا پورا چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔'' اس نے بلکتی سسکتی صندل کے تازہ زخموں پر مزید نمک بھر دیا۔ صندل کے دل ودماغ میں اٹھتی ہوئی ٹیس بڑی شدید تھی۔

''تم باپ بیٹے...... تم دونوں درندے ہو۔'' بے بسی کی جلتی ہوئی آگ میں اس کی آواز چیخ چیخ گئی۔

''اپنی ماں کو کیوں بھول رہی ہو جس نے لومڑی کی طرح اپنے بچاؤ کی خاطر درندوں کو شکار کی طرف خود متوجہ کیا ہے۔'' وہ تیز دھار خنجر کی طرح اس کے دل میں اتر گیا۔

''چلے جاؤ...... چلے جاؤ یہاں سے۔'' وہ کمزور آواز میں دہاڑی۔ ''تیرا باپ تجھ سے زیادہ بے رحم درندہ نہیں ہے۔'' اس نے خنجر کو خنجر سے کاٹنا چاہا تو صندل کو بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کے لبوں پر بے حد زہریلی

مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اب یہ ناممکن ہے، آخر درندہ جو ٹھہرا۔ اتنی آسانی سے شکار کو ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔'' وہ اس کے پاس سے اٹھ گیا اور وہ اس طرح تڑپی گویا اس نے واقعی کسی بے رحم ڈاکٹر کی طرح اس کا کچا پھوڑا چیر دیا ہو۔ ''تمہاری ماں کو بھی تو احساس ہو کہ شکار بعض اوقات شکاری کو بھی زخمی کر دیتے ہیں۔'' وہ جیسے میان سے نکلی ہوئی تلوار بن گیا جو صندل کی روح پر گھاؤ لگانے لگی۔ اس نے بے بسی سے اپنا چہرہ تکیے میں چھپا لیا۔

''تمہاری ماں نے مجھے تو گھر سے نکال دیا مگر اب میں نے بھی تجھے اس گھر سے نکالنے کا بندوبست کر دیا ہے تبھی تم دونوں ماں بیٹی کو محسوس ہوگا کہ کھلے آسمان کی چھت کتنی بے رحم، کتنی جلانے والی ہوتی ہے۔ آج نہیں تو کل میرا باپ تجھے بھی اس گھر کی دہلیز سے باہر دھکا دے دے گا۔''

''خدا کے لیے اجو...... چپ ہو جاؤ۔'' وہ اپنے جسم میں اٹھتی ہوئی ٹیسوں کو بھول کر پلنگ پر سیدھی ہو گئی۔ ''تم مجھے زہر دے دو مگر...... مگر اپنی باتوں سے اس طرح میرے دل کے ٹکڑے نہ کرو۔ یہ سب کچھ میں نے نہیں کیا۔ خدا کے لیے میرا اگلا دبا دو۔'' وہ گھگیائی۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا رک کر اس کے سامنے ستون کی طرح ساکن ہو گیا۔

''نقلی زہر کھانے کا کیا فائدہ، یہ تو بزدل لوگ کھاتے ہیں۔'' وہ بے حد طنز سے بولا۔ ''کھانا ہے تو میری طرح سچائی اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کا زہر کھاؤ۔'' اس کا لہجہ یکدم جوشیلا ہو گیا جیسے شعلہ بھڑک اٹھا ہو۔ ''تب تجھے معلوم ہوگا کہ اصل زہر کی کاٹ کیا ہوتی ہے۔ جب تیری ماں کے کلیجے پر ہاتھ پڑے گا تبھی اسے محسوس ہوگا کہ اولاد کو والدین کے سائے سے محروم کرنے کا کیا مزہ ہوتا ہے۔'' وہ سلگتے سلگتے جل اٹھا۔

''چلے جاؤ اجو...... خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔'' اس نے جیسے کسی لاش پر بین کیا۔ ''ورنہ میرا کلیجا پھٹ جائے گا اور تم میرے لبوں سے ابلتے خون کے لوتھڑے برداشت نہیں کر سکو گے۔'' وہ بڑے کرب ناک طریقے سے پلنگ سے اتر آئی۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ وحشت کی سرخی پھیل رہی تھی۔

''وہ سینہ جو تیرا باپ کی نہیں کر سکا، وہ میں خود تیرے سامنے کھول دیتی ہوں تاکہ تو دل پھٹنے کا نظارہ کر سکے۔'' اس نے زخمی شیرنی کی طرح غراتے ہوئے شدید ہیجان اور غصے میں دونوں ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالے اور وحشیانہ انداز میں دامن تک قمیص پھاڑ دی۔ اس کے اپنے ہی ناخن اس کے عریاں سینے پر گہری خراشیں چھوڑ گئے۔ اجمل چند لمحوں کے لیے بھونچکا رہ گیا اور پھر تیزی سے گھوم گیا۔

''صندل......'' اس کی بھاری آواز صندل کے ابلتے ہوئے ذہن میں دھماکے کی طرح پھٹی۔ ''اپنی ماں کی غلطی دہرا کر مجھے میرے باپ کی جگہ کھڑا نہ کرو۔ میں نے تم سے شروع میں بھی کہا تھا...... میں جا رہا ہوں اب شاید دوبارہ نہ آسکوں۔'' اس کے لہجے میں پچھتاوے یا پشیمانی کے بجائے ایک حکم تھا عجیب قسم کی کھٹی میٹھی خواہش تھی، اچانک اس نے جیب سے چابی نکال کر فرش پر پھینک دی۔ ''اب اس کی ضرورت نہیں رہی اس لیے اپنی ماں کے آنے تک اپنے کمرے کا دروازہ بند رکھنا کیونکہ جب بھیڑیے آزاد ہو جائیں تو خود کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو پنجرے میں قید کر لینا چاہیے۔'' وہ اس پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

''نہ جاؤ اجو...... مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ۔'' وہ اچانک فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ ''تمہارے ایسے جلتے ہوئے سورج کی اوٹ میں مجھے ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔'' فرش پر کسی مردے کی طرح اپنے آپ کو بچھاتے ہوئے اس کا رواں رواں پکار اٹھا۔ جواب میں باہر کا دروازہ زور سے بند ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا گویا وہ قبر کے گہرے اندھیرے میں اترتی جا رہی ہے۔

اچانک پیٹ پر بھوک کا ہتھوڑا پڑنے سے اسے محسوس ہوا کہ شام کی مرجھائی ہوئی دھوپ کی جگہ نئی صبح کی تازہ کرنوں کی حدت پھیل رہی ہے اور اس پر سے کئی خزائیں گزر چکی ہیں۔ قدموں کی آہٹ پر ہڑبڑا کر وہ بستر پر سیدھی ہو گئی۔

''وہ بستر پر کیسے آ گئی؟ وہ تو فرش پر ڈھیر ہو گئی تھی؟'' اپنی اس بازگشت پر اس نے نگاہیں اٹھا کر گردوپیش کا جائزہ لینا چاہا تو اس کی ویران آنکھیں ماں کے نفرت، غصے اور اجنبیت کے رنگوں میں رنگے چہرے پر رک گئیں۔

''آ گئیں رانی صاحبہ ہوش میں۔'' ماں کی تیز دھار آواز کا خنجر ایک دفعہ پھر اس کی روح میں اتر گیا مگر اب تو وہ شاید تڑپنے کے قابل بھی نہیں رہ گئی تھی اس لیے پھٹی ہوئی نگاہوں سے ماں کی بھڑکتی ہوئی آنکھوں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی۔

''اتنے بڑے بڑے دیدے پھاڑ کر مجھے کیا دیکھ رہی ہے؟ تو تو میرے لیے بغل کی چھری بن گئی ہے۔'' ماں کا تیز و تند لہجہ کھولتے ہوئے لاوے کا مظہر تھا۔

''ماں......!'' اس نے خشک گلے سے مشکل سے

آواز نکالی، وہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گئی تھی۔

"کہاں کی ماں...... کس کی ماں؟" وہ آگ کی لپٹ بن کر لپکی۔ "تجھے تو یار کی ضرورت تھی پھر ابھی تک اس گھر میں کیا کر رہی ہے...... تو تو ناگن سے بھی زیادہ زہریلی نکلی۔ اپنی ماں ہی کو ڈس لیا۔" اس نے تیزی سے قریب آکر کشور کے اسی گال پر **بھرپور** طمانچہ جڑ دیا جس پر پہلے بھی ملک صاحب کی انگلیاں نشان چھوڑ چکی تھیں۔ کشور نے بے اختیار گال پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی سانس جیسے سینے میں ہی اٹک گئی جبکہ ماں کی تیز سانسیں پھنکارتے ہوئے سانپ کی طرح تھیں۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ماں...... خدا گواہ ہے میں نے کچھ نہیں کیا۔" ایک دفعہ پھر اس کے لبوں سے سسکیوں کا سیلاب ابل پڑا۔

"تو نے کچھ نہیں کیا...... ہونہہ۔" اس نے شدید غصے میں اس کے بال مٹھیوں میں پکڑ کر کشور کو تین چار جھٹکے دے دیے۔ اس کی نگاہوں میں کمرے کی ہر چیز گھوم گئی اور اس نے بے اختیار گھٹنوں میں منہ چھپالیا۔ "اور وہ تیرا باپ ایسے ہی سرخ انگارہ بن کر رات بھر مجھے جلاتا رہا۔" ماں نے اسے گھونسوں اور تھپڑوں سے دھن دیا۔ کشور بستر پر ادھر ادھر لڑھکتی رہی۔

"ماں...... وہ مجھے...... تیری سوکن بنانے پر آمادہ تھا۔" اس نے سسکیوں کے درمیان صفائی پیش کرنا چاہی تو گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش اور بھی تیز ہوگئی۔

"ہاں...... ہاں اب تو یہ نہیں کہے گی تو سچی کیسے بنے گی۔ میں نے تجھے اپنی بہو بنانے سے انکار جو کر دیا تھا۔" ماں لال بھبوکا بن کر اس پر غلیظ گالیوں کا کیچڑ اچھالتی رہی۔

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ انہوں نے میری عزت پر حملہ کرنا چاہا تھا۔" اس نے تلملا کر پھر صفائی پیش کی۔

"عزت...... ہونہہ......" وہ غضب ناک ہو کر پھنکاری۔ "تو تو پہلے ہی اپنے یار سے اس کا سودا کر چکی ہے۔ تو کسی خبیث...... کی اولاد ہے۔" وہ اپنے غصے کی انتہائی بلندی پر پہنچ کر بری طرح ہانپنے لگی تھی۔

"ماں......!" اس نے تڑپ کر ماں کو گھورا۔ "میرے باپ کو گالی نہ دے...... تو مجھ سے بہتر جانتی ہے۔"

"واہ...... ایک تو چوری، اس پر سینہ زوری۔" ماں نے بے رحمی سے ایک دوہتڑ اس کے سر پر جما دیا۔ سوتیلے باپ نے ماں کے ذہن میں کچھ اس طرح برف جما دی تھی جسے اس کی سسکیاں یا صفائی کی کمزور سی گرمی پگھلا نہیں سکی کیونکہ باپ نے اس طرح اس کے کان بھرے تھے کہ اس کی بیٹی کے کرتوت پر سے پردہ اٹھانے کے لیے ہی اس نے...... سارا ڈراما کھیلا تھا لہٰذا اس کی خباثت سرے ہی سے ماں کے نزدیک اہم نہیں تھی۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اس نے کیسے دیدہ دلیری سے دونوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اجمل پر ڈورے ڈال لیے تھے۔

"تو نے یہ ساری خاک کب، کہاں اور کیسے میرے سر میں ڈال دی؟" وہ کسی پاگل کی طرح باقاعدہ اونچی آواز میں چلا کر اپنے شوہر کو اپنی لاعلمی کا یقین دلانے لگی۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" اس نے بے بسی سے ہچکچا کر کہا وہ لاشعوری طور پر اجمل سے تعلق کی تردید بھی نہیں کر سکی۔

"ہاں...... ہاں اتنی بھولی تھی نا کہ یار کا ہاتھ پکڑتے وقت کچھ پتا ہی نہیں تھا۔"

"یہ تم ہاں، بیٹی نے کیا تماشا بنا رکھا ہے۔" سوتیلے باپ کی زخمی، غصیلی آواز کشور کو مفلوج سا کر گئی۔ "میرے گھر کو گھر رہنے دو۔" اس کی تنبیہ میں تیز نشتر تھا۔ "میں باہر جا رہا ہوں، واپسی میں مجھے تیری بیٹی کا چہرہ دکھائی نہ دے۔" اس کا حکم حتمی اور لہجہ فیصلہ کن تھا۔ "چاہو تو اپنی بیٹی کے ساتھ خود بھی جا سکتی ہو۔" اس کی آخری ضرب پر ماں نے خون برساتی نگاہوں سے کشور کو گھورا۔

"اب تو پڑ گئی کلیجے میں ٹھنڈ۔" ماں کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا لیکن اس میں اب ہاتھ اٹھانے کی سکت نہیں تھی۔ "اسی دن کے لیے تجھے پال پوس کر جوان کیا تھا کہ میرے چہرے پر کالک مل دے۔" کشور کا دل تو چاہا کہ کہہ دے پہلے ہی اس کا چہرہ کون سا چمک رہا ہے مگر اس کے دل میں اب بھی ماں کا احترام تھا۔ وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"میں چلی جاؤں گی ماں۔" موتیوں کی لڑی کی طرح اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ کہاں......؟ اس کا اسے علم نہیں تھا۔ وہ تو صرف گرتی ہوئی دیوار سے بچنا چاہتی تھی۔

"ہاں، ہاں تو فوراً چلی جا...... اسی وقت اپنے یار کے پاس۔" اس نے جیسے کمزور سے دھاگے کے کئی ٹکڑے کر دیے۔

"ماں......!" وہ بلبلا اٹھی۔ "اتنی ظالم تو نہ بن، آخر میں تیری بیٹی ہوں۔" اس نے ایک دم سے گرتی ہوئی دیوار روکنی چاہی۔

"میری کوئی بیٹی ویٹی نہیں۔" اس نے تڑپتی ہوئی کشور کے دل میں ایک اور گولی اتاری۔ "اپنا کپڑا لتا سمیٹ اور یہاں سے جا، میں نہیں چاہتی کہ میرا گھر جل کر خاک ہو جائے۔"

''مگر میں کہاں جاؤں ماں؟'' وہ اپنا جسمانی درد بھول کر زخمی انداز میں گڑگڑائی۔

''اپنے یار کے پاس...... یہاں اب تیری گنجائش نہیں۔'' اس نے دوٹوک الفاظ میں فیصلہ سناتے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''یار کے پاس؟'' وہ ہذیانی اندز میں بڑبڑائی، اذیت ناک حد تک اس کا دل جسم کے گہرے غار میں ڈوبنے لگا۔ ''کیا ماں سے اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس نے اجمل سے کوئی رشتہ نہیں جوڑا؟'' سوچ کے اس بے حقیر تنکے کے سہارے اس نے اپنے آپ کو سنبھالنا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے یہ تنکا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ سوتیلے باپ نے تو اس کی ماں کو دلدل بنا دیا تھا جس میں جتنے ہاتھ پاؤں چلاؤ، اتنا ہی آدمی تیزی سے غرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ اندھیرا...... گہرا اندھیرا۔

''کب تک پتھر بن کر یوں میرے سینے پر مونگ دلے گی۔'' دو تین گھنٹوں کے بعد اسے بدستور بستر پر جمے دیکھ کر ماں آگ بن کر برسی۔ ''اپنے یار کو بلا یا خود اس کے پاس چلی جا، میرا میاں آنے والا ہوگا۔'' اس نے اسے بازو سے دبوچتے ہوئے بڑی بے رحمی سے جھٹکا دیا کہ وہ بستر سے فرش پر آ رہی۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی ماں...... میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔'' وہ سسکیوں کے درمیان ایک دم ماں کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ ''تیرے قدموں میں میری جنت ہے۔''

''اور میری جنت میرے میاں کے قدموں میں ہے، سمجھی...... تو یوں نہیں مانے گی۔'' اور وہ شدید غصے میں ایک دفعہ پھر اسے بالوں سے جکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے سے برآمدے میں اور وہاں سے باہر کے دروازے پر لے آئی۔ دونوں کی سانسیں بے طرح پھول گئیں۔

''ماں اپنے دودھ ہی کا خیال کرلے۔'' وہ دروازے پر ہاتھ جماتے ہوئے گھگیائی۔

''میرا دودھ پیا ہوتا تو تو... کیوں اپنا منہ کالا کرتی۔'' اس نے پھولی ہوئی سانس سے کہتے ہوئے دروازہ جھٹکے سے کھولا اور پوری قوت سے اسے دہلیز کے باہر دھکا دے دیا۔ زوردار دھماکے سے بند ہوتا ہوا دروازہ کتنی دیر تک کشور کے دل و دماغ میں گونجتا رہا۔ وہ اندھوں کی طرح دروازے کو گھورتی رہی۔

''اٹھو بیٹی...... ایک در بند ہوتا ہے تو اللہ سو در کھول دیتا ہے۔'' اسے لگا کسی مہربان ڈاکٹر نے اس کے رستے ہوئے زخم کو نرم روئی سے صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی آنکھوں میں روشنی لوٹ آئی۔ پھیری والا بوڑھا ''نیکی کر دریا میں ڈال'' کی زندہ مثال بنا اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کی ایک ہی سلامت آنکھ سے محبت اور شفقت کا نور پھوٹ رہا تھا۔ کشور کے اندر سارے طوفان دم توڑ گئے۔

''گو یہ پھٹی ہوئی چادر میلی ہے مگر ایک بیٹی کی عزت پوری طرح چھپا سکتی ہے۔'' اس نے اپنی بے انتہا بوسیدہ بدبودار چادر اس کے زخمی جسم پر پھیلا دی۔ مردے کے کفن کی طرح۔ نیم بے ہوشی میں اس کی زبان مفلوج اور احساسات مردہ ہو گئے تھے۔

''جب تک یہ دروازہ نہیں کھلتا، تب تک میری جھونپڑی میں انتظار کرلو۔ اوپر والا بہتری کرے گا۔'' اس نے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کشور کے دکھتے ہوئے بدن کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس نے کوئی سوال کر کے اس کے زخموں کو نہیں کریدا۔

اپنے آپ میں گم اسے تو یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کس سمت میں کتنا فاصلہ طے کر چکی ہے۔ یا ماں کے گھر سے دوسری ہی گلی میں اس نوجوان نے بوڑھے سے کیا سرگوشی کی تھی جو وہ بغیر کسی جھجک کے اس کی تقلید کرتے ہوئے اسے ایک ایسے دروازے پر لے آیا تھا جو بہرحال کسی جھونپڑی کا دروازہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ تو اس وقت پورے ہوش وحواس میں آ کر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی جب بوڑھے نے لاٹھی سے دروازے پر کمزور سی دستک دی اور ایک دم پیٹھ موڑ کر اس نوجوان کو جاتے ہوئے حیرانی سے دیکھ کر اسے بوڑھے کے بیٹے کا خیال آیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے خوف زدہ نگاہوں سے کھلتے ہوئے دروازے کو دیکھا۔ گویا وہاں سے سانپ یا بچھو برآمد ہوں گے۔ اس نے غیر یقینی نظروں سے بوڑھے کو دیکھا جو خود ایسا دکھائی دے رہا تھا گویا اس کی ایک آنکھ نے دھوکا دے کر اسے کسی غلط دروازے پر لا کھڑا کیا ہو۔

''اوپر والے پر بھروسا رکھ بیٹی۔ اس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔'' بوڑھے نے کشور سے زیادہ اپنے آپ کو تسلی دی تو اس کے جسم و روح پر چوٹوں کی ٹیسیں کسی بے ہنگم سازکی طرح ابھر آئیں۔ کچلا ہوا جسم کمزور ٹانگوں پر ڈگمگانے لگا۔ وہ دو روز سے بھوکی تھی۔ دروازے میں جھری کے ساتھ ہی ایک نو دس سال کے بچے نے جھانک کر چند لمحوں کے لیے دونوں کا جائزہ لیا پھر تیزی سے دروازہ بند کر لیا۔

''اماں کہتی ہیں، ابھی روٹی نہیں ہے یہ آٹا لے لو۔''
چند منٹ بعد بچہ ہاتھ میں آٹے سے بھری تھالی اٹھائے باہر آگیا۔ کشور کو دھچکا سا لگا۔ میلی پھٹی ہوئی چادر اوڑھے بوڑھے کی اوٹ میں اب وہ واقعی بھکارن بن گئی تھی۔ اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''خدا تمہیں بڑی عمر دے بیٹے، آٹا نہیں چاہیے...... تمہارا کوئی بڑا گھر میں نہیں ہے؟'' بوڑھے کی منمناتی آواز میں شرمندگی تھی۔ بچے کے چہرے پر معصومیت بھری حیرانی چھا گئی اور وہ ایک دفعہ پھر تیزی سے اندر غائب ہوگیا۔

''ارے تم ہو بابا......'' متعجب آواز پر دونوں نے بیک وقت نظریں اٹھا کر مخاطب کرنے والے کو دیکھا۔ پہلی ہی نظر میں کشور کو وہ آدمی بے حد شریف نظر آیا۔ خشخشی سی ڈاڑھی اور پیشانی پر سجدے کا نشان ساتھ ہی اس کی پتلیوں پر پھیلی ہوئی طمانیت اور ٹھہراؤ کشور کے لیے باعث سکون تھا۔ ''آج ادھر کیسے راستہ بھول پڑے؟ تم تو یہاں کبھی نہیں آتے۔'' انداز میں بدستور تعجب بھری مسرت تھی۔

''بس ایک ضرورت لے آئی بابو صاب۔'' وہ اپنی واحد آنکھ سے اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''مجھے اطمینان ہوا کہ آپ مجھے جانتے ہیں...... ایک امانت سپرد کرنے آیا ہوں۔'' اس نے کشور کی طرف نگاہ اٹھا کر امانت کی نوعیت کا اظہار کیا تو اس نے پہلی مرتبہ بڑے سوچ کے انداز میں دزدیدہ نگاہوں سے میلی چادر میں لپٹی ہوئی کشور کو دیکھا۔

''میں اس قابل تو نہیں ہوں مگر تم نے مجھے اس بھروسے کے قابل سمجھ کر میرا مان بڑھا دیا ہے بابا۔'' اس کے پرخلوص لہجے میں چاشنی تھی۔

''جاؤ بیٹی، اندر چلی جاؤ۔'' اس نے دروازے سے ہٹتے ہوئے پدرانہ شفقت سے کہا اور نگاہیں بوڑھے پر جمادیں مگر کشور کے پاؤں جیسے زمین میں دھنس گئے۔ اسے رشتوں اور دیواروں کی اوٹ سے خوف آنے لگا تھا۔ اس نے بڑی بے بسی سے بوڑھے کو دیکھا۔

''تم مجھے اپنی جھونپڑی میں لے جاؤ، غیر لوگ امانت نہیں سنبھالتے۔'' روح کی پکار اس کے سختی سے بھینچے لبوں کی دیوار سے ٹکرا کر رہ گئی۔

''شکریہ بابو...... میری جھونپڑی کمزور ہے ورنہ میں آپ کو تکلیف نہ دیتا...... اندر چلی جاؤ بیٹی۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔'' اس کی یقین دہانی پر بھی وہ کسی چھڑی کی طرح ساکت زمین میں گڑی رہی۔

''تم بھی آجاؤ بابا، تھوڑا دم لے کر چلے جانا۔'' اس نے کشور کی ذہنی کشمکش کا اندازہ لگاتے ہوئے بوڑھے کو بھی اندر آنے کی دعوت دی تو وہ بھی مجبوراً دونوں کے پیچھے ڈیوڑھی میں داخل ہوگئی۔ وہ ڈیوڑھی میں ہی بغلی دروازے میں اچانک غائب ہوئے تو بے پناہ ذہنی کشمکش نے اس کے پاؤں پھر جکڑ لیے۔ اندر کے چھوٹے سے صحن میں آٹا لانے والا بچہ تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا جو جلد ہی غائب ہوگیا۔

''کون ہو بیٹی؟ کیا چاہیے؟'' ممتا کی مٹھاس میں ڈوبی پرکشش مگر کمزور سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے سہم کر صحن کی جانب دیکھا۔ اس کی ٹانگیں بھی لرز گئی تھیں۔ ادھیڑ عمر کی عورت کا چہرہ چاند کا ہالہ محسوس ہوا۔ اتنا چمک دار چہرہ ...... اس کے اندر سے بے اختیار سرگوشی ابھری۔ اس کے فرشتوں ایسے چہرے نے کشور کے تنے ہوئے اعصاب کو سکون بخشا تو وہ ڈھیلے پڑ گئے گو ردعمل خوشگوار مگر کمزور کر دینے والا تھا۔ بھوک اور تھکاوٹ ایک دم اس پر حملہ آور ہوئی۔ سر سے میلی چادر ڈھلکی تو عورت نے تعجب سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اچھے لباس کی موجودگی میں اسے کشور کا چہرہ ایک دم بدلا بدلا مگر مظلوم دکھائی دیا۔ وہ بھکارن کسی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ تیزی سے کشور کے قریب آگئی کیونکہ کشور کی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ اسے ڈگمگاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹی؟ بیمار ہو؟'' اس نے حلاوت بھری ہمدردی سے پوچھتے ہوئے جونہی اس کے کندھے کو تھاما، اپنے آپ کو سنبھالنے کی بے پناہ کوشش کے باوجود کشور اس کے پاؤں میں ڈھیر ہوگئی۔ عورت نے حیرانی و پریشانی میں بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دینا چاہی۔ بچہ سہم کر بیٹھک سے باپ کو بلا لایا۔

''بیٹی اور مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے بانو۔'' عورت نے سوالیہ نگاہوں سے خاوند کو دیکھا تو اس نے بڑی شفقت سے نرم آواز میں کہا اور میلی چادر اٹھا کر کشور کے سر پر ڈال دی۔ ''سجدۂ شکر بجا لاؤ، اللہ نے تمہیں اتنی اچھی بیٹی گھر بیٹھے عطا کر دی ہے۔'' اس نے بڑے میٹھے لہجے میں اپنی بیگم کو تسلی دی۔ ساتھ ہی اس نے پدری شفقت سے نرم انداز میں کشور کے سر پر ہاتھ پھیر کر جلدی سے کھینچ لیا۔

''حوصلہ کرو بیٹی۔'' اس نے شفقت سے کشور کو بانہوں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی سہمے ہوئے بچے کی طرح اس سے لپٹ گئی۔ ''تمہیں ہمارے پیار اور خلوص میں کبھی کھوٹ نہیں ملے گا...... بیٹی کے بغیر گھر کتنا

سونا ہوتا ہے۔ آج اللہ نے میری یہ کمی بھی پوری کردی۔'' بانو کی ممتا سے ٹھنڈا میٹھا چشمہ بہہ نکلا اور وہ ایک لمبی سسکی لے کر جیسے مدہوش ہوگئی۔

''اسے اندر لے جاؤ بیگم اور کھانے کا بندوبست کرو پتا نہیں ہماری بیٹی کب سے بھوکی ہے۔'' وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر پھر بیٹھک میں چلا گیا۔

پیٹ بھرنے کے بعد وہ اتنا سوئی کہ دوسرے دن دوپہر کی خبر لائی۔ دو مہینوں سے جاگنے کے بعد پہلی مرتبہ سکون سے سوئی تھی۔ پندرہ دن کے مختصر عرصے میں اسے گھر کے لوگوں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگیا۔ وہ سیدھے سادھے دین دار قناعت پسند لوگ تھے۔ بانو کا میاں رحمت علی کسی اسکول میں دینیات کا استاد تھا۔ دونوں بڑے لڑکے کالج میں پڑھتے تھے جن کی اس نے ایک دفعہ بھی شکل نہیں دیکھی، البتہ تیسرا سب سے چھوٹا بیٹا ماجد بہت جلد اس سے گھل مل گیا جو بہن کے پیار کے لیے ترسا ہوا تھا۔ اس کی معصوم سی چاہت کشور کے زخموں پر مرہم بنتی جارہی تھی۔ دونوں بڑے بیٹے ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے کیونکہ باپ کی تنخواہ قلیل تھی جبکہ بانو خود بھی ظہر اور عصر کے درمیانی وقفے میں محلے کے بچوں کو قرآن مجید کا سبق دیتی تھی۔ شاید اسی لیے گھر میں زیادہ تر مسور کی دال پکتی تھی۔ سب سے زیادہ وہ اس بات پر مطمئن تھی کہ میاں، بیوی نے بھول کر بھی اس کے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھر کے ماحول میں اتنا تقدس اور پاکیزگی تھی کہ وہ منہ اندھیرے اٹھ کر نماز بھی پڑھنے لگی۔

بیس بائیس روز کے بعد شام کے وقت اسے بیٹھک میں عجیب سی ہلچل سنائی دی۔ ماجد بھی بھاگ کر بیٹھک میں چلا گیا تھا مگر وہ تجسس کے باوجود بیٹھک کے قریب نہ جاسکی۔ وہاں جانے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ دس منٹ کے بعد ماجد ہاتھ میں لفافہ لیے بیٹھک سے نکلا اور تیر کی طرح باورچی خانے میں ماں کے پاس چلا گیا، خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''امی...... امی بڑے بھائی جان آئے ہیں۔'' اسے ماجد کی مسرت میں تمتماتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اچھا'' ماں کی آواز میں تعجب تھا۔ ''بہت دنوں کے بعد اسے یہاں کا خیال آیا۔'' کہتے وقت بانو کے شکایتی لہجے میں ممتا کا چشمہ پھوٹ رہا تھا۔ کشور ممتا کی اس مٹھاس میں جیسے خود بھی گھل گئی، کتنی ماؤں کی چاشنی اس ایک عورت میں جمع ہوگئی ہے، اس نے سوچا۔

''صندل بیٹی، تم چائے کا پانی رکھو...... میں ابھی آئی۔'' یہاں اس نے بالکل غیر ارادی طور پر اپنا نام صندل ہی بتایا تھا حالانکہ اس خوشبو کے ساتھ نفرت اور انتقام کی آنچ بھی شامل تھی، اس نے نظر اٹھا کر بانو کو دیکھا تو تعجب سے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے پہلی مرتبہ بانو کے چہرے پر اضطراب و بے چینی کی پھیلتی ہوئی لہریں دیکھی تھیں۔

کیا یہ اس کا چوتھا بیٹا ہے؟ اس نے بے اختیار سوچا پھر تو اسے بلاتکلف گھر کے اندر آجانا چاہیے تھا، وہ الجھ گئی۔ باورچی خانے میں پندرہ منٹ کا وقفہ اس کے لیے صدیوں کا وقفہ بن گیا تھا کیونکہ گھر کے سارے افراد بیٹھک میں تھے۔

''چائے تیار ہوگئی بیٹی؟'' لہجے کی شیرینی میں غیر معمولی گرم جوشی صندل کے لیے خلافِ معمول تھی۔

''جی امی۔'' اس نے نگاہ اٹھا کر بانو کو دیکھا تو وہ خود اسے قدرے الجھی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''ہے تو معیوب سی بات بیٹی۔'' بانو نے اٹک اٹک کر کہا تو وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''مگر تم بیٹھک میں مہمان کو چائے دے آؤ۔'' صندل پر بجلی سی گری۔ وہ تو اس کے بیٹوں کے سامنے نہیں گئی تھی۔ وہ ہکا بکا ہو کر اس نئی ماں کو دیکھنے لگی۔

''ایسے مت دیکھو بیٹی، میری طرح تم بھی کڑوا گھونٹ بھرلو۔ خدا بہتری کرے گا۔'' اس نے دوسری طرف متوجہ ہوتے ہوئے صندل کو تسلی دی۔ ''الماری سے نیا کپ لے کر طشتری میں چائے لے جانا۔'' اس نے سادگی سے کہا اور وہ بے بسی سے امی کو دیکھتی رہ گئی۔ کیا ایسے لوگوں کے بھی کئی روپ ہیں جن کے ماتھے پر سجدوں کا نشان اور چہروں پر تقدس کا غازہ ہوتا ہے۔ وہ لرزتے قدموں سے چائے اٹھا کر بیٹھک کی طرف چل دی۔ دروازے پر چند لمحوں کے لیے ٹھٹکی۔ اس کا دل چاہا چائے دیے بغیر واپس لوٹ جائے مگر پیٹھ پیچھے قدموں کی چاپ نے اسے بیٹھک میں دھکیل دیا۔

پہلی نظر میں اسے بیٹھک میں کوئی نظر نہیں آیا، البتہ دوسری گھومتی ہوئی نگاہ نے اسے شعلہ بنا دیا۔ ٹرے پر اس کے ہاتھ اتنی سختی سے جم گئے کہ اس کے کنارے اسے اپنی ہتھیلیوں میں گھستے ہوئے محسوس ہوئے۔ چائے کی پیالی زلزلے کا سماں پیش کررہی تھی۔ اس کی جلتی نگاہیں دروازے کی اوٹ میں کھڑے اجمل کو گھورنے لگیں جس کے لبوں پر شوخ، کھلنڈری سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی جو صندل کو بڑی کریہہ لگی۔

''کیوں تمہارا انتقام پورا نہیں ہوا جو شیطان کی طرح یہاں بھی آموجود ہوئے؟'' شدید ردعمل نے اس کا انداز کرارا بنا دیا تھا۔ اجمل کی مسکراہٹ اور بھی شریر ہو گئی۔

''صندل بیگم......!'' اس نے چٹخارا سا لے کر نام چبایا۔

''جہنم میں گئی تمہاری صندل بیگم۔'' اس نے بڑی تلخی سے اس کی بات کاٹی۔

''خدا کا شکر کرو خود آگ میں جل کر تمہیں جہنم سے نکال دیا ہے۔ ٹرے اس تپائی پر رکھ دو، کہیں ان غریب لوگوں کا نقصان نہ ہو جائے۔'' اس نے اس کے لرزتے ہاتھوں سے زبردستی ٹرے چھین کر نیچے رکھ دی۔ وہ پہلے جیسا مظلوم سا اجمل بالکل نہیں تھا۔

''رہا تمہیں اس گھر سے نکلوانے کا سوال تو......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر شرارتی نگاہوں سے صندل کو دیکھا۔

''مجھے اب پہلے والی صندل نہ سمجھنا۔'' وہ جل کر بل کھا گئی۔ ''اب تو کوئی گھر ہی نہیں تو نکلواؤ گے کیا۔'' اس کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ اجمل کے چہرے سے اچانک ہی شوخی کا مصنوعی نقاب اتر گیا۔

''اس گھر میں میری بادشاہی نہیں، جب تک تم خود اپنی خوشی سے اس گھر سے نہ جانا چاہو، تمہیں کوئی نہیں نکالے گا۔ یہ عزت والا گھرانا ہے۔''

''مگر میں ہر ایک سے رحم کی بھیک مانگتے مانگتے تنگ آ گئی ہوں۔'' اس نے جھنجلا کر اپنی انگلیاں مروڑیں۔ ''آخر تمہارا کون سا روپ حقیقی ہے؟''

''یہی میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' اس نے نرم لہجے میں پھیکی سی مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بتاتی ہوں۔'' وہ قدرے جبڑے بھینچتی ہوئی بولی۔ ''تم انتقام کی اندھی لاٹھی کے سوا کچھ نہیں ہو۔ کسی بڑے درخت پر نہ مار سکے تو میرے جیسی کمزور شاخ پر دے ماری۔'' وہ بڑی تلخی سے کہتے ہوئے جانے کے لیے گھوم گئی۔ ''پتا نہیں تمہیں کس نے میرا پتا دے دیا۔'' دروازہ تھام کر قدرے گردن گھما کر اس نے غصے سے جلتی نگاہوں سے اجمل کو دیکھا۔

''دینا کس نے تھا، میں تو خود قدم بہ قدم تمہارے ساتھ چلتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔'' اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''تم جھوٹ بکتے ہو۔'' وہ زخمی ناگن کی طرح پلٹ کر پھنکاری۔ ''تم محض جھوٹ کا پلندا ہو اور سمجھتے ہو بہت زیادہ پڑھ لکھ کر بہت زیادہ چالاک ہو گئے ہو اسی لیے مجھ جیسی اناڑی لڑکی کو ابھی تک اپنی مرضی کے مطابق موم کی ناک کی طرح موڑتے رہے۔'' صندل کی سرخ سرخ سی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے۔

''مگر یاد رکھو، میرا نام کشور ہے۔ اب کسی اور کو ڈھونڈو جسے صندل کا لباس پہنا کر اپنے گھر کی صفائی کروا سکو۔'' اس کا پورا چہرہ نفرت و غصے کی آگ میں بھبوکا بن گیا تو وہ پہلے سے زیادہ دلفریب، زیادہ پرکشش لگنے لگی۔ اجمل کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں پھیل گئے اور وہ اس کے مقابل آ کر بے باکی سے کھڑا ہو گیا اور پھر اس کے دونوں مضبوط جوان ہاتھ صندل کے نازک سے کندھوں پر جم گئے اور اسے محسوس ہوا گویا کسی نے اس کے کندھوں پر وزنی چٹانیں رکھ دی ہیں۔ وہ زمین میں دھنس جائے گی۔

''گھر کی صفائی کروا سکوں یا نہیں، البتہ تمہارے دل کی صفائی ضرور کر دوں گا۔'' اس کی سنجیدگی گہری ہو گئی۔ ''تمہیں اس گھر کے لوگوں سے تو کوئی شکایت نہیں؟'' اس نے قدرے بھاری آواز میں پوچھا۔ اپنے کندھوں پر اس کے بے تکلف ہاتھوں کی بنا پر وہ جلتے جلتے ایک دم سلگنے لگی۔ گویا شعلوں پر پانی پڑ گیا ہو۔

''تم مکار ہو، کوّے کی طرح چالاک ہو۔'' اس کی آواز دھواں دینے لگی۔

''اپنے بارے میں نہیں، اس گھر کے لوگوں کے بارے میں پوچھا ہے۔'' اس کی گونجتی ہوئی سرگوشی دھمک پیدا کر گئی۔ اجمل کی نگاہوں میں بجلی سی لہرائی تھی۔

''وہ سب تمہاری ضد ہیں، تم ان کے پاؤں کے برابر بھی نہیں ہو۔'' اس کی آواز باقاعدہ بھیگ گئی تو اجمل نے گہرا سانس لیتے ہوئے اس کے کندھوں پر سے اپنے ہاتھ اٹھا لیے۔

''تب تم یقین رکھو، اس گھر سے تمہاری ڈولی اٹھے یا جنازہ، باعزت طریقے سے اٹھے گا۔'' اس نے لفظ جنازے پر زور دیا تو صندل کو وہ پھر بہروپیا سا لگا جو اب اسے سنہرے خواب دکھانے لگا تھا۔

''اگر تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہو تو کچھ کام کی بات کر لوں جس کے لیے ممانی جان سے انتہائی خوشامد کر کے تنہائی میں تم سے بات کرنے کی اجازت حاصل کرنا پڑی ہے۔'' اجمل جیسے تیزی سے گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا۔

''ممانی جان......؟'' وہ بے پناہ حیرانی سے دہراتی ہوئی بھربھری ریت کی طرح بیٹھتی چلی گئی۔ ''تم آخر مجھ سے کھلونے کی طرح کیوں کھیل رہے ہو؟'' اس نے سنبھالا لینے کی کوشش کی۔ ممکن ہے اس کی طرح اجمل نے بھی اپنی فرضی ممانی بنا لیا ہو۔ ''ٹھیک ہے میں نے تم سے ہمدردی کی

تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے اپنا کھلونا سمجھنے لگو...... تم اور تمہارے باپ کو دیکھتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ اتنی نیک سیرت، اتنی اچھی اور خلوص کی چاشنی کا اتنا گہرا سمندر تمہاری ممانی ہوسکتی ہیں۔'' اس نے ایک قسم کا ہتھیار پھینکتے ہوئے غیر یقینی لہجے میں کہا۔

''تمہارے دماغ میں بالکل ہی بھس بھر گیا ہے تو میں کیا کروں۔'' اجمل نے چڑ کر کہا تو صندل بے اختیار مسکرا پڑی۔ اسے اس طرح چڑتے دیکھ کر پہلی مرتبہ اس کے دل میں لڈو پھوٹے تھے۔ اس کا سارا غصہ بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔

''جو عورت تنہائی میں مجھ سے ملنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے، تم خود سوچو کیا وہ خود اس طرح سر جھاڑ منہ پھاڑ کسی غیر مرد کے سامنے جاسکتی ہے جیسے وہ یہاں آگئی تھیں البتہ تمہارا یہ خیال ٹھیک ہے کہ مجھ سے یا میرے باپ سے ان کا رشتہ بڑا غیر فطرتی محسوس ہوتا ہے مگر یہ بہر حال موجود ہے...... حلال کے لقمے کھانا میں نے انہی سے سیکھا ہے۔''

''تبھی کمینہ پن کرتے پھر رہے ہو۔'' صندل نے بے ساختہ کہا تو اسے بے پناہ روحانی سکون سا ملا۔

''اے...... زبان سنبھال کر بات کرو۔'' اجمل نے بچے کی طرح منہ بسور کر کہا تو وہ کھل کر مسکرادی۔

''اتنے اچھے گھر میں رہ کر کیا یہی زبان سیکھی ہے اور جہاں کھولنی چاہیے تھی وہاں زبان پر تالا لگا رکھا تھا۔'' اس نے طنز سے کہا۔ ''ممانی جان کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے ورنہ تمہارا دماغ درست کردیتا۔'' وہ بچوں کی طرح جھگڑنے لگے۔

''اب اتنا نہ بڑھو میں تمہاری کوئی زرخرید لونڈی نہیں ہوں...... کہو کیا بکنے آئے تھے؟'' وہ اپنی شوخ سی بے باکی پر خود حیران ہو رہی تھی۔ اس کی روح میں شہد بھی گھلتا جا رہا تھا۔

''ہاں بکنے ہی آیا تھا مگر تم نے مجھے دوسری باتوں میں الجھا دیا۔'' اجمل کے انداز میں سوز اور چہرے پر اچانک دکھ کی پرچھائیں آگئی۔ وہ حیرانی سے ایک دفعہ پھر بدلتے ہوئے اجمل کو دیکھنے لگی جس کی نگاہوں میں بے پناہ کشمکش ابھرنے لگی تھی۔

''کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ آخر تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا جبکہ میں نے دل کی پوری سچائی سے اپنا ہر قدم تمہاری طرف بڑھایا تھا؟'' اجمل کے لہجے میں بھنور تھا، طوفان تھا، بگولا تھا۔ صندل شوخ بادلوں پر پرواز کرتی ہوئی جیسے اس بگولے کی لپیٹ میں آگئی۔

''میں نے...... اور تمہیں دھوکا دیا؟'' حیرانی سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ اس کی آواز مرتعش ہوتی گئی۔ ''مگر کب...... کہاں...... کیسے؟'' وہ سر سے پاؤں تک سلگ اٹھی۔

''تھوڑے دن پہلے...... میرے اپنے گھر کے باورچی خانے میں۔'' اس کے جبڑے بھنچ سے گئے۔ ''میری مرحوم ماں کو بیچ میں لا کر مجھے ایک مظلوم، بھولی بھالی اور پاکیزہ سی نکھری ہوئی صندل کا خواب دکھایا تھا؟'' اجمل ٹوٹا ہوا دل بن گیا ایک دم اتنا تغیر...... وہ ہوا میں معلق ہوگئی جس کے چاروں طرف کوئی سہارا نہیں تھا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی، آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اس کی آواز بکھر گئی۔ ''کیا میں نے تم سے ہمدردی کرکے کوئی جرم کیا تھا؟ یا میں نے تازہ پکائی ہوئی روٹی میں زہر ملا کر تمہیں کھلا دی تھی؟''

''کاش...... تم ایسا ہی کردیتیں تو میں اس ذہنی اذیت اور روحانی عذاب سے بچ جاتا جس سے میں اس وقت گزر رہا ہوں۔'' وہ نچکچایا۔ ''میں گھر سے بے گھر ہوا صرف تمہارے لیے۔'' اجمل جیسے نوحہ کرنے لگا۔ ''اپنے آپ کو جذبات کی بھٹی میں جلایا، تمہاری خاطر اس کمزور سے بوڑھے کو تمہاری حفاظت پر مجبور کیا جو خود اپنے چار جوان بیٹوں کی قبریں اٹھائے دردر کی خاک چھانتا ہے۔ ان نیک اور شریف لوگوں کو تمہیں پناہ دینے پر مجبور کیا ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ تم آسانی سے اس دروازے پر پہنچ جاتیں۔ پہنچ بھی جاتیں تو یہ لوگ آج کی طرح تمہیں اپنے سینے سے بھی لگا لیتے۔'' وہ بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح کشور کو تنکے کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔

''اس سے بھی بڑھ کر تمہارے شوہر ہونے کی کالک اپنے چہرے پر ملی۔ صرف اس لیے کہ تمہیں ایک ایسے بھیڑیے کے پنجوں سے رہائی دلاسکوں جو تمہاری نام نہاد عزت کی دھجیاں اڑانے کے قریب تھا۔ میں نے اپنے باپ کے سامنے کتنی بے غیرتی سے تمہیں اپنے طاقت ور بازوؤں کا سہارا دیا۔ گویا تم واقعی میرے جسم و روح کا حصہ بن چکی ہو۔'' اجمل بلند سے بلند تر شعلہ بنتا گیا۔

''تم نے ابھی تک نہیں بتایا کہ میں نے تمہیں کون سا دھوکا دیا ہے؟'' اس نے بے بسی سے پوچھا۔

''دھوکا؟'' نفرت و غصے کا سارا زہر اس لفظ میں جمع ہو گیا تھا۔ ''کل تک میں تمہیں جو کچھ سمجھتا رہا، آج صبح وہ بارود کے دھماکے کی طرح بکھر گیا ہے...... شادی شدہ ہوتے ہوئے آخر مجھے الجھانے کی تمہیں کیا ضرورت تھی؟'' اس نے نچکچا کر کہا تو صندل کی ہچکیاں اس طرح رک گئیں گویا اجمل نے اس کے حلق میں لوہے کا گولہ پھنسا

دیا ہو۔ فرطِ حیرت سے کسی مُردے کی طرح اس کے ہونٹ کھلے رہ گئے تھے۔

''تم نے جان بوجھ کر کسی بھی موقع پر اس طرف اشارہ تک نہیں کیا۔'' کوشش کے باوجود وہ اپنی آواز کو اونچا ہونے سے نہ روک سکا۔ ''اس وقت بھی نہیں جب تمہیں بیوی کی طرح اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر میں نے اپنے باپ کی آنکھوں میں دھول جھونکی۔'' اجمل کے الفاظ انگارہ بن کر صندل کے جسم وروح پر آبلے ڈال رہے تھے۔ ''کل تک میں یہی سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ تمہاری جیسی مظلوم لڑکی کو سہارا دے کر میں نے نیکی کا کوئی بہت بڑا کام کیا ہے مگر اس وقت تمہیں سامنے پا کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی تیندوے نے اپنے پنجے کا پھندا میرے گلے میں کس دیا ہے۔'' وہ آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ اتنی ذرا سی چوک کا اتنا بھیانک انجام، صندل دہشت سے منجمد ہوتی جا رہی تھی۔ کھلی آنکھوں کے باوجود اندھیرے کی دبیز چادر اس کے سامنے تیزی سے پھیلنے لگی' اس نے اندھوں کی طرح دیوار کا سہارا لے کر فرش پر بیٹھنا چاہا۔

''تم نے تو...... تم نے تو آج تک میرا نام تک جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی تو پھر اتنی بڑی حقیقت کیسے جان لیتے؟'' بے جان دیوار کے سہارے نے اسے بڑا حوصلہ دیا تھا۔ ''نفرت اور انتقام کی چنگاریوں کے سوا تم نے کبھی دوسری روشنیاں محسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ دوسری طرف حالات نے مجھے پے در پے اتنے دھکے دیے کہ میرے لبوں سے آہوں، سسکیوں اور ہچکیوں کے سوا کچھ نہ نکل سکا۔'' وہ گویا پھانسی کے تختے پر لٹکنے سے پہلے اپنی آخری صفائی پیش کرنے لگی۔

''مجھے کیا معلوم تھا کہ جس راستے پر چل کر میں یہاں تک پہنچی ہوں، اسے تمہارے ہاتھوں نے بنایا تھا ورنہ میں اس راستے پر پاؤں رکھنے سے پہلے کسی گاڑی کے نیچے رکھ کر انہیں کاٹ ڈالتی۔'' گویا اس کے زخمی الفاظ اور ناگفتہ بہ حالت نے اجمل کو متاثر کیا تھا مگر اس کا اپنا زخم کچھ اتنا گہرا تھا کہ صفائی کا مرہم بھی اسے تکلیف پہنچا رہا تھا' اس نے پہلو بدل کر گہرا سانس لیتے ہوئے جلتی نگاہوں سے صندل کا جائزہ لیا۔

''مجھے تم سے اس کے سوا اور کوئی شکایت نہیں کہ تم نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرے جذبات سے کھیلا۔ میرے خلوص کے ساتھ ایسا بھیانک مذاق کیا ہے کہ کچھ دیر پہلے میں خودکشی تک کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا اور اب بھی میں چوروں کی طرح یہاں تک پہنچا ہوں۔'' اجمل کی آواز میں ٹوٹی چٹانوں کا شور بڑھنے لگا۔

''کیونکہ...... کیونکہ......'' اس نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کرنے کی کوشش کی۔ ''کیونکہ صبح کا اخبار چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہا ہے کہ ایک بڑے گھر کے بیٹے اور کالج کے ہونہار طالب علم اجمل ملک نے ایک شادی شدہ عورت کو ورغلا کر اغوا کرلیا ہے۔ اب دونوں کسی جگہ دادِ عیش دے رہے ہیں۔ ہونہہ...... دادِ عیش......'' اس نے زخمی سانپ کی طرح پھنکار کر کرب سے انکشاف کیا تو صندل کے سامنے ساری حقیقتِ حال واضح ہوگئی۔

''نہیں...... نہیں اجمل، یہ سب جھوٹ ہے۔'' وہ بلبلا کر ایک دم کھڑی ہوگئی گویا اجمل نے دہکتی ہوئی سلاخ اس کے دل میں اتار دی ہو۔ ''میں کسی کی بیوی نہیں ہوں...... میں کسی کی بیٹی نہیں ہوں...... میرا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے، میرا یقین کرو۔'' وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح تڑپی۔

''یہ سب جھوٹ ہے۔'' اجمل کا لہجہ بڑا زخمی، بڑا کربناک تھا۔ اس نے جیب سے تڑا مڑا اخبار نکال کر کشور کے منہ پر دے مارا۔ ''تو اسے پڑھو۔'' اس کی آواز حد درجہ وحشت زدہ ہوگئی۔ ''اور جب صندل کے پاکیزہ جسم میں کشور کا زہر اتر جائے تو اس اخبار کو جلا کر اپنے اور میرے چہرے پر اس کی راکھ مل لینا تاکہ ہم دونوں کے اصل چہرے چھپ جائیں۔'' غصے، صدمے اور بے بسی نے مل کر اجمل کا چہرہ بھیانک بنا دیا اور کشور خوف زدہ ہوگئی۔

''خدا گواہ ہے، یہ سب جھوٹ ہے...... ایک دم جھوٹ۔'' اس نے سسکی روکنے کے لیے بے اختیار اپنی دو انگلیاں دانتوں میں لے کر چبا ڈالیں۔

''اخبارات، قانون اور عدالت خدا کی ایسی گواہی نہیں مانتے جب ان کے سامنے میں موجود ہوں، تم موجود ہو۔'' اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔ اس کی نگاہیں بڑی.... بے رحمی سے صندل کو چھید رہی تھیں۔ وہ پنجوں کے بل اس کے مقابل فرش پر بیٹھ گیا۔ ''اگر یہ جھوٹ ہے تو پھر سچ کیا ہے؟''

''تقریباً سال بھر پہلے میں نے...... میں نے طلاق لے لی تھی ورنہ میں اپنی ماں کے ساتھ تمہارے گھر آنے پر مجبور کیوں ہوتی؟'' اجمل تڑپ کر کھڑا ہوگیا۔ ''شاید تمہیں یاد ہو، میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں تم سے کسی بھی رشتے کے قابل نہیں ہوں۔'' اس نے گھٹنوں میں سر دیتے ہوئے صفائی پیش کی۔

''اس وقت سوال تمہارے قابل یا ناقابل ہونے کا نہیں ہے۔'' وہ بل کھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے اس نئے

انکشاف کی روشنی میں، میں ناصر بھٹی نام کے اس شخص کو کہاں فٹ کروں جس نے قانون کی دہائی دے کر اس لیے میرے اور تمہارے وارنٹ گرفتاری نکلوا دیے ہیں کہ اس کی بیوی مسمات کشور بیگم تیس ہزار کی نقدی اور سارے زیورات سمیٹ کر کالج کے نوجوان طالب علم اجمل ملک کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔ قانون اسے برآمد کر کے اس کے حوالے کرے اور پولیس تمہیں اور مجھے برآمد کرنے کے لیے اپنا پہلا قدم اٹھا کر آج صبح میرے کالج آ پہنچی تھی...... کیا یہ شخص تمہارا دوسرا شوہر ہے؟'' وہ ایک ایک فقرہ چباتے ہوئے غصے سے کپکپایا۔ صندل کو حالات کے اس نئے رخ سے شدید دھچکا پہنچا۔ اس کی آنکھیں پھٹی اور ہونٹ کھلے رہ گئے تھے پھر وہ بے جان گٹھری کی طرح دیوار سے گھسٹتے ہوئے فرش پر لڑھک گئی۔

ممانی کی مدد سے زخمی صندل کو اندر بھجوانے کے باوجود وہ اپنی خون سے لتھڑی انگلیوں کی تمام تر دہشت کے ساتھ اجمل کے سامنے ہی منجمد تھی گویا اس نے اپنا نہیں اجمل کا خون پیا ہو۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا، اپنے گھر کے باورچی خانے کی ایک مظلوم سی دوشیزہ اب ڈائن کے روپ میں اس کے سامنے ظاہر ہوئی تھی جو اتنی بے رحم بن گئی تھی کہ اپنی پوری قوت سے اس کے دل و دماغ پر دو دو شوہروں کے ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

یہ تو اس کے ماموں کی مشفق سی آواز تھی جس نے اسے اس دہشت سے نجات دلائی۔ جس نے اسے اپنے سینے سے کسی مشفق باپ کی طرح لپٹاتے ہوئے یہ کہہ کر تسلی دی کہ دنیا میں دنیا جیسی ہی باتیں ہوتی ہیں لہٰذا اسے صبر اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ اس نے اسے موجودہ صورت حال کی نزاکت کا یہ احساس دلایا کہ دراصل ان دونوں کا ایک جگہ پایا جانا الزام کا ثبوت بن سکتا ہے اور صفائی پیش کرنے کے لیے اسے وقت کی مہلت درکار ہے۔ خدا پر کامل یقین کی بنا پر اس کا ماموں بالکل پرسکون تھا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے آئندہ کے حالات کی پیش بندی کر رہا تھا کیونکہ اسے دونوں کی بے گناہی کا یقین بھی تھا۔ اس لیے جب وہ تین چار گھنٹے کی مختصر مدت میں اپنے ایک وکیل دوست کی مدد سے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کر کے اجمل کے ساتھ گھر پہنچا تو وہ بیٹھک میں پولیس انسپکٹر کو دیکھ کر اجمل کی طرح قطعاً ہراساں نہیں ہوا جبکہ انسپکٹر نے تجربے کی بنا پر پہلی ہی نظر میں اپنے مطلوبہ ملزم کو پہچان لیا۔ اس کے ماموں نے خندہ پیشانی سے انسپکٹر کا استقبال کرتے ہوئے چند ہی منٹ کی گفتگو میں اپنی شرافت کا نقش اس کے دل میں بٹھاتے ہوئے صورتِ حال کی وضاحت کے ساتھ ضمانت کا کاغذ بھی اس کی طرف بڑھا دیا تو انسپکٹر کا رویہ بہت حد تک نرم ہو چکا تھا جس سے اجمل کے چہرے کی رنگت پھر سے بحال ہو گئی تو اپنے دوست وسیم کو انسپکٹر کے ساتھ دیکھ کر اس کے سارے جسم پر پہلی دفعہ چیونٹیاں سی رینگ گئی تھیں لیکن حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے اس کے خلوص پر شبہ نہیں کیا۔ باپ کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ ابھی تک اپنے اسی دوست کے ساتھ رہ رہا تھا جس نے اسے اپنے کمرے میں سر چھپانے کی جگہ دی۔

''انسپکٹر صاحب! اگر مناسب سمجھیں تو ہمیں اس شخص ناصر بھٹی کے بارے میں کچھ بتائیں۔ ہم نے یہ نام آج ہی پہلی مرتبہ سنا ہے۔'' جب انسپکٹر کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد جانے لگا تو ماموں نے درخواست کی۔ جواب میں کچھ سوچ کر انسپکٹر نے مختصراً ناصر بھٹی کے بارے میں بتایا کہ ناصر بھٹی اپنی بدعنوانی کی بنا پر محکمۂ انکم ٹیکس سے نکالا جا چکا ہے۔ ایکسپورٹ کا کام کرتا ہے اور لوگوں کو انکم ٹیکس کے بارے میں مشورے بھی دیتا ہے۔ چلتا پرزہ ہے اسی لیے پکڑائی نہیں دیتا۔ مزید یہ کہ اس کے پاس نکاح نامہ موجود ہے جو اس کی درخواست کے ساتھ منسلک ہے جس کی بنا پر یہ کارروائی عمل میں آئی ہے مگر طلاق نامے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ چلتے چلتے اس نے اس کے ماموں اور اجمل کی معصومیت سے قدرے متاثر ہو کر یہ مشورہ بھی دیا کہ جتنی جلد ہو سکے، طلاق نامے کے ساتھ باقاعدہ طور پر عدالت سے رجوع کر لیں جسے دونوں نے شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہوئے انسپکٹر کو اپنے مکمل تعاون اور بے گناہی کا یقین دلایا حتیٰ کہ یہ بھی جتلا دیا کہ اجمل اور کشور میں سوتیلے بہن بھائی کا رشتہ بھی موجود ہے۔ تو انسپکٹر ''اوہ'' کر کے رہ گیا۔ یہ اس کے لیے نیا انکشاف تھا اس لیے اس نے ان لوگوں کی شرافت دیکھتے ہوئے یہاں تک اظہار کر دیا کہ ناصر بھٹی یقیناً ان دونوں کے خلاف کوئی جال پھیلا رہا ہے لہٰذا انہیں فوری طور پر طلاق نامے کے ساتھ جواب دعویٰ داخل کر دینا چاہیے۔

انسپکٹر کی فوری رخصتی کے بعد ممانی سر پر چادر ٹھیک کرتی ہوئی بیٹھک میں داخل ہوئیں تو وسیم پر نظر پڑتے ہی چونک پڑیں۔

''بیگم، یہ بھی ہمارے بچوں جیسا ہے، اجمل بیٹے کا دوست ہے۔'' جواب میں اس نے سلام کیا۔

''جیتے رہو بیٹا۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے اور نیکی

دے۔'' ممانی نے جواباً کہا۔ اجمل نے اس کا مختصر تعارف کرواتے ہوئے اس کی بھرپور مدد اور تعاون کی تعریف کی۔
''آج صبح اس کی ہوش مندی سے مجھے کالج سے آپ کے یہاں آنے کا موقع ملا۔''
''کیوں شرمندہ کرتے ہیں اجمل بھائی۔'' وسیم نے جلدی سے بات کاٹی۔ ''اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میرا سہارا چھن جاتا۔'' اس نے خلوص سے کہا۔
مختصر بات چیت کے بعد وسیم اور اجمل باہر نکل آئے۔
''تو یہ کشور آپ کی سوتیلی بہن ہیں؟'' وسیم نے باہر آتے ہوئے راستے میں ڈرتے ڈرتے اجمل سے پوچھا۔ اجمل نے عجیب سی کربناک نگاہوں سے اسے دیکھا پھر اداس سی مسکراہٹ لبوں پر پھیل گئی۔
''ہاں...... مگر زبردستی کی۔ بہرحال تمہارا شکریہ، تمہاری بروقت ہوشیاری سے حالات قابو میں آگئے۔ ورنہ سوچو اگر تم اس انسپکٹر کے سامنے مجھ پر پردہ نہ ڈال دیتے تو ضمانت سے پہلے ہی تھانے میں میرا حلیہ بگڑ چکا ہوتا۔'' اس نے قدرے شگفتہ لہجے میں کہا۔
''بس اجمل بھائی، مجھے شرمندہ نہ کریں مجھے تو ایسے لگا تھا گویا کسی نے زبردستی یہ بات مجھ سے کہلوادی ہے کہ آپ آج کالج ہی نہیں آئے حالانکہ انسپکٹر آپ کو بڑا گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔'' وسیم اس لمحے کے تصور پر سہم سا گیا۔
''کہاں تک میرا ساتھ دینے کا حوصلہ ہے کیونکہ حالات اور الجھ سکتے ہیں۔''
''جب تک آپ ڈٹے ہوئے ہیں۔'' اس نے بڑے خلوص سے جواب دیا تو فرط جذبات سے اس نے وسیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور اسے رخصت کر کے دوبارہ ماموں کے گھر آ گیا۔
''مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے بھیگی ہوئی آواز سے کہہ کر اسے رخصت کر دیا۔
''معاملہ تو سب خیریت سے نمٹ گیا؟'' جب وہ دوبارہ بیٹھک میں داخل ہوا تو ممانی بوجھل، فکرمند لہجے میں اپنے میاں سے پوچھ رہی تھیں۔
''فی الحال تو اللہ نے کرم کیا ہے...... صندل بیٹی کا کیا حال ہے؟'' ماموں کے استفسار پر خود اجمل کا دل بھی دھڑک اٹھا۔
''ہوش میں آ کر بس روئے جا رہی ہے۔ میں نے اس کی انگلیوں پر پٹی باندھ دی ہے۔'' ممانی نے الجھی نگاہوں سے اجمل کو دیکھا۔ ''کیوں بیٹے...... تم نے اسے کیا کہہ دیا تھا جو اس نے اپنی انگلیاں تک چبا ڈالیں؟''
''اسے میری سچی بات شاید کڑوی لگی تھی۔'' اس نے کسی مجرم کی طرح صفائی پیش کی۔ ''میں نے صرف اس سے یہ تصدیق چاہی تھی کہ ناصر بھٹی کیا اس کا دوسرا شوہر ہے۔'' اس کے انداز میں اب بھی تپش تھی۔
''دوسرا شوہر؟'' دونوں میاں بیوی کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور پھر دونوں ایک دوسرے کو الجھی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔
''ضروری نہیں کہ سچی بات ہی کڑوی لگے، بعض اوقات جھوٹا الزام بھی سچ سے زیادہ کڑوا لگتا ہے۔ خاص کر عورت کا نازک مزاج اسے بہت کم برداشت کر پاتا ہے۔'' ممانی نے اسے تصویر کا دوسرا رخ دکھایا تو اجمل جھرجھری لے کر رہ گیا۔ دلیل وزنی تھی مگر دوسرے شوہر کے تصور کی رقابت اجمل کے جذبات کا اتنی جلدی پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔
''تو پھر اسے کم از کم اس کی تردید کرنی چاہیے تھی۔'' اجمل نے گویا اپنے آپ کو سہارا دیا تو ماموں کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''جب تک معاملہ بخیر و خوبی نمٹ نہیں جاتا میں اپنے بجائے وسیم کو خیریت دریافت کرنے بھیجتا رہوں گا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے ماموں سے کہہ کر سوالیہ انداز میں دیکھا۔
''نہایت مناسب خیال ہے کیونکہ فیصلہ ہونے تک تم جتنا اس گھر سے دور رہو گے، اتنا ہی تم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔ اچھا بیگم تم کھانے کی تیاری کرو۔ اس پریشانی میں بھوک بھی جیسے غائب ہوگئی۔ تم بھی کھانا کھا کر جانا۔'' اجمل نے اقراری سر جھکا دیا۔
کھانے کے بعد ماموں نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم تم نے کس خیال سے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی بہرحال صندل بیٹی نے بہت سی باتوں پر سے پردہ اٹھایا ہے اور میرے نزدیک اس کی تمام باتیں اطمینان بخش ہیں۔ اس لیے اگر تم بھی کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر دو تو میں زیادہ بہتر مشورہ دے سکتا ہوں۔ تم دونوں ایک دوسرے کی حیثیت کا یقین کر کے شک و شبے کی فضا کو صاف کر دو ورنہ عدالت میں تم دونوں کے بیانات ایک دوسرے کے خلاف جا سکتے ہیں۔'' انہوں نے بڑے میٹھے لہجے میں اپنے بھانجے کو سمجھایا آخری نکتہ اجمل کے دل میں اتر گیا تھا مگر وہ اپنے ماموں سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہ کر سکا۔

"مجھے خوشی ہے تم میں رشتوں کا احترام موجود ہے۔" ماموں نے مزید بتایا کہ ناصر بھٹی ہی اس کا پہلا اور آخری شوہر تھا جس سے اس نے خود اس بنا پر طلاق حاصل کی تھی کہ اپنے مذموم مقاصد کے لیے وہ اسے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ردعمل میں اجمل کا تنا ہوا چہرہ نرم پڑ گیا۔ آنکھوں کی چمک بھی بڑھ گئی۔

"گناہ میں بڑی لذت اور آزادی ہوتی ہے بیٹے۔ اسی لیے کمزور لوگ اس کی پابندیوں سے بھاگتے ہیں۔ صندل بیٹی بھی ایسا کرسکتی تھی مگر اس نے نیکی کے تقاضوں کو قبول کرلیا۔ آگے فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔ ماشاء اللہ پڑھے لکھے اور سمجھدار ہو۔" انہوں نے نماز کے لیے اٹھتے اٹھتے بڑے مشفقانہ انداز میں اجمل کو نصیحت کی۔

"میرے لیے بھی دعا کیجیے گا۔" وہ بھی احتراماً کھڑا ہوتے ہوئے قدرے رقت سے بولا تو وہ مسکرا اٹھے۔

"مجھ گناہ گار سے زیادہ شاید اللہ کو تمہارا اپنے سامنے جھکنا زیادہ بھلا لگے بیٹے۔ تم بھی ہم سب کے لیے دعا کرو۔" وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے کچھ سوچ کر پھر ٹھہر گئے۔

"جانے سے پہلے صندل سے دل صاف کرلینا۔ وقت کم ہے، ہمت ہار دو گے تو آنے والی کل کا مقابلہ کیسے کرو گے۔" ماموں نے اسے گم صم دیکھ کر حوصلہ بڑھایا۔

"وہ باورچی خانے میں ہے۔ اپنی ممانی اور ماجد کو میرے پاس بھیج دینا۔" وہ اندر چلے گئے تو اجمل کی آنکھیں بھر آئیں۔

☆☆☆

وہ کسی مجرم کی طرح باورچی خانے میں داخل ہوا تو صندل کے بائیں ہاتھ میں منہ کی طرف جاتا ہوا لقمہ درمیان ہی میں معلق ہوگیا۔ ممانی کی نظر بھی اجمل کے بجھے ہوئے چہرے پر پڑی تو چونک کر کھڑی ہوگئیں۔

"ماموں جان آپ کو بیٹھک میں بلا رہے ہیں۔" اس نے شرمندگی میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا تو ممانی کے ماتھے پر کئی شکنیں ابھر آئیں، شاید ان کے احساسِ تقدس پر چوٹ پڑی تھی۔

"دیکھو بیٹے، مجھے شرمندہ نہ کرنا۔ میں نے تمہیں کبھی اپنی اولاد سے کم نہیں سمجھا۔" ممانی بڑے دکھ سے کہہ کر باورچی خانے سے نکل گئیں۔ لقمہ پلیٹ میں واپس ڈالتے ہوئے بیٹھے بیٹھے وہ اور بھی سکڑ گئی۔ چند منٹ کی گہری خاموشی کے بعد اجمل بھی آہستہ آہستہ پنجوں کے بل فرش پر ہی اس کے سامنے بیٹھ گیا اور آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر صندل کی گود میں رکھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"مجھے معاف کردو صندل...... مجھے معاف کردو۔ میں...... میں کبھی ایسے حالات سے نہیں گزرا۔" اس کا زخمی ہاتھ آنکھوں سے لگاتے ہوئے جیسے ان میں شگاف پڑ گیا اور رکا ہوا آنسوؤں کا سیلاب بے طرح بہہ نکلا۔ وہ اور بھی منجمد ہوگئی۔

"نہیں...... نہیں صندل واپس آجاؤ۔" اس نے گھگیا کر پہلی دفعہ صندل کے رخسار کو تھپتھپایا تو اجمل کے پورے وجود میں چھناکا سا ہوا۔ "اب میں تمہارے پاس آیا ہوں تو...... تم دور بھاگ رہی ہو۔" اس نے رقت سے ٹوٹتی ہوئی آواز میں التجا کی۔ صندل نے تیزی سے اپنا زخمی ہاتھ کھینچ لیا۔

"آج سے میں کسی پر بوجھ نہیں بنوں گی۔" خلافِ توقع اس کی آواز پختہ اور پرسکون تھی۔ "میں کسی کو دکھ نہیں دوں گی...... تمہیں بھی نہیں۔" اس نے نرم مگر پرعزم آواز میں کہا۔ "امی جان نے مجھے بتائے بغیر بہت کچھ سکھادیا ہے...... تمہارا شکریہ تم نے ایک اچھے گھر کی دہلیز پر لاکر چھوڑا ہے۔" سسکیوں کے بجائے صندل کے ہر انداز سے سکون کی لہریں پھوٹ رہی تھیں۔

"چھوڑا نہیں ہے صندل...... میں نے تمہیں چھوڑا نہیں ہے۔" اس نے بڑے سوز سے یقین کی آنچ میں جلتے ہوئے کہا۔ "صرف تازہ دم ہونے کے لیے ٹھہرایا ہے تاکہ ہم ایک نئے حوصلے، ایک نئی امید کے ساتھ اپنے مستقبل کی طرف سفر شروع کرسکیں۔" صندل نے عجیب سی نگاہوں سے روتے بلکتے اجمل کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہوں میں کوئی نرم گرم جذبہ نہیں تھا۔

"میرا سفر ختم ہوگیا ہے اجو جبکہ تم نے ابھی شروع بھی نہیں کیا۔" اس نے خشک سی ہنسی بھری۔

"تیرا میرا ساتھ اس گھر کے باورچی خانے سے شروع ہوکر اس گھر کے باورچی خانے پر ختم ہوگیا ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔" اجمل نے اس کی مایوسی کو دیکھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے اس کا زخمی ہاتھ دوبارہ ہاتھ میں لے لیا۔

"کاش ایسا ہی ہوتا صندل۔" اس کی آواز بڑی گداز تھی۔ "مگر میں اپنی سوچ کا کیا کروں کہ میرے سفر کا آغاز تمہارے قدموں کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ تمہاری خواہش تھی کہ میں اس گھر سے تم دونوں ماں بیٹی کو نکال دوں لیکن اسے تو نہیں البتہ تمہیں یہاں تک گھسیٹ لایا ہوں جس سے تمہیں بے شمار خراشیں آگئی ہیں لیکن یہاں سے آگے میں

تمہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کرلے جانا چاہتا ہوں۔'' اجمل کے لہجے میں جذباتیت کے ساتھ عزم کی آنچ بھی تھی۔ وہ اس آنچ سے ذرا سا پگھل گئی۔

''میں تمہارے قابل نہیں ہوں، پہلے بھی یہ بات میں نے مذاق میں نہیں کہی تھی۔ میں ایک ٹوٹی پھوٹی عورت ہوں، کانٹوں بھری جھاڑی ہوں جبکہ تم......'' شدت جذبات سے آواز رندھ گئی۔ ''تم ایک ہیرا ہو اس لیے اپنے جیسا پھول ڈھونڈ لو جس پر کسی غیر مرد کے ہاتھوں کی گرد نہ پڑی ہو۔'' صندل کے مرجھائے چہرے پر متانت اور وقار نے کچھ اور بھی جاذبیت اور کشش پیدا کردی تھی۔

''میری طرف دیکھو صندل۔'' جذبات کے دھنک رنگ نے صندل کو نگاہیں اٹھانے پر مجبور کردیا۔ ''کچلے جانے سے پھول کی خوشبو نہیں مرجاتی۔'' اپنے جذبے، اپنے لگاؤ کی گرمی سے پگھل کر اجمل، صندل کے طوفان مچاتے ہوئے دل پر قطرہ قطرہ بن کر ٹپکنے لگا۔ ''بس ایک دفعہ اور مسکرا کر اپنے اندر کی اس خوب صورتی کو دکھا دو تاکہ مجھے یقین ہوجائے کہ تمہاری روح پر میرے سوا کسی کا سایہ نہیں پڑا۔ صرف اور صرف میں ہی تمہاری پیشانی کا جھومر بن کر تمہارے اندر جگمگا رہا ہوں۔'' اجمل کی سرگوشی بے انتہا جذباتی اور پگھلا دینے والی تھی۔ صندل کو پہلی مرتبہ ایک نیا ابھرتا ہوا اجمل دکھائی دینے لگا جو اس کے لب ورخسار کو چھوئے بغیر اس کے خون میں شامل ہوکر پورے جسم میں گردش کرنے لگا۔

''تم......تم......میرے سارے پیار کی روح ہو......'' اس کے کپکپاتے ہونٹوں سے جیسے پھلجڑیاں چھوٹیں۔ اس نے بڑی حیا آلود نشیلی آنکھوں سے اجمل کو دیکھ کر چہرہ جھکالیا۔ اجمل سر سے پاؤں تک جھوم اٹھا۔

''تمہارا شکریہ صندل۔'' اس کی گہری سرگوشی میں رقت تھی۔ ''اب میں پورے حوصلے کے ساتھ دنیا کا مقابلہ کرسکوں گا۔ میں زندگی کی آخری سانس تک تمہارا ہوں۔'' اس نے جذبات کی گرمی سے صندل کی زخمی انگلیوں کو اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں سے لگالیا۔

''اجو......!'' وہ بھی تڑپ کر زخمی انگلیوں کے ساتھ اپنی ہتھیلی بھی اجمل کے ہونٹوں پر لے گئی۔ ''جس گھر سے بن مانگے خلوص ومحبت کا تحفہ مل جائے وہاں چوری کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہ تحفہ اپنے جسم وروح کی پوری سچائی کے ساتھ تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ اب تم ہی اس کے محافظ ہو۔'' صندل نے بھیگے لہجے میں بڑی حلاوت سے کہا اور ہاتھ ہٹالیا۔

وہ قدموں کی چاپ سن کر کھڑا ہوگیا اور مسکراتے ہوئے تیزی سے اپنی دو انگلیاں اس کے پنکھڑیوں ایسے لبوں سے چھو کر ان کی مٹھاس اپنے لبوں میں جذب کرلی۔ دونوں کئی منٹ تک ایک دوسرے کی نگاہوں میں جذب ہوتے رہے۔

''نکاح نامہ ہے؟'' اجمل نے حقائق کی دنیا میں آتے ہوئے بوجھل نشیلی آواز سے پوچھا۔

''ماں کے پاس ہے۔'' اس نے اجمل کو بوجھل نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''اور طلاق نامہ؟'' اس نے بڑی پرامید نگاہوں سے صندل کو دیکھا تو صندل کی آنکھوں میں ایک دم اداس سائے سمٹ آئے۔

''نہیں......وہ بھی میرے پاس نہیں۔'' اس نے بڑے دکھ سے بتایا۔ ''میرے پاس کچھ بھی نہیں، اپنا آپ تک نہیں۔'' اس نے جیسے ماتم کیا۔

''ارے......'' اجمل کی آواز بڑی شوخ تھی۔ ''پاگل خانے کا نام سنا ہے؟'' اس کی آنکھیں مسکرا پڑیں۔ ''جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا نا......'' اس نے اپنی کنپٹی کے ساتھ انگلی گھما کر سر کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ وہیں جاکر آرام کرتے ہیں۔''

''اب مجھے وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے بھی سنبھالا لے کر شگفتگی سے مسکرا کر کہا۔ ''اب تم جو پاس ہو۔'' وہ باقاعدہ کھل کر مسکرا پڑی۔

اچانک اجمل کے ذہن میں کوئی خیال آیا تو وہ چمکتی نگاہوں سے صندل کو دیکھنے لگا۔ ''جب تک اندھیرا اچھٹ نہیں جاتا خیر خبر کے لیے اپنے دوست وسیم کو وقتاً فوقتاً بھیجتا رہوں گا......بہت پیارا دوست ہے۔'' اس کے انداز سے بے پایاں خوشی پھوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

پہلی پیشی پر جہاں اجمل کو بہت سی باتوں کا علم ہوا، وہیں وہ پہلی مرتبہ ناصر بھٹی کا بھی صورت آشنا ہوا۔ کیلوں اور مہاسوں سے بھرے چہرے پر چھوٹی مگر بے حد چمک دار آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس کی عیاشی کے ساتھ اندرونی خباثت کے بھی مظہر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ اجمل کسی صورت اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

''ماموں جان، سمجھ نہیں آتی ناصر بھٹی کو میرے بارے میں اتنی مکمل معلومات حاصل کیسے ہوگئیں جبکہ ہم دونوں ایک

دوسرے سے قطعی ناواقف ہیں۔'' عدالت سے باہر نکلتے ہی اس نے حیرانی سے ماموں سے پوچھا۔

''ہاں قابلِ غور بات ہے...... جہاں تک تمہارے باپ کا تعلق ہے تو خواہ وہ کتنا بھی برا کیوں نہ ہو، اپنی ہی ہتھیلی پر تھوک کر نہیں چاٹ سکتا۔ لے دے کر صندل کی ماں ہی کی طرف خیال جاتا ہے۔'' ماموں نے سوچ کر کہا۔

''مگر ناصر نے اس کی ماں کو بھی گھسیٹ لیا ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ طلاق واقعی نہ ہوئی ہو؟'' ماموں نے بھانجے کے جذبات کو بھانپتے ہوئے تسلی دی۔

''طلاق کی تصدیق خود صندل کر چکی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ جھوٹی نہیں ہے اور پھر یہ بھی تو سوچو یہ سب کچھ اس وقت شروع ہوا ہے جب صندل بیٹی کو گھر سے نکالا جا چکا ہے۔ اس لیے کم از کم تم صندل بیٹی کی سچائی پر شک مت کرو۔'' ان تمام شواہد کے باوجود اجمل دل پر شکوک وشبہات کا بوجھ لیے واپس لوٹ گیا۔ اس کے ذہن میں طلاق نامہ گھوم رہا تھا۔

ہر لمحہ اندیشے کا ایک نیا تیر صندل کے دل ودماغ کو بھی چھلنی کر رہا تھا کیونکہ اگلی پیشی پر اسے عدالت میں پیش ہو کر زبانی اور تحریری طلاق کا ثبوت پیش کرنا تھا۔ گھر میں تقریباً سناٹا تھا۔ ممانی کمرے میں دال صاف کر رہی تھیں جبکہ ماجد بھی اسکول سے آکر سیدھا غسل خانے میں گھس گیا تھا لہٰذا وہ جھاڑو اٹھا کر اس خیال سے بیٹھک کی طرف چل دی تاکہ باپ بیٹوں کے آنے سے پہلے صفائی کر ڈالے۔ وہ ابھی بھی اس کے دونوں بیٹوں کے سامنے نہ گئی تھی۔ سینے پر دوپٹے کی بے ترتیبی کا خیال کیے بغیر بیٹھک میں داخلے کے ساتھ ہی وہ ایک ایسے خطرناک لمحے کی گرفت میں آگئی جو زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہ جانے بغیر کہ بیٹھک میں موجود نوخیز سا نوجوان اجمل کا دوست وسیم ہے یا اجمل کا ماموں زاد بھائی، وہ بے اختیار اس کی متعجب معصومیت بھری نگاہوں میں جذب ہوگئی۔ وسیم کا بھی کچھ اتنا ہی شدید ردعمل تھا۔ وہ بے انتہا اضطراب وگھبراہٹ میں بیٹھک سے نکل آئی۔

''نہیں...... نہیں......!'' وہ بے اختیار سسک اٹھی۔ اس کا پورا بدن پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ ''کیا ہرجائی پن کا زہر مجھ میں اتنا سرایت کر چکا ہے۔'' وہ ہچکچاتی ہوئی بڑبڑائی۔

''میرے مولا! میں اب کسی اور امتحان کے قابل نہیں ہوں۔ ان نیک لوگوں کے صدقے میں مجھ پر رحم فرمادے۔'' وہ سراپا زخم بن کر چارپائی پر گر گئی مگر وسیم کا ہیولا اس کے چاروں طرف گھوم گھوم کر قہقہے لگاتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ماجد کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اجمل کا دوست وسیم تھا۔

بعد میں حالات کے پیشِ نظر یہ جانے بغیر کہ اس کے ماموں کے گھر میں صندل کے ساتھ ڈراما شروع ہو چکا ہے۔ وہ دو مرتبہ وسیم کو ماموں کے گھر بھیج چکا تھا مگر صندل نے سامنے آنا تو کجا دروازے کے پیچھے سے بھی اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا جبکہ عدالت میں پیشی کا وقت اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ صندل سے ملے بغیر گزارہ بھی نہیں تھا۔ ذہنی انتشار کی وجہ سے پڑھائی بھی متاثر ہو رہی تھی اس لیے وہ اس جھنجٹ سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ جذبات میں ذرا ٹھہراؤ کے بعد اسے شدت سے محسوس ہونے لگا کہ اس نے خوامخواہ ہی پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑا دی ہے۔

بیٹھک میں داخلے پر میلی سی دیوار پر صندل کی کچلی ہوئی انگلیوں کا منظر پھر ابھر آیا تھا۔ ''بزدل'' اس نے اپنے آپ پر طعن سی کی اور پھر بیٹھک میں داخل ہوتی ہوئی صندل پر نگاہیں جم گئیں۔ اس کے ستے ہوئے چہرے پر طوفانی لہریں مچل رہی تھیں۔

''تمہارے پاؤں میں مہندی تو نہیں لگی ہوئی تھی جو آ نہیں سکتے تھے۔'' آخر چند منٹ کی خاموشی کے بعد صندل بپھر سی اٹھی۔

''اب آ گیا ہوں کیونکہ تم نے خود اپنے پاؤں بالکل کاٹ لیے ہیں۔'' اجمل نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''پھر جس انداز میں تم نے وسیم سے ملنے سے انکار کیا ہے اس سے مجھے کوفت ہوئی۔ وہ کیا خیال کرتا ہوگا۔'' جواب میں چند منٹ تک صندل نے بھرپور نگاہوں سے اجمل کی آنکھوں میں جھانکا مگر کچھ کہہ نہیں سکی۔

''کوئی جواب نہیں دینا تھا تو بلایا کیوں تھا؟'' اس نے چڑ کر کہا۔

''دیکھو اجو......!'' اس نے بڑے کرب سے سرگوشی کی۔ ''موجودہ حالات میں کسی غیر مرد کو بیچ میں مت لاؤ۔ خاص طور پر میرے اور اپنے درمیان۔'' صندل کا لہجہ بڑا گمبھیر تھا۔

''مگر وہ تو ابھی محض بچہ ہے۔''

''تمہارے لیے ہوگا مگر میرے لیے کسی غیر کا بچہ بھی مرد سے کم نہیں۔'' اس نے اجمل کی بات کاٹی۔

''تم بات الجھا رہی ہو کیا۔ اس نے تم سے کوئی بدتمیزی کی ہے؟'' اجمل کا لہجہ تیز ہو گیا۔

''نہیں......'' اس نے جلدی سے تردید کی۔ ''مگر...... اجمل! تم اتنے پڑھ لکھ کر بھی اتنی چھوٹی سی بات نہیں سمجھ سکتے۔'' اس نے بے بسی سے کہا تو اجمل اسے اور بھی حیرانی سے دیکھنے لگا۔

''جس بات کا سر پیر نہ ہوا سے کس طرح سمجھوں...... بات کرنے آیا تھا، تم کچھ اور بتانے بیٹھ گئیں۔''

''سنو اجو......!'' اس نے بڑے کرب مگر بے پناہ اپنائیت سے کہا۔ ''عورت کے معاملے میں عورت پر بھی بھروسا مت کرو۔ مجھ پر بھی نہیں...... میں تمہارا اعتماد کھونا نہیں چاہتی۔ میرے پاس اس کے سوا اب کوئی سہارا نہیں ہے جبکہ مجھے خود نہیں معلوم کہ میرے اندر کون سی خطرناک بیماریاں جنم لے چکی ہیں۔'' اس نے بڑی مشکل سے اپنی رندھی ہوئی آواز پر قابو پایا۔ ردعمل میں پہلی مرتبہ اجمل کی نگاہوں سے شعلے سے لپکنے لگے۔ وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ صندل نے تاب نہ لاکر نگاہیں جھکالیں۔ ایسا سچ کتنا کڑوا ہوتا ہے جس میں رقابت کا زہر بھی گھلا ہوا ہو۔

''آئندہ میں اس کا خیال رکھوں گا۔'' اجمل کی آواز ایک دم مردہ سی ہوگئی۔ ''ویسے میں نے تمہیں کبھی پابند نہیں کیا، یہ تو دل کا سودا ہے۔'' اس نے دل پر جبر کر کے کہا۔ صندل گھٹ کر خاموش ہوگئی۔ ''میں تم سے ایک ضروری مشورہ مانگنے آیا تھا......'' آخر اس نے گہری خاموشی کو توڑا۔ صندل بھری بھری نگاہوں سے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

''میں معاملے کو مزید طول نہیں دینا چاہتا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ تحریر کردہ طلاق نامہ مل جائے تو اگلی ہی پیشی پر جان چھوٹ سکتی ہے۔'' اس نے نظریں چرا کر گونجتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ دل کا زخم بڑا گہرا تھا۔

''مجھے یقین نہیں کیونکہ اس ساری کارروائی میں مجھے اپنی ماں کا ہاتھ نظر آتا ہے اور طلاق نامہ اسی کے پاس ہے۔'' صندل کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ ''اس انتقامی کارروائی میں تمہارا باپ بھی مددگار ہوسکتا ہے کیونکہ وہ مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکا تھا۔'' اس کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''پھر کیا مشورہ دیتی ہو؟'' اس کا انداز بے حد مایوسانہ تھا۔

''صرف یہ کہ تمہیں اور دکھ نہ دوں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا، گویا ایک نئی صندل جنم لے رہی ہو۔ ''میرے پاؤں تو کٹے ہوئے ہیں لہٰذا جو بھی اٹھا کر لے جائے تمہارا بھی چھٹکارا ہوجائے گا اور میری ماں اور تمہارے باپ کا انتقام بھی پورا ہوکر دونوں کے لیے باعثِ سکون ہوگا۔''

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' وہ جھلا کر غرایا۔ ''اتنی ہی بزدل تھیں تو تمہیں میرے باپ ہی کا گھر کیا برا تھا۔''

''جب تک تم وہاں تھے تمہارے باپ کا گھر واقعی بہت اچھا تھا۔'' اس نے شوخ سے لہجے میں کہا۔ ''مگر موجودہ صورتِ حال میں شاید میرے سابقہ شوہر کا گھر ہی مناسب رہے۔'' وہ پھر سلگ سی اٹھی۔

''تم جو بھی سمجھو مگر میرے ماتھے پر لگا ہوا تمہارے اغوا کا لیبل پھر بھی نہیں اترے گا۔ اس طرح تو تم الزام کو جرم ثابت کردوگی۔ کیا خیال ہے اگر میں کڑوا گھونٹ بھر کر خود تمہاری ماں سے بات کرلوں؟'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''میں تمہیں یہ مشورہ نہیں دوں گی۔'' اس نے تڑپ کر اجمل کی بات کاٹی۔ ''بات اور الجھ سکتی ہے۔''

''مگر بات تو اب بھی سلجھی ہوئی نہیں ہے۔ دھاگے میں کوئی سخت گرہ پڑجائے تو اسے توڑ کر اگلا سرا پکڑنا ہی پڑتا ہے۔'' اس نے ارادے کی پختگی سے کہا۔ صندل کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیسے اسے ارادے سے باز رکھے۔

''اجو...... تم سمجھتے کیوں نہیں۔'' وہ باقاعدہ روہانسی ہوگئی۔ ''بات صرف میری ماں کی نہیں تمہارے زخمی باپ کی بھی ہے۔ تمہیں دیکھ کر وہ یقیناً مشتعل ہوجائے گا...... نہیں اجو! میرا دل ڈرتا ہے، میں تمہیں وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ ہم سچے ہیں اجو...... ہم سچے ہیں۔ خدا یقیناً کوئی بہتر سبب پیدا کرے گا۔'' آنکھوں میں موٹے موٹے آنسوؤں کے ساتھ وہ سراپا التجا بن گئی۔ وہ شدید الجھن میں صندل کو گھورنے لگا۔

''بغیر حرکت کوئی سبب پیدا نہیں ہوتا، یہ قانونِ قدرت ہے۔ میں مناسب موقع دیکھ کر جلد از جلد تمہاری ماں سے ملنے کی کوشش کروں گا البتہ یہ احتیاط کروں گا کہ اس وقت میرا باپ گھر پر نہ ہو۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اب تم جاکر ممانی جان کو بھیج دو۔'' اس کا لہجہ ایک دم سپاٹ ہوگیا۔

☆☆☆

واپسی پر سب سے پہلے اس نے وسیم سے اشاروں کنایوں میں اپنے دل سے اس کانٹے کو نکالنے کی کوشش کی جو صندل نے پرو دیا تھا مگر صندل کے خصوصی ذکر پر وسیم کے ردِعمل نے اس کانٹے کو اور بھی گہرائی میں اتار دیا۔ صفائی پیش کرنے کا اس کا انداز کچھ اسی قسم کا تھا، گھبرایا ہوا احساسِ جرم سے نگاہیں جھکی ہوئیں۔ بات کرنے پر ہکلایا ہوا سا۔ صندل کانٹوں بھری جھاڑی بن کر آہستہ آہستہ زمین سے ابھر رہی تھی۔

''دوست کا احسان اتارنے کے لیے وہ یہ قربانی بھی دے دے گا۔'' اس نے کھولتے ہوئے پانی سے پیاس بجھانے کی کوشش کرتے ہوئے پُرسکون ہونا چاہا۔

تیسرے ہی روز صندل کے اندیشوں کے پودے میں نہایت کڑوا پھل آگیا۔ صبح کے بعد کاموں سے فارغ ہوکر جب سب اپنے اپنے اسکول اور کالج روانہ ہوگئے۔ ممانی بھی تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئیں تو وہ بھی چائے کی

ایک اور پیالی پینے کے لیے جونہی باورچی خانے میں داخل ہوئی، باہر کے دروازے پر بے تاب سی دستک نے اسے سر سے پاؤں تک سہا دیا۔ کیا اجمل کسی کامیابی کی خبر لے کر لوٹا ہے؟ وہ تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف چل دی۔ یہ خیال کیے بغیر کہ ممانی اس کی اس حرکت کا کتنا برا منائیں گی مگر دروازے پر وسیم کا زرد چہرہ دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''کمبخت پھر آن مرا۔'' اس نے بڑبڑا کر اس طرح دروازہ بند کیا گویا اس نے وسیم کے چہرے پر جوتا کھینچ مارا ہو مگر اس کا دل و دماغ اس کی گردان رٹنے لگا تھا۔ دوسری دستک پر جوتا گویا اسی پر پلٹ پڑا۔

''کیا ہے؟'' ذرا سی جھری کے پیچھے پھٹی ہوئی خشک آواز میں اس نے جیسے ڈانٹا۔ ''پھر زہر گھولنے آ گیا مردود۔'' لاشعور نے شعور پر ضرب لگائی۔

''اجمل بھائی قتل کے الزام میں گرفتار ہو گئے ہیں۔'' اس نے اٹک اٹک کر خشک ہوتے حلق سے بڑی مشکل سے آواز نکالی۔

''بکومت...... جھوٹے بے ایمان۔ مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو۔'' وہ آنکھیں نکال کر غرائی۔ گویا اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہو۔ ''بھاگ جاؤ، خبردار جو آئندہ یہاں آئے۔'' اس کی اونچی ہوتی غصیلی آواز سے وسیم سراسیمہ ہو کر اور بھی زرد پڑ گیا۔

''یہ...... یہ...... اخبار......'' اس نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار دروازے کی جھری سے اس کے پاؤں میں کھسکا دیا۔

''بھاگ جا شیطان...... مجھے ورغلانے......'' مگر پیٹھ پیچھے اس کے کندھے پر ممانی کے مشفق ہاتھ نے اس کی زبان پر تالا لگا دیا۔

''میرے پاس آ جاؤ...... میرے سینے میں اپنا بھولا سا چہرہ چھپا لو...... آؤ میں اپنا سارا پیار تم پر قربان کر دوں۔'' اس کا لاشعور گنگنانے لگا۔

''تھوڑی دیر بعد اس کے ہوش ٹھکانے آئے تو ''اجمل بھائی قتل کے الزام میں گرفتار ہو گئے ہیں'' کی بازگشت اس کے ذہن میں گونجی۔ اس نے گھبرا کر گرد و پیش پر نظر دوڑائی تو اسے محسوس ہوا گویا مقتول کے ورثا اسے دفنانے کے بعد اب قاتل سے حساب کتاب چکانے آ گئے ہیں۔ زرد چہرے، ویران آنکھیں اور پپڑیاں جمے ہونٹ بند ہونے کے باوجود اس سے صرف ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے۔ تم نے اجمل کو موت کے منہ میں کیوں دھکیلا؟

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس نے ہسٹریائی انداز میں چیختے ہوئے اندر کے جوالا مکھی کو باہر نکال دینا چاہا۔ ''میں نے اسے وہاں جانے سے منع کیا تھا۔'' مگر جواب میں دونوں میاں بیوی میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ خاموشی، گمبھیر سناٹا۔

''آپ میرا یقین کیجیے، میری بات سچ مانیے۔'' شدتِ گریہ سے اس کی آواز پھٹ گئی تو ممانی کا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے کندھے پر اس طرح آ گرا جیسے کوئی وزنی چٹان لاوا اگلتے دہانے پر جم گئی ہو۔

''تمہیں کسی نے قصوروار نہیں ٹھہرایا بیٹی۔'' ممانی کی مشفق مگر مردہ آواز میں حوصلے کی دیوار لرز رہی تھی۔

''مشیت ایزدی کے سامنے ہم سب بے بس ہیں، ایسے امتحان اللہ کی قربت ظاہر کرتے ہیں۔'' ماموں نے بھی صندل کے ساتھ ساتھ اپنے گرتے ہوئے حوصلے کو سہارا دیا۔ اسکول میں اخبار کی سرخی دیکھتے ہی چھٹی لے کر وہ گھر کی طرف بھاگا تھا مگر وسیم پہلے ہی دھماکا کر کے جا چکا تھا۔ وہ خود پہلی مرتبہ اپنے آپ کو بلند شعلوں میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگا۔ صندل دونوں میاں بیوی کے بجھے ہوئے چہروں کو باری باری دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ اس کی رنگت بحال اور چہرے کی زردی سرخی میں بدلنے لگی۔ اس کے اندر قوتِ عزم انگڑائی لے کر تیزی سے بیدار ہو رہی تھی۔ یہ فضول سے آنسو حوصلہ بہا لے جاتے ہیں۔ اس کے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''ابو! آپ اخبار مجھے دے دیجیے۔'' وہ حیرت انگیز طور پر بڑی پختہ آواز میں بولی تو دونوں اس کی بدلی ہوئی حالت پر بے حد حیران ہوئے۔ ''آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انجانے میں آپ پر بہت بوجھ ڈال چکی ہوں، اب مجھے اپنا بوجھ خود اٹھانے دیجیے۔''

''ہمیں غلط نہ سمجھو بیٹی...... آزمائش کی اس گھڑی میں تم تنہا نہیں ہو۔'' ممانی نے متاسف نگاہوں سے ملائم آواز میں کہا۔

''کہے بغیر بھی مجھے آپ کی بات کا یقین ہے امی۔'' آنکھوں میں چمک بڑھنے سے آواز بھی بڑی مضبوط تھی۔ ''چند ہفتوں میں آپ ہی سے میں نے یہ سبق سیکھا ہے کہ پریشانیاں مقابلہ کرنے ہی سے ختم ہو سکتی ہیں۔ آنسو بہا کر میں دراصل ان مصیبتوں سے بھاگتی رہی تھی۔ بس آپ میری ثابت قدمی کے لیے دعا کیجیے۔'' وہ ایک بالکل ہی بدلی ہوئی صندل تھی۔

''انشاء اللہ بیٹی، ثابت قدمی ایمان کی پیداوار ہے۔ جو ڈگمگا گیا وہ کبھی منزل پر نہیں پہنچا۔ مگر بیٹی یہ ہم سب کی مشترکہ آزمائش ہے۔'' ماموں نے صندل کی باتوں سے خود بھی حوصلہ پایا تھا۔

''بس تو آپ مجھے عمل کرنے کا موقع دیجیے۔'' صندل نے نظریں جھکا کر پہلی مرتبہ اجمل کے ماموں سے کہا۔ ''آپ

یقین رکھیں، میں اپنی کسی بات سے آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گی اگر بھول چوک سے کوئی ایسی بات ہو جائے تو مجھے دل سے معاف کر دیجیے گا۔'' صندل کا لہجہ بہت گرما دینے والا تھا جس میں سوز و گداز کی آنچ تھی۔

''مگر تم کرنا کیا چاہتی ہو بیٹی؟'' ممانی نے حیرانی مگر مشفق انداز سے پوچھا۔

''اپنا مقدمہ آپ لڑنا چاہتی ہوں۔ صرف آپ کی شفقت اور اس گھر کی چھت کا سایہ چاہیے۔'' اس کے لہجے میں کسی کمزوری کا نشان تک نہیں تھا اور وہ براہِ راست ممانی کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

''مقدمہ...... مگر کون سا؟ ملوث تو میرا بھانجا اور بہنوئی ہے۔'' ماموں نے حیرانی سے پہلی دفعہ انکشاف کیا تو صندل چونک کر اسے دیکھنے لگی ورنہ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید اجمل نے اپنے باپ کا خون کر دیا ہے۔

''تو کیا پھر......'' اس کی آنکھوں کے پھیلاؤ میں سمندر کی وسعت اور لہجے میں اندیشے کی مہیب لہر اٹھی تھی۔ چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔ ''اخبار مجھے دیجیے۔'' اس کے انداز میں وحشت کی جگہ عزم و ارادے کی تپش تھی۔

''ہمیں تم سے دلی ہمدردی ہے بیٹی۔ تم ہمیں ہی اپنا سب کچھ سمجھو۔'' ماموں نے دبی آواز میں ہمدردی سے کہتے ہوئے اخبار صندل کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے جلتی نگاہوں سے دونوں میاں بیوی کو دیکھ کر اخبار پر نظریں جما دیں۔

''خاندانی رنجش کا افسوس ناک انجام۔ باپ بیٹا موقع پر گرفتار۔ مقتولہ سوتیلی ماں اور مقتول سوتیلی ماں کا سابقہ داماد تھا۔'' موٹی سرخی کے نیچے ابتدائی مگر مختصر تفصیل تھی اور اخبار نے مزید سنسنی خیز تفصیلات کی خوشخبری سنائی تھی۔ ماں اور سابقہ شوہر ناصر بھٹی کی تصویروں کے پہلو بہ پہلو دونوں باپ بیٹے کی تصویر بھی موجود تھی۔

''یہ سب کیسے ہوا...... ایسا کیسے ممکن ہے؟'' وہ خلا میں گھورتی ہوئی بڑبڑانے لگی۔ ممانی نے بے اختیار اسے اپنے سے لپٹا لیا مگر میرے شوہر کا میری ماں کے پاس کیا کام؟ ایک سے بڑھ کر ایک سوال اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔

''بیگم! جب تک صورتِ حال پوری طرح واضح نہیں ہو جاتی تم صندل بیٹی کو میری بہن کے گھر لے جاؤ۔'' وہ کمرے کی طرف بڑھے۔

''مگر......'' بیگم نے کچھ پوچھنا چاہا۔

''فی الحال کچھ نہیں بیگم۔'' اس نے بڑی سختی سے اسے ٹوکا۔ ''احتیاط ضروری ہے۔ میں اجمل کا باپ نہیں جو اتنی آسانی سے گھر کی عزت نیلام ہونے دوں گا۔ حق بات کے لیے ہر نقصان برداشت کیا جا سکتا ہے۔'' انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''پولیس کسی بھی لمحے دوبارہ یہاں پہنچ سکتی ہے کیونکہ صندل بیٹی بھی زد پر ہے۔ میں ایک دفعہ پھر قانونی پناہ حاصل کرنے جا رہا ہوں۔'' انہوں نے تیزی سے قدم بڑھا کر خود ہی دونوں کو چادریں گھسیٹ کر دیں اور انہیں لے کر گھر سے باہر آ گئے۔ صندل سر سے پاؤں تک زرد ہو گئی تھی۔ ممانی کی حالت بھی اس سے کچھ کم نہیں تھی۔

تمام دن کی دوڑ دھوپ کے بعد تھک ہار کر جب وہ دوبارہ اپنی بیوی اور صندل کو لے کر گھر پہنچا تو اس کا انداز ایسا تھا گویا طوفان گزرنے کے بعد ان کے پورے وجود پر دلدل سی پھیل گئی ہو۔

''کوئی زیادہ خطرے کی بات تو نہیں؟'' آخر ممانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری تو وہ الجھی نگاہوں سے بیوی کو دیکھنے لگا۔

''فی الحال تو کوئی بات بھی صاف نہیں۔'' رحمت علی نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ ''بڑی کوشش کے بعد وکیل صاحب کے ذریعے اجمل سے مختصر ملاقات ہو سکی ہے۔ موقع پر موجود ہونے کی بنا پر شک میں پولیس نے اسے حراست میں لے لیا ہے چونکہ پولیس ابتدائی تحقیقات میں مصروف ہے، اس لیے ابھی پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع نہیں ہوا البتہ اجمل کا باپ اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہے۔ اجمل کے بعد دیگرے تین گولیوں کی آواز سن کر اضطراری طور پر گھر میں گھس گیا تھا اور اس نے اپنے باپ کے ہاتھ میں پستول دیکھا تھا۔ اس لیے وکیل نے امید ظاہر کی ہے کہ اجمل کی ضمانت شاید ہو جائے اور وہ محض عینی شاہد کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہو۔'' اس نے سر سے ٹوپی اتار کر ہاتھ پھیرتے ہوئے سکڑی سمٹی صندل کو دیکھا جو اپنے اندر کے طوفان کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ویسے صندل بیٹی کی ضمانت کی ضرورت نہیں البتہ ابتدائی تحقیقات کے سلسلے میں پولیس کسی وقت بھی اس کا بیان لینے کے لیے آ سکتی ہے۔ اس کے لیے بیٹی، تمہیں ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ پولیس ناصر بھٹی کے گھر گئی ہوئی ہے۔ بہرحال بیٹی، یہ ہم سب کی آزمائش کا وقت ہے۔ اللہ سے دعا کرو انجام بخیر ہو اور بیگم تم مجھے جائداد کے کاغذات نکال دو۔'' چند لمحوں کے لیے دونوں نے رحمت علی کو دیکھا اور پھر اچانک صندل نے اپنی انگلی سے سونے کی انگوٹھی نکالنے کے بعد اپنے کانوں سے بالیاں نکالنی شروع کر دیں۔

''کاش میرے پاس کچھ اور ہوتا یا میں خود کو نیلام

کرسکتی۔'' صندل نے دونوں چیزیں رحمت علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹی......'' وہ تڑپ کر بولے۔''تم ہمارے گھر کی عزت ہو آئندہ کبھی ایسی بات سوچنا بھی نہیں اور یہ دونوں چیزیں پہن لو ورنہ ان کے بغیر ایسا لگے گا جیسے کسی پودے کے پھول جھڑ گئے ہوں۔''

☆☆☆

رات دس بجے کے قریب آخر پولیس انسپکٹر نے بمع دو لیڈی کانسٹیبل کے رحمت علی کے دروازے پر دستک دے دی۔ ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود سب لوگوں کے دل بری طرح دھڑک اٹھے مگر پھر صندل میں جیسے ایک نئی صندل نے جنم لیا۔

''ابو! میں بیان دینے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ جو کچھ گزر چکا ہے، صرف وہی تو دہرانا ہے۔ آپ پولیس کو بیٹھک میں بٹھائیے۔ میں خود پولیس انسپکٹر سے بات کروں گی۔'' صندل کا لہجہ بڑا ٹھوس تھا۔

''مگر بیٹی، اس طرح بے حجاب......''

''مجبوری سمجھ کر معاف کر دیجیے۔ میں بے پردہ ہو کر بھی پردے میں رہوں گی۔ ورنہ سچائی کے سورج پر دھبا ضرور آ سکتا ہے۔'' وہ جوالا مکھی کی طرح راکھ بکھیرنے لگی۔ ماموں بے بسی سے باہر چلے گئے۔

''انسپکٹر صاحب! اگر میرا وارنٹ گرفتاری آپ کے پاس ہے تو پہلے مجھے گرفتار کر لیجیے۔ میں بیان بعد میں دوں گی۔'' بیٹھک میں داخلے کے ساتھ ہی جب دونوں لیڈی کانسٹیبل تیزی سے اس کے دونوں جانب کھڑی ہو گئیں تو وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غرائی۔ انسپکٹر غالباً اس قسم کے حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''آپ مجرم ہیں یا نہیں اس کا فیصلہ عدالت کے اختیار میں ہے۔ پولیس کا کام تحقیقات کرنا ہے۔ حقائق معلوم کر کے عدالت کے روبرو پیش کر دینا ہے اور ہماری اب تک کی تحقیقات میں آپ کی حیثیت مرکزی ہے۔ گو براہ راست آپ جرم میں ملوث نہیں ہیں اسی لیے وارنٹ کے بغیر تفتیش کی غرض سے آیا ہوں۔ اہم گواہ کی حیثیت سے آپ بہرحال پولیس کی نگرانی میں ہیں۔ اگر ضروری ہوا تو آپ کو گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے......بیٹھ جائیے۔'' وہ روایتی سختی سے کہتے ہوئے اسے گھورتا رہا۔

رحمت علی بے بسی سے دونوں کو باری باری دیکھتا رہا۔ بلکتی سسکتی صندل سے اتنی بے باکی کے اظہار کا احساس تک نہیں تھا۔ صندل تمتماتے چہرے سے چند لمحوں تک انسپکٹر کو دیکھتی رہی۔ اسے یہ جان کر اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ گرفتار نہیں کی جا رہی۔

''میں اپنی حیثیت جانے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی انسپکٹر صاحب! آپ سے تعاون کے بغیر ویسے بھی میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔'' اس نے بیٹھتے ہوئے کھرکھراتی آواز میں کہا اس نے ایک لمحے کے لیے رحمت علی کو دیکھا۔

''آخر یہ بھی ہماری طرح انسان ہیں ابو اور پیشہ ورانہ تجربے کی بنا پر ہماری نسبت یہ زیادہ بہتر طریقے سے سچ جھوٹ کی تمیز کر سکتے ہیں۔'' صندل نے دوسرے پہلو سے انسپکٹر پر حملہ کرتے ہوئے ردعمل جاننے کے لیے گہری نظروں سے انسپکٹر کو دیکھا۔

''محترمہ ہم سچ جھوٹ جاننے کے لیے ہی اتنی دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔'' انسپکٹر نے قدرے تلملا کر کرسی پر پہلو بدلا۔''اور ہمارا واسطہ ہر قسم کے مجرموں سے پڑتا ہے وہ بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔'' اس نے بڑی طنزیہ نگاہوں سے صندل کو دیکھا۔

''آپ یقین کیجیے انسپکٹر صاحب، صندل بیٹی بالکل.... بے گناہ ہے۔''

''صندل بیٹی......؟'' انسپکٹر کے ماتھے پر شکنوں کا جال ابھر آیا۔

''جی، مجھے پیار سے صندل ہی کہتے ہیں ورنہ میں ہی کشور بانو ہوں، ناصر بھٹی کی سابقہ بیوی۔'' صندل نے جلدی سے وضاحت کی۔

''اوہ......بہرحال آپ اپنا بیان لکھوائیے۔ سچ جھوٹ کا فیصلہ میرا کام نہیں ہے۔ آپ پہلے کیس میں بھی ضمانت پر ہیں۔'' اس نے کاغذات کا پلندا سنبھالتے ہوئے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

''جی ہاں اور موجودہ صورت حال سے آپ کو اس کے سچ جھوٹ کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔'' صندل نے چوٹ کی تو انسپکٹر نے اسے گھور کر دیکھا۔

''یہ بھی عدالت کا کام ہے۔ ویسے بھی وہ کیس میرے پاس نہیں ہے لیکن اب شاید دونوں کی ایک ہی فائل عدالت میں پیش کی جائے گی۔'' اس کا انداز بدستور روکھا تھا۔ رحمت علی نے میز اس کے آگے رکھ دی اور جب تک وہ کاغذات میز پر جماتا، اندر کے دروازے پر دستک ہوئی اور رحمت علی نے آگے بڑھ کر اپنی بیوی کے ہاتھ سے چائے کی ٹرے لے لی۔ صندل نے بیان لکھوانا شروع کر دیا۔ انسپکٹر کا قلم تیزی سے چلتا رہا۔ بیان کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کبھی کبھی انسپکٹر کا قلم خود بخود رک جاتا تھا۔ جب وہ بیان کے اختتام پر دستخط کر رہی تھی تو وہ انسپکٹر کے سامنے کھلی ہوئی کتاب تھی۔ حالانکہ وہ اپنے اور اجمل کے

درمیان کا لکھا ہوا باب سرے سے گول کر گئی تھی۔ درمیان میں اس نے کسی جگہ جذباتی انداز کا اظہار نہیں کیا بلکہ بڑے وقار اور تسلسل سے مربوط بیان دیا۔ رحمت علی کا تاثر یہی تھا کہ اس کا بہنوئی تاج ملک، صندل کے بیان کی روشنی میں قانون کے شکنجے میں کچھ زیادہ ہی کس دیا جائے گا البتہ اجمل کی ضمانت کے امکانات زیادہ واضح تھے۔

''اپنے اس بیان کے ثبوت کے طور پر کیا آپ اس بوڑھے کو عدالت میں پیش کر سکتی ہیں؟ واردات کے وقت بھی آپ کو اپنی عدم موجودگی ثابت کرنا پڑے گی۔'' بیان کے آخر پر اس نے صندل کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے نشانات بھی کاغذ پر لگواتے وقت کہا۔ اس کے رویے میں پہلے کی نسبت ہمدردی تھی۔

''جی یقیناً وہ کبھی کبھی یہاں آتا ہے۔ ویسے مجھے اس کے ٹھکانے کا علم نہیں۔'' صندل نے نشان دینے کے بعد ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جہاں تک دوسرے ثبوت کا تعلق ہے تو اتفاق سے پچھلی رات ہمارے پڑوس میں رسم عقیقہ تھی۔ ہم سب وہاں موجود تھے۔ سب پڑوسی اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔'' صندل نے ذرا سی جوشیلی آواز میں کہا۔

''یہ بات آپ کے حق میں جائے گی اور محترم اب آپ کا بیان بھی بہت ضروری ہے۔'' اس نے رحمت علی کو مخاطب کیا۔

''جی میں حاضر ہوں اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو اب صندل بیٹی کو اندر جانے کی اجازت دے دیں۔'' رحمت علی نے کچھ اس انداز میں درخواست کی کہ انسپکٹر الجھن میں پڑ گیا۔ ''جی! آپ اس کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ میں صندل بیٹی کی ہر طرح ضمانت دینے کو تیار ہوں۔ دراصل میرے گھر میں پردے کی سخت پابندی ہے اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ صندل بیٹی کو گھر کے اندر جانے دیں۔ ہم ہر طرح آپ سے تعاون کے لیے حاضر ہیں۔'' انسپکٹر نے رحمت علی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''بہتر ہے...... میں آپ کی شرافت کے پیشِ نظر انہیں اندر جانے کی اجازت دیتا ہوں۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔

''شکریہ انسپکٹر صاحب۔'' دونوں نے بیک وقت کہا۔

''امید ہے آپ میرے بیان کی روشنی میں میرے ان محسنوں کا خیال رکھیں گے۔ خدا کے بعد اب یہی لوگ میرا آسرا ہیں۔'' صندل نے بڑے پُرسوز لہجے میں پہلی دفعہ بھرائی ہوئی آواز میں انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ انسپکٹر کے چہرے سے سختی بالکل غائب ہو چکی تھی۔

''آپ بے فکر رہیں بہن...... اگر آپ بے گناہ ہیں تو قانون یقیناً آپ کی مدد کرے گا۔ قانون یا پولیس آپ لوگوں کی حفاظت کے لیے ہی ہے۔'' انسپکٹر کے رویے میں مثبت تبدیلی دیکھ کر صندل کی آنکھیں ایک دم چھلک اٹھیں۔

''آپ کے الفاظ نے میرے جیسی بے سہارا لڑکی کو بہت حوصلہ دیا ہے۔'' وہ اٹھی، ایک لمحے کے لیے باری باری دونوں کو دیکھا اور پھر اچانک سسکیاں بھرتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

☆☆☆

دھندلا تعلق کتنا اذیت دیتا ہے، اس کا تجربہ بھی صندل کو وسیم کے آنے اور چلے جانے پر ہوا۔ وہ کیوں آیا اور پھر اس سے ملے بغیر کیوں چلا گیا، دونوں ہی خنجر تیز دھار تھے۔ وہ دوستی نبھانے کی خاطر اپنی جمع پونجی اجمل کی پیروی کے لیے اس کے ماموں کو زبردستی دے گیا تھا۔ گویا وہ دودھاری تلوار بن کر صندل کو بھی چرکا لگا گیا جسے چور کی ڈاڑھی میں تنکے کی طرح وہ اپنے ہرجائی پن کی سزا سمجھنے لگی تھی۔ دل کے اسی چور کو چھپانے کی خاطر وہ اجمل کے ماموں سے وسیم کی اس بھیک پر احتجاج نہیں کر سکی کیونکہ پہلے ہی جذباتی نادانی سے ممانی کے دل میں وسوسہ پیدا کر چکی تھی۔ اس دھندلے تعلق کی اذیت اس پر اس وقت بھی مسلط تھی جب وہ روح تک کو زخمی کر دینے والی عدالتی کارروائی سے چھٹکارا پا کر ٹوٹے ہوئے جسم کے ساتھ واپس آئی تھی۔

عدالت کا ہر سوال اور اس کا جواب جیسے انگارے دہکا رہا تھا۔ مختلف گواہوں کے ابتدائی بیانات، پولیس کے تفتیشی شواہد اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے مل کر دوہرے قتل کے اس مقدمے کو پیچیدہ بنا دیا تھا۔ اسی لیے ابتدائی چالان پیش کرنے کے بعد پولیس نے مزید تفتیش کے لیے مہلت حاصل کی تھی۔

اجمل کے باپ نے جو بیان دیا، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اسی کی تائید کر رہی تھی۔ صندل کی ماں اور اس کا سابقہ شوہر ناصر بھٹی اس کی گولیوں سے زخمی تو ہوئے تھے لیکن دونوں کی موت خود ناصر بھٹی کے اس پستول کی گولیوں سے واقع ہوئی تھی جو تفتیش اور تلاشی کے دوران ناصر بھٹی ہی کے گھر سے ملا تھا جس پر انگلیوں کے نشانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس پر ناصر بھٹی کی انگلیوں کے نشانات ابھارنا بھی مشکل تھا اور ماہرین کی رپورٹ کے مطابق بھی جسموں سے برآمد ہونے والی گولیاں ناصر بھٹی کے پستول سے نکلی تھیں۔ زخموں کی نوعیت سے ایک بات اور بھی پایۂ ثبوت کو پہنچی تھی کہ ناصر بھٹی نے شاید سامنے سے اس کی ماں کے سینے میں گولی ماری تھی لیکن پیچھے سے کسی نے خود اسی کے پستول سے پیٹھ پر فائر کیا تھا جو اتنے قریب سے ہوا تھا کہ اگر اس کے سینے کی ہڈیاں رکاوٹ نہیں بنتیں تو گولی

آگے سے جسم کے پار ہو جاتی۔

جائے واردات سے اتنی دور آلۂ قتل کی بازیابی نے اس شبہے کو تقویت دی تھی کہ وہاں کوئی تیسرا شخص بھی موجود تھا جس نے ناصر بھٹی کو گولی مارنے کے بعد پستول اس کے گھر میں ڈال دیا۔ جہاں یہ پیچیدگی پیدا ہوئی، وہاں اجمل کے باپ کا جرم ہلکا ہو گیا اور اجمل بھی جرم میں ملوث ہونے سے بری الذمہ ہو گیا کیونکہ اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ پستول ناصر بھٹی کے گھر ڈال آتا۔ اس طرح سے موقع واردات پر موجود ہونا ناممکن تھا اور اس سوال کے جواب میں کہ اس کے اشتعال میں آنے کی کیا وجہ تھی کہ اس نے بے دریغ گولی چلا دی، اجمل کے باپ نے قدرے وضاحت سے جواب دیا کہ اول تو چوری چھپے ناصر بھٹی کی موجودگی ہی اس کے لیے اشتعال انگیز تھی کیونکہ اخباری خبر کی روشنی میں وہ اجمل کے باپ کے لیے بدنامی کا باعث بنا تھا جبکہ کشور کی ماں نے اس سے شادی سے پہلے اپنی بیٹی کا طلاق نامہ دکھا کر ہی اسے شادی پر آمادہ کیا تھا لہٰذا اس کے بیٹے پر اغوا کا الزام سرے ہی سے غلط تھا۔

وہ شرم ناک قسم کی سودے بازی پر ایک دوسرے کو آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس میں اس کے بیٹے کی زندگی کا سوال اہم تھا۔ اس لیے محض تنبیہ کی خاطر تاکہ وہ پوری طرح سازش سے آگاہ ہو سکے، اس نے دونوں کو زخمی کرنے پر اکتفا کیا ورنہ وہ انہیں جان سے بھی مار سکتا تھا۔ کشور پر دست درازی کا حصہ وہ اپنے بیان سے بالکل گول کر گیا تھا۔ ویسے بھی اس کا موجودہ قتل سے براہ راست تعلق نہیں تھا۔

''جو کچھ ہوا مجھے اس پر افسوس نہیں......'' قیدیوں والی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اجمل کے باپ نے اجمل سے کہا جو سب سے الگ تھلگ کھڑا ہتھکڑی اترنے کے بعد کلائیاں سہلا رہا تھا۔

''افسوس صرف اس بات کا ہے کہ تم ہمیشہ غلط وقت پر میرے سامنے آئے اور تم نے پرائے پھڈے میں ٹانگ پھنسانے کا انجام بھی دیکھ لیا ہے۔ امید ہے آئندہ اس سے سبق حاصل کرو گے۔'' اس کے لہجے میں ذرا سے تاسف کے ساتھ پدرانہ شفقت کی جھلک بھی تھی۔ اجمل نے پہلی مرتبہ کرب ناک نگاہوں سے باپ کو دیکھا۔

''ابو! مجھے آپ کے سائے کی ضرورت ہے شاید اسی لیے ہر بہانے آپ کے پیچھے بھاگتا رہا۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''اب نہ بھاگنا، میرے سائے میں شاید چنگاریوں کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کشور کا سایہ تمہیں موافق ہے۔ اس کی ماں کیسی بھی تھی مگر اس کی رگوں میں یقیناً شریف باپ کا خون ہے۔'' اس نے سلگتے سے انداز میں آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

''وہ وقت کا فریب ہے ابو، محض دھوکا ہے۔ ہم شاید دونوں ہی غلط فہمی کا شکار ہیں۔'' اس نے بڑے دکھ سے کہا تو اس کا باپ تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

''بیٹے! یہ اپنا اپنا تجربہ ہے اور میرا تجربہ یہ ہے کہ عورت جو کچھ دکھائی دیتی ہے، وہ نہیں ہوتی۔'' اس نے تھکی ہوئی سانس لی۔ ''پتا نہیں، اس وقت تیسرا کون میرے کمرے میں موجود تھا جس نے پیچھے سے ناصر بھٹی کی کمر میں گولی ماری؟ شکر ہے وہ تم نہیں تھے۔'' اس نے بھاری آواز میں سرگوشی کی۔

''صندل بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے پاس ایسا کرنے کے کئی جواز ہیں......''

''صندل...... ہاں...... تمہارا مطلب کشور سے ہے۔'' اس نے جلدی سے بات کاٹی۔ ''مگر ایسا مت سوچو۔ ابھی تمہیں کسی بات کا تجربہ نہیں ہے۔ قاتلوں کی آنکھوں میں زندگی کی رونق کے بجائے وحشت اور سرد مہری کی ویرانی ہوتی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ابھی تک ایسی کوئی علامت نہیں دیکھی۔ پولیس اتنی ناتجربہ کار نہیں ہوتی بیٹے...... کوشش کر کے اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔ زیادہ سے زیادہ پولیس اپنی تفتیش تک میرا کمرا بند رکھے گی۔'' اس نے حکم کے بجائے محض خواہش کا اظہار کیا۔

''کوشش کروں گا ابو...... فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پیچھے آ گیا۔

گو اجمل کے ماموں کی آغوش کشادہ تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے پر بضد بھی تھے لیکن سامنے ہی صندل کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔ مگر جونہی اس کے ماموں، وکیل سے مزید مشورے کے لیے دونوں کے پاس سے ہٹے، صندل اس کی طرف جھک آئی۔

''اجو...... گھر چلو، تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔'' اس کی سرگوشی کسی چور کی طرح ڈانواں ڈول تھی۔ ''کاش تم میرا کہنا مان لیتے۔''

''تمہارا ہی کہنا مانا تھا۔'' اس نے تھکے تھکے انداز میں جوابی سرگوشی کی۔ ''اور کس گھر میں جاؤں، ہر جگہ تو تم نظر آ رہی ہو۔'' وہ سراپا منجمد آنسو تھا۔ صندل کے لب سل سے گئے کیونکہ اسے محسوس ہوا تھا گویا اجمل نے اس کی زبان میں اپنے دوست وسیم کا کانٹا پرو دیا ہے۔

''اب تو تڑپنے کی بھی سکت نہیں اجو۔'' اس نے بے بس

فریاد کی۔

''تب بھی خوش قسمت ہو، آنسو بہا کر ہمدردی تو حاصل کر لیتی ہو، میں تو یہ بھی نہیں کر سکتا۔'' وہ جاتے جاتے بھی نشتر لگا گیا۔

باپ کا گھر ہو یا وسیم کا کمرا یا ماموں کی بیٹھک...... ہر جائے پناہ پر صندل انگارہ بن کر دہک رہی تھی۔ ایسے میں بوڑھے بابا کی جھونپڑی کا ٹھنڈا تصور اس کے دہکتے ہوئے جسم اور سسکتی ہوئی روح پر مرہم بن کر پھیل گیا۔ متعفن اور تنگ گلیوں سے گزر کر ڈگمگاتے قدموں سے جب وہ جھونپڑی تک پہنچا تو اسے اپنی پیشانی پر لکھی ہوئی تقدیر ہی سب سے بڑی دشمن محسوس ہوئی۔ اس کی بے بسی کی آگ بوڑھے کے سرد جسم میں ہمدردی و شفقت کی کوئی گرم لہر پیدا نہیں کر سکی۔ آس پاس کے لوگ غربت کا لاشہ چھپانے کے لیے اپنی اپنی غربت کی دھجیاں اکٹھی کر رہے تھے۔ خود ٹوٹا پھوٹا ہونے کے باوجود جب وہ اپنے سے بھی زیادہ ٹوٹے پھوٹے لوگوں میں اندھوں میں کانا راجا بن کر ابھرا تو بجھی بجھی سی تمام خاموش نگاہیں مکھیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں۔

''تم چھوٹے بابو ہو؟'' ایک عمر رسیدہ شخص نے تیزی سے اس کے پاس آ کر تھانے دار کی طرح سوال کیا اور پھر اس کے اقرار پر اپنی میلی پیوند لگی صدری میں ہاتھ لے گیا۔

''پچھلی تمام رات بابا اپنے مرے ہوئے بیٹوں کے ساتھ تمہیں بھی بہت یاد کرتا رہا مگر تم بہت دیر سے آئے بیٹے۔'' اس کی دبی دبی سرگوشی میں کوئی جذباتی گرمی نہیں تھی گویا اس کے لیے موت و زندگی میں کوئی زیادہ فرق نہ ہو۔ ''اپنی یہ امانت سنبھالو، مرنے سے پہلے مرحوم نے تمہاری دلہن کے لیے میرے سپرد کی تھی۔'' اس نے ایک غلیظ چھوٹی سی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ ''تمہاری دلہن کا نام غالباً کسی خوشبو جیسا ہے۔'' مگر اجمل نے کوئی جواب دیے بغیر جیب میں ڈال لی۔

تجہیز و تکفین کے بعد جب تمام پڑوسی اس سے اس طرح تعزیت کر کے رخصت ہو گئے گویا وہی مرحوم کا حقیقی بیٹا ہو تو رات کے سناٹے میں سرسوں کے تیل کے جلتے ہوئے دیے کی روشنی میں اس نے پوٹلی کھولی اور گدڑی میں لعل کے مصداق جگمگاتا ہوا سونے کا ایک چھوٹا سا جھومر اس کی محرومیوں پر مسکرانے لگا۔

''چار قبروں کے اس تعویز کے ساتھ تو بڑے حوصلے سے بہت دیر جیا بابا۔ تجھے تو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے لاشعوری طور پر جھومر اپنے ماتھے پر سجا لیا۔

''اور اب تیری پانچویں بہو بھی تیرے اس جھومر کو زندگی دیے بغیر شاید بہت جلد مر جائے گی۔'' جھومر کو ماتھے پر زور سے دباتے وقت اسے اپنی محرومیوں اور مایوسیوں کے وہ تمام چنگھاڑتے ہوئے آنسو درندوں کی طرح اپنے دل کے پنجرے سے باہر آتے ہوئے محسوس ہوئے جنہیں وہ اب تک بوڑھے ہی کی طرح بڑے حوصلے سے سنبھالتا آیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

ہفتے بھر ہی میں اسے محسوس ہونے لگا گویا وہ صدیوں سے اسی جھونپڑی کا ایک بانس بن کر زمین میں گڑا ہوا ہے۔ بڑھی ہوئی ڈاڑھی، میلے کپڑے، بے نور آنکھیں اور پچکے ہوئے گال، وہ انہی جھونپڑیوں کا باسی معلوم ہو رہا تھا۔

''ابا آج خوب اخبار بکا ہے۔'' ساتھ والی جھونپڑی سے کسی لڑکے کی جوشیلی آواز گونجی۔

''کیوں، آج کے اخبار میں کوئی خاص خبر تھی؟'' باپ نے قدرے تجسس سے پوچھا۔

''ہاں ابا! خاص بھی اور بڑی چٹ پٹی بھی۔ پولیس نے اپنی ہی ماں اور میاں کی قاتلہ کو پکڑ لیا ہے۔'' اجمل کو لگا جھونپڑی زلزلے کے ایک شدید جھٹکے سے تہ و بالا ہو گئی ہے۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آیا۔ اس کا سارا بدن پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں اخبار مانگا مگر مایوسی ہوئی۔ لڑکا تمام اخبار بیچ آیا تھا۔ اسے اپنے آپ پر بے انتہا غصہ آیا کہ وہ ہفتہ بھر سے اپنی خود غرض تمناؤں اور آرزوؤں کے سوگ میں ڈوب کر گرد و پیش کے حقائق سے مفرور رہا۔ مردوں کو تو یہ سب باتیں زیب نہیں دیتیں۔ ایسے حالات میں تو کمزور سی عورت بھی شیرنی بن جاتی ہے۔ وہ اپنے ماموں کی طرف بھاگ اٹھا۔ کٹی ہوئی پتنگ کی بقیہ ڈور کا لچھا وہیں تھا۔

ماموں کا چہرہ ایسا تھا گویا طوفان آ کر گزر چکا ہو مگر بظاہر اس کی پرسکون آنکھوں میں اجمل کو ان کی گہرائی سے دہشت سی محسوس ہوئی۔ اصل مجرم وہی تھا کیونکہ ذلت و رسوائی کا تمام ڈھیر اسی نے اپنے ماموں کے گھر میں لا پھینکا تھا۔ اس کے باوجود ماموں کے لبوں سے ابھی تک ایک بھی حرف شکایت نہیں نکلا تھا۔

''مصائب سے اس طرح تو نہیں بھاگتے بیٹے...... میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ تم اپنے دوست کے ساتھ ہی ہو۔'' ماموں کے انداز میں حد درجہ شفقت تھی لیکن اس خیال کی تیز و تند لہر اسے قلابازی کھلا گئی کہ وسیم اسے ڈھونڈنے کے بہانے صندل سے اس کی عدم موجودگی میں ملا ہے۔

''میں بابا کی جھونپڑی میں تھا ماموں جان! وہ......''

''بابا کی جھونپڑی میں؟'' ماموں نے بے انتہا حیرانی مگر غیر یقینی لہجے میں دہرایا۔

''جی ماموں جان۔'' اس نے جھرجھراتی آواز میں یقین دہانی کروائی۔ ''مگر میرے پہنچنے سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا، میں صرف جنازے کو کندھا دے سکا۔''

''اناللہ.....'' ماموں نے جلدی سے پڑھا۔ ''اندر چلو بیٹے، تمہاری ممانی تمہارے لیے بے حد پریشان ہیں۔'' جواب میں چند لمحوں کے لیے اجمل نے اپنے حلیے پر نظر ڈالنے کے بعد حسرت بھری نگاہوں سے ماموں کو دیکھا۔

''میری اس ہیئت کذائی سے انہیں تکلیف ہوگی۔''

''مگر تمہارے آنے کی خوشی اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ بیٹے کسی حالت میں بھی ہوں، ماں کے لیے بیٹے ہی رہتے ہیں۔ جاؤ اندر چلے جاؤ۔'' ماموں نے اسے زبردستی اندر بھیج دیا اور جب ممتا کا طوفان تھوڑا تھما تو وہ تھکا تھکا سا بیٹھک کی طرف چل پڑا۔ اسے گھر میں صندل کی خوشبو تک محسوس نہیں ہوئی تھی۔

مگر ستے ہوئے زرد چہرے پر بے پناہ کرب میں ڈوبی آنکھوں والے اپنے دوست وسیم پر اس کی نگاہ پڑی تو اس کے دل میں رقابت کا تیز دھار خنجر اتر گیا جبکہ وسیم اسے دیکھتے ہی اس طرح تڑپ اٹھا گویا کوئی کھویا بچہ دوبارہ والدین کو پا کر تڑپ اٹھتا ہے۔

''اجمل بھائی!'' جذباتی یلغار کی وجہ سے وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے بے اختیار معصومانہ انداز پر اجمل کو رقابت کی جگہ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ یکایک ایک جوان بچے کا باپ بن گیا ہے کیونکہ کسی دہشت زدہ بچے کی طرح وسیم کی حالت قابلِ رحم تھی جو اپنی کمزوری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے بے رحم حالات کا شکار ہو گیا ہو۔ وسیم بھی صندل کی گرفتاری کی خبر پڑھ کر اسی مفروضے کی بنا پر وہاں آیا تھا کہ اجمل اپنے ماموں ہی کے گھر رہ رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ساتھ ہی صندل کے تصور نے اس کے دل میں میٹھی سی گدگدی بھی کی تھی۔ اجمل نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھا، وہ یقیناً صندل کی گرفتاری کے صدمے سے شدید متاثر دکھائی دے رہا تھا کیونکہ پیار کے ابتدائی ریلے میں بڑی شدت ہوتی ہے مگر وہ ماموں کی اس بیٹھک میں اس حقیقت کی تصدیق نہیں کر سکتا تھا۔

''عدالت میں تو صندل کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی پھر یہ سب......؟''

''فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا بیٹے۔'' ماموں نے جلدی سے اجمل کی بات کاٹی۔ ''البتہ مجھے اتنا یقین ضرور ہے کہ طوفان کا یہ آخری ریلا ہے پھر انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا کیونکہ رات کے آخری پہر کی نیند موت سے بہت قریب ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو پھر صبح کی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ سو تمہیں اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔'' ماموں کے ان الفاظ سے دونوں دوستوں کو ایک نیا حوصلہ ملا۔

''مگر بے چاری صندل کی کیا حالت ہوگی؟'' اجمل دبی آواز میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''وہ جہاں بھی ہے صرف اللہ کی حفاظت میں ہے کیونکہ ہم مخلوق ہونے کے ناتے کسی کی حفاظت کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتے۔'' لہجے میں یقین و ایمان کی آنچ نے اجمل کے اندیشے بہت حد تک پگھلا دیے جونہی صندل کے اندیشے سے نجات ملی، وہ وسیم کے دل میں جھانکنے کے لیے بے تاب ہو اٹھا کیونکہ رقابت کا چور اس کے دل میں پھر نقب لگانے لگا تھا۔

''بیٹی کا خوف ناک انتقام...... کیونکہ شادی کی آڑ میں مقتولہ ماں نے دراصل اسے بیچ دیا تھا جبکہ شوہر زرخرید لونڈی کی طرح اسے اپنی عیاشی کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ مقتول شوہر بلیک میل کرنے کے لیے ملوث عورتوں کی خفیہ طور پر عریاں فوٹو کھینچ لیتا تھا۔ ڈرامائی انداز میں گرفتار ہونے والی ملزمہ کے سنسنی خیز انکشافات۔'' وسیم کے کمرے میں پہنچ کر اجمل نے سب سے پہلے تازہ اخبار کی موٹی موٹی سرخیاں پڑھ ڈالیں۔ ردعمل میں صدمے یا نفرت و غصے کی جگہ اس کے دل میں صرف چبھن اور پھانس کی خلش سی رہ گئی جو تکلیف کے بجائے صرف اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ لگتا تھا وہ تیز و تند طوفانی موجوں سے لڑنے کے بعد ساحل پر بے دم ہو کر گر پڑا ہے۔

''اب کیا ہوگا اجمل بھائی؟'' وسیم کی روحانی کرب میں ڈوبی آواز پر اجمل نے چند لمحوں کے لیے ٹکٹکی باندھ کر وسیم کو دیکھا اور عجیب سی دکھ بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

''پھانسی یا پھر عمر قید...... پولیس نے یقیناً پورے ثبوت کے ساتھ یہ قدم اٹھایا ہے۔'' اپنے ہی تبصرے پر نہ صرف یہ کہ اسے اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا بلکہ وسیم کی مزید غیر ہوتی ہوئی حالت پر بے انتہا رحم بھی آیا۔ وہ ابھی ادھ کھلا پھول تھا جسے اتنی بے دردی سے مسلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ اس کی رقابت کی لاشعوری حرکت تھی۔

''مجھے افسوس ہے تمہیں میرے اظہار خیال سے دکھ ہوا وسیم مگر میں تمہارا دوست ہوں اور تمہاری حالت پر مجھے رحم آ رہا ہے۔ کاش! تم میرے سامنے اپنے دل کا چور باہر نکال دو۔ ہماری دوستی اور بھی مضبوط ہو جائے گی۔'' اجمل کے انداز میں بزرگانہ شفقت تھی۔

''میرے دل میں کوئی چور نہیں اجمل بھائی۔'' اس کی

شکست خوردہ آواز لہولہو تھی۔ بھولپن، معصومیت، بچکانا پن کا وہ بے داغ سا مجسمہ تھا۔

''ہے وسیم ......صندل کا چور......شاید اس کے پیار کا چور تمہیں ڈرا رہا ہے۔''

''اجمل بھائی!'' وہ اس براہِ راست چوٹ پر بلبلا اٹھا۔ رقابت و ہمدردی کا دودھاری خنجر خود اجمل کی روح میں اتر گیا تھا۔

''جب میں آپ کی گرفتاری کی خبر لے کر ماموں جان کے ہاں گیا تھا تو ان سے اچانک سامنا ہوگیا......'' آخر اس نے دبے لہجے میں اعتراف کیا۔ ''مگر......مگر ان کے لیے میرے دل میں کوئی برا خیال ہرگز پیدا نہیں ہوا تھا، بس ایسا لگا تھا جیسے ......میں انہیں شروع سے جانتا ہوں یا وہ ہمیشہ میرے ہی پاس رہی ہیں۔ وہ بھی مجھے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔'' اس نے اٹک اٹک کر کئی مرتبہ تھوک نگلا۔ وہ پسینے پسینے ہوگیا تھا لیکن دل کا چور نکال دینے سے وہ سکون محسوس کرنے لگا تھا۔

''اسی پہچان کو تو پیار کہتے ہیں میرے بھولے دوست۔'' اس کی شکست خوردہ مسکراہٹ بے حد پھیکی تھی۔

''کیونکہ والدین اور بھائی بہنوں کے بعد اب تمہاری زندگی میں اسی پیار کی کمی تھی۔''

''مگر اجمل بھائی! میرے دل میں ان کے لیے کوئی برا خیال نہیں ہے۔'' اس نے تڑپ کر احتجاج کیا۔

''پیار کوئی بری چیز نہیں ہوتی وسیم......شاید پیدائش کے ساتھ ہی انسان اپنی روح کی گہرائیوں میں اپنے محبوب کو بھی چھپا کر لاتا ہے۔'' وسیم کے اعتراف سے اس کے دل میں ناکام تمنا کا کانٹا سا اتر گیا۔ کیا اس نے اتنا کٹھن سفر محض اس لیے طے کیا تھا کہ منزل پر پہنچ کر وہ اپنی ساری کی ساری آرزوئیں پلک جھپکتے میں دوسرے کی جھولی میں ڈال دے۔ اس بھوکے پیٹ مزدور کی طرح جو اشتہا انگیز اشیا کا بھرا ٹوکرا اٹھا کر مالک تک پہنچا دیتا ہے۔

''آپ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں اجمل بھائی......وہ آپ کے لیے سب کچھ ہیں۔'' وہ باقاعدہ روہانسا ہوگیا۔

''سوال تو یہ ہے کہ کیا میں بھی اس کے لیے سب کچھ ہوں......بہرحال تمہارا شکریہ، میں تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔'' اس کے چلنے کے انداز پر وسیم تڑپ کر اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

''آپ مجھے تنہا چھوڑ کر اب کہیں نہیں جائیں گے ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپ کا دل میری طرف سے صاف نہیں ہے۔'' اس نے کسی بچے کی طرح مچل کر اسے رکنے پر مجبور کر دیا مگر اجمل کے دل میں وسیم کی پھانس اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہی۔

صندل سے ملنے کے لیے ہفتے بھر کی تگ و دو کا نتیجہ صفر تھا۔ وسیم کے کانٹے کے باوجود اسے پہلی مرتبہ صندل کی محبت کا شدت سے احساس ہوا۔ وکیل نے یہ بتا کر اسے اور بھی مایوسی کی دلدل میں دھنسا دیا کہ مکمل تفتیش سے پہلے ملاقات تو کجا پولیس صندل کا اتا پتا بتانے پر بھی تیار نہیں ہے جبکہ ماموں کی پراسرار خاموشی بھی اسے انگاروں پر لوٹا رہی تھی۔ وہ یہاں تک شک کرنے لگا کہ وہ صندل ایسی بلا سر سے ٹل جانے پر خوش ہیں۔ وسیم کی چپ کی راکھ کے نیچے سلگتے ہوئے انگاروں کی آنچ بھی اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تو کوئی جاسوس بھی نہیں تھا کہ افسانوی ہیرو کی طرح اصل قاتل کو ڈھونڈ نکالتا۔

اجمل پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی جب ماموں کے دروازے پر دستک کے جواب میں خلافِ توقع صندل کا بجھا بجھا چہرہ دروازے کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ شدید جذباتی ردعمل میں پھیلی ہوئی آنکھوں کی تاب نہ لا کر صندل دروازہ کھلا چھوڑ کر غائب ہوگئی۔

''اچھے وقت پر آئے ہو......وکیل کی طرف جانا ہے۔'' چند منٹ بعد ماموں کی آواز پر جھرجھری لے کر برف کا پہاڑ چٹخا۔

''مگر وہ......وہ......صندل ماموں جان؟'' اس کی بچکانا ہکلاہٹ پر ماموں کے لبوں پر مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سب ٹھیک ہے بیٹے ......سب ٹھیک ہے۔ اندھیرے کے بعد اب آہستہ آہستہ روشنی پھیل رہی ہے۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔'' وہ اسے تسلی دیتے ہوئے وکیل کی طرف لیتے چلے گئے۔ وہاں بھی بات کچھ ایسی گول مول تھی کہ صندل کی روپوشی پر کوئی روشنی نہ پڑ سکی۔ ذہن میں گھومتی صندل پھر اس کے سامنے تھی۔

''بعض اوقات تو ایسا لگتا ہے گویا ہم جھوٹ کے پلندوں میں سے خوردبین کے ذریعے سچائی کے ذروں کی اس طرح تلاش کر رہے ہیں جس طرح سنار دریائی ریت سے سونے کے ذرے تلاش کرتا ہے۔'' اجمل نے صندل پر نظریں جمائے گویا اپنے آپ سے کہا۔ صندل الجھی مگر کرب ناک نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔

''اب تم ہی دیکھو سچائی کی اس چھت کے نیچے ہم مکمل جھوٹ بن کر بے بس کھڑے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔'' اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ مگر آنکھوں میں درد کے سائے تھے۔ واپسی میں اس نے بہ اصرار ماموں سے اس ملاقات کی

اجازت لی تھی۔

''ممکن ہے تم اپنی جگہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہو لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے ابھی تک تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ البتہ یہ میری بدقسمتی ہے کہ اب تک کے حالات نے میرے ہر سچ کو دھندلا دیا۔ میں بے مقصد فریاد بن کر رہ گئی ہوں۔'' اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے تپتی ہوئی چٹان پر بارش کے قطرے بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو رہے ہیں۔

''میں تم سے تمہارا اطمینان نہیں چھیننا چاہتا صندل۔'' اس نے تھکے ہوئے جواری کی طرح کہا۔ ''میں صرف اپنی منزل، اپنی حیثیت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ تمہاری نگاہوں میں میری حیثیت ایک قلی کی ہے یا......''

''اجو......!'' صندل نے تڑپ کر اس کی بات کاٹی۔

''حالات کے اندھیرے میں، میں خود پہچان نہیں پا رہی ہوں کہ میرے لیے کون کیا ہے۔ حتیٰ کہ میرے اس اعتماد میں بھی شگاف پڑ گیا ہے جو تم نے میرے اندر پیدا کیا تھا۔'' اس نے ایک لمحے کے لیے نگاہیں ملا کر جھکا لیں۔

''کبھی لگتا ہے تم میرے لیے سب کچھ ہو تو روحانی سکون سا ملتا ہے مگر کبھی لگتا ہے جیسے تم کسی خوشگوار جھونکے کی طرح جلد ہی ساتھ چھوڑ جاؤ گے اور میں پھر اس بے رحم دنیا میں پہلے کی طرح تنہا رہ جاؤں گی...... کبھی میں اپنے آپ کو بہت سے لوگوں کی سچ مچ کی قاتل سمجھ کر دہشت زدہ ہو جاتی ہوں اور کبھی لگتا ہے میرے اردگرد کے لوگ ہی مجھے تنہا دیکھ کر مار دیں گے۔ میں بے بس ہوں اجو...... میں حالات کے سامنے بے بس ہوں۔'' بنجر چٹان کی طرح اس کے اندر شدید توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ ''اس اندھیرے میں اگر تمہیں کوئی روشنی کی کرن نظر آ رہی ہو تو خدا کے لیے مجھے بھی دکھا دو۔'' وہ فریاد بن کر اجمل کے پاؤں میں بہنے لگی جواب میں اجمل گہرا سانس لے کر ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''میرے پاس روشنی کی ایسی کرن ہے۔'' اس کا لہجہ...... بے حد گمبھیر تھا۔ صندل سراپا سوال بن گئی اور اجمل نے دل تھامنے کے انداز میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ ''وہ ہے میرا دوست وسیم...... مجھے یقین ہے تم دونوں زندگی بھر خوش رہ سکتے ہو۔'' صندل چند لمحوں کے لیے منجمد سی ہو گئی۔

''اجو......! تم تو اتنی بے رحمی سے میرے زخموں میں مرچیں نہ بھرو۔'' اس نے بڑی مشکل سے تھوک نگل کر مردہ آواز میں التجا کی۔

''میں نے مرہم رکھنے کی کوشش کی ہے صندل۔'' اس کا انداز بڑا بے رحمانہ تھا۔ ''اور زخم گہرا ہو تو دوا ضرور لگتی ہے مگر بعد میں آرام ملتا ہے۔'' وہ خون کی بوند بن کر ٹپکا تو صندل ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح فرش پر گر گئی۔ اس کا سارا خون جیسے برف کی ڈلی بن گیا۔ اجمل کو اپنی جذباتی غلطی کا بعد از وقت احساس ہوا۔

''مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے اجمل مگر میرے احساسات تم اتنی بے دردی سے کچلو گے، اس کی توقع نہیں تھی۔'' وہ ماتم سا کرنے لگی۔ ''کاش میں تمہیں سمجھا سکتی کہ تمہارے دوست کے بارے میں میرے کیا جذبات ہیں۔ کاش وہ کبھی میرے سامنے نہ آتا مگر قسمت کا لکھا بھی کبھی ٹلا ہے ورنہ میں اس اذیت میں کیوں مبتلا ہوتی جو میری روح کو ڈس رہی ہے...... اس نے تمہاری طرح میرے دل پر دستک نہیں دی بلکہ جیسے وہ میرے دل کے کسی گوشے میں پہلے سے چھپا بیٹھا تھا۔ میرا دل چیر کر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا ہے...... نہیں اجو! پیار جب دل پر دستک دیتا ہے تو ایسی اذیت نہیں ہوتی، اسے دیکھتے ہی میرے دل و دماغ میں بالکل عجیب جذبوں کا طوفان اٹھا ہے۔ ایسے جذبے جو میں تمہارے اس دوست پر تو نچھاور کرنا چاہتی ہوں مگر ان جذبوں کو تمہارے ساتھ جوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ کاش وہ وہی ہوتا جو تم سمجھتے ہو تو میں ایک مسلسل عذاب میں مبتلا نہیں ہوتی۔'' صندل کے چہرے پر دکھ بھرا پسینا پھوٹ پڑا۔ اجمل کسی بے حس ستون کی طرح اس کے سامنے جما ہوا روح تک کو چھیدنے والا اعتراف سنتا رہا۔

''کس قسم کا جذبہ صندل؟'' اس کی آواز بے حد کمزور تھی جیسے مرنے والا آخری ہچکی لے رہا ہو۔ ''آخر تمہارے اس جذبے کی نوعیت کیا ہے جو تمہیں اتنا دکھ دے رہی ہے؟'' اس کے انداز میں کچکچاہٹ کی جھلک تھی۔ صندل بے پناہ کشمکش کے انداز میں بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

''کیا بتاؤں کہ وہ کس قسم کا جذبہ ہے؟'' اس نے مزید اذیت سے بچنا چاہا۔ جواب میں اجمل کی نگاہیں بہت تیز تھیں۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے اصل جذبات پر پردہ ڈال کر مجھے اس وقت تک الجھائے رکھنا چاہتی ہو جب تک تمہیں میری ضرورت ہے۔'' وہ میان سے کھنچا ہوا خنجر بن کر صندل پر لپکا۔

''اجو! بغیر سوچے سمجھے ایسا مت کہو۔'' اس نے التجا کی۔ ''تم میرے لیے ہمیشہ وہ رہو گے جیسا اپنے گھر کے باورچی خانے میں تھے۔ میں چاہتی ہوں کسی بیوہ ماں کی طرح تمہارے دست کو پیار کروں، کسی ننھے بچے کی طرح اس کے سارے جسم کو سہلاؤں اور پھر اسے گدگدا کر ہنساتے ہوئے اپنی محرومیوں پر جی بھر کر آنسو بہاؤں۔'' وہ سپنوں اور خواہشوں

کے بھنور میں گم ہوگئی۔

''صندل!'' اجمل کی آواز منجمد ہوگئی۔ سردی کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود سے گزرنے لگی تھی۔

''پتا نہیں حالات کا یہ دھارا کب تک آبشار بن کر توڑ پھوڑ کرتا رہے گا۔'' چند منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی۔

''اپنی حالیہ گرفتاری کی خبر پر کچھ روشنی ڈال کر مجھ پر ایک اور مہربانی کردو۔'' اس نے تھکی ہوئی گہری سانس لے کر ہتھیار ڈال دیے۔ صندل خود ابھی تک جیسے خلا میں قلابازیاں کھا رہی تھی جبکہ اجمل اس کی اس وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ شاید وہ خود بھی ایسا کہہ کر مطمئن نہیں تھی۔ اس نے اپنی چاہت کو ایسا رنگ دے کر شاید اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔

''میں پولیس کی درخواست پر اس سے تعاون کر رہی ہوں مگر خود مجھے اس تعاون کی نوعیت کا علم نہیں ہے۔'' اس نے دکھ بھری آواز میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ اجمل نے اسے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا مگر وہاں سچائی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

''ممکن ہے اصل مجرم کو مطمئن کرنے کے لیے پولیس نے یہ جال پھیلایا ہو تاکہ وہ بے فکری میں کوئی قابلِ گرفت سراغ چھوڑ جائے۔ خدا کرے اب مزید کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔'' جواب میں اس نے نگاہ بھر کر اجمل کو دیکھا۔

''ہمت نہ ہارو اجو..... خدا بہتری کرے گا مگر ایک بات کا خیال رکھنا کہ میرا ہر لفظ تمہارے پاس امانت ہے اور اس لیے اظہار کیا ہے تاکہ انجانے میں تمہاری مشکوک نگاہوں کے تیر مجھے اور اذیت نہ پہنچائیں۔'' اس کے ایک ایک لفظ میں اپنائیت کی چاشنی تھی۔

''پتا نہیں، سچی خوشی ٹیڑھے ہی راستوں کا انتخاب کیوں کرتی ہے۔ بہرحال اس حوصلہ افزائی کا شکریہ مگر تم ابھی اپنے دل کی روشنی میں راستہ طے کرنے کے لیے آزاد ہو..... میں چلتا ہوں، ممانی جان کہیں جز بز نہ ہو رہی ہوں۔'' صندل عجیب سلگتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔ اس طوفان میں میرے لیے تم ہی ایک سہارا ہو۔'' رندھی ہوئی آواز سے کہہ کر وہ خود ہی چلی گئی مگر وہ اس لمحے تک دوبارہ صندل سے نہ ملا جب تک کہ احاطۂ عدالت میں ان کا آمنا سامنا نہیں ہوگیا۔ آنے والے واقعات کی دہشت نے صندل کو ضرورت سے زیادہ دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اس کی خود اعتمادی کی جیسے دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ جونہی اجمل کا ماموں وکیل کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھا، صندل سہارا لینے کے لیے اجمل کے ساتھ سمٹ سی گئی۔

''میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں اجو..... لگتا ہے میرے لیے قیامت کی گھڑی شروع ہوگئی ہے۔'' اس نے کپکپاتی آواز میں سرگوشی کی۔ اجمل کو اس کی حالت پر بے انتہا رحم آیا۔

''اپنے آپ کو سنبھالو صندل۔'' اس نے پہلی مرتبہ زندگی کی تمام تر لطافت اور چاشنی میں ڈوبی سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

جج اور وکیل سرکار کے بیک وقت کمرائے عدالت میں داخلے پر اجمل باہر جاتے جاتے رک گیا۔ ویسے بھی صندل ایک دم نروس ہوگئی تھی۔

''جناب عالی! میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تمام غیر متعلقہ لوگوں کو کمرائے عدالت سے باہر چلے جانے کا حکم دے۔'' جب جج مقدمے کی فائل کا سرسری نظر سے مطالعہ کر چکا تو سرکاری وکیل نے کہا۔

''کیا آپ کی اس درخواست کو مدعا علیہ کے وکیل کی تائید حاصل ہے؟'' قانونی تقاضے کے تحت پوچھا گیا۔

''جناب عالی!'' وکیل نے اقراری انداز میں کہا۔ ''بلکہ یہ ملزمہ کے وکیل ہی کی درخواست ہے جس سے میں نے تعاون کیا ہے۔''

''ملزمہ؟'' اجمل کے ذہن میں جیسے بغیر نوک کی سوئی اتر گئی۔ اس نے غیر یقینی نظروں سے لرزتی ہوئی صندل کو دیکھا کیونکہ ابھی تک کمرے میں اس کے سوا کوئی عورت نہیں تھی۔ اخباری نمائندوں کو بھی کمرائے عدالت سے چلے جانے کا حکم دے دیا گیا۔

''جناب عالی! جب تک پولیس ملزمہ کو لاک اپ سے عدالت میں حاضر کرتی ہے، میں معزز عدالت کے ریکارڈ کے لیے اخبار کا یہ تراشہ پیش کرتا ہوں۔'' خالی خالی سے کمرائے عدالت میں سرکاری وکیل کی آواز کچھ زیادہ گونجیلی تھی۔ اجمل نے تھکی تھکی سانس لیتے ہوئے پہلو بدل کر اپنے ماموں کو دیکھا جس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ تراشہ پڑھنے کے بعد جج نے سوالیہ انداز میں وکیل کو دیکھا۔

''جناب عالی! اخبار کا یہ تراشہ مقدمے کی موجودہ صورت حال کی بنیاد ہے مگر یہ خبر قطعی فرضی اور ضرورت کے تحت چھپوائی گئی تھی جو اصل ملزم تک پہنچنے کا واحد ذریعہ بنی جبکہ اس مقدمے کی مرکزی حیثیت کی حامل کشور بانو کا مکمل تعاون اس خبر کے سلسلے میں حاصل تھا۔ اس لیے میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ وہ خبر کے اس تراشے کو اصل ملزم تک پہنچنے کے لیے پولیس کی کوشش کا ایک حصہ تصور کرے۔ اس خبر کی بنا پر محترمہ کشور بانو کو جو ذہنی پریشانی کی صورت میں قربانی

دینا پڑی ہے اس کے لیے پولیس ان کی شکر گزار ہے اور اپنی تفتیش کی بنا پر محترمہ کو بالکل بے گناہ سمجھتی ہے۔'' سرکاری وکیل کا بیان سریلا نغمہ بن کر صندل، اجمل اور اس کے ماموں کے کانوں میں رس گھول گیا۔ ویسے صندل سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گئی تھی۔

وکیل کے بیان کے ساتھ اخبار کا تراشہ ریکارڈ میں شامل کرنے کے بعد جج نے سرسری نگاہ سے کمرائے عدالت کا جائزہ لیا اور پھر ہتھکڑی کے ہلکے شور کے ساتھ سیاہ جدید برقع میں زنانہ پولیس کی نگرانی میں ملزمہ کمرائے عدالت میں داخل ہوئی تو صندل شدید اضطراب میں اپنی جگہ سے کھڑی ہونے لگی مگر اجمل کے ہاتھ نے سختی سے اسے اٹھنے سے باز رکھا۔

''یہ کون ہے...... یہ کون ہے؟'' صندل کے روئیں روئیں سے صدا بلند ہونے لگی۔ دوسرے ہی لمحے میں ہتھکڑی میں اجمل کا باپ بھی کمرائے عدالت میں داخل ہوا تو اجمل بھی مضطرب ہو گیا مگر صندل کی نگاہیں اپنے پاؤں میں گڑ گئیں۔

رسمی کارروائی کے بعد ہتھکڑی اتارتے ہوئے ملزمہ کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کے ساتھ دوسرے کٹہرے میں تفتیشی انسپکٹر کو بھی عدالت کے روبرو ملزمہ کی شناخت کے لیے کھڑا کر دیا گیا اور جب عدالت کی ہدایت پر شناخت کے لیے ملزمہ کا نقاب اٹھا دیا گیا تو ساتھ ہی ''نادو تم!'' کے چیخ نما الفاظ صندل کے لبوں سے نکلے اور پھر وہ شدت جذبات سے.... بے ہوش ہو گئی جبکہ نادو سپاٹ چہرے پر پتھریلی آنکھوں سے ہر شخص کو اجنبی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ چند منٹ کی بے ہوشی کے بعد جب صندل دوبارہ ہوش میں آئی تو انسپکٹر شناخت کرنے کے بعد کٹہرے سے باہر آ رہا تھا۔

''جناب عالی!'' سرکاری وکیل نے گلا صاف کرتے قدرے جوشیلی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''یہ ثابت ہونے کے بعد کہ موقع واردات پر کوئی تیسرا شخص بھی موجود تھا جس نے آلۂ قتل جائے واردات سے کافی دور مقتول ناصر بھٹی کے گھر میں رکھ دیا جو چند گھنٹوں بعد پولیس کو تلاشی کے دوران مل گیا تھا مگر یہ اس وقت تک آلۂ قتل ثابت نہ ہوا جب تک ماہرین اسلحہ کی رپورٹ حاصل نہ ہو گئی جس میں انکشاف کیا گیا تھا کہ دونوں مقتولین کی موت دراصل ملزم تاج ملک کے پستول کے بجائے خود ناصر بھٹی کے پستول سے واقع ہوئی تھی۔ ماہرین کی دیگر رپورٹوں کی روشنی میں اجمل ملک تماشائی ثابت ہوا جبکہ اس کا باپ تاج ملک مقتولہ کو محض زخمی کرنے کا ملزم پایا گیا۔'' وکیل سرکار نے ردعمل دیکھنے کے لیے پہلے جج پھر باری باری نادو اور دیگر لوگوں کو دیکھا۔ جج بطور ریکارڈ اس کے الفاظ نوٹ کرتا رہا۔

''آلۂ قتل موقع واردات پر موجود ہوتا تو اسے سیدھا سیدھا انتقامی کارروائی اور جوابی کارروائی سمجھا جاتا مگر ملزمہ نے موقع واردات سے آلۂ قتل ہٹا کر فاش غلطی کی اور اس سے بھی بڑی غلطی خود مقتول کے گھر میں پستول ڈال کر کی جس سے اس بات کا انکشاف بھی ہوا کہ ملزمہ مقتول کے اتنا قریب تھی کہ اس کے گھر کی چابی تک اس کے پاس رہتی تھی کیونکہ تلاشی کے سلسلے میں پولیس چند گھنٹوں بعد وہاں پہنچی تو مقتول کا دروازہ مقفل تھا۔ جسے پولیس نے ایک اور چابی سے کھولا۔ اس طرح دروازے پر سے ملزمہ کے نشانات بھی غائب ہو گئے کیونکہ اس وقت تک پولیس کو کسی تیسری ہستی کے ملوث ہونے کا خواب وخیال بھی نہیں تھا۔ وہ تو محض ضابطے کی کارروائی کے طور پر ناصر بھٹی کے گھر پہنچی تھی جبکہ ابتدائی طور پر ہی موقع واردات پر دونوں باپ بیٹا پکڑے گئے تھے۔ مزید یہ کہ ملزم تاج ملک کا بیٹا اجمل ملک اور مقتولہ کی سگی بیٹی کشور بانو مقتول ناصر بھٹی کے دائر کردہ اغوا کے کیس میں ضمانت پر رہا تھے اور اگلی پیشی پر کشور بانو کے جو اس وقت بھی کمرائے عدالت میں موجود ہے مطلقہ ہونے یا نہ ہونے کا ثبوت پیش کیا جانا تھا لہٰذا پولیس کے لیے یہ دہرا قتل بظاہر آپس کی رنجش کا نتیجہ تھے لہٰذا ملزمہ کو جہاں اپنے جرم کا احساس ہوا تھا، وہیں تفتیش کے غلط رخ کی بنا پر ملزمہ نے پستول پر اپنے ہاتھوں کے نشانات صاف کر دیے کیونکہ ملزمہ پڑھی لکھی ہونے کی بنا پر ایسے نشانات کی اہمیت سے بخوبی واقف تھی۔'' وکیل نے الزام کا پہلا حصہ مکمل کرنے کے بعد تھکا ہوا سانس لے کر پھر نادرہ پر طائرانہ نگاہ ڈالی جواب بھی کٹہرے میں لاتعلق انداز میں کھڑی جیسے خلا میں گم تھی۔

''لہٰذا جناب عالی! تفتیش نئے سرے سے شروع ہوئی تو چھان بین کے دوران تاج ملک کے کمرے میں جہاں دونوں قتل ہوئے، کپڑوں کی قد آدم الماری میں لٹکے چند کپڑوں پر تفتیشی افسر کو لپ اسٹک اور دانتوں کے غیر معمولی نشان نظر آئے جن کے مشاہدے سے معلوم ہوا کہ کسی نے نہایت خوف زدگی کے عالم میں چیخ روکنے کے لیے منہ کے سامنے لٹکے کپڑوں کے مختلف حصے بے اختیار منہ میں دبا لیے تھے اور لپ اسٹک مرد نہیں عورتیں استعمال کرتی ہیں۔'' اس نے ایک لمحہ رک کر ملزمہ نادرہ کے چہرے کا جائزہ لیا جس پر اسے پہلی دفعہ ذرا سے تغیر کی جھلک محسوس ہوئی وہ اور زیادہ ٹھوس لہجے میں بیان کرنے لگا۔

''جناب عالی! اس کے ساتھ ہی آس پڑوس سے پوچھ گچھ کی گئی تو جائے واردات کی گلی کی نکڑ پر موجود پان فروش سے دوسرا قابل قدر سراغ ملزمہ کے موجود ہونے کا ملا۔ گو اس کا پہلا خیال مقتولہ کی بیٹی کی طرف گیا تھا لیکن اس کے بارے میں پہلے

ہی ثابت ہوگیا تھا کہ وہ واردات سے کافی پہلے اور بعد تک بھی مسلسل ایک تقریب میں شریک تھی۔ اس لیے اس نئے سراغ نے جہاں یہ طے کردیا کہ تیسری ہستی نہ صرف یہ کہ کوئی عورت ہے بلکہ کشور بانو کے علاوہ ہے تو تفتیشی افسر نے اسی چیز کو مدِنظر رکھ کر پان فروش سے پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ واردات سے چند گھنٹے پہلے پان لینے کے بہانے ملزمہ نے اس سے مقتولہ یا دوسرے لفظوں میں تاج ملک کے گھر کی نشاندہی چاہی کیونکہ وہ مقتولہ کے گھر کا پتا نہیں جانتی تھی۔ اس کے باوجود کہ ملزمہ نے اپنا چہرہ پوری طرح نقاب میں چھپا رکھا تھا، پان فروش کو اس لیے یاد رہ گئی کہ پان لینے کے دوران اس کی دکان پر سگریٹ جلانے والی سلگتی ہوئی رسی سے بے دھیانی میں ملزمہ کے برقع کے اوپری حصے کا ایک کونا جلنے لگا تھا جسے خود پان فروش نے بجھایا تھا۔ یہ نشان اب بھی ملزمہ کے برقع پر موجود ہے جو وہ اس وقت بھی اوڑھے کھڑی ہے۔'' سرکاری وکیل نے بڑے فاتحانہ انداز میں نادرہ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے جج کو متوجہ کیا تو عدالت میں موجود ہر شخص اسے دیکھنے لگا۔ نادرہ کے چہرے پر کرب کے آثار کافی واضح ہوگئے جبکہ صندل بدستور چہرہ جھکائے جذباتی کشمکش چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔

''ان شواہد کے باوجود پولیس مکمل اندھیرے میں تھی لہٰذا مقتول ناصر بھٹی کے چال چلن اور خود اس کی مطلقہ بیوی کشور بانو کے بیان کی روشنی میں پولیس کو یقین ہوگیا کہ مقتول کے بیک وقت کئی عورتوں سے تعلقات تھے۔ انہی میں سے کسی نے انتقاماً ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے لہٰذا پولیس نے نفسیاتی حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے محترمہ کشور بانو کی اجازت سے بطور تعاون اخباروں میں ان کی گرفتاری کی جھوٹی خبر کے ساتھ عریاں فوٹوگرافی کے الفاظ کا بھی بطور انکشاف اضافہ کیا تاکہ ملزمہ اپنی بدنامی کے خوف سے اندھیرے سے روشنی میں آجائے لہٰذا دکھاوے کے طور پر مقتول ناصر کے گھر کی نگرانی ختم کردی گئی مگر تفتیشی افسر خود گھر کے پاس موجود کریانے کی دکان پر نئے ملازم کے روپ میں مقتول کے گھر کی نگرانی کرتا رہا کیونکہ پولیس کو یقین تھا کہ ملزمہ کے پاس مقتول کے گھر کی چابی اب بھی موجود ہے اور وہ اس خبر کے بعد کبھی نہ کبھی چوری چھپے ان فرضی عریاں تصاویر کی تلاش میں ضرور وہاں آئے گی لہٰذا دس روز کی مسلسل اور صبر آزما نگرانی کے بعد آج سے تین روز پہلے رات... دس بجے کے قریب اسی جلے ہوئے برقع میں وہ چابی سے مقتول کے گھر کا دروازہ کھول کر اس طرح داخل ہوئی گویا وہ اس کا اپنا گھر ہے۔ دس منٹ کے انتظار کے بعد تفتیشی افسر نے اپنے افسرِ اعلیٰ کی موجودگی میں چند سپاہیوں کے ساتھ جب چھاپا مارا تو ملزمہ جنونی حالت میں مقتول کی خواب گاہ کی چیزیں الٹ پلٹ کررہی تھی حتیٰ کہ اس نے مفروضہ عریاں تصاویر کی تلاش میں تکیے اور لحاف تک کو ادھیڑ دیا تھا مگر پولیس کو دیکھتے ہی اس پر ہذیانی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس لیے ابھی تک پولیس اس سے کوئی بیان نہیں لے سکی البتہ وہ ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات لے کر ان نشانات سے موازنہ کرچکی ہے جو وہ پستول رکھتے وقت دراز پر چھوڑ گئی تھی۔ اس ضمن میں پولیس معزز عدالت سے جسمانی ریمانڈ کی درخواست کا حق محفوظ رکھتی ہے۔'' سرکاری وکیل نے الزام عائد کرنے کے بعد جج کا ردِعمل جاننے کے لیے اسے دیکھا۔

''کیا ملزمہ نے اپنی صفائی کے لیے کسی وکیل کو مقرر کیا ہے؟'' جج نے سرکاری وکیل کے آخری الفاظ لکھ کر عینک اتارتے ہوئے پوچھا۔

''جی جناب عالی!'' ایک ادھیڑ عمر وکیل نے آگے بڑھتے ہوئے اپنا وکالت نامہ جج کے سامنے پیش کیا۔

''کیا اپنی مؤکلہ کی مدافعت میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟'' جج نے سرسری نظر سے وکالت نامے پر نظر ڈالنے کے بعد پوچھا۔

''جی جناب عالی! چونکہ میری مؤکلہ ذہنی صدمے کی بنا پر ابھی کچھ کہنے کے قابل نہیں ہیں اس لیے میں اپنی مؤکلہ پر لگائے گئے فاضل وکیل کے الزامات کے جواب میں معزز عدالت کی اجازت سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنے کاغذات میز پر رکھتے ہوئے سرکاری وکیل کو جیسے للکارا۔

''جناب عالی! سب سے پہلے میں معزز عدالت کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ فاضل وکیل نے اب تک میری مؤکلہ پر الزامات کے سلسلے میں صرف مفروضوں سے کام لیا ہے جیسا کہ فاضل وکیل نے خود اعتراف کیا ہے کہ اصل مجرم تک پہنچنے کے لیے پولیس کے پاس کوئی واضح شہادت موجود نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ آلۂ قتل موقع واردات سے دور خود مقتول ناصر بھٹی کے کمرے میں پایا گیا مگر پولیس کے پاس اب بھی کوئی واضح ثبوت نہیں ہے کہ یہ حرکت میری مؤکلہ کی ہے جبکہ پستول پر کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں ہیں اور اپنی مؤکلہ کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے میں معزز عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ میری مؤکلہ اتنی چالاک یا مضبوط اعصاب کی مالک نہیں ہے کہ وہ آلۂ قتل پر اپنے نشانات مٹانے کے بارے میں فیصلہ کرنا تو کجا سوچ بھی سکتی۔ الماری میں چند کپڑوں پر محض لپ اسٹک اور دانتوں کے نشان دیکھ کر پولیس

نے کسی عورت کے ملوث ہونے کا مفروضہ قائم کیا۔ مانا کہ لپ اسٹک عورتیں استعمال کرتی ہیں اور دانتوں کے نشانات خوفزدگی کے عالم میں کپڑوں پر ثبت ہوئے مگر یہ کہاں لازم آتا ہے کہ یہ میری ہی مؤکلہ کے ہیں جبکہ عین اس لمحے ایک اور عورت یعنی مقتولہ مسز تاج ملک بھی اسی کمرے میں موجود تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ نشان خود مقتولہ کے ہونٹوں اور دانتوں کا ہو جبکہ قاتل کو دیکھ کر اس پر یقیناً خوف کی حالت بھی طاری ہوگئی ہوگی۔“ اس نے بھرپور مدافعت کرتے ہوئے سرکاری وکیل کو فاتحانہ انداز میں دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے کمرائے عدالت پر گمبھیر سناٹا ساطاری ہوگیا۔

”میں معزز عدالت کی اجازت سے وکیلِ صفائی کو بتانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ضرور دیکھی ہوگی جس میں مقتولہ کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ دوم مقتولہ کی آنکھوں میں خوف کے بجائے حیرانی کی کیفیت پائی گئی ہے۔ فرض کیجیے مقتولہ کے ہونٹوں پر لپ اسٹک موجود ہوتی بھی تو الماری کے اندر کسی صورت بھی وہ نشان نہیں آسکتا تھا کیونکہ لاش الماری سے اتنی دور پائی گئی تھی کہ اس کا الماری تک پہنچنا ہی ناممکن تھا۔ کجا یہ کہ وہ الماری کے اندر داخل ہوتے ہوئے کھڑی ہو کر کپڑوں پر نشان چھوڑ سکتی۔ میں یہ بھی واضح کردوں کہ ملزمہ نادرہ اکرام کی انگلیوں کے نشان الماری کے دروازوں پر موجود ملے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے خوف زدگی کے عالم میں کپڑوں کی اس الماری میں پناہ لی تھی۔“ سرکاری وکیل نے اس کی دلیل کو کاٹنے کی کوشش کی۔

”تب بھی یہ لازم نہیں آتا کہ میری مؤکلہ کے وہ نشانات موقعِ واردات پر اس کی موجودگی ثابت کرتے ہیں، اس سے پہلے کے بھی ہوسکتے ہیں کیونکہ میری موکلہ اور مقتولہ کی بیٹی کشور بانو آپس میں گہری سہیلیاں رہی ہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی اپنی سہیلی سے ملنے وہاں جاتی رہی ہوگی۔ جیسا کہ ابھی ابھی میری موکلہ کے کمرائے عدالت میں داخلے پر محترمہ کشور بانو کا ردعمل مشاہدے میں آیا ہے بلکہ اسی مقدمے سے منسلک مقتول کے دائر کردہ اغوا کے مقدمے کی روشنی میں یہ عین ترین قیاس ہے کہ لپ اسٹک کا وہ نشان خود کشور بانو کے ہونٹوں کا ہو کیونکہ پولیس کو دیے گئے خود ان کے بیان کی روشنی میں ملزم تاج ملک نے جو اس وقت بھی کمرائے عدالت میں موجود ہے، اسی کمرے میں ان کی عصمت پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی......“ نادرہ اکرام کے وکیل نے اپنی موکلہ کو ابتدا ہی میں شک کا فائدہ پہنچانے کی غرض سے بڑی سپاٹ آواز میں عدالت کی توجہ دوسری طرف گھمادی اور پھر فاتحانہ انداز میں سرکاری وکیل، چہرہ جھکائے کشور اور متورم سی آنکھیں لیے اجمل کے باپ کو دیکھا۔ کمرے میں پھر گمبھیر سناٹا چھا گیا۔

”مجھے خوشی ہوگی اگر کشور بانو خود معزز عدالت کے سامنے اپنے اس بیان کی تردید کردیں۔“ لوہا گرم دیکھ کر اس نے دوسری چوٹ لگائی۔ کشور پر وکیلِ صفائی کے حملے کا اجمل کے باپ کی نسبت ردعمل زیادہ شدید تھا۔

”جنابِ عالی!“ سرکاری وکیل نے فوری مداخلت کی۔

”وکیل صفائی غیر ضروری طور پر حقائق کو دوسرا رنگ دینے کی کوشش کررہے ہیں جبکہ ملزمہ نہ تو ابھی تک کوئی بیان دے سکی ہے نہ ہی خود وکیل موصوف نے کوئی ایسی واقعاتی شہادت پیش کی ہے جس کی بنا پر ان کی دلیل کو من و عن تسلیم کرلیا جائے۔ سوال یہ نہیں کہ کیا ہوسکتا ہے سوال یہ ہے کہ واقعہ کیا پیش آیا ہے۔ حالات و واقعات کی منطقی سوچ کے نتیجے میں پولیس نے ملزمہ تک پہنچنے کا جو راستہ اختیار کیا، وہ آخر ملزمہ تک پہنچ گیا۔“ سرکاری وکیل کا لہجہ بڑا جارحانہ تھا۔

”وکیل موصوف اس بات کا کیا جواز پیش کریں گے کہ ملزمہ صرف اس وقت مقتول ناصر کے گھر میں داخل ہوئی جب مفروضہ قاتلہ کی گرفتاری کی خبر شائع ہوئے دس روز گزر چکے تھے اس لیے کہ اسے اطمینان ہوگیا تھا کہ پولیس اب اس کی طرف متوجہ نہیں ہوگی۔ اسی لیے وہ اپنی دانست میں جرم کا رہا سہا ثبوت بھی ان فرضی تصاویر کو حاصل کرکے ضائع کرنے کے لیے وہاں پہنچی کیونکہ مقتول کے چال چلن سے مکمل آگاہی کی بنا پر اسے اپنی عریاں تصاویر لیے جانے کا یقین تھا بلکہ یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ملزمہ کے پاس مقتول کے گھر کی چابی کی موجودگی مقتول کے ساتھ اس کے خاص تعلقات کی وجہ سے تھی۔“

”جنابِ عالی......!“ وکیلِ صفائی نے بات کاٹتے ہوئے جج سے احتجاجاً کہا۔ ”میں گزارش کروں گا کہ فاضل وکیل کی یہ دلیل ریکارڈ پر نہ لائی جائے جو میری مؤکلہ کے اخلاقی کردار پر حملے کے مترادف ہے۔“ جج نے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دونوں وکیلوں کو باری باری دیکھا۔

”کیا آپ ایسا نہ کرنے کی وجہ بیان کریں گے جبکہ سرکاری وکیل کا موقف ٹھوس شہادت پر مبنی ہے۔ ملزمہ کے قبضے میں مقتول کے گھر کی چابی کا آخر کیا جواز ہے؟“ جج نے اعتراض کیا۔

”جنابِ عالی!“ وکیلِ صفائی نے قدرے دھیمی آواز میں کہا۔ ”یہ اس طرح ممکن ہے کہ مقتول ناصر اور میری مؤکلہ کا شوہر نہ صرف آپس میں گہرے دوست تھے بلکہ یہ دوستی ان کے بچپن سے چلی آرہی تھی اور مقتول کے چال چلن کو دیکھتے

ہوئے یہ عین ممکن ہے کہ میری مؤکلہ اپنے شوہر کے کردار کے بارے میں جاننے کے لیے ہی ان فرضی تصاویر کی تلاش میں شوہر سے چابی چرا کر وہاں پہنچی ہو۔" اس کی اس دلیل میں پہلے جیسا دم خم نہیں تھا۔

"جب تک ملزمہ عدالت کے روبرو بیان دینے کے قابل نہ ہو، عدالت آپ کے ممکنات سے اتفاق نہیں کرسکتی۔" جج نے اپنا فیصلہ دے کر سرکاری وکیل کو اپنا بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ جواب میں سرکاری وکیل نے شکریہ ادا کیا۔ کشور نے بھی جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق اطمینان کا سانس لیا۔

"جنابِ عالی! وکیلِ صفائی خود مفروضوں کا سہارا لے کر حقائق کو الجھا رہے ہیں حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ پولیس نے ایک تو ملزمہ کی ذہنی حالت دوسرے اس وجہ سے اس سے حقائق معلوم کرنے کے لیے ابھی تک سختی سے کام نہیں لیا کہ ملزمہ دو تین ماہ کی امید سے ہے۔"

"کیا......؟" کشور اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے بے ساختہ بول اٹھی۔ جج سمیت تمام لوگوں نے چونک کر متغیر چہرے والی کشور کو دیکھا۔ سب کی نگاہوں میں یکساں سوالیہ نشان تھا جبکہ کشور خود کٹہرے میں کھڑی نادرہ کو گھورنے لگی تھی۔ یکایک نادرہ کے چہرے پر وحشت و ویرانی کی جگہ کرب و اذیت کی سیاہ گھٹا سی چھا گئی اور اس نے بڑے زخمی انداز میں کشور کو دیکھا۔ چند لمحوں بعد ہی تمام لوگوں کے ساتھ کشور کو اپنی "کیا" کا شدت سے احساس ہوا۔ گویا اس نے انتقاماً نادرہ کو "کیا" کی گولی کا نشانہ بنا دیا ہو۔ نادرہ کی درد و کرب میں ڈوبی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے وہ بری طرح پچھتانے لگی مگر لبوں سے نکلا ہوا "کیا" کا تیر اب واپس نہیں آسکتا تھا کیونکہ پوری عدالت اسے اس طرح دیکھ رہی تھی گویا اسی نے اعترافِ جرم کیا ہو۔

"آپ کو جو کچھ کہنا ہے گواہوں کے کٹہرے میں آکر کہیں۔" جج نے گمبھیر آواز میں سناٹے کو توڑتے ہوئے کشور کو ہدایت کی۔

"میں......میں......جناب......" وہ بری طرح ہکلا کر اپنی جگہ منجمد سی ہوگئی۔

"محترمہ! آپ کو جو کچھ کہنا ہے کٹہرے میں آکر کہیں۔" جج نے تحدیدی لہجے میں دہرایا تو اجمل کا ماموں لرزتی کانپتی کشور کو تھام کر گواہوں کے کٹہرے میں لے آیا۔

"حوصلہ رکھو بیٹی، سچائی کے مقابلے میں کسی رشتے کی پروا مت کرو۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کشور کو تسلی دی۔ جواب میں اس نے دزدیدہ نگاہوں سے نادرہ کو دیکھا جس کی جلتی چبھتی نگاہیں کشور کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

"جناب ...... نادرہ کا شوہر......"

"ہاں......ہاں، میں نے ناصر کو گولی ماری تھی ورنہ وہ مجھے اور میرے بچے کو مار دیتا۔" اچانک نادرہ ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی بیچ ہی میں بول پڑی اور پھر بے اختیار ہچکیاں لیتی ہوئی کٹہرے میں ڈھیر ہوگئی۔ کمرائے عدالت میں گہرا سکوت چھا گیا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

"آخر اس کے شوہر کے بارے میں تم ایسی کیا بات بتانے جارہی تھیں کہ شدید ردعمل کے طور پر اس نے جرم کا اعتراف تک کرلیا۔ ورنہ اس کا وکیل اسے صاف بچا لے جاتا۔" نادرہ کی حالت کے پیشِ نظر مقدمے کی نئی تاریخ ملنے کے بعد عدالت سے نکلتے ہی اجمل نے سرگوشی کی۔ کشور (صندل) نے نم نم سی آنکھوں سے ایک لمحے کے لیے اجمل کو دیکھا۔

"مجھے نہیں یاد کہ میں کیا کہنے جارہی تھی۔" اس نے چہرہ جھکا کر دبی آواز میں پہلو بچایا۔ دفورِ حیا سے اس کا چہرہ بھی تمتما سا گیا تھا۔ اجمل نے ایک لمحے کے لیے رک کر عجیب سی نشیلی نظروں سے اس کے تمتمائے ہوئے چہرے کو دیکھا اور سر ہلا کر خاموشی سے چلنے لگا۔

اجمل نے کمرا کھولا تو اسے لگا نادرہ کے اعترافِ جرم کا طوفان گویا وہیں سے ہو کر گزرا ہے۔ کم از کم وسیم کی ہر بکھری ہوئی چیز کچھ ایسا ہی منظر پیش کررہی تھی۔ دوسری نگاہ میں اسے اپنے بستر پر وسیم کا ایک سطری پرچہ نظر آیا۔

"میں اپنے گاؤں جارہا ہوں، شاید امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔" وہ ایک ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔

"جاؤ بھئی، خدا تمہارے والدین کو سلامت رکھے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اس کی بکھری ہوئی چیزیں سنبھالنے لگا۔

خلافِ توقع ایک ہی ہفتے بعد سوائے نادرہ کے وہ سب پھر کمرائے عدالت میں جمع تھے کیونکہ سرکاری وکیل نے نادرہ کے اس تحریری بیان کے ساتھ مکمل چالان پیش کردیا تھا جو اس نے از خود تیسرے ہی روز اپنے وکیل اور چند مخصوص گواہوں کی موجودگی میں اسپتال میں پولیس کو دیا تھا کیونکہ علیحدگی میں لیڈی ڈاکٹر نے پولیس انسپکٹر کو جتا دیا تھا کہ مریضہ کے چلنے پھرنے یا کوئی جذباتی دباؤ پڑنے سے حمل کے ساقط ہوجانے کا خطرہ ہے۔ اس لیے اسے عدالت کی حاضری سے مستثنیٰ رکھا جائے۔

نادرہ کے تحریری بیان کی ایک نقل کشور اور اجمل کے باپ کے وکیل کی درخواست پر انہیں فراہم کردی گئی تھی، اس کا بیان تھا۔

"میرا شوہر اکرام اور ناصر بچپن اور پھر کالج کے زمانے ہی سے گہرے اور راز دار دوست تھے۔ میرا شوہر اپنی کمزور

شخصیت کی وجہ سے ناصر کی چالاک فطرت کے دباؤ میں رہتا تھا۔ ناصر کے انکم ٹیکس کے ایک اچھے عہدے پر فائز ہونے کی بنا پر اس کی واقفیت اور تعلقات کے بل بوتے پر میرے شوہر نے اپنا بزنس قائم کرلیا تھا چونکہ میرے والد بھی ایک اوسط درجے کے کاروبار کے مالک تھے، اسی وجہ سے میرے شوہر کی میرے والد صاحب سے جان پہچان ہوگئی اور جیسا کہ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اپنے دوست ناصر کے ہی ایما پر میرے شوہر نے مجھ سے شادی کی تاکہ دونوں دوست بچپن ہی سے آزاد فطرت کے عادی ہونے کی بنا پر میری آڑ میں اپنی عیاشی کو جاری رکھ سکیں اور اپنی بگڑی ہوئی ایسی خواہشات کی تکمیل بھی کرسکیں جو کسی اور صورت ممکن نہیں تھی۔ میں نے پہلی ہی ملاقات میں ناصر کے چال چلن کو بھانپ کر اپنے شوہر کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی اور دونوں دوستوں کی بے تکلفی کے باوجود ناصر کو بھی اپنے گھر میں خوشی سے خوش آمدید نہیں کہا۔ بدقسمتی سے دو سالہ شادی شدہ زندگی میں میری گود ہری نہ ہوئی جبکہ دوسری جانب میں ان کے درمیان دیوار بھی بن گئی تھی تو میرے شوہر نے مجھے بنجر چٹان کے طعنے کے ساتھ جھگڑنا بھی شروع کردیا۔ تنگ آکر میں نے دونوں کے ڈاکٹری معائنے پر زور دیا جس کا نتیجہ میرے شوہر کے لیے شرمندگی اور میرے لیے اذیت کا باعث بنا کیونکہ میرا شوہر ہی باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ میں نے دونوں کی عزت کی خاطر چپ سادھ لی مگر میرے شوہر نے اس راز میں ناصر کو بھی شریک کرلیا تو وہ جارحانہ انداز میں.... بے تکلفی سے ہمارے گھر آنے لگا۔ اس کے ہر انداز میں میرے لیے یا تو ترغیب ہوتی یا طعنہ۔ اس اذیت سے بچنے کے لیے میں نے باتوں باتوں میں ناصر کو شادی کا مشورہ دے ڈالا تاکہ میرے گھر اس کا آنا جانا بند نہیں تو کم ضرور ہوجائے کیونکہ میرا شوہر تو اس کا غلام نظر آتا تھا مگر ایک ہی ہفتے بعد میں یہ سن کر سکتے کی سی حالت میں رہ گئی کہ وہ نہ صرف دو روز بعد گھر بسانے والا ہے بلکہ اس کی دلہن کے استقبال کا سارا انتظام بھی مجھے ہی کرنا ہے۔ یہ جان کر تو اور بھی دکھ ہوا کہ وہ ایک ایسی عورت کی بیٹی سے شادی کررہا ہے جو خود اس کی آشنا ہے۔ شادی سے پہلے ناصر دو ایک دفعہ کشور کی ماں کو میرے گھر بھی لایا تھا اور ایک رات میرے گھر میں بھی گزاری تھی۔ جیسی ماں ویسی بیٹی کے مفروضے پر کشور کے بارے میں میرا خیال کچھ اچھا نہیں تھا مگر دلہن کے روپ میں اس کا استقبال کرنے پر وہ مجھے بے حد مظلوم اور معصوم دکھائی دی اور اس وقت تو میں اسے بے اختیار گود میں بھر کر تسلی دینے پر مجبور ہوگئی جب تھوڑی سی تنہائی ملنے پر کشور میرے سینے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی کیونکہ وہ اپنی ماں اور شوہر کے تعلقات سے بخوبی آگاہ تھی اور اسے احساس تھا کہ وہ قربانی کا بکرا بن گئی ہے۔ میں نے ازراہِ ہمدردی اس کے کسی محبوب کے بارے میں جاننا چاہا جو اسے اس مشکل سے نکالنے میں مدد کرسکے مگر مجھے یہ جان کر شرمندگی اور اپنی.... بے وقوفی کا احساس ہوا کہ وہ سرے ہی سے محبوب کے تصور سے ناآشنا تھی۔ کشور کی موجودگی کی وجہ سے جہاں میرا ڈر ختم ہوا وہیں ناصر کی طرف سے کھنچاؤ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ حتیٰ کہ جب کشور گھر کے کام میں مصروف ہوتی، میں چند منٹ کی تنہائی میں ناصر سے کھل کر باتیں بھی کرنے لگی۔ اس طرح میرے اور ناصر کے درمیان خود اپنا پیدا کردہ فاصلہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ ایک سال میں، میں اس پر اعتماد کرنے لگی جبکہ کشور بھی بے تکلفی سے اپنی اس پریشانی کا اظہار کرنے لگی کہ ابھی اس کے ماں بننے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔

”میرے اعتماد کی بے تکلفی، کشور کی محرومی اور میرے شوہر کی کمزوری سے شہ پاکر آخر ناصر نے ایک دن تنہائی میں یہ کہہ کر اپنا پرانا کھیل پھر سے شروع کردیا کہ میں اپنے ناکارہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کرکے اس سے شادی کرلوں اور اگر میں ایسا نہ کرسکوں تو اپنی خواہش کی تکمیل اور گھر کی عزت کی خاطر اس کی محبوبہ بن جاؤں۔ اس نے یہ انکشاف کرکے مجھے انگاروں پر گھسیٹ لیا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے پیار کرنے لگا تھا اور مجھے قریب لانے کے لیے ہی اس نے کشور کو میرے لیے چارے کے طور استعمال کیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے یہ بتا کر اور بھی اپنے شوہر سے متنفر کردیا کہ دونوں دوست ایک مشترکہ بیوی پر بھی متفق ہیں کیونکہ وہ شروع ہی سے اکٹھے عیاشی کرتے رہے ہیں۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ بیک وقت بے بسی، مجبوری اور انتقام کے جذبوں نے مجھے نڈھال کردیا۔ میں کشور کو کچھ بھی بتا کر اس سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن میں ایک ایسے چوراہے پر کھڑی تھی جہاں چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میں نے ناصر ایسے شیطان شخص کے گھر نہ جانے کا تہیہ کرلیا تو پندرھویں روز کشور خود میرے پاس پہنچ گئی۔ وہ خود بھی بے حد پریشان تھی۔ اسے دیکھ کر میں اتنی بے قابو ہوئی کہ میں نے اسے سب کچھ بتادیا مگر اس کا انجام میری آج کی تباہی کی صورت میں نکلا کیونکہ کشور نے چند روز میں طلاق حاصل کرلی اور تنہائی کی بنا پر مجھے مستقبل زیادہ تاریک نظر آنے لگا۔ اسی دن ناصر پریشانی کی حالت میں مجھے سب بتانے آیا تو مجھے تاریکی میں ایک کرن نظر آئی۔ میں نے اسے تجویز پیش کی کہ اگر وہ مجھے اپنے دوست سے طلاق دلوادے تو میں اس سے شادی کرلوں گی مگر اس نے حامی اس شرط پر بھری

کہ طلاق کے بعد بھی میں اس وقت تک اپنے شوہر کے گھر رہوں جب تک موجودہ حالات قابو میں نہیں آجاتے۔ میں کچھ اس درجہ دل برداشتہ اور مایوس تھی کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے اس کی بات مان لی۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک اور شدید دھچکا پہنچا کہ ناصر کی تجویز سنتے ہی میرے شوہر نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر یہ کہتے ہوئے کاپی کے ایک سادہ ورق پر طلاق نامہ گھسیٹ دیا کہ ایسا کرنے کے لیے وہ اب تک میری رضامندی کا منتظر تھا بلکہ وہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ آزاد تعلقات سے زندگی اور رنگین ہوجائے گی اور یہ سوچ کر کہ میں کہیں اس کے جال سے آزاد نہ ہوجاؤں، ناصر ہمیں اپنے گھر لے گیا اور دو گھنٹوں کے اندر اندر اس نے مجھ سے شادی کا ڈھونگ رچالیا۔ دوسرے روز اس نے گھر کی چابی میرے حوالے کرتے ہوئے ہدایت کی کہ میں صرف رات کے وقت وہ بھی برقع اوڑھ کر اس کے پاس جایا کروں۔ میں اس کی ہدایت پر عمل کرنے پر مجبور تھی لیکن ایک ماہ پیشتر اپنے شوہر ناصر کی درج کروائی ہوئی کشور کے اغوا کی رپورٹ کی خبر نے میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکا دی کیونکہ اب میں ماں بننے والی تھی۔ میرے استفسار پر ناصر نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا کہ کشور کی ماں خود کشور کو اس کے حوالے کرنے پر آمادہ ہے تو وہ بھلا انکار کیوں کرے...... جبکہ وہ پہلے بھی کشور کو طلاق دینے پر آمادہ نہیں تھا کیونکہ اس کی ماں نے دھمکی کے ذریعے اس سے طلاق حاصل کی تھی، جب میں نے اسے اس حرکت سے باز رکھنے کے لیے سب لوگوں کو موجودہ حالات بتادینے کی دھمکی دی تو اس نے بڑی رکھائی سے مجھے احساس دلایا کہ میں چوہیا کی طرح اس کے مضبوط پنجرے میں بند ہوں کیونکہ طلاق نامے کے ساتھ میرا نیا نکاح نامہ بھی اسی کے پاس ہے اور میں کسی طرح یہ ثابت نہیں کرسکتی کہ مجھے اکرام سے طلاق بھی ملی ہے اور ناصر کے ساتھ شادی بھی ہوئی ہے جبکہ میں ابھی تک اپنے سابقہ شوہر کے گھر میں رہ رہی تھی جو وہاں صرف دن میں محلے والوں کو اپنی شکل دکھانے آتا تھا جبکہ رات میں، میں اپنے شوہر کے پاس چلی جاتی تھی۔ اس نے محلے میں مشہور کر رکھا تھا کہ دراصل میں ہی اس کی بیوی کشور ہوں جو اپنی ماں اور شوہر کے درمیان جھگڑے کی بنا پر ماں سے چوری چھپے اپنے شوہر کے پاس آتی ہوں۔ ناصر نے مجھے یہ بھی جتادیا کہ اگر میں نے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی تو وہ یہ مشہور کردے گا کہ میرا سابقہ شوہر باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہے پھر میں ماں کیسے بن سکتی ہوں جبکہ میں ابھی تک اسی کے گھر میں رہ رہی تھی۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ لے دے کر ایک ہی راستہ تھا کہ کسی طرح کشور کی ماں کو ہی اس سودے بازی سے باز رکھا جائے۔ اسی لیے میں نے اپنے اور کشور کے بچاؤ کے لیے کشور کی ماں سے ملنا ضروری سمجھا تاکہ میں اس کے علم میں یہ حقیقت لے آؤں کہ اب ناصر میرا شوہر ہے اور میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں جبکہ میں یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ کشور کی ماں ایسا کرنے پر کیوں آمادہ ہوئی ہے۔

”ڈھونڈتی ڈھونڈتی آخر میں اس محلے میں پہنچی اور اجمل ملک کا نام لے کر پان والے سے گھر کا پتا پوچھا کیونکہ خبر کی وجہ سے یہ نام میرے ذہن میں رہ گیا تھا۔ اسی دکان پر میرا برقع بھی جلا۔ شام کا جھٹ پٹا پھیل گیا تھا جب میں نے کشور کی ماں کے گھر پر دستک دی۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھتی ہوئی یہ سمجھی شاید میں اس کی بیٹی کے اغوا کے سلسلے میں ہمدردی کرنے آگئی ہوں۔ اس لیے اس کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا تھا مگر جب میں نے ناصر کا ذکر کیا تو اس کی پیشانی پر اور بھی شکنیں پڑگئیں۔ اس نے بڑے روکھے لہجے میں بتایا کہ ناصر اور اس کے درمیان ٹانگ پھنسانے والی میں کون ہوں۔ جواب میں، میں نے جب اسے ساری حقیقت بتائی تو اس کے رویے میں ایک دم تبدیلی آگئی لہٰذا تفصیل سے ساری بات سننے کے لیے اس نے مجھے کھانے کے لیے روک لیا۔ اس طرح رات کے نو بج گئے جبکہ مجھے تیار ہو کر رات دس بجے تک ناصر کے پاس پہنچ جانا چاہیے تھا کیونکہ دس بجے تک ناصر کے پاس پہنچنا میرا معمول تھا اور پھر ان واقعات کی ابتدا ہوگئی جس کا مجھے یا کشور کی ماں کو خواب وخیال تک نہ تھا۔ دیر ہونے کی بنا پر میں گھر جاکر تیار ہوتے ہوتے وقت پر ناصر کے پاس نہیں پہنچ سکتی تھی اس لیے اپنی حالت درست کرنے کے لیے کشور کی ماں سے ذرا سا میک اپ کرنے کی اجازت لے کر ابھی اپنے ہونٹوں پر بمشکل لپ اسٹک ہی لگا پائی تھی کہ دروازے پر آہستگی سے دستک ہوئی جسے سن کر کشور کی ماں کا چہرہ ایک دم اتر گیا۔ اس نے دبی سرگوشی میں مجھے ناصر کی آمد کی اطلاع دی کیونکہ وہ اس کی دستک کا انداز پہچانتی تھی۔ میری حالت اس سے بھی بری ہوگئی۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں جاکر دروازہ بند کرلینے کی ہدایت دیتے ہوئے خود دروازہ کھولنے چل دی مگر مجھے سنبھلنے میں دو ایک منٹ لگ گئے اس لیے جب تک میں دروازے تک پہنچتی، دونوں کی سرگوشی سنائی دی۔ کمرے میں کپڑوں کی قدآدم الماری کے سوا چھپنے کی اور کوئی جگہ دکھائی نہ دی تو میں نے الٹے قدموں تیزی سے واپس ہوتے ہوئے اپنے برقع کا اوپری حصہ سمیٹتے ہوئے اس الماری میں چھپ گئی مگر اس کی چوڑائی اتنی کم تھی کہ میں اسے پوری طرح بند نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے میں نے حتی الامکان اپنے آپ کو سمیٹ کر مکمل طور پر چھپنے کے لیے اپنے اور جھری کے درمیان

کپڑے پھیلالیے، ہینگر سے پتلون کھینچ کر اپنے پاؤں تک لٹکاتے ہوئے میں نے پاؤں چھپانے کی بھی پوری کوشش کی۔

"وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کی بے وقت آمد پر ناراضی کا اظہار کررہی تھی۔ جواب میں ناصر نے اسے جتایا کہ وہ اسے ہمیشہ اسی وقت بلاتی رہی ہے یا خود اس کے پاس آتی رہی ہے پھر اس نے ناصر کی آمد کا مقصد پوچھا تو ناصر کے جواب سے مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا کہ کشور کی ماں نے ہی اپنی بیٹی اور خاص کر اپنے سوتیلے بیٹے اجمل سے انتقام لینے کے لیے ناصر کو اس لالچ پر اغوا کا مقدمہ درج کروانے پر آمادہ کیا تھا کہ طلاق نامے کے ساتھ کشور کو بھی اس کے حوالے کردے گی۔ اس لیے اس وقت وہ حفظِ ماتقدم اور یقین دہانی کے طور پر اپنا لکھا ہوا طلاق نامہ حاصل کرنے آیا تھا تاکہ دو دن کے بعد عدالت میں پیش ہوتے وقت اس کے جھوٹا ہونے کا خدشہ باقی نہ رہے۔

"طلاق نامہ تو کشور کی کنجی ہے، وہی تمہارے حوالے کردیا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اجمل کا کانٹا بھی نکل جائے گا؟" اس کی ماں نے بڑی رکھائی سے پوچھا تو وہ بہت جز بز ہوا اور اسے یقین دلانے لگا کہ اغوا ثابت ہونے پر اجمل سلاخوں کے پیچھے ہوگا مگر اس کی ماں نے یہ کہہ کر طلاق نامہ دینے سے انکار کردیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چند دن جیل میں بند رہے گا اور پھر اپنے وسیع اثر رسوخ سے کام لے کر اس کا باپ فوری طور پر ضمانت پر رہا کروالے گا لہٰذا پیشی سے پہلے ہی ناصر اسے اس طرح مستقل طور پر راستے سے ہٹادے کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ وہ اسی وقت طلاق نامہ اس کے حوالے کردے گی مگر ناصر اس کے ساتھ گزارے ہوئے انتہائی جذباتی وقت کی باتیں دہراتے ہوئے تکرار کرنے لگا کہ کشور کی ماں نے اس کے سامنے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ بس وہ اپنی بیٹی اور اجمل کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔

"مجھے بھی اس وقت علم نہیں تھا کہ تم نے اپنے ہی دوست کی بیوی پر ہاتھ صاف کرکے اپنے بچے کی ماں بھی بنادیا۔" کشور کی ماں نے بڑے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو ناصر غصے سے سرخ ہوگیا اور اس نے قسم کھا کر اس کی ماں کو یقین دلایا کہ وہ اسی وقت گھر جاکر مجھے سیر کے بہانے کسی سنسان جگہ لے جاکر کسی خطرناک موڑ پر چلتی ہوئی اپنی گاڑی سے اس طرح دھکا دے کر ہلاک کردے گا کہ یہ محض حادثہ سمجھا جائے۔ اس کے اس ارادے پر میں خوف سے کپکپانے لگی۔ کشور کی ماں نے بڑے طنز سے اسے پہلے اجمل کو ختم کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ لالچ بھی دیا کہ سوتیلے بیٹے کا کانٹا نکل جانے کے بعد وہ اپنے شوہر کی دولت میں سے بھی اسے اتنا دے دے گی کہ وہ کشور جیسی دس عورتیں خرید کر راجا اندر کی سی زندگی بسر کرسکے گا۔ جواب میں ناصر نے اچانک پستول نکال کر دھمکی آمیز انداز میں طلاق نامہ اس کے حوالے کرنے پر اصرار کیا تاکہ وہ موجودہ مقدمے کی مصیبت سے نکل سکے تو اس کی ماں نے اس کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے اجمل کو ٹھکانے لگانے پر تکرار کی اور ابھی وہ اسے دولت کا لالچ دے ہی رہی تھی کہ ایک دھماکا سا ہوا۔ وہ کراہ کر جھک ہی رہی تھی کہ دوسرا دھماکا ہوا اور وہ تڑپ کر ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی۔ ردعمل میں، میں نے اپنی دہشت زدہ چیخ روکنے کے لیے بے اختیار اپنے سامنے لٹکے کپڑوں کو دانتوں میں دبالیا تو بھی میری گھٹی گھٹی سی چیخ کی آواز نکل گئی اور ناصر ایک دم الماری کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کی آنکھیں خون ہورہی تھیں۔ اس نے کشور کی ماں کے سینے میں گولی ماردی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ الماری کی طرف قدم اٹھاتا کشور کی ماں بے جان ہوکر اس پر گری اور ناصر کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر الماری کے پاس میرے قدموں میں آرہا۔ خوف و دہشت کے شدید عالم میں، میں نے اسی لمحے پستول اٹھایا اور اپنی جانب پشت کیے جھک کر کشور کی مردہ ماں کو زمین پر ڈالتے ہوئے ناصر کی پیٹھ میں گولی اتار دی۔ اس حالت میں مجھے کوئی ہوش نہیں تھا کہ میں کیا کررہی ہوں۔ وہ ایک گھٹی ہوئی کراہ کے ساتھ کشور کی ماں کے ساتھ ہی گر پڑا۔ ساتھ ہی کمرے میں بجلی بند ہوگئی۔ شاید کسی نے باہر سے مین سوئچ بند کردیا تھا۔ ردعمل میں، میں اس کمرے سے نکلنے کے لیے بری طرح مضطرب ہوگئی۔ لاشعوری طور پر میں نے پستول اپنے گریبان میں اڑس لیا۔ کیوں...... میں نہیں جانتی پھر تیزی سے میں الماری سے دروازے کی اوٹ میں آگئی۔

"جونہی کوئی اندر آیا میں دبے قدموں کمرے سے نکل کر باہر کے دروازے کے پاس بنی سیڑھیوں کے نیچے دبک گئی۔ دو ہی منٹ بعد باہر کا دروازہ کھلا اور دروازہ بند کیے بغیر کوئی تیزی سے میرے پاس سے گزرتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ موقع غنیمت دیکھ کر میں بھی باہر نکل آئی۔ گلی سنسان پڑی تھی کیونکہ گولیوں کی پے در پے آوازوں سے سہم کر آس پڑوس کے لوگ گلی میں نہیں آئے تھے۔ میں تیزی سے پان والے کی مخالف سمت دوسری گلی کی طرف چل دی۔ حواس معطل تھے اور میری ٹانگیں بری طرح کپکپارہی تھیں۔ دوسری گلی پار کرلینے کے بعد مجھے اپنے گریبان میں پہلی مرتبہ پستول کا وزن محسوس ہوا۔ جوں جوں اس منحوس گھر سے دور ہورہی تھی، ہوش میں آنے کے بعد توں توں مجھ پر دہشت سوار ہوتی جارہی تھی۔ کشور کی ماں کی تڑپتی ہوئی لاش کے ساتھ مجھے اس بات کا بھی تھوڑا سا احساس ہورہا تھا کہ میں نے پستول چلایا ہے لیکن ناصر

کے مرجانے کا احساس تک نہیں تھا۔ تیسری گلی کے نکڑ پر بڑی سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے پتھر پر کپکپاتا ہوا پاؤں پڑتے ہی میں گر گئی۔ تو سامنے سے گزرتے ہوئے رکشے والے نے مجھے گرتے دیکھ کر تیزی سے رکشا روکا اور مجھے سہارا دے کر رکشے میں سوار کروا کر ناصر کے گھر کے قریب چھوڑ دیا۔ اس دوران میرے لبوں سے بے اختیار سسکیاں نکلنے کی بنا پر رکشے والے کو صرف یہ گمان گزرا کہ میرے پاؤں میں بہت زیادہ موچ آ گئی ہے۔ گو وہ مجھے گھر کے دروازے پر اتارنے کے لیے اصرار کر رہا تھا مگر میں نے اسے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ میرا گھر بہت دور ہے۔ یہاں میں اپنی سہیلی سے ملنے آئی ہوں جس کا میاں اپنی گاڑی میں مجھے گھر چھوڑ آئے گا۔ اس طرح میں نے بالکل لاشعوری طور پر ناصر کے گھر کا دروازہ کھولا برقع کے پلو سے پستول پکڑ کر گریبان سے نکالا اور میز کی جو بھی دراز میرے سامنے آئی، اس میں ڈال دیا۔ پوری طرح حواس میں آنے کے بعد مجھے پہلی مرتبہ حالات کی سنگینی کا احساس ہوا اور یہ کہ میں ان واقعات کا حصہ بن چکی ہوں جبکہ یہ بھی احساس ہوا کہ انگلیوں کے نشانات کی مدد سے پولیس فوراً مجرم کی شناخت کر لیتی ہے۔ میں نے برقع کی مدد سے پستول صاف کر دیا اور وہاں سے سیدھی اپنے سابقہ شوہر کے گھر پہنچی جو اتفاقاً موجود تھا۔ اپنی بے اختیار ہچکیوں کے درمیان جونہی میں نے اسے تمام واقعہ سنایا، وہ مجھے انتظار کرنے کا کہہ کر اس طرح غائب ہوا کہ میں نے اب تک اس کی شکل نہیں دیکھی۔

''دو روز تک نیم پاگل سی حالت میں رہنے کے بعد میں نے کچھ کھانا زہر مار کیا تو میں اپنے شوہر ناصر کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو گئی مگر باہر جانے کی مجھ میں نہ ہمت تھی نہ حوصلہ۔ میں نے بڑی مشکل سے پڑوس کے بچے سے پچھلے دو تین روز کے اخبارات منگوائے جن سے مجھے کشور کی ماں کے ساتھ ناصر کی موت کا بھی علم ہوا اور دونوں باپ بیٹے کی گرفتاری کا بھی۔ ناصر کی موت پر میرے دل و دماغ میں ایک اور خوف ناک جنگ شروع ہو گئی۔ میں تین ماہ کی امید سے تھی جبکہ میرا شوہر ناصر مر چکا تھا مگر میرے پاس نہ طلاق کا ثبوت تھا، نہ ناصر سے شادی کا ثبوت۔ جان سے زیادہ عزت کا خوف مجھے گھن کی طرح چاٹنے لگا لیکن ناصر کے گھر جانے کی ہمت نہیں ہوئی ..... سب سے زیادہ مجھے یہ سوچ کھائے جا رہی تھی کہ اگر میں پکڑی گئی تو اپنے ہونے والے بچے کے باپ کا کیا ثبوت پیش کر سکوں گی۔ سابقہ شوہر کا نام لینے سے مجھے اس کی طرف سے تردید کیے جانے کا یقین تھا کیونکہ وہ اپنی گردن بچانے کے لیے میرا کسی صورت ساتھ نہ دیتا ورنہ وہ ایک دم غائب ہی کیوں ہوتا۔ بالفرض دیتا بھی تو کسی نہ کسی مرحلے پر وہ ڈاکٹر اس بات کی تردید کر دیتا جس نے ہم دونوں کا معائنہ کیا تھا۔

''فرضی قاتلہ کے پکڑے جانے کی خبر سے مجھے کچھ تسلی اور حوصلہ ملا اور میں مجبوراً طلاق نامہ اور نکاح نامہ ڈھونڈنے اپنے شوہر کے گھر پہنچی۔ مجھے اس بات کا تصور بھی نہیں تھا کہ یہ خبر جھوٹی ہے اور صرف مجھ تک پہنچنے کے لیے پولیس نے یہ جال پھیلایا ہے مگر میں اپنی عزت بچانے کی خاطر ایک ننھی سی چوہیا کی طرح اس جال میں پھنس گئی ہوں۔ مجھے قانون جو بھی چاہے سزا دے مگر میری صرف ایک درخواست ہے کہ وہ میرے مرحوم شوہر ناصر کے گھر سے طلاق نامے کے ساتھ نکاح نامہ بھی ڈھونڈ دے تاکہ مرتے وقت مجھے سکون رہے کہ دنیا میرے ہونے والے بچے کو ناجائز اولاد سمجھ کر اس پر تھوکتی نہیں رہے گی۔

بدنصیب نادرہ ناصر!''

''تحریری بیان کے خاتمے پر کئی گواہوں کے دستخطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملزمہ نے بغیر کسی جبر کے اپنی مرضی سے بیان دیا ہے کیا سرکاری وکیل کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟'' جج نے تمام بیان کا مطالعہ کرنے کے بعد گہری خاموشی کو توڑا۔

''جی جناب عالی!'' اس نے قدرے کندھے اچکا کر وکیلِ صفائی کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ ملزمہ کے بیان میں واقعات کا ربط اور تسلسل ملزم تاج ملک اور اس کے بیٹے اجمل ملک کے ابتدائی بیان میں کچھ باتوں کے مطابق بھی ہے لیکن ملزمہ کے پورے بیان کو اس وقت تک من و عن تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ طلاق نامے اور نکاح نامے کی بنیادی دستاویز دستیاب نہیں ہو جاتیں یا بقول ملزمہ کے اس کا سابقہ شوہر عدالت میں حاضر ہو کر ان دونوں بنیادی باتوں کی تصدیق نہیں کر دیتا کیونکہ ملزمہ کو اپنی گرفتاری تک سوچ بچار کے لیے کافی وقت ملا اس لیے ملزمہ کے بیان کو ایک عمدہ کہانی سمجھا جا سکتا ہے جو اس نے اپنے آپ کو قانون کی نظروں میں مظلوم ظاہر کرنے کے لیے گھڑی ہے تاکہ جہاں وہ اپنے جرم کی شدت کو گھٹا سکے، وہیں وہ اپنے ہونے والے بچے کے باپ پر پردہ بھی ڈال سکے۔ اس لیے میں معزز عدالت سے مقتول ناصر بھٹی کے گھر کی مکمل تلاشی کے وارنٹ جاری کرنے کی درخواست کے ساتھ ہی ملزمہ کے سابق شوہر کی تلاش کے وارنٹ جاری کرنے کی بھی درخواست کرتا ہوں۔''

''جناب عالی!'' اچانک وکیل صفائی جج سے مخاطب ہوا۔ ''میں عدالت کی اجازت سے فاضل سرکاری وکیل کے اپنی مؤکلہ کے اخلاقی کردار پر بار بار حملے پر احتجاج کرتا ہوں کیونکہ میری مؤکلہ نے اپنے بیان کا ایک ایک لفظ ایک مجبور اور مظلوم

عورت کے روحانی کرب کی سچائی میں ڈوب کر ادا کیا ہے۔اس نے بغیر ہچکچاہٹ و جبر جس تسلسل سے واقعات بیان کیے ہیں، وہ اس پر بیتے ہوئے ظلم و ستم کی سچائی کا منہ بولتا ثبوت ہے ورنہ اس بیان میں کہیں نہ کہیں جھول ہوتا اور کچھ نہیں تو ملزم تاج ملک کے بیان ہی سے اختلاف ہوتا جو اس نے اپنی بریت کے ثبوت میں دیا ہے۔وہ مقتول اور مقتولہ کے لبوں سے ادا کیے ہوئے الفاظ سن کر اتنا مشتعل ہوا کہ اس نے بے اختیار اپنی بیوی پر پستول جھونک مارا۔ بیان کی روشنی میں میری مؤکلہ نے دراصل حفاظت خود اختیاری کا حق استعمال کیا ہے ورنہ مقتول ناصر مقتولہ کی طرح میری مؤکلہ کو بھی ہلاک کر دیتا اور پولیس کو ناصر کی جگہ بالکل ہی ایک غیر متعلقہ عورت کی لاش ملتی اس لیے میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ملزم تاج ملک کو ایک دفعہ پھر مکمل بیان دینے کا حکم دے جس میں میری مؤکلہ کو مقتول کی طرف سے دی گئی دھمکی کی خاص طور پر تصدیق یا تردید بھی کرے۔ میں ملزم تاج ملک کو معزز عدالت کی اجازت سے اس بات کا احساس دلانا چاہتا ہوں کہ اس کی تردید یا تصدیق پر ایک بے انتہا مظلوم اور حالات کی چکی میں پسی ہوئی عورت کی زندگی کا دارومدار ہے۔ میں معزز عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ملزم تاج ملک یاد کر کے مقتول کی دھمکی کا مفہوم یا اس کے قریب ترین الفاظ دہرا سکے تو میری مؤکلہ قتل عمد کے جرم میں ملوث نظر نہیں آئے گی۔'' وہ سانس لینے کے لیے چند لمحوں کے لیے ٹھہرا تا کہ جج اور سرکاری وکیل کا ردعمل بھی دیکھ سکے۔

''چونکہ ملزم تاج ملک میری مؤکلہ کے تحریری بیان سے ابھی تک لاعلم ہے اس لیے اس کی گواہی یقینی طور پر عینی شہادت ہوگی کیونکہ ایک ہی واقعے کے کئی شاہد اسے بے شک اپنے اپنے انداز میں بیان کریں مگر واقعے کی بنیادی سچائی میں ذرہ بھر فرق نہیں ہوگا اور قانون اسی بنیادی سچائی کو تلاش کرتا ہے۔'' اس کا انداز بڑا جوشیلا اور لہجہ ٹھوس تھا۔

''میں فاضل سرکاری وکیل کی اس تجویز سے پوری طرح متفق ہوں کہ مقتول ناصر بھٹی کے گھر کی مکمل تلاشی لی جائے تا کہ میری مؤکلہ کے بیان کی نہ صرف تصدیق ہو سکے بلکہ اس کے پیٹ میں پرورش پانے والی ایک معصوم اور بے گناہ ننھی سی جان کا دنیا میں آنے سے پہلے ہی مستقبل بھی تاریک نہ ہو۔'' اس نے اپنا بیان ختم کر کے تمتمائے چہرے سے تمام کمرے پر نظر ڈالی لہٰذا اجمل کے باپ نے الفاظ کے ذرا سے اختلاف کے ساتھ مقتول ناصر کی دھمکی کی تصدیق کی جو اس نے خود سنی تھی۔ اغوا کی اس خبر نے اسے بھی اپنی بیوی (کشور کی ماں) کی طرف متوجہ کیا تھا جسے پڑھ کر نادرہ بھی اس کی ماں سے ملنے پر مجبور ہوئی۔ اسی لیے تاج ملک نے اپنی بیوی کی نگرانی شروع کر دی اور پان فروش کو اپنے گھر پر آنے جانے والے پر نظر رکھنے کو کہا۔ اسی سے نادرہ کی آمد کی اطلاع بھی اسے ملی تھی اور وہ سمجھا تھا کہ ماں بیٹی مل کر اس کے اور اس کے بیٹے کے خلاف سازش کر رہی ہیں اور اس کا سابقہ داماد ناصر ان کی پشت پناہی کر رہا ہے۔اس نے کشور کا طلاق نامہ دیکھنے کے بعد ہی شادی کے ساتھ اسے پناہ دینے کی ہامی بھری تھی۔اس دن پان فروش نے ہی اسے ناصر کی آمد کی اطلاع بھی دی تھی اور وہ چند منٹ بعد دبے قدموں اندر آ کر دونوں کی گفتگو سننے لگا تھا۔گولی چلانے کے بعد بجلی کا مین سوئچ بھی اسی نے بند کیا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ واپس آ کر دروازہ باہر سے بند کر دیتا، اسے یکے بعد دیگرے دو گولیوں کے چلنے کی آواز سنائی دی اور وہ صورتِ حال جاننے کے لیے اندھا دھند اندر داخل ہو گیا مگر گھبراہٹ اور اندھیرے کی بنا پر نادرہ کو کمرے سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھ سکا۔

''جنابِ عالی! ملزم تاج ملک کے بیان سے مقتول کے مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کی وجہ بھی اب پوری طرح سمجھ میں آتی ہے کہ اصرار کے باوجود مقتولہ کا طلاق نامہ حوالے کرنے کے انکار کے ساتھ ہی جب ملزم نے گولی چلا کر اپنی بیوی کو زخمی کیا تو مقتول ناصر اسے یقیناً اپنے خلاف دونوں ماں بیٹی کی سازش سمجھا ہوگا جو مقتولہ نے انتقام لینے کے لیے اس کے ساتھ چلی اور انتقامی طور پر اس نے بے دریغ مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔یوں دہرے قتل کا یہ معما اب بالکل صاف ہو گیا ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ معزز عدالت ان تمام حقائق و شواہد کی روشنی میں میری مؤکلہ کے لیے فیصلہ صادر کرے گی۔'' وکیل صفائی نے ملزم تاج ملک کے بیان کے فوری بعد لوہا گرم دیکھ کر آخری چوٹ بھی لگا دی۔

عدالت کے احاطے کے ایک سنسان سے کونے میں کھڑی صندل دل ہی دل میں نادرہ کے لیے اپنے دل میں بے انتہا درد محسوس کر رہی تھی کہ ایک آٹھ نو سال کا بچہ دیہاتی وضع کی پیوند لگی قمیص مگر دھلی ہوئی شلوار پہنے جھجکتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اجمل اپنے ماموں کے ساتھ کسی عدالتی دفتر میں چلا گیا تھا۔

''آپ کو میری امی بلاتی ہے۔'' بچے نے اجڈ دیہاتی لہجے میں سہمے سہمے انداز میں شرما کر کہا۔صندل نے چونک کر دھڑکتے دل سے بچے کو دیکھا کیونکہ ایسی جگہ جہاں اس کے چاروں طرف پولیس، ہتھکڑیاں پہنے مجرموں اور ان کے رشتے داروں کے ویران اور وحشت زدہ چہرے بکھرے ہوئے تھے، اس طرح کسی بالکل اجنبی بچے کے مخاطب کیے جانے پر اس کا ڈر جانا بالکل فطری امر تھا۔اس نے سر سے پاؤں تک بچے کو

دیکھا جس نے اپنے گندے پاؤں میں اسفنج کی ٹوٹی پھوٹی چپل بڑی مشکل سے پھنسا رکھی تھی۔ آنکھ جھپک کر اس نے پھر بچے کو گھورا اور پھر گھورتی ہی چلی گئی۔ بچہ معصوم سی سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بے انتہا تذبذب کے عالم میں اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔

''تم کون ہو بیٹے؟'' اس کا دل الفاظ کی صورت میں بچے پر لپکا۔

''وہ......وہ......امی بلاتی ہے۔'' بچہ بری طرح گھبرا کر ہکلایا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ اور کہتی، وہ جلدی سے گھوم کر بھاگ اٹھا۔ گو صندل کا دل چیخ چیخ کر کہتا رہا۔

''رک جاؤ بیٹے، میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ تم اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں پکڑا دو۔'' اسے سمجھ نہیں آئی وہ ایسا سوچتے ہوئے پسینے میں کیوں نہا گئی ہے۔ پھر یکایک اسے احساس ہوا کہ یہی حالت پہلی مرتبہ وسیم کو دیکھ کر بھی ہوئی تھی۔

''وسیم......'' اس کا دل یکایک بیٹھنے لگا۔ ''یہ......یہ بچہ بھی تو بالکل وسیم کی طرح کا ہے......اوہ خداوند......صرف انہی دونوں کو دیکھ کر ایسا کیوں ہوا ہے؟'' وہ بلبلا اٹھی اور ٹانگیں کپکپانے کی وجہ سے وہ بے اختیار پاؤں کے وزن پر زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اسے شدت سے پانی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ گھومتے ہوئے سر کے ساتھ اس کا دل بھی جیسے زمین کی گہرائیوں میں اترنے لگا۔

''خدا کے لیے اجو جلد لوٹ آؤ۔ کہیں میں بھری عدالت میں تماشا نہ بن جاؤں۔''

''بیٹی......!'' شدتِ جذبات سے کپکپاتی ایک کمزور زنانہ آواز اس کے کانوں میں پڑی تو اس نے بیٹھے ہی بیٹھے چہرہ اٹھا کر برقع کی جالی سے اپنی مخاطب کو جھانکا۔ بوسیدہ سی چادر میں لپٹی وہ دیہاتی بوڑھی عورت اسے بے انتہا تکتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا تمہاری ہی ماں کو کسی نے مارا ہے؟'' دیہاتی اور اجڈ لہجے کے باوجود اس کی آواز میں بے انتہا مٹھاس تھی۔ ٹکٹکی باندھ کر بوڑھی عورت کو دیکھتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے اقراری سر ہلایا تو عورت چادر سمیٹتی ہوئی جیسے تڑپ کر اس کی طرح پاؤں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''کیا تمہاری ماں کا نام شمشاد بیگم اور باپ کا نام قادر بخش تھا؟'' بوڑھی عورت کے لبوں سے اپنے والدین کے بارے میں تڑپتا ہوا استفسار اس پر جیسے بجلی گرا گیا اور وہ بے اختیار گھٹنوں میں سر دے کر سسکیاں بھرنے لگی۔

''جواب دو بیٹی......خدا تیرا کلیجا ٹھنڈا رکھے۔'' ممتا کی تمام تر شفقت میں تڑپ کچھ زیادہ ہی تھی اور اس نے سسکتی ہوئی صندل کے سر پر بے اختیار ملائمت سے ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا تھا۔ صندل نے تڑپ کر سر جھٹکا جیسے ملائم سے ہاتھ کے نیچے وہ پسی جا رہی ہو۔

''ہاں!'' اس نے گھٹی ہوئی آواز سے اقراری سر بھی ہلایا۔ بوڑھی عورت پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔

''کوئی اور بہن بھائی تو نہیں ہے تمہارا بیٹی؟'' ایک دوسری مگر مردانہ کمزور سی آواز نے تڑپ کر اگلا سوال کیا تو صندل نے اپنے اندر بغاوت کا شدید ردعمل محسوس کیا۔ گویا اس پر پھر سے کوئی فردِ جرم عائد کی جا رہی ہے۔ وہ حسرت سے اپنی طرف تکتے ہوئے بوڑھے کو دیکھ کر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی گویا بیٹھنے سے وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔

''کوئی بہن بھائی ہوتا تو عدالت کے اس کھلے احاطے میں اس وقت تم مجھ کو تماشا نہ بنا سکتے۔'' اس نے بڑی تلخی سے کہا مگر دوسرے ہی لمحے اپنے بوڑھے باپ کی پیٹھ کے پیچھے ابھرتا ہوا وہی بچہ اس کی رگ و پے سے گزر گیا۔

''بیٹی ناراض نہ ہو۔'' بوڑھے کی کپکپاتی آواز رندھ گئی۔ ''ہمارا مقصد تمہیں تماشا بنانا نہیں ہے بلکہ ہماری بوڑھی نظریں اپنی کھوئی ہوئی دولت ڈھونڈ رہی ہیں......'' اس نے بڑے شفقت بھرے کرب سے کہا۔ ''ہم تو خیر بوڑھے ہو گئے ہیں مگر تمہاری جوان آنکھیں کیا اس بچے میں کچھ محسوس نہیں کرتیں۔ اسی عمر میں تم نے کبھی نہ کبھی آئینے میں اپنا چہرہ ضرور دیکھا ہوگا۔'' بوڑھے نے یکایک اپنے گندے بچے کو کھینچ کر اس کے قریب کر دیا۔ اس کی روتی ہوئی آواز میں صندل کو بادلوں کی گرج سی محسوس ہوئی اور وہ جلے ہوئے تنے کی طرح بھربھرانے لگی جس پر بجلی گر چکی ہو۔

''بیٹی اپنا چہرہ دکھا دے......'' اچانک بڑھیا نے گڑگڑا کر جیسے بھیک مانگی۔ ''کیونکہ ماں اپنی اولاد کا چہرہ کبھی نہیں بھولتی خواہ وہ اس کی گود میں ایک ہی دن کیوں نہ رہی ہو۔'' دل و دماغ کی شدید سنسناہٹ میں صندل کے لیے اس کی آواز کسی جھینگر سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ تو بچے کو لمحوں میں بڑا ہو کر وسیم کا روپ دھارتے دیکھتی رہی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نگاہوں میں دو وسیم بن گئے۔ ایک چھوٹا ایک بڑا۔

''بیٹی......!'' اس کے کانوں کے ریکارڈ پر جیسے گھسی ہوئی سوئی سرسرانے لگی۔

''شمشاد بیگم نے تمہیں میری گود سے زبردستی اٹھا لیا تھا کیونکہ وہ ضرورت مند تھی اور میں مجبور......'' سرسراتی ہوئی سوئی بین کر رہی تھی۔ ''شمشاد بیگم بانجھ تھی اور ہماری غربت میری

بیماری کے ساتھ اتنی اولادوں کا بوجھ نہیں سنبھال سکی تھی اس لیے ایک مجبوری نے واسطہ دے کر دوسری مجبوری کو خرید لیا۔''

''چپ ہو جاؤ بڑی بی۔'' عدالت میں نادرہ کی طرح اچانک صندل نے بھی ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے برقع کا نقاب بھی لاشعوری طور پر نوچ پھینکا۔ اردگرد کے لوگ نہ صرف ان کی طرف متوجہ ہوگئے بلکہ صورتِ حال سے زیادہ صندل کے تمتمائے ہوئے چہرے کی کشش سے کھنچ کر قریب بھی آ گئے۔ گویا کسی مداری نے ڈگڈگی بجا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا ہو مگر بڑھیا اس کا چہرہ دیکھتے ہی بے قابو ہوگئی اور اس نے جھپٹ کر زبردستی صندل کے دونوں کانوں سے بال سمیٹتے ہوئے ان کا پچھلا حصہ ٹٹولا۔

''دیکھ...... دیکھ میری طرح تیرے اس کان کے پچھلے حصے میں بھی پیدائشی گڑھا ہے۔'' وہ بالکل دیوانوں کی طرح اس کے بائیں کان کو مروڑتی ہوئی بے قابو آواز میں چلاّ سی پڑی۔ ''بس تیری یہی نشانی مجھے آج تک یاد ہے۔'' مگر صندل بڑی بے رخی سے اس کے ہاتھ جھٹک کر بڑے وسیم کی طرف بڑھ گئی۔ لوگ بڑی دلچسپی اور تعجب سے آگ کا بگولا بنی صندل کے خوب صورت چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

''بے ایمان...... بے رحم۔'' شدید غصے میں صندل کے منہ سے جھاگ سا اڑا اور اس کا زناٹے دار تھپڑ بت بنے وسیم کے رخسار پر پوری شدت سے پڑا۔ ''میرا تماشا دکھانے کے لیے تمہیں کیا یہی جگہ ملی تھی بزدل...... آخر ہو تو مرد، کیا ہوا اگر تم نے بھائی کا روپ دھار لیا ہے۔''

''باجی......!'' بے اختیار گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرطِ جذبات سے کپکپاتی وسیم کی آواز بری طرح رندھ گئی۔

''ماں ہی سے صبر نہیں ہوسکا تھا۔'' وہ کسی مجرم کی طرح منمنایا۔ صندل کو لوگ اس جذباتی ڈرامے پر تالیاں پیٹتے ہوئے محسوس ہوئے مگر اس کی شعلہ بار آنکھیں وسیم کے گال پر اپنی انگلیوں کے پانچوں نشانوں کو دیکھتی رہیں۔ لوگ صندل کی ہمدردی میں وسیم کو دھن دینے کی فکر کر رہے تھے کہ صندل وسیم کے بالکل پہلو سے جا لگی۔

''تم تو صبر کرسکتے تھے بے صبرے۔'' اس نے سلگتی ہوئی آواز سے سرگوشی کی اور پھر وسیم کے گال سے اس کا ہاتھ اٹھاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اپنی انگلیوں کے چھوڑے ہوئے نشانات کو دیکھا اور پھر بے اختیار اپنا گال وسیم کے گال سے لگا دیا۔

''بیٹھک میں ہی بتا دیتے ڈرپوک کہ میں تمہیں تمہاری دوسری بہنوں کی یاد دلا رہی ہوں۔'' اس کی آواز بھیگ گئی مگر وسیم تھپڑ پڑنے کے بعد جیسے پتھر بن گیا تھا۔

''شاید صندل کو پھر کچھ ہوگیا ہے۔'' اجمل نے دور سے صندل کے گرد مجمع اکٹھے دیکھ کر گھبرا کر اپنے ماموں سے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں۔ میں نے وسیم کو بھی بڑے پھاٹک سے کچہری میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔'' مگر مجمع کے پاس پہنچتے ہی اس پر پوری طرح رقابت کا بھوت سوار ہوگیا کیونکہ صندل بھرے مجمع میں اب بھی وسیم کے گال پر اپنا گال رگڑ رہی تھی۔

''صندل......!'' وہ کسی زخمی درندے کی طرح غرایا۔ ''یہ کیا پاگل پن ہے۔'' وہ سر سے پاؤں تک جل اٹھا تھا۔ صندل نے ذرا سا چہرہ اٹھا کر بھیگی آنکھوں اور کپکپاتے ہونٹوں سے بے انتہا دکھ بھری نگاہوں سے اجمل کو دیکھا اور پیچھے ہٹتے ہوئے چہرے پر نقاب درست کیا اور مجمع کے پیچھے آ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس کے ماموں کی طرف بڑھ گئی۔ لوگوں نے کائی کی طرح پھٹ کر اسے راستہ دے دیا۔

''ابو گھر چلیے۔'' وہ کسی تھکے ٹوٹے بچے کی طرح ماموں سے مخاطب ہوئی۔ ''اب مزید تماشا برداشت نہیں ہوتا۔'' اس نے غیر محسوس سکی سی بھری۔ ''اکیلی تھی تو بڑا حوصلہ تھا مگر اب ایک دم سے اتنے لوگوں کو پا کر جیسے میں بہت کمزور ہوگئی ہوں۔'' اس نے کسی بسورتے ہوئے بچے کی طرح شکایت کی۔

''مگر بات کیا ہے بیٹی؟ اتنے غیر لوگوں کے درمیان اجمل کے دوست کے ساتھ تمہارا رویہ قابلِ اعتراض تھا۔'' ماموں نے احتجاج کیا۔

''یہ لوگ اچانک میرے دعوے دار بن بیٹھے ہیں۔ ناصر کی طرح شاید اب یہ بھی مجھ پر دعویٰ دائر کردیں گے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''خدا نہ کرے بیٹی۔'' پاس کھڑے بوڑھے نے تڑپ کر بے اختیار اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اجمل کے ماموں نے پہلی مرتبہ اس مظلوم سے دیہاتی بوڑھے کو دیکھا جس کے کپڑوں ہی سے غربت و بے کسی پھٹی پڑ رہی تھی۔

''تمہارا دل نہیں مانتا تو ہم واپس چلے جائیں گے۔'' بوڑھے نے جیسے سکی سی بھری۔ ''جہاں اتنے سال دل پر پتھر رکھ چھوڑا ہے چند سال اور برداشت کرلیں گے۔''

''مگر آپ کون ہیں محترم؟'' اجمل کے ماموں نے ذرا فاصلے پر میلی سی چادر میں زمین پر بیٹھی سکڑی سمٹی گم صم سی عورت کو دیکھا جو یک ٹک بے پناہ حسرت سے صندل کو تکے جا رہی تھی۔

''یہ میرے والد صاحب اور وہ میری والدہ ہیں ماموں جان۔'' وسیم نے اپنا گال سہلاتے ہوئے تھرتھراتی ہوئی آواز

میں دخل اندازی کی۔

''اوہ......!'' اجمل اور اس کے ماموں کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور اجمل باری باری سب کو حیرانی سے دیکھنے لگا۔

''تو......تو......صندل......''

''جی اجمل بھائی، وہ میری بڑی بہن ہیں۔'' وسیم نے جلدی سے انکشاف کیا مگر صندل جیسے ڈر کر ماموں کے بازو سے پیوست ہوگئی۔

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، ماں کو انہی کی یاد میں تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ اکثر یہی دہراتی ہیں کہ مرنے والوں کا صبر آجاتا ہے مگر زندگی ہی میں اولاد بچھڑ جائے تو کبھی صبر نہیں آتا۔'' اپنے باپ کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر وسیم کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی۔

''ہمارے اور باجی کے درمیان بہت فاصلہ ہے مگر ہم زبردستی اسے کم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اپنی خوشی کے لیے صندل باجی کی خوشی نہیں چھینیں گے۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ کھوئی ہوئی بہن مل گئی ہے اور وہ خوش ہے۔'' وسیم نے خفیف سی ہچکی لی اور نظر بھر کر صندل کو دیکھا اور پھر اپنی ماں کی طرف جھک گیا۔

''چل ماں چلیں......اپنی بیٹی کو زندہ سلامت دیکھ کر اب تو تمہیں صبر آ گیا ہوگا۔ بہنیں تو ویسے بھی پرائے گھر کی امانت ہوتی ہیں۔'' اس نے لاوا اگلتی آواز سے کہتے ہوئے ماں کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اچانک صندل ماموں کا سہارا چھوڑ کر وسیم کے باپ کے پاس پنجوں کے بل بیٹھی اور ڈرے سہمے باپ کے ساتھ چپکے چھوٹے بھائی کو زبردستی کھینچ کر بازوؤں میں بھرتے ہوئے اتنی شدت سے اپنے سینے سے بھینچا کہ چھوٹے بھائی کی گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔

☆☆☆

''مگر بھائی! تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ بے چاری نادرہ کا کیا بنا؟'' میں نے اجمل کے دوسرے بیٹے کی سالگرہ کے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالنے سے پہلے پوچھا۔ اجمل میرا کزن تھا ہم لوگ کینیڈا میں رہتے تھے کافی سالوں بعد ملاقات ہوئی تو محسوس ہوا کہ ہم سب کی زندگیوں میں کتنی بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔

''واہ شہاب بھائی، ساری رات یوسف زلیخا کا قصہ پڑھتے رہے صبح پوچھتے ہیں زلیخا مرد تھی کہ عورت۔'' صندل نے چہک کر شوخی سے بات اچکی۔

''پھوپی جان، امی بلاتی ہیں۔'' اچانک ایک چار پانچ سال کے گول مٹول خوب صورت بچے نے کمرے میں داخل ہو کر صندل کو مخاطب کیا۔

''بڑے بدتمیز ہو، انکل کو سلام بھی نہیں کیا۔'' صندل نے پیار سے بچے کو ڈانٹا تو اس نے سہم کر مجھے دیکھا اور سلام کر کے جھٹ سے بھاگ گیا۔

''تو یہ تمہارے بھائی وسیم کا بیٹا ہے؟'' میں نے قدرے تعجب سے تصدیق چاہی۔

''جی نہیں۔'' صندل کا انداز بے حد شوخ تھا۔

''میری بھابی نادرہ کا۔'' میں ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔

''تمہاری بھابی نادرہ کا......؟'' میں نے بے ساختہ دہرایا اور پھر چکراتا ہوا دوبارہ اپنی کرسی پر آ کر ٹک گیا۔

''ہاں شہاب بھائی، بھابی نادرہ کا۔'' اس نے ایک ادا سے اٹھلا کر پہلے اجمل اور پھر مجھے دیکھا اور ایک دم کھلکھلا کر زندگی سے بھرپور ہنسی ہنس دی۔

''مگر وہ تو تمہیں بھی پھوپی جان کہہ رہا تھا۔'' میں نے مزید حیران ہو کر کہا۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔'' اس کی شوخ آواز بڑی جاندار تھی۔ ''دراصل وسیم بھائی ہمدردی کے جوش میں ذرا سا شرما کر نادرہ پر عاشق ہو گئے تھے۔''

''اوہ۔'' میں نے بے ساختہ تعجب کا اظہار کیا۔

''دراصل بات یہ ہے شہاب بھائی کہ......'' اب کے اجمل نے جلدی سے صندل کی بات اچکی۔ ''ناصر کے گھر کی تلاشی کے دوران طلاق نامے کے ساتھ نکاح نامہ بھی مل گیا تھا۔'' اجمل نے اپنی بیوی صندل کو نشیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے وضاحت کی۔

''اتفاق سے نادرہ بھابی کے باعزت بری ہونے پر والد صاحب وسیم کو لے کر یہ کہتے ہوئے زبردستی اسپتال پہنچ گئے کہ نادرہ بھابی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے، انہیں تا برخواست عدالت سزا ہوئی تھی۔''

''تو یہ بچہ ناصر......؟''

''نہیں......نہیں۔'' صندل نے تیز چھری کی طرح میری بات کاٹی۔

''یہ وسیم ہی کا بیٹا ہے۔ اپنی بریت کی خبر سنتے ہی نادرہ بھابی پر اتنا شدید جذباتی ردعمل ہوا کہ اسی وقت اسقاط ہوگیا۔ میں آپ کو پریشان کر رہی تھی۔ ظاہر ہے عامر وسیم بھائی اور نادرہ کی ہی اولاد ہے۔'' صندل نے پرجوش انداز میں وضاحت کی تو میں خاموش ہوگیا۔ مجھے اس کے تقدس کو مجروح کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔